

سایہ دیوارِ حلی نہیں



قیصرہ حیات

WWW.PAKSOCIETY.COM

سایہ دیوار بھی نہیں

قصہ حیات

ڈاٹ کام

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام ناول سایہ پیار بھی نہیں

مصنفہ قیصرہ حیات

ناشر گل ناز احمد

کچھ رنگ علم و عرفان پبلشرز، اردو بازار لاہور

پروف خوانی رفاقت علی

سن اشاعت عمار اکرم شاہد

مطبع جنوری 2007ء

قیمت جو درجہ پورے 300/- روپے

سیونٹھ سکاٹی پبلیکیشنز

غزنی سٹریٹ، الحمد مارکیٹ

40- اردو بازار لاہور

علم و عرفان پبلشرز

34- اردو بازار لاہور

فون: 042-7352332-7232336

انتساب!

بہت پیارا اور دعاؤں کے ساتھ
اپنی سب سے چھوٹی بہن ”سنبل“ کے نام
جسے میں بہت محبت کرتی ہوں۔

ڈاٹ کام

”دیباچہ“

یہ ناول پاکیزہ ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا میرا پہلا ناول ہے جو عام روایتی ناولوں سے قدرے مختلف ہے کیونکہ اس میں کوئی بھی کردار مخصوص انداز میں ہیرو یا ہیروئن بن کر نمودار نہیں ہوا بلکہ یہ معاشرے کے ان چلتے پھرتے کرداروں کی کہانی ہے، جو اپنی اپنی سوچ کے مطابق زندگیوں گزار رہے ہیں اور دنیا کی اسٹیج خالی کر کے چلے جاتے ہیں، جو سوچے تو بہت کچھ ہیں مگر اس کے مطابق عمل نہیں کر سکتے۔ جو احساسات و جذبات تو رکھتے ہیں مگر بروقت ان کا اظہار نہیں کر پاتے۔ ایسے کردار ہمیں ہر معاشرے اور ہر طبقے میں ملتے ہیں۔ جنہیں ہم کبھی نظر انداز کر دیتے ہیں اور بعض اوقات نظر انداز کرنے کے باوجود بھی وہ ذہن سے محو نہیں ہو پاتے کیونکہ قدرت نے کہیں نہ کہیں ان میں کوئی انفرادیت ضرور رکھی ہوئی ہے اور یہ انفرادیت ہر کردار میں نہیں بلکہ بہت سے ایک جیسے کرداروں میں سے صرف چھ ایک میں ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ بھلائے نہیں جاسکتے۔

بھول جیسے چیز ”یہ دنیا ایک اسٹیج ہے جہاں ہر انسان اپنا کردار ادا کر کے چلا جاتا ہے۔“ اب یہ قدرت کی عطا ہے کہ وہ ہم انسانوں کو اس دنیا کا کلام چلانے کے لیے کیا کیا رول (کردار) دیتی ہے۔ ہمیں اس کردار کو سمجھ کر بخوبی سمجھانے کے فن سے کس حد تک آشنا کرتی ہے۔ ہمیں کتنی صلاحیتوں سے نوازا کرتی ہے۔ ہمارے فہم و ادراک کو کتنا متحرک اور فعال بناتی ہے۔ زمانے کی تکفید اور اپنی حیثیتوں کو سمجھنے کا کتنا شعور دیتی ہے۔ ہماری سوچ کس حد تک پریکٹیکل (عملی) بنتی ہے یا محض تخیلاتی۔ ہمارے لیے ہمارا ماحول کس حد تک سازگار ہے۔ یہ سب عوامل مل کر نہ صرف ہمارا کردار تشکیل دیتے ہیں بلکہ دنیا کی اسٹیج پر ہمارے کردار کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔

یوں معاشرے کے ان تمام کرداروں کی دنیا بند کر دیں تو سب سے پہلے ہمیں Prototype کردار نظر آتے ہیں یعنی دنیا کی اسٹیج پر نمودار ہونے والے صف اول کے شاہکار کردار جنہیں قدرت سیکڑوں، ہزاروں سالوں بعد دنیا میں بھیجتی ہے۔ ایسے جو ہر نایاب، کمیاب ہوتے ہیں اور وہ صرف دنیا والوں کے لیے ایک مثال اور نمونہ بننے کے لیے تخلیق کیے جاتے ہیں۔ انہیں ہر طرف سے بھرپور داد و تحسین دی جاتی ہے۔ ان کے مرنے کے بعد بھی دنیا انہیں بھول نہیں پاتی۔ ایسے کردار دنیا کی بڑا اور انسانیت کی خدمت کے لیے تخلیق کیے جاتے ہیں۔ دنیا کی پوری تاریخ پر نظر دوڑائیں تو ایسے نایاب کردار ہمیں گے تو ضرور مگر کم تعداد میں۔ جیسا کہ اس ناول کا بظاہر اہم اہم نظر آنے والا کردار، موحّد (ولیم) جو اپنی زندگی کا مقصد انسانیت کی خدمت کو ٹھہراتا ہے۔ موحّد میں اپنے اس کردار کو سمجھانے کی کتنی صلاحیت ہے اس کا اندازہ اس کے محسوسات سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس نے ظاہر کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیا مگر اس کے اندر اتنی پختلاصل پیدا ہو چکی ہے کہ وہ تمام آزمائشوں سے آسانی گزر سکتا ہے۔ جو لوگ اوائل شباب میں ہی اپنے محسوسات، جذبات، شعور و خیالات سے جنگ کر کے اپنے لیے مراد مستقیم متعین کر لیتے ہیں وہ دراصل اپنی ذات اور اس کے تقاضوں کو سمجھ کر، اپنے Complexes کو نظر انداز کر کے دنیا کی حقیقتوں کا سامنا کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ ان کی اس تکفیل کا مقصد ہی

یہی ہوتا ہے کہ قدرت ان کو اس کردار کو بھانے کے فن سے آشنا کر رہی ہوتی ہے جو انہوں نے آئندہ زندگی بھر پر انعام میں ادا کر کے دنیا کے لیے ایک مثال بننا ہوتا ہے۔

دوسرے کردار قدرے کم اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ لوگوں سے داد و تحسین تو پاتے ہیں مگر ہمیشہ یاد نہیں رکھے جاتے۔ وہ آتے ہیں اور اپنا کردار احسن طریقے سے نبھا کر چلے جاتے ہیں۔ یاد آنے پر ان کی تعریف تو کی جاتی ہے مگر وہ پہلے کردار کی طرح مثال نہیں بن پاتے جیسا کہ اس ناول کا ایک اہم کردار حیدر ہے۔ جسے سراہا تو جاسکتا ہے مگر جس نے کوئی انتہائی قدم نہیں اٹھایا اور زندگی کے روایتی دھارے کو بہنے سے نہیں روکا۔ ایسے Stereotype کردار زندگی کو صرف چلاتے ہیں کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیتے۔

تیسرے کردار ایکسٹرا (Extras) ہیں جو دنیا کی اسٹیج کو صرف Fill کرنے کا کام انجام دیتے ہیں۔ دنیا کو ان کے آنے اور نہ آنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بھول ایک مغربی مفکر ”ایسے لوگ حشرات الارض“ ہوتے ہیں جو جنم لیتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ جن کی زندگی میں Contributions کچھ بھی نہیں ہوتیں۔ اس ناول کے زیادہ تر کردار Extras ہیں۔

چوتھے کردار Idiosyncatic ہیں جو نہ تو اپنے کردار کو سمجھ پاتے ہیں نہ ہی اپنی صلاحیتوں کو اور نہ ہی اسٹیج یعنی اس دنیا کی ڈیمائٹز کو۔ وہ گوئی کیفیت میں ہوتے ہیں۔ جو چاہتے ہوئے بھی نہ کچھ کہہ پاتے ہیں اور سوچتے ہوئے بھی عملی قدم نہیں اٹھا پاتے۔ وہ ہمیشہ مناسب مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں اور جب بھی کوئی قدم اٹھاتے ہیں تو انتہائی نامناسب موقعوں پر ایسے کردار دنیا کے لیے ایک سوالیہ نشان بن جاتے ہیں اور جن کے چلے جانے کے بعد لوگ حیرت سے ان کے بارے میں سوالات کرتے رہتے ہیں۔ اس ناول کا مرکزی کردار (شہلا) سب کے لیے ایک سوال بنا رہا ہے کہ شہلا کون تھی؟ پہلے طلاق کیوں نہ لی۔ اس نے بچے کیوں چھوڑ دیے۔ اس نے پیڑ کو ولیم کا نام کیوں رکھ دیا۔ وہ پیدائش سے لے کر مرنے تک ایک سوال بنی رہتی ہے اور میرے اس ناول کا مقصد ہی معاشرے کے ان کرداروں کو Highlight کرنا تھا جو ہمیشہ نظر انداز کیے جاتے ہیں۔ جن کے بارے میں ہم حیرت سے سوال تو کرتے ہیں مگر ان کی نفسیات کو جاننے کی کوشش نہیں کرتے اور جن کے اندر جہانک کران کے احساسات تک رسائی نہیں کر پاتے اور جو مختلف نفسیاتی عارضوں اور جسمانی بیماریوں کا شکار ہو کر مر جاتے ہیں۔

ان ہی کرداروں میں ایک اہم کردار ”شکل“ کا ہے جنہیں ہم Odd یا انجیل کردار کہتے ہیں۔ میں نے کچھ عرصہ آرڈی پبلک کالج سیکوٹ میں بطور انگلش ٹیچر جاب کی۔ اس دوران بہت سے نوجوان لڑکے، لڑکیوں کے مسائل سامنے آئے جو ذہن میں مواد کی صورت میں قمع ہوتے رہے۔ ان میں ایک کردار کی مماثلت ”شکل“ سے تھی۔ جو نبھانے دنیا کی بھیڑ میں کہاں گم ہو گیا مگر میرے ذہن سے ٹوٹ نہیں ہو سکا۔ اور جس کے یاد آنے پر دل سے ”آؤ نکلتی ہے۔ میں غم کے ذریعے معاشرے کے ان چلتے پھرتے کرداروں کو میں کس طرح Portray کر پائی ہوں۔ اس کا فیصلہ قارئین کے ہاتھ میں ہے۔

اس ناول کے ضمن میں کچھ مخصوص لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جو اس ناول کی تخلیق اور اشاعت کا باعث بنے۔

سب سے پہلے اپنی دوست عمیرہ احمد کا، جس نے ہمیشہ اپنے ہر غلوں مشوروں سے نوازا اور جس کے قائل کرنے پر ہی میں نے پاکیزہ

ڈائجسٹ میں لکھنا شروع کیا اور بہت سے قارئین تک رسائی ممکن ہوئی۔

اس کے بعد مکر مسانم انصار صاحبہ (پاکیزہ کی ایڈیٹر) کا جنھوں نے اس ناول کا انتخاب میرٹ کی بنیاد پر کیا جسے میں نے دو تین سال قبل مکمل کر کے بھیجا اور جسے گا ہے پڑھ کر انھوں نے پاکیزہ میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔

اور ان تمام قارئین کا جنھوں نے ہر نقطہ کے بعد اپنی قیمتی آراء سے نوازا اور میری بھرپور حوصلہ افزائی کی۔ جو اس ناول کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا باعث بنی۔

قارئین اپنی آراء اس ایڈریس پر ای۔ میل کر سکتے ہیں۔

lco2006-akl@yahoo.com

سب کے لیے دعا گو

قیصرہ حیات

23-11-2006



پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام

موسم تیزاں کی سرد و شام کو مضمحل، دم توڑتی دھوپ میں آسمان پر روئی جیسے اڑتے پھرتے ہادلوں کے سنگ اور زمین پر چیر ہوا کے جھونکوں میں ہر طرف اڑتے پھرتے، بھڑاتے، کڑکڑاتے، سوکھے پتوں پر قدم رکھتے ہوئے وہ نہ جانے کن سوچوں میں گم تھی۔ کوتاہی کی سیاہ سڑک پر ہر طرف بڑاؤن، اور سبز کی رنگوں میں بدلتے پتوں کے ڈھیر لگے تھے۔ جیسے درخت اپنا سارا بوجھ اتارنے پر تلے ہوں اور اس فریضے سے جلد از جلد فارغ ہو کر قدرت کی طرف سے نئی آرائش کے منتظر ہوں۔ پرانے، مضمحل، شکستہ وجودوں کو اتار پھینک دینا چاہیے۔۔۔۔۔ وہ کس کام کے؟ وہ سڑک کے عین وسط میں کھڑی ہو گئی اور ایک لمحے کو سوچا۔ ارد گرد سفیدے کے لیے لے لے اور سنیل کے درختوں ایک شکستہ عمارت کی ٹوٹی تھا۔ یہ سڑک کا سب سے خوب صورت حصہ محسوس ہو رہا تھا۔ مختلف سائز اور اشکال کے پتے، کچھ نیچے گرے ہوئے اور کچھ اکا دکا شاخوں کے ساتھ چپے ہوئے، سب سے لگ رہے تھے۔ ہوا کا شدید جھولنا نہ جانے کہاں سے آیا اور پتے پھر ہوا کے سنگ بھڑ بھڑانے لگے۔ ہوا کے دوش پر سوار نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ جیسے انسان۔۔۔۔۔ قسمت کے جھوٹے انجمن کیسے کیسے اڑاتی پھرتی ہے۔ کبھی وہ اس کے پروں پر سوار ہوا میں خود پرواز ہو جاتے ہیں تو کبھی وہ انہیں انہماک کر زمین پر زور سے پھینکتی ہے۔ کبھی وہ قدموں تلے آ کر کڑکڑ کرتے ہیں۔ کبھی گیلی زمین کے ساتھ چٹ کر خاک میں پنہاں ہو جاتے ہیں۔

وہ آگے بڑھی۔ خوبصورت بڑے بڑے پتوں کو ہاتھ لگا کر دیکھنے کی خواہش کی تو نہ جانے کہاں سے کسی کی کوئی ٹیک کی کانٹوں بھری شاخ نے سر اٹھایا۔ اس پر ہر طرف کانٹے تھے۔ کہیں اکا دکا چھوٹے چھوٹے پتے اور تھوڑے تھوڑے قاصدے پر سرخ چھوٹے، چھوٹے مسکراتے ہوئے تین پھول کانٹوں بھری اس شاخ پر آگے سرخ پھول اسے قدموں سے اٹھائے گئے۔ اس نے پھول توڑنے کی کوشش کی، کانٹوں بھری شاخ اس کے دامن سے الجھ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں کئی کانٹے چھب گئے۔ اس نے پھر پھول توڑنے چاہے مگر اب کی بار کانٹوں نے اس کے دوپٹے کو بھی اپنے حصار میں لے لیا۔ وہ الجھتی لگی۔ کانٹے چبے ہی گئے۔ اس نے کانٹوں سے دامن چھڑا دیا تو ایک شاخ سے دوسری اور تیسری کئی کانٹوں بھری شاخیں نمودار ہوئے لگیں اب اس کا ہاتھ پلیٹ میں لے لیا۔ کانٹے چبے گئے اور لہجہ ہانپا ہوئی لگی۔ قدموں تلے سرسرا تے، بھڑ بھڑاتے، پتے دم توڑتے رہے۔ اس کی ساری جگہ دھوا کا رت لگی۔

وہ کانٹوں کی چیخیں روح کے اندر تک محسوس کرتی رہی۔ فرار حاصل کرنے کی کوشش میں ادھر ادھر بھاگتی رہی مگر کانٹوں میں الجھا ہوا وہ پتا اس کے گلے کا پھندا بن رہا تھا۔ اس کی ایک لمحے کی خواہش اور آرزو نے اس کے وجود کو بھی خطرے میں ڈال دیا تھا۔ محض ایک لمحے کی خواہش، بنا سوچے سمجھے لا حاصل کی تمنا، کچھ حاصل کرنے کی جستجو وہ تو کر چکی کر چکی ہو گئی تھی۔ بالکل شکستہ اور زخمی، جال میں پھڑ پھڑاتے پنچھی کے مانند۔۔۔۔۔

وہ فیصلہ نہ کر سکی کہ اس کی خواہش، تمنا اور اس کے حصول کی جستجو بے فربہ تھی یا بے سود۔ وہ الجھتی رہی، بھاگتی رہی اور کانٹوں کی چیخیں شدید ہوتی گئی۔ اچانک شاخ سے پھول ٹوٹ کر گرے اور پتی پتی ٹکڑے ہو گئے۔ حاصل کی تمنا دم توڑ چکی تھی۔ ہر جذبہ بے نامہ پڑنے لگا۔ کچھ بھی باقی نہ رہا۔ نہ شاخ، نہ پھول، نہ کانٹے اور نہ ہی وہ خود۔۔۔۔۔ وہ لہجہ ہانپا دل اور شکستہ قدموں کے ساتھ ایک سمت کو مڑ گئی اور سیاہ لمبی سڑک۔۔۔۔۔ پر چلتی ہوئی پتھروں سے ٹکراتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

”تم ایک انسان ہو۔ مکمل شخصیت، مکمل وجود۔

تم بے حقیقت ہو۔ وجودی شخصیت..... مکمل وجود۔

تم خوب صورت احساس ہو، منفرد شخصیت..... حسن و جمال کا بیکرا

تم ایک عورت ہو۔ ایک معزز شخصیت..... خالق کی معجز مخلوق.....

اور..... سہو..... تم مسلمان بھی تو ہو۔ کہیں سے آواز آئی۔

”جیسا، میرا کوئی وجود نہیں۔ کوئی شخصیت نہیں اور کوئی مذہب بھی نہیں۔ اس نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ اسے آج اور اسی وقت فیصلہ کرنا

تھا۔ ایک اہم فیصلہ جس پر اس سمیت، کئی ذمہ داریوں کا دار و مدار تھا۔ ایسا فیصلہ جس نے کتنے سالوں پر حاوی ہونا تھا۔ کتنے وجودوں پر اثر انداز ہونا تھا۔ پراگندہ اور منتشر سوچوں نے اس کے ذہن کی یکسوئی کو تباہ کر دیا تھا۔ وہ جھنجھلا گئی۔

گھر کے باہر کبھی سیاہ سنسان سڑک پر اطراف میں اونچے اونچے درختوں کے درمیان چلتی ہوئی، سیاہ اوور کوٹ میں پڑا مرد چہرے، پراگندہ سوچوں اور سرخ شدہ شخصیت کے ساتھ دھر مچایا ہوا خنزیر رسیدہ پنا لگ رہی تھی اس کے قدم ڈنگا رہے تھے جیسے اس کی سوجھیں اٹھ چکی ہو رہی تھیں۔

”میں کیا ہوں؟“ اس نے پوچھی ہے آکھیں بچ لیں اور اپنے آپ سے سوال کیا۔

”تم ایک انسان ہو، منفرد وجود و محبت کے قابل..... صرف تمہاری زندگی کا تم پر حق ہے۔ تم اس دنیا کی اہل حقیقت ہو۔ اس لیے صرف اور صرف اپنے بارے میں سوچو۔ دنیا میں تمہارے وجود سے بڑھ کر تمہارے لیے کچھ اہم نہیں ہونا چاہیے۔“ پیٹر کے الفاظ اس کے ذہن میں گونجنے لگے اور اسے کچھ کرنے پر اکسانے لگے۔

”تم ایک مکمل وجود ہو، ایک وجودی شخصیت۔ جس کا کوئی ماضی نہیں اور جس کا کوئی ماضی نہیں ہوتا۔ اس کی کوئی شناخت نہیں اور جس کی کوئی شناخت نہیں ہوتی وہ دنیا کی سب سے زیادہ بے وقعت اور حقیر شے ہوتی ہے۔ جسے صرف اور صرف نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔“ ملک منصور کے الفاظ اسے اندر ہی اندر کچھ کے لگانے لگے۔ اسے شدید ذلت کا احساس ہونے لگا۔

”تم قدرت کا حسین شاہکار ہو، چاند کی چاندنی اور ہوا کے خوشگوار مترنم جھونکے کا حسین، دلگداز احساس، چاہے جانے کے قابل ایک اہم وجود۔“ اسے حیدر کی پنے برائی یاد آنے لگی۔ اس کے اندر ایک کڑی کھلی اور تازہ ہوا کے خوشگوار جھونکے کا لطیف احساس اسے اندر ہی اندر مضطر کرنے لگا۔ لیون پر پھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں نمی بھی حیرنے لگی۔

”تم ایک عورت ہو، ایک بٹی، خالق کی پیدا کردہ معزز مخلوق۔ مکمل حقوق کے ساتھ عزت کے قابل۔“ سید صاحب کے الفاظ ہمیشہ رستے دشمنوں پر مرہم کا کام دیتے تھے۔

”لیکن مجھے تو منصور اور پیٹر میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہے۔ حیدر اور سید صاحب تو میرا ماضی ہیں اور ماضی کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ ان

سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ٹھنڈی ہوا کے رخ جو مجھے اس کے جسم سے ٹکرائے اس نے کانپ کر جھرجھری سی لی۔
 "اور تم۔۔۔ ایک مسلمان بھی تو ہو۔" کسی نے اندر سے پھر ٹپکا دیا۔

کسی نے کہا۔ "..... یہ تو..... یہ تو سید صاحب کا مذہب ہے۔ میرا تو نہیں جب میرے وجود کی شناخت ہی نہیں تو مذہب کیا۔ میرا کوئی مذہب نہیں۔ نہ معدوم، نہ مسلمان، نہ کرسچن۔"

"انسان کو صرف اور صرف اپنے وجود، اپنی ذات کے حقوق کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس دنیا میں ذمہ و رتبے کی آرزو اس کی ہوتی سب سوچوں پر حاوی ہوتی چاہیے۔" پیٹر کے الفاظ اسے ایک فیصلہ کرنے پر مجبور کرنے لگے۔ اس نے نادانستہ آنکھیں بند کیں تو آنسوؤں سے بھری آنکھیں برستے لگیں۔

"انسان کا نصب کبھی نہیں بدلتا۔ مشرق ہو یا مغرب، مگر ہو یا باہر، انسان تھا ہو یا بھوم میں۔" اسے اپنے ہی کہے ہوئے الفاظ یاد آنے لگے جو اس نے ایک دفعہ حیدر سے کہے تھے۔

"ہاں، ہم سب بہت پس انسان ہیں۔ اپنی اپنی تقدیر کے ہاتھوں۔" حیدر کی شکستہ آواز کہیں سے سرگوشیوں کی صورت میں ابھری۔
 "مگر جی عبت اور لگن قدرت کے فیصلوں کو بدل بھی دیتی ہے۔ دل سے نکلی ہوئی، کلیجے کو شق کرتی دعا۔ کیا وہ بھی نہیں؟" اس نے آخری بار حیدر کو کونہ سے کرنے کی کوشش کی۔

"جہنم..... قدرت اپنے فیصلوں میں ہمیشہ اٹل ہوتی ہے۔" حیدر نے تردید کی اور حقیقت بتائی۔

"لیکن مجھے یقین ہے۔ وہ ضرور اپنے فیصلوں کو بدلے گا۔" وہ پراحتا دلچسپی میں بولی۔

"Nature has to be done" حیدر کی سرگوشی، دم مہم ہوتی گئی۔

وہ چلتی ہوئی نہ جانے کہاں سے کہاں تک پہنچ چکی تھی۔ اونچے اور لمبے لمبے درخت جھولتے ہوئے، سرسراہٹے ہوئے ایک دوسرے کو چھیڑ رہے تھے۔ آسمان اب آلود تھا۔ لندن کی صبحوں اور شامیں یکسانیت کا شکار ہو گئیں تھیں اور وہ خود بھی ویسی ہی ہو گئی تھی۔ موسم، ماحول، لوگ، کچھ بھی اسے متاثر نہیں کر رہا تھا۔

"You're a woman enjoy your rights you're an individual" پیٹر کے الفاظ اسے چھوڑ رہے تھے۔ کوئی قدم اٹھانے پر مجبور کر رہے تھے۔

"دنیا کی سب سے بڑی حقیقت تم ہو۔ یہ سچے سچے نئے سب بے بنیاد باتیں ہیں۔ تم اہم ہو۔ تمہاری خوشیاں اہم ہیں۔ صرف اور صرف اپنا سوچو۔ اپنی ذات کی خوشیاں مقدم رکھو باقی سب بھول جاؤ۔ تمہارے لیے کوئی اہم نہیں۔ صرف..... تم اپنے لیے اہم ہو۔" پیٹر کے لہجے کا اعتماد اسے اندر ہی اندر سکون بخش رہا تھا۔

"نیکی سچ ہے، اسی نیکی سچ ہے۔ سب سے پہلے میں ایک انسان ہوں بعد میں کچھ اور۔" اس نے مثبت انداز میں سوچا اور فیصلہ کر لیا۔ اس

نے ڈور بیل بجائی تو اس کی چھ سالہ بیٹی شفق نے دروازہ کھولا۔ وہ بغیر کچھ کہے اندر داخل ہو گئی۔ خاموشی سے اور کوٹ اتارا اور میز کے سامنے بیٹھ گئی۔ شفق حیرت سے ماں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”تمہارے باپا کہاں ہیں؟“ اس نے پرسکون لہجے میں پوچھا۔

”اوپر.....“ شفق نے جواب دیا۔

”اکیلے یا پھر کوئی اور بھی ساتھ ہے۔“ جواباً شفق خاموش رہی اور وہ اوپر چلی گئی۔

کمرے کا ماحول بہت دروازے تھا۔ آتش دان میں آگ دھک رہی تھی۔ بیرونی لٹ کے خوب صورت دیوار پر دے، سگار اور کافی کی بھیجی بھیجی ہبک آتش دان کے قریب دونوں غلوں کھنڈ پر بیٹھے تھے۔ شزا گٹار بجار رہی تھی اور منصور اس کے سامنے بیٹھا صحبت بھری پرستاش لگا ہوں سے اسے دیکھنے میں مگن تھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“ شزا تعجب کر مسکراتے ہوئے بولی۔

”گٹار کے تاروں سے لٹکنے والے سروں کے ساتھ جھللاتی، چمکتی اور بے ہوش کرتی ان خوب صورت نیلی آنکھوں کو۔“ منصور ہوشی کے عالم میں بولا۔

”دنیا میں اور بھی تو بہت کچھ ہے ان کے سوا۔“ وہ اک ادا سے مسکرا کر بولی۔

”ہاں..... ہے تو سبھی..... مگر ہم تو صرف وہ دیکھ رہے ہیں جو موجود اور پھر جس تک رسائی بھی ممکن ہو۔“ وہ بھی مسکرا کر بولا۔

”اور جس تک رسائی ممکن نہ ہو تو؟“ اس نے معنی خیز مسکراہٹ سے پوچھا۔

”تو میں..... ملک منصور سے چھین لینے کا عادی ہوں۔ جلدی یا دیر۔ اس تک رسائی کو ممکن بنانا ملک منصور کو اچھی طرح آتا ہے۔“ وہ فخر یہ انداز میں بولا۔

”بہت پونہ سیو ہو۔“

”ہاں..... جب تم جیسا آتھیں حسن بہکانے پر تلا ہو۔“ ملک منصور نے اس کے نازک سر میں ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں بند کیا جیسے پیپ میں موٹی۔

”اچھا یہ بتاؤ، والہی کب جا رہے ہو؟“ شزا نے جلدی سے بات کا موضوع بدلا۔ مبادا وہ کہیں مزید نہ بہک جائے۔ وہ اس کی دل پیچک طبیعت سے اچھی طرح واقف تھی۔

”کل رات کو۔“

”سب.....“

”ہاں..... ظاہر ہے۔“ منصور پر اعتماد لہجے میں بولا۔

”مگر میں نہیں.....“ شہلا ایک دم اُندھا مٹی اور اس کے سامنے کھڑے ہو کر بولی۔ منصور کو اس کی غیر متوقع آمد سے جھٹکا۔ وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی اتنی جرات کہ شزا کی موجودگی میں وہ اس کے کمرے میں آگئی تھی۔

”تم..... اور تمہاری یہ جرات!“ منصور اس کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے غرایا۔

”شٹ اپ!“ اس نے اس کے ہاتھ کو روکتے ہوئے کہا۔

منصور کے لیے یہ شاک سے کم نہیں تھا۔ ”میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں..... یو ہاسٹرز!“

”ہولڈ پورنگ.....“ وہ غصے سے آنکھیں ٹکاتی ہوئی بولی۔

شزا پٹی پٹی لگا ہوں سے دلوں کی طرف دیکھنے لگی۔ ”پلیز ریلیکس، میں جا رہی ہوں۔“ شزا ایرانی سے دلوں کی طرف دیکھتی ہوئی باہر جانے لگی اور اسی میں عافیت سمجھی۔

”تم کہاں جا رہی ہو۔ یہ تمہارا بھی طرح دیکھ کر جانا۔“ شہلا نے اس کا بازو پکڑ کر اسے روکنا چاہا۔

”کیا مطلب؟“ منصور چوٹا۔

”مجھے ڈائریس چاہیے ابھی اور اسی وقت!“ شہلا نے دھوکہ کہا۔

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نا؟“ منصور غیر یقینی لہجے میں بولا۔

”ہاں، بالکل ٹھیک ہے اور شاید ابھی ٹھیک ہوا ہے۔ اب میں مزید ذلت کی زد مگنی نہیں گزاد سکتی۔ تم نے مجھے جتنا بے عزت کرنا تھا خوب کر لیا۔ اب تمہارے اور میرے راستے جدا جدا ہیں۔“ وہ تعلیت سے بولی۔ منصور کے لیے یہ خبر شاک سے کم نہ تھی۔ وہ شہلا جس نے کبھی اس کے سامنے زبان نہ کھولی تھی آج کیسے اس سے جھگڑ رہی تھی۔

”تم کہاں سے آ رہی ہو؟“ منصور نے اس کے تہودیکھ کر معنی خیز اذعان میں پوچھا۔

”تم سے مطلب.....“ شہلا قدرے بے پروائی سے بولی۔

”تم اپنی حد کس کر رہی ہو۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ وہ اپنا لہجہ صیحا کرتے ہوئے بولا۔

”میں بہت سوچ سمجھ کر بول رہی ہوں اور جس آج کر رہی ہوں وہ مجھے بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔“ وہ اعتماد سے بولی۔

”مجھے سب معلوم ہے یہ آگ اسی ہاسٹرز پٹری کی لگائی ہوئی ہے۔ جس سے تم چھپ چھپ کر لٹی ہو۔ دیسے بڑی پارمانتی ہو..... اور

اب..... تم ہو ہی ہاسٹرز.....“ وہ دانت پکچھا کر بولا۔

”کیا تمہیں احساس ہے کہ بچے.....؟“ منصور نے آخری حربہ استعمال کیا۔

”بچے تمہارے ہیں اور بچوں کا جھوٹا سہارا لے کر انہیں میرے پاؤں کی زنجیر بناؤ۔ جب عورت بچوں کے لیے تڑپے تو تم لوگوں کو

احساس نہیں ہوتا اور جب وہ خود چھوڑ دے تو تم لوگ اسے خود غرض اور نہ جانے کیا کیا کہہ کہتے ہو۔ مجھے نہ اب تم سے تعلق رکھنا ہے اور نہ تمہاری اولاد

سے۔ تم نے نو برس جس طرح میرے وجود کو، میری ذات کو دبائے رکھا، مجھے اذیتیں دیں اور میری شخصیت کو کھرچ کر پھی کیا ہے۔ یہ سب اسی کا نتیجہ ہے۔ میں چلتی پھرتی ذمہ داریاں بن گئی ہوں۔ میں تمہارے لیے کبھی بھی اہم نہ تھی اور نہ کبھی ہوتی ہوں۔ تم نے مجھے بہت ذلیل کیا ہے۔ یقیناً تمہاری اولاد بھی ایسا ہی کرے گی۔ آخر وہ بھی تو تمہارے بچے ہیں۔ تمہاری خون ہیں۔ تمہارے ہاتھوں تو ذلت اٹھا چکی ہوں۔ اب تمہاری اولاد کے ہاتھوں ذلیل نہیں ہونا چاہتی۔ منسور اس شادی شدہ زندگی کا صرف ایک لمحہ بناؤ جب تم نے میری اس طرح پذیرائی کی ہو جس طرح آج تم شزا کی کر رہے تھے۔ آخر میں بھی تو عورت ہوں۔ مجھے بھی پذیرائی چاہیے۔ مجھے بھی تحفظ اور عزت چاہیے اور نہیں تو طمانیت کا کچھ احساس ہی چاہیے۔ تم نے مجھے کیا دیا۔ سوائے مار کٹائی اور ذلت کے۔۔۔۔۔ اب میں دھمکتی ہوں تمہیں اور تمہاری اولاد کو۔۔۔۔۔ ”وہ چلاتے ہوئے بولی۔

”اور سید صاحب کو کیا جواب دوں کہ سید زادی۔۔۔۔۔“ وہ طعنیہ لہجے میں بولا۔

”میں سید زادی نہیں۔۔۔۔۔ بقول تمہارے مائی کا کیرا ہوں جو اتفاق سے رہنکستا ہوا ان کے قدموں سے لپٹ گیا۔ فرق یہی ہے انہوں نے مجھے قدموں تلے روندنا نہیں مانگا کر سینے سے لگالیا۔ تم ہی بناؤ کیا اس سے میرا منی بدل سکتا ہے۔ میں جو پہلے دن تھی۔ اب بھی وہی ہوں۔ سندھ میری شناخت کو بدل سکے اور نہ تم۔۔۔۔۔“

”شاید اب تمہارا نیا شوہر بیڑ بدل دے۔“ منسور اس کی بات کاٹ کر طعنیہ لہجے میں بولا۔

”ہاں شاید۔۔۔۔۔ کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔“ وہ بھی قدرے ڈھٹائی سے بولی۔

”تم اس قدر۔۔۔۔۔“ منسور طیش میں بولا۔ اس نے اس پر ہاتھ اٹھانا چاہا اور پھر نیچے کر لیا۔ شاید شزا کی وجہ سے۔

”ذلیل ہو سکتی ہو، یہی کہنا چاہ رہے ہو نا تم؟ واقعی میں بہت ذلیل ہو چکی ہوں۔ کل تک مجھے طلاق کے کاغذات مل جانے چاہیں۔“ وہ کہہ کر ہار نکل گئی۔

منسور ہونٹوں کی طرح اسے باہر جاتا دیکھتا رہا۔ وہ تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شہلا کبھی اس کے سامنے یوں ہڑ پڑ بولے گی۔ وہ تو صرف روتی اور خاموشی سے لالیل ہوتی شہلا کو جانتا تھا۔ اب اس میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی۔

وہ نیچے اتری تو شفق حیرت سے ماں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آج اسے ماں پہلے سے بہت مختلف لگ رہی تھی۔ پہلے تو ماما، پاپا کا سن کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی تھی اور آج خود اوپر چلی گئی تھی۔ شفق مضطرب سی کھڑی تھی۔

”فلک اور آفاق کہاں ہیں؟“ اس نے شفق سے پوچھا۔

”آفاق کچھ دیر گیم کھیل رہا ہے اور فلک سو رہی ہے۔“

”آفاق کو بلاؤ۔“

”کیوں ماما۔۔۔۔۔؟“ شفق نے حیرت سے پوچھا۔

”میں نے تم لوگوں کو ایک بات سمجھانی ہے۔ جاؤ اس کو بلا کر لاؤ۔“

”مما.....“ وہ آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی باہر نکل گئی اور آفاق کو بلا لائی۔

”شفیق تم بڑی ہوادور بھائی چھوٹا ہے۔ آپکل میں پیار سے رہنا۔ بھائی کا اور فلک کا بہت خیال رکھنا۔“ وہ انہیں سمجھاتے ہوئے بولی۔

”کیوں ممما..... آپ کہاں جا رہی ہیں؟“ شفیق نے حیرت سے پوچھا۔

”آپ لوگ پاکستان جا رہے ہیں اور میں یہیں رہوں گی۔ میں آپ کے ساتھ نہیں جا رہی۔“ وہ بے مشکل آنسو روکتے ہوئے بولی۔

”کیوں..... ممما..... کیوں ممما..... پھر ہم بھی نہیں جا رہے۔“ آفاق ضد کرتے ہوئے بولا۔

”نہیں بیٹا ضد نہیں کرتے۔ آپ میرے ساتھ نہیں رو سکتے۔

”کیوں..... ممما.....؟“ شفیق روتے ہوئے بولی۔

”اس لیے کہ تمہاری مہاشادی کر رہی ہے۔“ ایک دم منصور پیچھے سے بولا۔

”شٹ اپ منصور، میں تو شادی کرنے جا رہی ہوں اور تم خود؟“

”جسٹ شٹ اپ ناؤ تھ۔“ وہ بھی ہنسے سے کہہ کر باہر نکل گیا۔

”ممما آپ لیکن نہیں گی؟“ شفیق نے حیرت سے پوچھا تو وہ چمک گئی۔ اس نے تو خود بھی ایسا نہ سوچا تھا۔ وہ مضطرب ہو کر دوش روم میں

چلی گئی۔ اس کی آنکھیں ایک دم سرخ ہونے لگیں۔ اس نے دوش روم کے اوپر لگے بڑے سے آئینے میں دیکھا۔ وہ کتنی بدل چکی تھی۔ جو کچھ وہ کرنے

جا رہی تھی کیا واقعی درست تھا؟ اس سے کسی کو نقصان تو نہیں ہوگا؟ میری شفیق اور فلک اور میرا آفاق۔ کتنے چھوٹے ہیں سب..... وہ میرے بھی وجود کے

حصے ہیں اور اپنے وجود کو یوں نکلنے نکلنے کرنا کیا کوئی آسان کام ہے۔ وہ خود سے سوال کر رہی تھی مگر بچے تو صرف باپ کے ہوتے ہیں۔ آج نہیں تو

کل وہ اس کی ڈگر پر چلیں گے۔ میں ہر روز ان کے باپ کے ہاتھوں ذلیل ہوتی رہی ہوں۔ کل کو ان کے ہاتھوں ہوں گی اور پھر کل میرے پاس وقت

نہیں ہوگا۔ آج بچے ہیں۔ کل بڑے ہو جائیں گے اور وہ کل نہ جانے کیا ہو اس کل کے لیے میں آج کی خوشیوں کو کیوں داؤ پر لگاؤں۔ قدرت آج

مجھے آپشن دے رہی ہے اور زندگی میں صرف ایک موقع تو ملتا ہے جب انسان چاہے تو اپنے لیے کچھ کر لے۔ پہلے بھی لوگوں نے میرے ساتھ بہت

زیادتی کی ہے۔ کبھی رولتھل اور رسم و رواج کا بہانہ بنا کر تو کبھی میری ذات کی شائستہ کو نشانہ بنا کر۔ آخر زندگی کے اتنے برس گزار کر بھی میری حیثیت

گھر کی خادمہ جیسی نہیں تو پھر میں کیوں اپنے آج کو ان کے لیے برباد کروں۔ مجھے پتا سوچنا چاہیے۔ اپنی خوشیوں کے بارے میں خود فیصلہ کرنا چاہیے۔

وہ بیڈ پر آ کر لیٹ گئی۔ اس کا سارا وجود سلگ رہا تھا۔ دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔ شفیق آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آئی اور اس کے اوپر گر گئی۔

”ممما پلیز ہمیں چھوڑ کر مت جائیں۔ آئی لوو ممما.....“ شفیق بہت پورے سیوہور علی تھی۔

”آئی نو مائی ڈیر، آئی نو یو نو۔ ڈونٹ کرائی مائی چائلڈ۔ میں جلد آؤں گی۔“

”ممما فلک تو بہت چھوٹی ہے۔ ٹھیک طرح سے چلتی بھی نہیں اور تنگ بھی بہت کرتی ہے۔ کسی کے پاس بھی نہیں سوتی۔ میں اسے کیسے

سلاؤں گی۔“ شفیق قدرے پریشان ہو کر بولی۔

”تم لگ کیوں کرتی ہو تمہارے پاپا ہیں دادو دیکھ بھال کریں گے۔ وہ خود سلاٹیں گے اور پھر تمہاری دادو بھی تو ادھر ہے؟“ اس نے تسلی دی ”ادھر آؤ میرے پاس لیٹ جاؤ۔“ اس نے اسے اپنے پاس بیٹھ پر لٹا لیا۔

”مما۔۔۔ آپ برا بیٹھ بیٹھ کی۔ اس لیے ہمارے ساتھ نہیں جا رہیں۔“ شفق کے اس اچانک سوال نے اسے مضطرب کر دیا۔

”فضول باتیں مت کرو میں تمہارے پاپا کے ہاتھوں تنگ آ گئی ہوں سنا تم نے؟“ وہ قدرے تکی سے بولی۔ اسی اثنا میں آفاق آ کر ماں کے ساتھ لیٹ گیا۔

”مما پلیز۔۔۔ مجھے تو اپنے پاس رہنے دیں۔“ وہ روتے ہوئے ”مما۔۔۔ آپ پاپا کو جانے دیں۔ وہ آپ کو مارتے ہیں ہم تو تنگ نہیں کرتے۔ ہمیں تو ساتھ رہنے دیں۔“ دونوں اس کے ساتھ چٹ کر بولے۔

”آئی دل شوٹ پاپا۔“ آفاق غصے سے بولا۔

”نومانی ڈیر، آپ کی دادو وہاں ہیں۔ وہ آپ سے بہت پیار کرتی ہیں۔ اسی لیے تو بھیج رہی ہوں۔“

”مگر دادو اتنا اونچا سختی ہیں، ان سے بات کون کرے گا۔“ شفق ایک دم بولی۔

”ہاں۔۔۔ لیکن وہ تم سب سے پیار بھی تو بہت کرتی ہیں نا۔“ اس نے پھر دلاسا دیا ”اب تم لوگ جاؤ اور مجھے تنگ نہ کرو۔“ وہ ڈانٹنے سے بولی۔

”اوکے۔۔۔ گڈ نائٹ مما۔۔۔“ دونوں خاموشی سے پوچھ لے کر اٹھ اٹھے۔

دونوں کے اندر آتش فشاں اگلنے کو تیار تھا مگر راستہ کوئی نہیں مل رہا تھا۔ آفاق غصے میں ادھر ادھر پھرنے لگا پھر وہ نا شروع کر دیا۔ شفق اسے تسلی دینے لگی تو وہ اس کے گلے لگ کر رونے لگا۔

”آئی بیٹ مما۔۔۔“ وہ مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔

”آئی ڈو۔۔۔“ شفق نے بھی اس کی تائید کی۔

پینٹنگ مکمل ہو چکی تھی۔ جانے کے لیے سب تیار کھڑے تھے۔ دوسرا فلک پر ام میں سورجی تھی اور شفق نے پر ام کا ہینڈل منبھولی سے پکڑ رکھا تھا۔ آفاق اس کے پاس کھڑا تھا۔ بچوں کے چہروں پر سوگنداری اداسی چھائی تھی۔ آنکھوں میں ان گنت سوال اور شکوے تھے مگر لب ساکت تھے۔ وہ ان کی طرف بڑھی مگر کوئی بھی اس کے گلے نہ لگا۔ شفق نے آفاق کی طرف دیکھا اور دونوں پر ام دوپٹے ہوئے باہر نکل آئے۔

”یہ طلاق کے کاغذات ہیں۔ باقی کاغذات تمہارے پاس ہی ہیں۔ ہمارے ساتھ یہ گھر بھی تمہیں چھوڑنا پڑے گا۔“ منصور نے کاغذات تھماتے ہوئے کہا۔

وہ خاموش بھی تھی اور حیران بھی کہ منصور آج دہاڑا اتنا اس نے کوئی شور مچایا تھا۔ شاید وہ خود بھی اندر سے یہی کچھ چاہتا تھا اور خوش بھی تھا۔

شزا کی خواہش پوری ہو رہی تھی۔ وہ اب اس کے ساتھ جا رہی تھی اور وہاں جا کر دونوں بچیوں کی شادی کر لیں گے۔ باہر گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی تو وہ باہر کی طرف بھاگی مگر وہ لوگ جا چکے تھے۔ بچوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے مگر لب خاموش تھے۔ فلک شفق کی گود میں بے خبر سو رہی تھی۔



"ہیلو پیٹر میں آگئی ہوں۔" وہ مضحکہ خیز قدموں کے ساتھ اس کے پارکمنٹ میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

”اوہ گڈ۔۔۔ اعداء! وہیکم۔۔۔ وہیکم لو جو رسوےت ہوہ!“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ وہ خاموشی سے کوئی تاثر دیے بغیر صوفے پر بیٹھ گیا۔

”شکیل ڈارنگ، ڈونٹ یو وری۔ میں تمہارے لیے کافی لانا ہوں۔“ وہ ہمیشہ اسے شہلا کے بجائے شکیل ہی کہتا۔

”جھیک یو۔“ اس نے کافی لیتے ہوئے کہا۔ وہ خاموشی سے کافی کے سپ لیتی رہی اور بچوں کے بارے میں سوچتی رہی۔

”بھیل میں جاتا ہوں تم کیا سوچ رہی ہو؟“ وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

”کیا.....؟“ شہلانے حیرت سے پوچھا۔

”تم افسران و مکن سو چتا بہت ہے۔ میری مدد رائے نگراں بن و مکن تھا۔ ہر وقت خاموش سوچوں میں گم بکھو یا کھو یا سا.....“

”اب وہ کہاں ہیں؟“ اس نے نامانستہ پوچھا۔

”معلوم نہیں، دو سال پہلے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں چلا گیا۔ اب پتا نہیں کہاں ہے۔“ شہلا بھر گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ کیا اس نے

ٹھیک فیصلہ کیا تھا۔ وہ پیر کو نظر انداز کر کے پھر سوتے گئی۔

”ہاں، منصور نے تو مجھے ایک مذاک دین چھوڑ دیا تھا اور اب تو اسے بھیک بھی بڑھ چکی تھی کہ شزا، شادی سے پہلے اسے طلاق دے کر کہہ

ری تھی۔ کیا یہ اچھا نہیں کہ اس نے خود ہی یہ فیصلہ کر لیا۔ ابھی تو اس کے پاس آپشن تھا۔ قدرت نے پیٹر کو آپشن بنا کر ہی تو بھیجا تھا۔ اگر پیٹر نہ ہوتا تو

وہ کہاں حاتی۔ والہاں سید صاحب اور حیدر کے پاس..... نہیں کسی نہیں۔ اب وہاں میرا کوئی نہیں۔ پتھر بولڈ ہے۔ اسٹر ونگ ہے۔ اس نے میری نوات

کوسہارا دیا ہے۔ جہاں منصور ہر وقت مجھے ذلیل کرتا رہا ہے۔ پلیر نے مجھے عزت دی ہے اور ایک انسان کو دنا نہیں کیا جا ہے۔ یہی کردہ عزت سے

زندہ رہے۔ جہاں جائے عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ تمہاکی میں اور محفل میں بھی اس کا شوہر اس کی عزت کرے اور..... منصور نے نہ تو شوہر

ہونے کا حق ادا کیا۔ شاہک انسان ہونے کا..... اور نہ ہی مسلمان ہونے کا۔ ایسے بد قماش مسلمان سے تو ایک غیر مسلم اچھا انسان بہتر ہے جو دوسروں

کوا انسان سمجھے اور ان کو محرابِ عزت دے۔" اس نے اپنے فیصلے کا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

”لیکن سید صاحب کیا کہیں گے؟“ ایک لمحے کو سوچا مہجری۔

”میں کون سی ماں کی سگی اولاد ہوں اور بچے بھی مجھ سے زیادہ اُنہیں اپنے شجرے، غول اور حسب نسب کی فکر ہے۔ انہوں نے بھی تو مجھے

انسان نہیں سمجھا ہر مجھے کیوں فکر کرنی چاہیے۔“

”اور بچے.....“ اس کا دل کھٹنے لگا۔ ہر طرف شور مچا ہوا تھا۔ اس نے اپنے دفاع کے لیے کچھ کہنا چاہا لیکن سارے الفاظ کہیں کم ہو

مئے۔ وہ جیٹا سی گئی۔

”میں صرف اور صرف انسان ہوں۔ مجھے بھی زندگی دینے کا مکمل حق ہے۔ مجھے بھی عزت حاصل ہے، ایک تحفظ حاصل ہے۔ مجھے اپنے بارے میں

بہتر فیصلہ کرنے کا پورا حق ہے۔“ اس نے اپنے آپ کو مطمئن کیا۔ پھر اس کے چہرے پر ابھرتے تاثرات حیرت سے دیکھتا رہا اور پھر بولا۔

”ہیل ہیلیز ریلیکس، تم ریٹ کرو۔ شام کو چرچ چلیں گے۔“

”چرچ..... کس لیے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ویڈیو کے لیے اور کس لیے۔“

”ویڈیو.....“ وہ بڑبڑائی۔ اس کے دماغ میں انجانا سا خوف سراپت کر گیا۔ اس نے جبر جبری سی لی مگر خاموش رہی۔

”ہیل ڈارلنگ، تم کیا سوچتا رہتا ہے۔“ قصصیں اپنا آپ بدلنا پڑے گا۔ کیا تمہارا سوسائٹ اس بڑی شہزاد کے ساتھ خوش نہیں۔ تو بھرتہ کیوں

اواس ہوتا ہے۔ قصصیں بھی خوش رہنے کا اتنا ہی راز ہے جتنا اسے ہے۔“ شہلا کی سوچ پھر بدل گئی اس نے زخمی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا۔

”اوکے..... گیٹ ریڈی..... میں تمہارا ہائیڈل ڈریس اور رنگ لے کر آؤں گا اتنی دیر تم ریٹ کرو۔“ وہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

وہ وہیں صوفے پر غم راز ہو گئی۔ بچے اسے بار بار یاد آ رہے تھے۔ سید صاحب سفید ریش وادھی اور اسے نچے شیلے والے باعزت، پاک

باز قصص، عزت و ناموس اور خون کی امانت و حفاظت کے لیے جان دینے والے..... اور..... بی بی بی..... سر سے پاؤں تک ہار دہ، تقدس و پاکیزگی کا

چلتا پھرتا نمونہ اور وہ خود کیا تھی؟ لب مزک، رنگ و مزگ، کثیف، تلخ کپڑے میں لپٹا محیف و حقیر وجود۔ کیا اس نے ان دو عظیم ہستیوں کے سایہ

حافظت میں پرورش پائی تھی؟ بی بی بی کی آغوش کی گرمی اور ان کی محبت پر شاید اس کے اندر کا چھپا کینہ پن غالب آ گیا تھا۔ شاید اس کے جھوٹے

عقائد اور تھا۔ جیسے اس کو ختم دینے والوں میں..... شاید وہ کسی کے گناہوں کا شرمیلی یا پھر کسی مجبور و بے کس، روناہوں سے جکڑی ماں کا جگر گوشہ یا پھر کسی

مطلبس باپ کی ناقص حسرتوں کا شاہکار..... وہ کیا تھی؟ وہ تو ساری زندگی اسی شایستگی میں سرگرداں رہی تھی۔ کس سے پوچھتی۔ سید صاحب سے، بی

بی بی سے یا پھر حیدر سے۔ جو سب اس کے وجود کو تمانتے تھے مگر اس کی شایستگی کا انکاری تھے۔ کون تھی وہ؟ وہ خود بھی نہیں جانتے تھے۔ اس لیے

ماننے سے بھی انکاری تھے۔ وہ اس گھر کی کیا تھی۔ بی بی، ملازمہ، رشتے دار یا باندی۔ کوئی بھی تو نہیں نہ کر سکا۔

حیدر اس کے خوب صورت نیچر زدکھ کر اسے Egyption Beauty کہتا تھا۔ ملک منصور کسی انگریز کی اولاد کہتا تھا۔ شاید وہ انگریز،

ہندو تھا۔ کریگن یا پھر یہودی اور..... پیڑا سے ایٹھواٹرین کہتا تھا۔ وہ خود کو کیا سمجھتی تھی۔ اس کے پاس تو شایستگی کا کوئی خانہ ہی پر نہ تھا۔ دیکھی کبھی بے

خیالی میں ارد گرد چلتے پھرتے انسانوں کو گھور گھور کر دیکھتی۔ شاید کسی سے اس کی شکل ملتی ہو۔ شاید کوئی اسے یہ کہے کہ وہ ان کی کھوئی ہوئی اولاد تھی۔ نہیں

تھیں کی ہوئی، دھنکاری ہوئی۔ جیسے ریختے والا بے بس کیزا..... کہتے تھے جب وہ ملی تھی تو اس کے سارے جسم پر چھوٹیاں چھنی ہوئی تھیں اور جب سے

اب تک وہ ان کے ڈنگ اپنی روح میں بھی محسوس کرتی تھی۔ اس کا ذہن مسلسل سوچ رہا تھا۔ جو ہوا تھا ٹھیک ہوا تھا یا پھر سب کچھ غلط، الٹ پلٹ ہو گیا

تھا۔ وہ کیسے اپنے آپ کو سمجھائے۔



شام ہو رہی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی۔ پیڑا سامنے تھا اس کے ہاتھوں میں گلفس تھے وہ اسے دیکھ کر مسکرایا ”اب تم جلدی سے

تیار ہو جاؤ پھر چرچ چلتے ہیں۔“

اس نے بدولی سے برائیل ڈریس پہنا تو اس کا سارا جسم لرزے لگا۔ وہ کیا کرنے جا رہی تھی۔ سید صاحب کی اسنے سالوں کی ریاضت اور بی بی جی کی آغوش کی تربیت سب اکارت گئی تھی۔ وہ کتنی بے خانماں اور حقیر لگی تھی۔ خزاں کے سرد جھونکوں سے اپنے نحیف وجود کو نہ بچا سکی اور زرد پٹ پڑاتے پتے کی مانند اس کو ادھر ادھر اڑائے دے رہی تھی۔ وجود کی صداقت کے لیے کروار کی شرط ضروری ہوتی ہے اور وہ تو بہت بڑے کروار والی لگی۔ اس کے اندر مسلسل ٹیس میں ہی اٹھ رہی تھیں۔

”اٹھو اب کس کا انتظار ہے؟“ پٹرنے اس کے گرد محبت سے بازو دھرائیں کرتے ہوئے کہا تو وہ چونک سی گئی۔

”یہ ٹیس..... یہ لیجہ..... یہ قربت کتنی نا آشنائی ہے۔ اس میں وفا کی سچائی محبت کی مٹھاس اور غلوں کی چاشنی کتنی کم ہے۔“ اس نے دکھ سے سوچا۔
 ”بہت اسارت لگ رہی ہو۔ ویری پریشی.... تم تو بالکل بھی ایسٹرن نہیں لگتیں تمہارے فچرڈ..... تم گریک میٹھالوجی کی گود میں (Goddess) لگتی ہو۔ ویری اسٹریٹج، اوکے لیواٹ اینڈ بی بیکی۔“ وہ اس کا بازو تھام کر چلا۔

جیسے ہی اس نے چرچ کے اندر قدم رکھا اس کا سارا وجود دوبالا ہونے لگا۔ عمر کا لہا سفر جو وہ طے کر کے آئی تھی۔ خدا سے آشنائی کے سفر میں تو اس نے کسی کو بھی نہیں سہا تھا۔ اصحاہ کہتے وہ ایک دم تخلیق کے سامنے کھڑی تھی۔



ڈاٹ کام

سید صاحب کے گھر کی مقدس اور روح پرور فضا میں سانس لیتے لیتے وہ اچانک چرچ کی ہجیرہ اور سوگوار فضا میں دم لینے کوڑی تو سارا وجود تہ و بالا ہو گیا۔ میں کون سی کریمیں ہو رہی ہوں۔ بالآخر اس نے اپنے آپ کو سمجھا یا اور اس نے بے خبری میں نہ جانے کہاں کہاں دھکے دیے۔ جو وہ کہتا رہا۔ کسی ریلوٹ کے مانند وہ کرتی رہی۔ کاغذی کارروائی مکمل ہوئی تو وہ مدد میری اور کرائسٹ کے محسوس کے سامنے کھڑا منہ میں کچھ بڑبڑاتا رہا اور وہ خاموشی سے ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ اسے تو کسی دعا کی کوئی حاجت ہی نہ تھی۔

دعا کس کے لیے کرے اپنے بے قراں وجود کے لیے۔ اپنے معصوم بچوں کے لیے یا پھر..... پیڑ کے لیے جو اس کا کچھ بھی نہیں لگتا تھا گو کدہ سبز پیڑ بن گئی تھی۔ وہ کسی ایک کا بھی قصین نہ کر سکی۔ پیڑ اسے محبت سے گھیر لیا۔ دلوں تھا تھے۔ پیڑ اس سے میٹھی میٹھی مسود کن باتیں کر رہا تھا۔ محبت کی باتیں..... ملن کی باتیں..... دلوں کی باتیں..... چاہتوں کی باتیں..... وہ سن رہی تھی اور وہ اس کے وجود کا احاطہ کر رہا تھا مگر اس کو پیڑ سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس کے سامنے تو حیدر تھا۔ وہی اس کی محبت، چاہت، عشق اور جنوں تھا۔ وہی تھا جس کے نہ ملنے کے رد عمل نے اسے اتنا شدید جذباتی کروایا تھا۔

حیدر اپنی بھرپور شخصیت و چاہت اور عرب و بدبے کے ساتھ مکمل طور پر سیدزادوں سید شہاب الدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ سید شہاب الدین حیدر۔ ان کی جائداد اور گدی کا اکلوتا جائیں۔ خون کی لمانوں کا پاسدار۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، قانون کو الیغائیزہ سرچین..... مگر روایات کا پابند۔ وہ بھی اس سے محبت کرتا تھا مگر اس کی محبت، مصلحت میں بدل گئی جب سید صاحب نے اس کو یہ راز بتا دیا اور وہ سب کچھ دواڑے کی اوٹ میں کھڑی بن رہی تھی۔ حیدر ان سے بحث کر رہا تھا۔ وہ اسے سمجھا رہے تھے اور وہ کچھ نہیں رہا تھا اور بالآخر خٹک، آکر انھوں نے دو سب کچھ بتا دیا جس کو سن کر اس کا وجود بیت کے ذروں سے بھی زیادہ حقیر ہو گیا۔

”حیدر خون کی لمانوں سے انحراف ممکن نہیں۔ سیدوں کو اپنے وجود سے زیادہ اپنے خون کا مان رکھنا ہوتا ہے۔ ناموس کی حفاظت، نام کی حفاظت، جان سے زیادہ کرنا سیدوں کا شیوہ ہے۔ سید سر تو کٹا سکتا ہے مگر مصلحتوں کے آگے ہتھیار نہیں ڈال سکتا۔ میں نے مرحوم بھائی کی نشانی کو اپنے سینے سے لگا کر پالا ہے۔ تمہاری ہر بات، اپنی مکر و مہمت کہو جو میں مان نہیں سکتا۔ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ قطعی ممکن نہیں۔ شہلا کون ہے؟ کیا ہے؟ خدا کا ہی راز ہے۔ اس کی شناخت، پہچان سب کچھ پردہ اسرار میں ہے۔ وہ تو ایک صبح ہماری گاڑی کے آگے یوں آگئی جیسے کوئی کتا یا بلی..... ہم انسان تھے اور وہ بھی انسان تھی۔ انسانیت کے ناتے اسے سینے سے لگا لیا۔ اگر ہم اسے نہ اٹھاتے تو خدا ہی بھڑکا جاتا ہے وہ آج کہاں ہوتی۔ جو سر راہ قدموں سے لپٹے اور جسے ہم اپنے وجود اور خون کی آبادی سے جواں کریں۔ کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں..... سنو حیدر یہ سب ناممکنات میں سے ہے اور جان لو کہ خون بہانا تو سیدوں کا شیوہ رہا ہے۔ چاہے وہ اپنے عزیز ہی کیوں نہ ہوں۔“ سید صاحب اپنی مہاکاوند خصلت سے جھک کر گویا اسے دھمکی دے کر کمرے سے چلے گئے پھر ایک دم رکے۔

”اور ویسے بھی ایسا کرنے سے تم ایک سیدزادی کا حق مارو گے۔ ہماری بیٹیوں کا یوں حق مارا جائے ہمیں گوارا نہیں اور یہ ناقابل معافی جرم ہے۔“ وہ جو جھل قدموں سے باہر نکل آیا۔

”زہرہ خاتون ہم اپنی کسی بات سے منکر نہیں۔ کیا وہ بچی اس گھر میں ہماری بچوں کی طرح آسانشوں سے بھرپور زندگی میں نہیں ملی۔ ہم نے اس کی تربیت میں کسی چیز کی کمی نہیں کی۔ خدا گواہ ہے ہم نے اپنی سیدہ فاطمہ اور سیدہ نسیم کی طرح ہمیشہ اسے عزیزانہ جان رکھا ہے لیکن شادی بیاہ تو نسلوں کے دوام کا مسئلہ ہے اور نسلوں کے خون کی پاکیزگی کی ضمانت تو جھوٹے پاک ہونے پر ہے اور ایک دفعہ جھوٹ میں یوں فساد پیدا ہو جائے تو آئندہ خلیس (یعنی اختیار اور عداوت کی نذر ہو جاتی ہیں) انشاء اللہ ہم اسے اپنی بیٹیوں کی طرح ہی بیاہیں گے۔ اسے اپنی جاکہ او سے حصہ بھی دیں گے۔ تم دیکھنا کسی قسم کی کمی نہیں ہونے دیں گے۔“ سید صاحب نے جواب دیا۔

”سید صاحب میرا خیال ہے کہ بہت بات بڑھنے سے بہتر ہے کہ اسے بلا کر آپ ہماری بات سمجھا دیں۔ وہ سمجھدار ہے سمجھ جائے گی۔“ بی بی بی نے مشورہ دیا تو سید صاحب سوچ میں پڑ گئے۔

پیڑ بہت خوش تھا اور اس کے لیے ناشتا رہا تھا۔ اس نے ٹیبل پر بہت اہتمام سے اس کے لیے کافی اور میٹرو وڈ رکھے تھے۔ ”آج تم ریسٹ کرنا..... پھر اس کے بعد زندگی کی روٹن سیٹ کریں گے۔“ وہ مسکراتا ہوا بولا۔

”تم کمر کب آؤ گے؟“

”لیٹ نامٹ..... کیوں..... خیریت تو ہے؟“ اس کی مسکراہٹ میں نہ جانے کتنے مفہیم پوشیدہ تھے۔ وہ چونک گئی اور پھر کہیں کھوسی گئی۔
 ”کیا واقعی مجھے اس شخص سے محبت ہے؟ دیار غیر میں ایک بالکل اجنبی شخص..... کیا میں نے اس کی محبت کے لیے سب کچھ ڈاؤں پر لگایا ہے۔“
 ”بھیل تم کیوں پوچھ رہی ہو، کیا کوئی کام ہے؟“

”اوہ..... ہاں..... ہاں..... وہ میرے ڈاکو متش..... ان کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا اور میں یہاں، آئی میں.....“

”ناٹ ایٹ آل۔ میں نے آپ کسی میں بات کر لی ہے اور اب تم میری دانک ہو۔ اب تمہیں ڈاکو متش کی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ ڈنٹ تھک اباؤٹ وین۔ ایوری تھک از سیٹلا۔“ وہ اسے قسلی دیتے ہوئے بولا تو وہ خاموش ہو گئی۔ پیٹر کے چہرے پر ابھی بھی مسکراہٹ تھی۔ اس کی نیلی آنکھوں میں شرارت سی بھری تھی۔ گوکہ وہ درمیانی عمر کا خوب صورت نعتش والا انسان تھا۔ جس کے گرے بال اسے قدرے سویر بناتے تھے لیکن وہ اکثر حرکتوں اور باتوں میں بالکل بچوں جیسا رویہ اپناتا تھا۔ ہر بات کو لاکھی لیتا تھا۔

لندن میں آئے دو ماہ ہو چکے تھے اور پیٹر سے ملاقات صرف ایک ماہ پہلے ہوئی تھی اور اب وہ شخص اس کے لیے لازمی جز بننا چاہ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس سے اپنے دکھ شیز کرنا شروع ہو گئی تھی۔ منصور تو زیادہ وقت شیزا کے ساتھ باہری گزارتا۔ اس پر تو بس شیزا کا بہوت سوار ہوا تھا۔ وہ اپنا بزنس سہا سٹ اور مگر سب کچھ بھولا ہوا تھا۔ صرف شیزا اس کے من میں بس رہی تھی وہ ہر ممکن اسے خوش کرنے کی کوشش کر رہا تھا "شکر ہے منصور

نے مجھے طلاق نہیں دی۔ میں نے خودی ہے۔ ورنہ منصور کے اس طرآنچے کو میں ساری زندگی کیسے سہہ پاتی۔ فکر ہے پتیر میری زندگی میں آ گیا اور میں اس ذلت سے فک گئی۔" وہ سوچنے لگی۔

"بھیل تم نے بتایا نہیں کہ تم کیوں مجھے گمرا آنے کے بارے میں کہہ رہی تھیں؟" وہ اپنے بیک میں کچھ کتابیں اور کارڈز رکھتے ہوئے بولا۔
"بس یونہی۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"بھئی آج کل کرسمس اور نیا سیر کی وجہ سے بڑی ہوں۔ کارڈز کی سٹل بہت ہو رہی ہے۔ تم تو جانتی ہو بہت معروف ہوتا ہوں لیکن جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔ اوکے ٹیک کیئر ڈارنگ..... آئی لو یو سوچ۔" وہ محبت سے اسے گلے لگاتا ہوا بولا "دروازہ ابھی طرح لاک کر لو۔" وہ ہائے کہتا ہوا باہر چلا گیا۔

باہر شدید سردی تھی۔ گہری دھند میں چند قدم کے فاصلے پر بڑی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ دروازہ بند کر کے کمرے کے آگے بنی جھوٹی سی بالکونی میں کھڑی ہو گئی۔ اس کا اپارٹمنٹ زمین سے کافی اونچا تھا۔ نیچے چلنے والے لوگ سب ریگتے ہوئے کیڑے لگ رہے تھے۔ اس نے گہری سانس لی۔ شخصانہ جھوٹا اسے اپنے پیچھروں میں سرایت کرنا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی دھیر تھیں۔
وہ ایسی ہی سرد شام تھی۔ شاید ممبر کی ایک شام..... سب اپنے اپنے کمروں میں بیٹرز کے سامنے دیکھے بیٹھے تھے۔ جب سید صاحب نے اسے بلایا۔

"آؤ شہلا بیٹی۔" وہ ہمیشہ بیٹیوں کو اٹھ کر لیتے تھے کیونکہ یہی سنت رسول ﷺ ہے۔

"اسلام علیکم بابا؟" اس نے ادب سے سران کے آگے جھکایا۔

دعایم اسلام۔ کیسی ہے میری بیٹی؟" انھوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"ٹھیک ہوں، آپ نے مجھے بلایا؟"

"ہاں، اور بیٹھو میرے پاس اور جو میں کہوں توجہ سے سننا اور پھر اس پر غور کرنا۔ تمہاری دونوں بہنیں سیدہ فاطمہ اور سیدہ عیسیٰ اپنے اپنے کمروں کی ہو چکی ہیں اب تم ہو..... مگر بیٹی ایک مسئلہ ہے۔" سید صاحب کے لہجے میں کچھ پامائت تھی اور وہ اس کی وجہ جانتی تھی۔

"مئی فرمائیے، میں سن رہی ہوں۔"

"سیدہ اویں اور سیدہ ادویں کے درشتے آپس میں ہی ملے ہوتے ہیں۔ یہی ہماری روایات رہی ہیں۔ تم بھی میری بیٹیوں کی طرح ہو۔ کیا

میں نے تم میں اور ان میں کوئی فرق روا رکھا؟"

"نہیں بابا..... ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔"

"شکر ہے میرا املا..... لیکن میری بیٹی اگر حیدر سیدہ زادہ نہ ہوتا تو مجھے تمہارے اور اس کے رشتے پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ میں جانتا ہوں تم

دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو۔ ایک جگہ پہلے بڑھے ہوئے دونوں کا ملاپ ممکن نہیں۔ میں بھی تعلیم یافتہ ہوں اور مانتا ہوں کہ محبت بہت بڑا جذبہ ہے۔ مگر اسی محبت کے لیے بہت سی قربانیاں بھی دینا پڑتی ہیں۔ انسان اس میں مغل و غر و کھو بیٹھتا ہے مگر اس سے بڑھ کر آزمائش بھی کوئی نہیں.....

لیکن اب۔۔۔۔۔ ان کو الفاظ نہ مل رہے تھے۔

”بابا تو پھر میں کون ہوں؟“ اسی سوال سے تودہ ڈرتے تھے۔ چند لمحے خاموش رہے۔

”بتائیے بابا۔۔۔۔۔ میں کون ہوں۔ کس کی بیٹی ہوں؟“

”میں نہیں جانتا۔ سید صاحب نے منہ دوسری طرف کر کے کہا۔

”تو پھر آپ نے مجھے کہاں سے اٹھایا؟“

”ہل کے پاس ہنگی جگہ سے۔“ انہوں نے آہستہ سے جواب دیا۔

”تو آپ نے مجھے وہاں ہی کیوں نہ پیچک دیا۔“

”ہمارے خون میں انسانیت کی یوں بے مرضی شامل نہیں۔“

”نام اور پہچان کے بغیر ادھر اوجھ۔۔۔۔۔ جسے نہ اپنے آغاز کا ظلم ہے اور نہ شاید اختتام کا۔ وہ کیسے جیے۔۔۔۔۔ بابا۔۔۔۔۔ اس دنیا میں ہم جیسے لوگوں کا جینا کتنا مشکل ہے۔ یہ معاشرہ ہمیں کن نکالوں سے دیکھتا ہے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ کاش آپ مجھے وہیں مرنے دیجئے تو زندگی کا یہ دکھ اور طرب تو سہانہ پڑتا۔ بابا آپ نے جو سا بنان مجھے دیا تھا۔ یوں لگتا ہے آج خود ہی جھین رہے ہیں۔“ وہ سسکتے لگی۔

”میں خود تہا باری اچھی جگہ شادی کر ادوس گا اور کسی بھی شے کی کمی نہیں ہونے دوں گا۔ بس بیٹی بھی ایک مسئلہ تھا۔ مجھے مجھ سمجھ کر گزر کرنا۔“ وہ دکرے سے روتے ہوئے باہر نکل گئی۔ اس کے گلے میں پھانسی تھی۔ جیسے کوئی چیز گلے میں ایٹک گئی ہو اور اس کا ٹکٹا مشکل ہو گیا تھا۔ تیز و حار لہ اندر ہی اندر سے کاٹ رہا تھا۔ کبھی کبھی ان دیکھی اشیاء اور غیر معینی صورت حال انسان کو کتنا بے بس بنا دیتی ہیں۔ مولے مولے آنسو اس کے رخساروں پر گرے اور پھر گرتے ہی گئے۔ وہ کتنی ہی دیر حسرت و یاس کی تصویر بنی اپنے ”کل“ پر آنسو بہاتی رہی۔

وہ کھانا بنا کر بیڑی خشک تھی۔ جیسے کبھی کوئی نئی چیز پکا کر حیدر کی خشک رہا کرتی تھی۔ وہ کھانا جاتا اور مسکرا مسکرا کر نقص نکالتا جاتا اور وہ اسے کوئی راتی۔ اس نے تو کبھی زندگی کا تصور بھی حیدر کے بغیر نہیں کیا تھا۔ اس کے ساتھ بچپن گزرا۔ اسکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی تک ہر شام وہ اسے سارے دن کی روداد سنایا کرتی۔ جب کبھی وہ کہیں گیا ہوتا اور لیٹ ہو جاتا تو وہ شدت سے اس کی خشک رتی اور جب تک اسے سب کچھ سنانہ لیتی اسے جھین نہتا۔ جب وہ امریکا پڑھنے جا رہا تھا تو وہ افسردہ ہی کھڑی تھی۔

”یہ جدائی ہماری محبت کو اور مضبوط کرے گی۔“ وہ جاتے ہوئے آہستہ سے بولا مگر اس کے آنے کے بعد تو ہر طرف دواڑیں ہی پڑ گئیں۔

”حیدر تم کہاں ہو۔ دیکھو یہ سب کیا ہو گیا ہے؟“ ایک دم اس کے منہ سے حیدر نکلا اور وہ اونچی آواز میں سسکتے لگی۔ وہ جو اس کے دکھ میں دکھی اور خوشیوں میں شریک ہوا کرتا تھا۔ کہاں چلا گیا تھا۔ جب اس نے تنہا تنہا یونیورسٹی میں ٹاپ کیا تھا تو حیدر کی خوشی کی اعجابانہ تھی۔ دو بار بار اسے مبارک باد دیتا تو وہ جھینپ سی جاتی اور آج حیدر تم مجھ پر انوس کر دے یا دکھی ہو گے۔ کاش ایک لمحے کو تم نظر آ جاؤ تو میں اپنے سارے دکھ تمہیں بتا دوں۔ میرا وجود کونسی کرپھی ہو چکا ہے۔



اس نے بڑے اہتمام سے کھانا بجلی پر جن دیا تھا۔ پیڑرات کو بہت دیر سے آیا۔ وہ کھانا کھا رہا تھا اور اس کی تعریفیں بھی کر رہا تھا۔ ایسی تعریفیں جو زندگی میں ملک منصور نے کبھی نہیں کی تھیں۔ بحیثیت بیوی وہ ایسی تعریفیں اس سے سنتا چاہتی تھی مگر وہ تو اس کی ذات کو ہی اہمیت دیتا تھا۔ تعریفیں تو دور کی بات تھی۔

”میں نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا کہ پیڑرات میں آ جاؤ گے۔ قسمت بھی کبھی کبھی کیسے لوگوں سے ملا دیتی ہے جن کے ہارے میں انسان کبھی سوچتا بھی نہیں۔“ وہ اسے دیکھ کر ہار ہار سوچتی۔

آج سے ٹھیک ایک مہینے قبل پیڑرات میں اس کے لیے بالکل انجمنی تھا اور اب دونوں کیسے مضبوط رشتے میں بندھ گئے تھے۔ اس کے لیے اس نے اپنا نام نہاد مگر شوہر، بچے، ملک، شہر اپنی لاجوری پہچان سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ کیا صرف پیڑرات کے لیے..... نہیں صرف اس عزت کے لیے..... اس ریکارڈ کے لیے جو بحیثیت انسان پیڑرات میں اس کو دیا۔ ایک انسان ہونے کے ناتے اس کا احترام کیا تھا اور اس نے اپنا سب کچھ اس کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ پیڑرات کی بہت بڑی بک شاپ تھی ایک دن وہ بچوں اور ملک منصور کے ساتھ اس کی شاپ پر گئی۔ بچے اپنی اپنی پسند کی کتابیں خرید رہے تھے وہ بھی یونیورسٹی کی کتابیں دیکھنے لگی۔ بیسٹس سے ریڈیٹ ایک کتاب اسے پسند آ گئی۔

اس نے منصور سے وہ الفاظ میں کتاب خریدنے کو کہا تو جیسے وہ بھڑک اٹھا اسے قطعی توقع نہ تھی۔ اتنا امیر کبیر شخص اور محض ایک کتاب خریدنے پر اس کی یوں بے عزتی کرے گا۔ اس کا چہرہ شرمندگی سے لال بھسکا ہو گیا۔ پہلے یہ بے عزتی کرے اور گھر میں ہوتی تھی اور اب سرعام، دیار غیر میں گویا اس نے سارے زمانے کو اس راز میں شریک کر لیا تھا۔ اس کو یوں لگ رہا تھا جیسے سر بازار اس نے اس کے وجود پر چابک مارے تھے۔ بچے ہم کس کی طرف دیکھنے لگے۔ اس بے عزتی کی وجہ سے وہ ساری رات سو نہ سکی۔

شادی کے بعد ایک ایک مل اس نے منصور کے ساتھ اذیت میں گزارا تھا۔ اس شخص نے اسے بے حد ذلیل کیا تھا۔ ہر لمحے، ہر آن، ہر موقع پر..... اس کی روح شکست ہو چکی تھی۔ ہر وقت حیدر کے طعنے..... حیدر کے نام پر ذلیل کرنا مگر وہ خاموش رہتی۔ اس کے پاس کوئی آپشن نہ تھا۔ وہ اس کا ساہباں تھا۔ مضبوط نہ سہی مگر تھا تو سہی۔ اس کا حافظہ تھا اس کا نام اس سے منسوب تھا مگر شکستہ وجود اور ذلت کا شدید احساس اس لیے۔ منصور کی اس سے وابستگی ہی ایسی تھی۔

اگلے دن سخت سردی تھی۔ بالکل ہلکی ہارش نے جہاں ہنرے کو نیا رنگ دیا تھا وہیں سرمئی سرمئی بھی دخل کر خوب صورت ہو چکی تھیں۔ سب سو رہے تھے وہ باہر لان میں آ گئی۔ کل رات کی بے عزتی نے اسے ساری رات سونے نہ دیا تھا اور اب بھی اس کے اندر شدید تکلیف تھی۔ اس لیے وہ سخت سردی میں بھی تازہ دم ہوا کے جھونکے اپنے وجود میں سونے کے لیے آ گئی۔ اچانک پیڑراتنگیل پر سوار اس کے پاس آ کر رکا۔ وہ قدرے بھیگ چکا تھا۔ اس کی سپید رنگت شدید سردی کے باعث سرخ ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیکٹ تھا۔

”آپ کل ہماری شاپ پر آ تھا۔ یہ ہک آپ کے لیے گفٹ ہے۔ آپ کو یہ پسند تھا.....“ وہ بہت اپنائیت سے بولا۔

”تو جھٹکس..... مجھے اس کی ضرورت نہیں۔“ وہ قدرے دکھائی سے بولی۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے، پوری شاپ میں یہی تو آپ کو پسند آتی تھی نا اور ویسے بھی گفٹ واپس نہیں کرتے۔“ اس کے لہجے میں بہت اصرار تھا۔
 ”میں نے کہا نا..... اب مجھے اس کی ضرورت نہیں!“

”مجھے معلوم ہے یہ آپ کو بہت پسند ہے۔ یو آر اے گڈ وین۔ دیری ٹائس، آئی ریگلی رہ سہکتی ہو۔ آپ کے سسٹم نے رات کو ہائی بکس کی تصدیق کیا تو ان میں اس کا ڈیٹنگ کارڈ بھی تھا۔ اس لیے ایڈریس ڈسکریٹ نے میں دیر نہیں گئی۔ میں آپ کو رات کو ہی یہ کتاب دے دیتا مگر وہ بہت غصے میں تھا اس لیے اب لا یا ہوں۔ انکسپٹ اٹ پلیز۔“ اس نے خوب صورت پیکنگ میں اپنی کتاب اس کی طرف بڑھائی تو اس کی آنکھوں میں آنسو جھلکانے لگے۔

یہ کتاب نہیں تھی اس کے نازک احساسات کا احترام تھا اور کسی نے تو خیال رکھا تھا اس کے جذبات کو کسی نے تو محسوس کیا تھا۔
 ”جھینک ہو..... جھینک ہو سوچ.....“ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے کو پہنچا رہا تھا۔

”ٹو بیز..... اس پارٹ آف لائف۔ آپ کو جو بک پسند ہو۔ میری شاپ سے آ کر لے جائیں۔ بی بی..... یو آر اے ٹائس پرسن۔“ وہ مسکراتا ہوا چلا گیا اور وہ اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ ایسے نازک احساسات کا ادراک اور احساس کسی کسی کو ہوتا ہے ہر کوئی اس کا قائل کہاں؟ ہر کوئی کب کسی کے لیے ایسا درد محسوس کر پاتا ہے۔ یا خدا یا میری اتنی Negation کیوں ہوتی ہے۔ ہر قدم پر پیدائش سے لے کر اب تک میں یہی تو نہیں کرتی آئی ہوں۔ انسان کی عزت اتنی مشروط کیوں ہو گئی ہے اور بھروسہ کے لیے ہی دنیا کی ہر شے مشروط کیوں ہے۔ اس کی ذات، زندگی، نام، شخصیت، شرافت، پہچان، محبت اور عزت۔ سب کچھ ہی تو مشروط ہوتا ہے اور وہ اس معاملے میں کتنی بد قسمت رہی تھی۔ وہ بہت باسلیقہ، اطاعت گزار، اچھے اخلاق والی ایک عمدہ انسان بھی جاتی تھی اور ان میں سے کچھ بھی اس کے کام نہ آ سکا۔ وہ دھکاری ہوئی مخلوق کے طور پر ہی جانی جاتی تھی۔ سب کچھ کتنا بے معنی، فضول اور بے وقعت ہو گیا تھا۔ جب پیٹرن نے اس کو عزت دی تو وہ سب کچھ چھوڑنے پر مجبور ہو گئی۔ شوہر بچے، گھر اور منبری یادیں بھی۔



”مختل انسان کی زندگی بہت اہم ہے اور تم ہر وقت ڈپریشن رہتی ہو۔ دیکھو یہ سائنس کے کرشمے، نئی نئی ایجادات۔ سب اس کو لاعلم رکھنے کی جدوجہد کے سوسرہ تو ہیں۔“ پیٹرن اسے سمجھا رہا تھا۔

”ہاں، میں بھی یہی سمجھتی ہوں کہ کبھی کبھی جدوجہد، تہذیب و ثقافت، اخلاق، مذہب ظلمے اور تاریخ سب پر پانی پھیر دیتی ہے۔ انسان بکرا اپنی حیثیت بھول جاتا ہے اور اپنے منصب سے ہٹ کر وہ انھو، بے معنی اور کمینہ حرکتیں کرتا ہے۔“ اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔
 ”مختل تم کیوں ایسا نہیں کرتا ہے۔ کیا تم کچھ جانتا ہے؟“ پیٹرن نے اس کے چہرے پر پھیلی باسیت دیکھ کر کہا۔

”بے معنی زندگی میں کچھ تلوے کیسے؟“

”تم بہت مسئلہ میں ہو رہے۔“

”ہاں تم ویسٹرن لوگ بہت سی باتوں کو سمجھ کر بھی نا سمجھنے کی ایکٹنگ کرتے ہو تو اسے Mysticism کا نام دے دیتے ہو۔“ پیٹر اس کی بات سن کر کھٹکھٹا کر فیس دیا۔

”ویری انٹر سٹنگ!“ دو کتنی ہی دیر انتشار باور کافی کے سبب لپٹا رہا۔ وہ اسے ہنستا ہوا دیکھتی رہی اور حیدر اس کے حواسوں پر چھانے لگا۔

”شہلا تمہاری ذات بہت منفرد ہے۔ تم جیسی لڑکی میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ نہ یہاں نہ امریکا میں۔ کاش ہم یہاں نہ ہوتے۔ باہر کے کسی ملک میں ہوتے۔ جہاں ہماری پہچان میں ٹک نہ کرتی۔ ہم صرف اپنی محبت کی آجہاری کرتے۔ کاش ایسا ہو سکتا۔ زندگی کی حقیقت تو جذبولوں کی سچائیوں سے وابستہ ہے مگر جوش و جنوں ہونے کے باوجود رگوں میں دوڑنے والے خون کی حرمت کی پاسداری زیادہ ضروری ہے۔ ہم انسان تو نہ ہوئے بس مٹی کے پتلے ہوئے۔ ہماری ڈوریں کس کے ہاتھوں میں ہیں۔ ہم کیا جانتے ہیں۔“ حیدر اس کی رخصتی سے ایک دوڑ گئی اس کے پاس آ کر کہہ رہا تھا ”جو ہوا بھرتی ہوا۔ میری وجہ سے اس گھر کا پورا نکلام درہم برہم ہو جاتا۔ یہ مجھے کبھی گوارا نہ تھا۔“

”ہم تم نہ ہوں گے خاک میں پیٹیاں ہو کر“

”آثار مٹا دینے سے چیزیں مٹ تو نہیں جایا کرتیں۔ دلوں میں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ تم خوشبو کی طرح میرے اندر زندہ رہو گی۔ کسی کا کسی کے لیے خواہش کرنا، اسے چاہنا، اس سے عشق کرنا کیا اس کے اپنے بس نہیں ہوتا ہے۔ کیا ہوا کے جھونکے سے اس کی لطافت اور خوشبو بھٹنی جا سکتی ہے۔“ حیدر کے الفاظ بازگشت کی طرح اس کے لاشعور کے پردوں سے ٹکرا رہے تھے۔ وہ اندر ہی اندر سن رہی تھی۔

دل کی دنیا کن کن ناموں سے آباد ہوتی ہے۔ کسے خبر ہوتی ہے۔ دلوں تک کوئی نہیں پہنچ پاتا۔ پیٹر سامنے تھا اور حیدر راخندہ..... ظاہر اور باطن میں کتنا فرق ہے۔ حیدر تو سنہری لپٹ تھا۔ اس کے وجود کے ایک ایک حصے میں رہتی کسی خوشبو اور پیٹر تو اس کے وجود کا احاطہ کرنے کے باوجود بھی اس مقام پر نہ پہنچ پاتا تھا۔ وہ جہاں تھا وہیں کھڑا تھا۔ وہ اب اس کا لائف پارٹنر تھا۔ جس کچھ زندہ دل اور قدر کرنے والا انسان۔ ملک منصور سے قدرے مختلف..... مگر ان میں سے کوئی بھی تو حیدر جیسا نہ تھا۔

”خمیل اٹھو باہر چلے ہیں۔“ پیٹر نے کافی کانٹ بھیل پر رکھتے ہوئے کہا۔

”کہاں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”یونیورسٹی گھومتے ہیں۔ میرا دل چاہ رہا ہے۔ آج بہت دنوں کے بعد فرصت چلی ہے۔“

”اچھا.....“ اس نے لانگ کوٹ پہنا اور اس کے ساتھ باہر نکل آئی۔

”خمیل تم بہت اچھا انسان ہو مگر تمہارے مسیوڈ نے ایسا کیوں کیا؟“

”کیا؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”مس بی بیو، اس راتلی ویری ہیڈ ٹو ٹائلسٹ اورڈ۔“ وہ فیس دی اور اس کی ہنسی میں جیسے سارے جہاں کا درد سمٹ آیا۔ آنکھوں میں نمی تھی۔

”پیٹر کیا انسان کا اچھا ہونا اس کی قسمت بدل سکتا ہے؟“

"شاید..... It may be۔" وہ شانے اچکا کر بولا۔

"کبھی نہیں..... اور نہ ہی برا ہوگا۔"

"آئی ڈونٹ ایگری۔"

"پرسنل ایکسپریمنز ویوز (Views) کو بدل دیتے ہیں۔" شہلانے جواب دیا۔

وہ یونٹی سڑک پر گھومتے چلے جا رہے تھے۔ لوجوان لڑکے لڑکیاں، بچے، بوڑھے سب آ جا رہے تھے۔ پیڑ اس کو مختلف جوس بھی سنا رہا تھا اور اسے جہانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔

"شیل لائف انجوائے کرو، یہ ایک دفعہ ہی ملتی ہے۔" وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

"اور یہ کتنی ٹریجڈی ہے کہ کوئی شے ایک دفعہ ہی ملے اور وہ بھی اچھی نہ ملے۔" اس نے ڈک سے کہا۔

"کارنگا ڈسک، اپنی لائف یوں مت اسپاگل کرو۔ نسو، گاؤ، گھومو، پھرو..... تم آزاد ہو۔ تم جہاں چاہو جاؤ، کھاؤ پیو۔ مجھے یہ پسند نہیں کہ تم ٹیچکل ایسٹرن ویمن کی طرح کھانا بنا کر گھر میں میرا انتظار کرو۔"

"پیڑ کوئی آزادی بھی تو مکمل نہیں ہوتی۔ قید و بند سے آزاد تو دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں۔ نہ کوئی جذبہ نہ کوئی خیال نہ کوئی انسان تو پھر آزادی کہاں ہے..... کہیں نہیں؟" وہ اپنی ہی لے میں بولی۔

"بیدیکو سب لوگ آزادی سے گھوم پھر رہے ہیں نا؟"

"تو اس کا مطلب ہے کہ یہ سب آزاد ہیں؟"

"آئی تھنک سو....." پیڑ نے مسکرا کر جواب دیا۔

"بٹ آئی ڈونٹ۔"

"شیل پو آرسو....."

"مسٹر۔س۔....." وہ جلدی سے بات کاٹ کر بولی۔

"اوہ یس، بٹ آئی لیکٹ لو۔" وہ ہنس کر بولا۔

"شاید....." وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"او کے تم ادھر بیٹھو۔ میں تمہارے لیے آکس کریم لاتا ہوں۔" اس نے اسے پارک میں ایک بیچ پر بٹھا پا اور خود آکس کریم لینے چلا گیا۔

پیڑ تھا سمن درمیانی عمر کا خوب رو آؤی تھا۔ اس کی سفید رنگت، نیلی آنکھیں اور گرے بال اسے دوسرے انگریزوں سے قدرے منفرد بناتے تھے۔ وہ اس کی وجہ پناہ شدہ کسی اینگلو انڈین سے بناتا تھا۔ ہوا میں قدرے خشکی تھی۔ اس لیے وہ منٹ کر بیٹھی تھی۔ سامنے سے پیڑ آ رہا تھا اور اس کے ساتھ ٹکڑیاں لے بلوٹے بالوں والی ایک لڑکی آ رہی تھی۔

”مخل اس سے ملو۔ مائی انکس وائف سون بلیر ڈ۔“ پیٹر مسکرا کر اسے یوں تار ہاتھ پیسے دلوں میں کوئی بہت اچھا رشتہ ہو۔

”ہیلو۔۔۔۔۔“ لڑکی نے خوش دلی سے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”شی از پور سیکنڈ وائف؟“ سون نے مسکرا کر پوچھا۔

”نو۔۔۔۔۔ تھرڈ۔۔۔۔۔ نیسی واز سیکنڈ۔ شی لوز و د جان ناؤ۔“

”آئی سی ا“ وہ مسکرا کر بولی اور شہلا اس کا سر میں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے بہت سی ممکنات کے بارے میں سوچتی رہی۔

پیٹر نے ایک آئس کریم اسے دی، ایک سون کو اور اپنے لیے ایک اور لینے چلا گیا۔ وہ اس کے ساتھ ہی بیچ پر بیٹھ گئی۔ دونوں کافی دیر

خاموش رہیں پھر خود ہی اس نے سکوت توڑا۔

”تمہاری شادی کب ہوا؟“ سون نے پوچھا۔

”چھ روز پہلے۔“

”تم ایئر ٹرن ہو؟“

”ہاں پاکستانی۔۔۔۔۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”جین تم ایشین نہیں لگتا۔“

”شاید۔“

”تم نے پیٹر سے شادی کیوں کیا؟“

”معلوم نہیں۔“ اس نے غلامی گھورتے ہوئے گہری سانس لی۔

”اور تمہاری میریڈلائف کیسی ہے؟“

”کون سی؟“ اس نے ایک دم چمک کر پوچھا۔

”کیا اور بھی تھی؟“ سون نے گہری نظروں سے اسے دیکھ کر پوچھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ میرے کڈز تھے اور میری بھئی۔“

”تو کیا تم نے پیٹر کے لیے سب کچھ چھوڑ دیا؟“ اس نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ شاید۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ آئی ڈونٹ ناؤ۔“ وہ نرمی سے بولی۔

”یو آر سو مسٹریس۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ پیٹر آچکا تھا اس کے ہاتھ میں آئس کریم تھی۔

”سون تم نے میری وائف کو کس گائیڈ تو نہیں کیا؟“ اس نے ہنسنے ہوئے پوچھا۔

”اوہ۔۔۔۔۔ نو۔۔۔۔۔ نو۔۔۔۔۔ ڈارنگ۔۔۔۔۔ شی از ویری ٹائس ا“

”آئی لو۔“ وہ مسکرایا۔

”اب میں چلتی ہوں۔“ ٹھیکس کار آئس کریم۔“ وہ ہائے کہتے ہوئے چلی گئی۔ دوسون اور پیٹر کے بارے میں سوچتی رہی۔

”سون بہت انگریز ہے۔ مجھے بہت Snub کرتی تھی۔ بہت جھگڑا لو۔“

”کس بات پر؟“ شہلانے حیرانی سے پوچھا۔

”یونی، بیکار ہاتوں پر..... اس ہر نیچر آؤ چلے ہیں۔“ وہ آہستہ آہستہ ہاتھیں کرتے ہوئے اپنے اپارٹمنٹ کی طرف لوٹ آئے۔



سون مسلسل اس کے ذہن میں تھی۔ خوب صورت، نازک سی اور عام سی بھی ہر کردار اندر ہی اندر ایک دوسرے سے کتنا جلتا جلتا بھی ہوتا ہے اور نہیں بھی۔ وہ اپنی Negation کے بعد بھی کتنی خوش تھی جیسے وہ اب تھی۔ منصور سے مشروط معاہدے کے باوجود بھی وہ کتنی غیر اہم اور کمزور رہی تھی۔ سید صاحب نے منصور کی ہر ممکن خدش کی تھیں کہ وہ اسے طلاق نہ دے۔ انھوں نے اپنی جائیداد کا مخصوص حصہ بھی اس کے نام کر دیا تھا اور اس کا سارا اختیار ملک منصور کو دیا تھا۔

”جیسن اس کا ماضی داغ دار ہے..... اور میں ایسی رذیل عورت کے ساتھ گزارہ نہیں کر سکتی۔“ ملک منصور غصے سے فرمایا۔

”اگر تم میرے عزیز از جان دوست معراج الدین کے بیٹے نہ ہوتے تو قسم خدا کی تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا کرتوں کے آگے ڈال دیتا۔“
 شخصیں یہ بھی جیانیں کہ وہ کس اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور تم اس کے بارے میں فضول یادہ کوئی کر رہے ہو۔“ سید صاحب کا خصر عروج پر تھا۔
 ”اس خاندان سے اس کا تعلق صرف نام تھا ہی ہے نا خون کا رشتہ تو نہیں۔ آپ نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے میں کوئی محل سے کورا آدی ہوں۔ اگر وہ آپ کے خاندان کی ہوتی تو اس وقت میری جگہ حیدر اس کا شوہر ہوتا۔ آپ نے میرے ساتھ سنگین مذاق کیا ہے۔ نہ جانے وہ کون ہے اور اس کو میرے گھر کو..... مجھے تباہ کرنے کے لیے بھیج دیا ہے۔ کیا میں کوئی کم تر اور بے حیثیت انسان ہوں۔ ہزار ایک زمین اور سیاسی اثر و رسوخ کا مالک ہوں۔ شہر میں میری دو ٹیکسٹریاں ہیں۔ آپ نے میرے ساتھ گھائے کا سودا کیا ہے۔ سید صاحب میں بزنس میں نقصان ہونے پر کسی ملازم کو نہیں بھینٹ کر دیتا تھا۔ میں شہلا کو بخش دوں گا۔ اب وہ سسکتی رہے گی۔ اس گھر میں اس کی حیثیت جانور سے بھی بدتر ہوگی۔ آپ دیکھیے گاندہ شکایت کر سکے گی۔ نہ آپ کے سامنے رو سکے گی اور نہ ہی حیدر کو بھلا پائے گی۔ یہی اس کی سزا ہے۔“ وہ اتفاقاً چاچا کر بولا۔

سید صاحب جو کسی کی سب بات گوارا نہ کر سکتے تھے۔ ایک دم کمزور پڑ گئے۔ انھیں شدت سے احساس ہوا کہ وہ تو بیٹی کے باپ تھے اور بیٹی کا باپ اندر ہی اندر نہ جانے کیا کچھ برداشت کر لیتا ہے اور کچھ کہہ بھی نہیں پاتا۔ انھیں اب اس کا اعزازہ ہو رہا تھا۔ ان کا سارا خصر اور پیش ہوا ہو گیا۔ چہرے پر تنگ فہم اور سنجیدگی کی لہریں نمودار ہو گئیں۔

”منصور وہ کوئی رذیل مخلوق نہیں۔ میرے ایک دوست کی بیٹی ہے۔“ انھوں نے اسے بچانے کے لیے ذمہ کی میں پہلی دفعہ جھوٹ بولا تھا۔
 ”سید صاحب کیوں جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں نے اس کے بارے میں تحقیقات کروالی ہیں۔ وہ آپ کو سڑک پر لٹی تھی۔ حقیر..... ذرہ

خاک..... رذیل ذات..... جس کی نہ کوئی شناخت ہے نہ نام..... اور حیدر سے اس کا معاشرت بھی کوئی چھپی بات نہیں! "ملک منصور ہتھیری کی حدیں پار کرنے لگا۔

"دیکھو بیٹا، میری اور تمہارے باپ کی دوستی مثالی رہی ہے۔ اس دوستی کی خاطر ان سب باتوں کو بھول جاؤ۔ یہ سب بے بنیاد باتیں ہیں۔ تمہیں خواہ مخواہ وہم ہو گیا ہے۔ وہ بہت اچھی سلیقہ شعار بچی ہے۔ مجھے یقین ہے تمہیں ہر طرح سے سکھ دے گی۔" سید صاحب کے لہجے میں ہلاکی نکلتی تھی۔

"اے اتنا حق ملے گا تو سکھ دے گی نا۔" وہ بھی تجلی سے بولا۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ تم سمجھوتا کر لو۔ کسی بھی بات پر میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔" سید صاحب نے آخری بار ابھجائی۔

"ٹھیک ہے، آپ کی خاطر وہ اس گھر میں رہے گی مگر..... اس کے لیے آپ کو ایک شرط ماننا پڑے گی۔" ملک منصور کے لہجے سے عیاری نکلتی تھی۔

"ہاں..... کہو..... میں ضرور ماننے کی کوشش کروں گا۔" وہ بے میری سے بولے۔

"آپ شہر والی راسل بل میرے نام کر دیں۔" وہ قدرے ڈھٹائی سے بولا۔

"اور.....!" وہ سوچ میں ڈوب گئے۔ ہر راستہ مسدود نظر آ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے، چند روز تک تمہیں کاغذات مل جائیں گے۔" سید صاحب ہار مانتے ہوئے نکلتی سے دو چار ہوتے ہوئے بولے۔ وہ ریت کی عمارت کے مانند بالکل شکستہ ہو گئے تھے۔ ملک منصور کے چہرے پر طعنے مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے اسے بسانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ وہ اسے بالکل بیٹیوں کی طرح چاہتے تھے۔ وہ ایسے سووے کاسن کر جیسے سکتے ہیں آگئی۔

"اتنا مشروط وجود، اتنا مشروط رشتہ۔" اتنی مشروط زندگی۔ مرد ہر رشتہ کیوں مشروط بنا دیتا ہے۔ ہر تعلق مشروط کیوں ہے۔ وہ اس رات اتنا روئی کہ شاید آنسو ختم ہو گئے تھے مگر آنکھیں برسات نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ ملک منصور چند دنوں میں ہی راسل بل بیچ کر انگلیڈ چلا گیا۔ وہاں اس نے اپنا بزنس سیٹ کیا۔ زیادہ تر وقت وہ انگلیڈ میں ہی رہتا اور وسیع و عریض حویلی میں وہ اس کی بوڑھی بہری ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ یہاں چند نوکر اور جانوروں کی بہتات تھی۔ اس حویلی کے چپے چپے سے وحشت اور ویرانی چھٹی تھی۔ وہ سارا دن گائے، بھینس، گھوڑے، مرغیاں اور بکریاں دیکھتی راتی۔ نہ کسی سے بات نہ کسی سے دکھ سکھ شیئر کرتی۔ وہ اس گھر میں کیا تھی؟ مالکہ، ملازمہ، باندی یا پھر زرخیز غلام۔ وہ آج تک قصین نہیں کر سکی تھی، وہ اس کے بعد کبھی شو پورہ کا شاہ سید نہ گئی۔ شادی کے بعد وہ کبھی حیدر کے سامنے نہ گئی۔ بس اس حویلی کی خاک میں خاک ہو گئی۔

ملک منصور جب بھی انگلیڈ سے آتا تو نئی نئی لڑکیوں سے وابستگی کی یادیں بھی لے کر آتا۔ جتنے دن رہتا۔ ہر رات اس پر تشدد کرتا۔ کبھی طعنے لہجے میں تو کبھی چابک ہاتھ میں تمام کر۔ اتنی بڑی حویلی میں وہ ایک تنہا کراہتی مرضی سے ادھر سے ادھر نہیں رکھ سکتی تھی۔ زندگی کا حاصل کیا تھا؟ وہ تو ہر شے اور جذبے کی قید سے آزاد ہو چکی تھی۔ منصور اس کا کیا تھا اور وہ اس سے کس شے کی طالب تھی یہ بحث اور طلب ہی ختم ہو چکی تھی۔

اس نے سرواؤ بھری۔

پیر کافی اور سینڈویچز لے کر آگیا تھا اور پلٹتے سے ٹرے سجا کر اس کے سامنے دکھادی "اتنا مت سوچا کرو، یو پرٹی دیکھن۔" وہ محبت سے بولا۔
"اوہ تم!" وہ ایک دم مسکرا دی۔ کہاں اتنی ذلت اور کہاں اتنا مان۔

"کل تم تیار رہنا۔ میں نے تمہارے لیے ایک اسکول میں بات کی ہے۔ تم اپنے اے پیس لٹچر جوائن کرنا۔ یوں قاریغ بیٹھ کر بگ آ جاؤ گی۔" پیر نے کہا۔

"ٹھیک ہے، یہ تم نے اچھا کیا۔ واقعی میرے ذہن کو ڈنگ لگ چکا ہے۔"

"پیر سینڈویچز بہت ٹھیک سی ہیں۔" وہ تعریف کرتے ہوئے بولی۔

"اچھے ہیں نا، میں روز تمہارے لیے بنایا کروں گا۔" وہ خوش ہو کر بولا۔

"جینک یو۔" وہ بھی مسکرا دی۔

"میں اور بھی اچھی اچھی چیزیں بناتا ہوں۔ تمہیں بنا کر کھلاؤں گا۔"

"حظاً؟" وہ پتھس اعجاز میں بولی۔

"حظاً..... ٹھیک، ہاپل پائز، پنڈ اور غیر وغیرہ....."

"اس کا مطلب ہے تم اچھے لک بھی ہو۔"

"لک نہیں بیکر..... اور اب میں شاپ پر جا رہا ہوں۔ فروٹ میں نے فرنیچ میں رکھ دیا ہے۔ ضرور کھا لینا۔ اوکے گڈ بائے ایڈ ٹیک کیئر۔" وہ مسکراتا ہوا ہر گھل گیا اور آسمان کی آنکھوں میں جھلکانے لگے۔

پیر واقعی اتنا پتھس انسان ہے۔ اتنا محبت کرنے والا تو پھر سون نے اسے کیوں چھوڑ دیا۔ شاید کوئی کسی کے لیے سیٹھٹیکھن اور کسی کے لیے دس سیٹھٹیکھن کا باعث بنتا ہے۔ کتنا افسوس ہے سوچ میں یا پھر رویے میں۔ کہیں دن، کہیں رات۔ کسی کے لیے امداد میرا اور کسی کے لیے روشنی۔

اس نے اوپر تلے شفق آفاق اور فلک کو جہم دیا۔ منصور کو بچوں سے بہت محبت تھی اور اس سے بہت نفرت۔ نفرت کے سلاپ سے محبت نے جہم لیا تھا۔ عجیب معکھ خیر بات تھی۔ وہ اس کے وجود سے نفرت کرتا تھا۔ اس کا سایہ تنک سے گوارا نہ تھا اور اس کے وجود سے پھونکنے والی کونپلوں پر وہ جان دیتا تھا۔ بے نام نے نام والوں کو تخلیق کیا تھا۔ وہ بچوں کی ہر خواہش پوری کرتا اور اس کی ہر خواہش کو رد کرتا ہلکا اس کے پاس تو اعجاز کا حق ہی نہ تھا۔ ملازم بھی رعب سے اپنا حق مانگ سکتے تھے مگر وہ تو اس کے گھر میں کچھ بھی نہ مانگ سکتی تھی اور کس سے مانگی۔ لینے والے سے پہلے اپنے وجود اور حیثیت کا تعین تو کر داتی۔ وہ بچوں کو بہت سمھاتا پھرتا اور اس کو کبھی نہیں۔ پہلے شفق اور آفاق اکیلے باپ کے ساتھ جاتے۔ اب جب سے فلک پیدا ہوئی تھی تو اسے بھی کبھی کبھار شفق کے اصرار پر کھلی سیٹ پر بٹھا لینا۔ شفق دونوں کے وجود کا مرتع تھی۔ ملک منصور تو ویسے بھی اپنی خوب صورت اور ڈی شک پر سٹائلی کی وجہ سے ہر خاص و عام میں مقبول تھا اور اس کے فچر ڈی بھی کسی سے کم نہ تھے اور شفق تو بالکل ماں پر مکی تھی۔ شفق جیسے جیسے بڑی ہو رہی

تھی ماں کی حیثیت کا اعجاز کر رہی تھی۔ اس نے ہی ضد کر کے شہر کے اسکول میں داخلہ لیا اور اس کی وجہ سے سب کو شہر شفت ہوتا پڑا۔ ملک منصور نے ڈینٹس میں چار کنال پر محیط بڑا سا گھر انیس لے کر دیا۔ ہر طرح کی آسائشیں میسر تھیں۔ اس دلہہ بچوں نے چھٹیاں انگلیٹڈ میں گزارنے کی ضد کی تھی اور اب کی بار اسے بھی جانا پڑا کیونکہ ملک بہت چھوٹی تھی۔ شفیق اور آفاق کے بے حد اصرار پر اسے بھی لے کر جانا پڑا۔ جوں جوں ملک منصور کی امارت میں اضافہ ہو رہا تھا اس کی سیاسی حیثیت بھی بڑھ رہی تھی اور سماجی بھی۔ وہ آئے دن مختلف تقاریب میں خصوصی طور پر مدعو کیا جاتا کیونکہ وہ گلیسرز اور متحرک شخصیت کا مالک تھا۔ ہر روز نئی نئی چیزوں کے ساتھ حکومت۔ کبھی کسی این جی او کی رودادوں کے ساتھ۔ کبھی کسی پارٹی ورکر کے ساتھ اور کبھی کسی مشہور اداکارہ کے ساتھ تو کبھی ماڈلز کے ساتھ دیکھا جاتا۔ نئی نئی فیشن اسٹیل لڑکیاں بلا روک ٹوک اس کے گھر آتی جاتیں۔ کسی کو یہ حق نہیں تھا کہ وہ ان کے آنے جانے کی نوعیت پوچھ سکتا؟

منصور وودن سے گھر نہیں آیا تھا۔ اس نے شفیق کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ وہ ضروری کام سے کہیں جا رہا ہے۔ شفیق نے ماں کو بتا دیا تھا اور اس نے خاموشی سے سن لیا تھا۔ ناشتا خلیل پر لگ چکا تھا۔ وہ بچوں کو اٹھا کر لائی تو اچانک سامنے منصور بیٹھا تھا۔ خوش باش، ہنسنے لگا۔ وہ چونک سی گئی مگر کچھ بھی پوچھنے کی جرات نہ کر سکی۔

”ہیلو پاپا..... آپ یہاں.....؟“ شفیق نے حیرت سے پوچھا۔

”ہیلو ڈیئر، ہاں میں رہا ہوں۔ بس کام ختم ہو گیا تھا۔“

”پاپا آج چھٹی ہے مگر منے چلیں گے۔ آج زوجہ چلیں گے۔“ آفاق خوشی سے بولا۔

”ٹھیک ہے بیٹا۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ شفیق روز اخبار میں پزل اور اسکرہیل دیکھنے کی عادی تھی۔ ناشتے کے بعد وہ اخبار لے کر بیٹھ گئی اور پھر ایک دم چمک گئی۔

”مما..... تو دیکھ میں پاپا.....!“ وہ حیرت سے بولی۔

”کہاں، مجھے دکھاؤ۔“ آفاق اس سے اخبار پھینٹے لگا۔

”مگر یہ ساتھ کون ہے؟“ شفیق نے حیرت سے پوچھا۔

”پورنہو ما۔“ ملک منصور مسکراتے ہوئے بولا۔

”جی نہیں، ہماری مہمان تو یہ ہیں۔“ آفاق غصے سے بولا۔

”شی اڑاے گا مگر۔“ منصور نے اس کی تعریف کرنا چاہی۔

”بٹ وی بیٹ بر۔“ شفیق غصے سے بولی۔ اس کا موڈ سخت آف ہو گیا تھا۔

شہلا خاموشی سے سنی رہی۔ ناشتا کرنے کے بعد وہ اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔

تو منصور نے بآواز خراں نگر سے شادی کر لی۔ جس کا آج کل اس کے ساتھ چرچا تھا۔ اسے کوئی خاص دکھ نہ ہوا۔ منصور کے ساتھ اس کا

رشتہ بس نام کا رہ گیا تھا۔ وہ پہلے کون سا اس کا تھا جہاں سے دکھ ہوتا۔ منصور بہت خوش تھا۔ بچوں کو باہر لے کر جانا چاہتا تو کوئی بھی ساتھ نہ گیا۔ شفق کا دل ٹوٹ سا گیا تھا۔ وہ سارا دن کمرے میں بند رہی اور روتی رہی۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں نہ جانے کیوں اس نے اس بات کو بہت شدت سے محسوس کیا تھا۔ اس نے سارا دن کسی سے بات نہ کی۔ آفاق بھی روٹھا روٹھا رہا۔ آہستہ آہستہ دونوں ماں باپ سے بکھر ہونے لگے تھے۔



بی بی جی کی وفات کی خبر ملی تو وہ چرک سی گئی۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ بی بی جی یوں اچانک اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گی۔ ان کی محبت اور پیار بھر اس سب کچھ کتنا منفرد تھا اور اس میں کتنی مٹھاس تھی۔ کیا ان سب کو بھلانا آسان ہے۔ اسے شدید صدمہ ہوا۔ منصور نے خود ہی گاڑی نکالی اور ملازم کے ہاتھ اس کو پیچھا پیچھا وہ خاموشی سے بچوں کو لے کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ کبھی بھی منصور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر نہیں بیٹھی تھی۔ نہ ہی منصور نے کبھی اسے یہ حق دیا تھا۔ وہ ہمیشہ شفق کو آگے بٹھاتا تھا۔ وہ سارا راستہ روتی رہی۔ وہ شفق کی پیدائش کے بعد اب پہلی دفعہ کا شانہ سید جا رہی تھی۔ وہ تو ان راستوں کو کھوجتی رہی۔ انھیں اپنے اندر تلاش کرتی رہی جو کبھی اس کے تھے اور اب اس کے جانے کے بعد سب کچھ کتاب بدل چکا تھا گاؤں میں کافی ترقی ہو چکی تھی مگر اس کی نگاہیں تو ان کچے کچے راستوں اور پگڑیوں کو تلاش کرتی رہیں جن پر وہ حیدر کے سنگ چلا کرتی تھی۔

حوالی میں سب لوگ جمع تھے۔ سید صاحب بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ حیدر ان کے ساتھ ساتھ بھر رہا تھا۔ حیدر نے وہی حلیہ اپنا لیا تھا جو کبھی سید صاحب کا ہوتا تھا۔ بس اس کی نظر کی ٹینک کا نمبر بڑھ گیا تھا۔ حیدر کی اپنے تخیلی رشتے داروں میں شادی ہوئی تھی اور اس کی ایک بیٹی تھی شہلا۔ وہ نام سن کر چرک سی گئی۔ وہ روتی ہوئی بہنوں کے گلے لگی۔ تبسم آپا بھی کافی دیر اس کے گلے لگ کے روتی رہیں۔ کبھی وہ اس گھر اور اس کی آسائشوں میں ان کے ساتھ برابر کی صے دار تھی اور اب وہ اس گھر میں اجنبی تھی، مہمان تھی۔ سید صاحب نے اس کے سر پر بیاڑیا تو وہ جی بھر کر روتی۔ جنازے کے بعد وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔

”بی بی جی کو کیا ہوا تھا؟“ اس نے پوچھا۔

”ہونا کیا تھا بس بڑا چاہا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا پیاری ہو سکتی ہے؟“ سید صاحب خاموش ہو گئے۔

”بابا انہوں نے مجھے کبھی یاد نہ کیا؟“

”کرتی تھی۔ بہت زیادہ..... مگر میں نے خود ہی بلانا مناسب نہ سمجھا۔“

”کیوں..... میں اس قدر غیر ہو گئی ہوں۔“

”جہیں، منصور کے ڈر سے۔ کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے۔“

”تو کیا اب وہ مجھ سے خوش ہے؟“ اس کے لہجے میں بلکا کا درو تھا۔

”منصور نے شادی کر لی ہے؟“ سید صاحب نے آہستہ سے پوچھا۔

”کیا فرق پڑتا ہے۔ میں اس کے گھر میں قالمو شے سے بھی کم حیثیت رکھتی ہوں۔“

”میں تمہارا تنہا ہوں۔“ سید صاحب کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

”آپ اپنے دل سے ہر وہم نکال دیں۔ کیا قسمت سے بھی کوئی ٹکڑا ہے۔ یہ سب میرا نصیب ہے جو مجھے مل کر رہتا ہے۔“ اس نے سید صاحب کی تسکینی کرنا چاہی۔

اچانک حیدر کمرے میں آیا تو ٹھنک سا گیا۔ وہ پہلے سے لڑاؤ درگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر جیسے خزاں کا کوئی موسم غمیر سا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دکھ ہی دکھ تھا ”کسی ہو؟“ وہ جیسے مت کچا کر کے بولا۔

”ٹھیک ہوں۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا اور وہ خاموشی سے کمرے سے باہر نکل آئی۔

تین دن شہلا وہاں رہی حیدر نے اس دوراں منصور کی بہت آؤ بھگت کی۔ اس کے بچوں کو بہت پیار کیا۔ جانے سے پہلے وہ سب سے مل رہی تھی۔ وہ کچن میں جسم آ پا سے ملنے لگی تو حیدر وہاں کھڑا تھا۔

”تم اس قدر کیوں بدل گئی ہو۔ تم وہ شہلا ہی نہیں لگ رہیں۔ خوش رہا کرو۔“ حیدر نے کہا۔

”کیا پتا آسان ہے؟“ وہ آہستہ سے بولی۔

”ناممکن تو نہیں، کوشش کیوں نہیں کرتی۔“

”میرے لیے اب سب کچھ ناممکن ہے۔“ اس نے آہ بھر کر کہا۔

”کیا زندگی بڑی ہی مگر ارد گرد کی؟“

”شاید۔“

”جس میں یوں دیکھ کر مجھ دکھ ہوتا ہے۔“ وہ قدرے مافردگی سے بولا۔

”کیوں؟“

”کیا تم نہیں جانتی؟“

”حیدر ماضی کو وہاں دفن کر دو جہاں سوائے تاریکیوں کے کچھ بھی نہ ہو۔ اب میں آئندہ وہاں کبھی نہیں آؤں گی۔“ وہ کہہ کر باہر نکلے تو منصور باہر کھڑا ساری باتیں سن رہا تھا۔ وہ جا کر خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ مگر آتے ہی منصور نے اسے غلطی کا کیوں سے نوازا تھا۔ مرد کا کندہ ترین ہتھیار، جو عزت اور لحاظ کے تمام بت پاش پاش کر دیتا ہے۔ مرد کو اسے منصف پر بٹھا کر جب عورت اپنے بارے میں پہلی دفعہ ایسے الفاظ سنی ہے تو اس کا بس نہیں چلنا کہ اس شخص کو اپنے قدموں تلے روند ڈالے۔ کیننگی کی بدترین شکل..... جسے مرد ادا کر کے خوش ہوتا ہے۔ عورت کی تذلیل کے احساس سے اس کی اتاسکین پاتی ہے۔ ملک منصور بھی امدادی امداد خوش ہو رہا تھا۔ جب وہ ایک سے بڑھ کر ایک غلطی گالی اسے دے رہا تھا۔

”منصور گالیاں مت دیں؟“ وہ پہلی دفعہ چلائی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”تم جو اپنے عاشق سے مل کر آئی ہو۔ اس خوشی میں پھولوں کے ہار پہناؤں۔“

”میرے اور حیدر کے تعلقات بہت اچھے اور پاکیزہ تھے اور مجھے کبھی بھی اس پر شرمندگی نہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کو پسند کیا اور عزت دی۔ ایسی عزت جو شاید ہی کوئی مرد کسی عورت کو دے سکے۔ میرا اور اس کا کوئی قہر ڈاکاں اٹھ کر نہیں تھا۔“ اس نے ہلکا خرمست کر کے کہا۔

منصور کو تو جیسے کسی بچہ نے کاٹ لیا ہو۔ اسے قلعی قلع نہ تھی کہ وہ یوں اس کے سامنے بولے گی۔ اس نے جو اس کو مارنا شروع کیا تو رکنے پر ہی نہ رہا تھا۔ اس کے سر سے خون بہنے لگا۔

”تمہاری یہ عزت کہ مجھ سے اس طرح بات کرو۔“ وہ غصے سے بے تاب ہو کر بولا۔

”پاپا بس کریں۔“ شفیق نہ جانے کہاں سے آگئی تھی۔ اس نے آکر باپ کو روکا تھا۔ شفیق کے کہنے پر وہ رکنا اور نہ آج تو وہ اس کی بوٹی بوٹی کرنے پر ملا تھا۔

شفیق اور آفاق دونوں ماں کا سرد ہار ہے تھے اور رد بھی رہے تھے۔ اس کا پورا پورا رونا روناں جل رہا تھا۔ سب کچھ اسے یاد آ رہا تھا۔ باہر ٹیڑس پر خوشگوار ہوا کا جھونکا اس کے بالوں کو چھونے لگا مگر اندر کی آگ سے تن بدن جل رہا تھا۔ پیڑا سے ٹیڑس پر کھڑا دیکھ کر نیچے سے ہاتھ ہلا رہا تھا مگر وہ تو شدید احساس ذلت میں جل رہی تھی۔ اب وہ باہر زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ جب وہ اچانک چونک کر مڑی اور دروازہ کھولا۔

”بھیل تم کیا کرتا ہے۔۔۔۔؟“ وہ اسے دیکھ کر بھینچا کر بولا۔

”کیوں؟“

”میں تمہیں نیچے ہلا رہا تھا۔“

”سب؟“

”اوہ مائی گاڈ! بھیل ڈارنگ اپنی سوجھوں سے باہر نکل آؤ۔ اپنا پاسٹ کہیں پیچک دو۔ کہیں تاریک گوشے میں۔ صرف پریذنٹ کو دیکھو کسی کو یاد نہ رکھو۔ بس تم یہاں ہو اور میں تمہارے ساتھ۔“ وہ اس کے ساتھ لپٹتے ہوئے بولا۔

”زندگی کسے اتنے سال کہاں گم کر دوں، وہ لمبے لمبے دیں۔ وہ باتیں بھر بہت کچھ۔ بھلانا بھی چاہوں تو نہیں بھلا سکتی۔“ وہ المیہ سے بولی۔

”اوہ کے کل سے تم اسکول جوائن کرو گی پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“

”کون سے اسکول؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”میں نے تمہارے لیے چاب ڈھونڈی ہے بتایا تو تھا اور تم اسکول میں پچھس پڑھاؤ گی۔ کل انٹرویو ہے لیکن ابھی سب چلتے ہیں۔“ وہ

خوش ہو کر بولا۔

”نہیں، میرا دل نہیں چاہ رہا۔“

”اوہ گاڈ! ایک تو میں تمہارے دل سے بہت شک ہوں۔ تم اس کو سمجھانا کیوں نہیں۔“ وہ بھینچا کر بولا۔

”کیا سمجھاؤں؟“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”جو میں کہتا ہوں۔“

”تم کیا کہتے ہو؟“

”لو۔۔۔ روٹا ہوا اینڈ۔۔۔“ وہ شرارت سے بولا۔

”یہ ایسی باتیں نہیں سمجھتا۔“

”اُس دیری اسٹوپ۔“ نادانستہ پیئر کے منہ سے نکلا تو شہلا کھلکھلا کر ہنس دی، ”جھینکس گاؤ۔ تم ہنس تو۔۔۔“ اور وہ خود بھی ہنسنے لگ پڑا

”ہب چلیں؟“

”نہیں۔“

”مودی دیکھنے چلیں۔“

”نہیں۔“

”دقیئر۔“

”نہیں۔“

”تو پھر۔۔۔؟“

”باتیں کرتے ہیں۔ میری زندگی میں ابھی باتوں کی کمی رہی ہے۔ تم باتیں کرو۔ میں بس سنتا چاہتی ہوں۔ ابھی باتوں سے بڑھ کر دنیا

میں کوئی قیمتی شے نہیں، بے تا پیئر۔“

”اوہ نو۔۔۔ تم پھر سیز ہو جاتی ہو۔“ پیئر اکٹا ہٹ سے بولا۔

”اب نہیں ہوتی تم باتیں کرو۔ میں سنتی ہوں۔“

”جہیں تم کرو، میں سنتا ہوں۔“

”کیا۔۔۔ کون سی باتیں۔ کیسی لود کس کے متعلق؟“ اس نے خود سے سوال کیا۔ دونوں خاموش ہو گئے اور پھر کھلکھلا کر ہنس دیے۔

”پیئر تم بہت Jolly ہو۔۔۔“

”اور تمہیں بھی ایسا ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔“ وہ مسکراتا ہوا بولا۔

”تم اتنے اچھے کیوں ہو؟“

”کتنا اچھا؟“ پیئر اپنی تعریف سننے کے موڈ میں تھا۔

”بہت سے لوگوں سے اچھے ہو۔ دیری ٹاکس پارٹنر اینڈ سوٹ۔ سوٹ۔“

”کیا سب سے اچھا نہیں؟“ پیئر نے ہنسنے ہوئے پوچھا۔

”مطلوم نہیں.....“ حیدر کی طبیعت ایک دم اس کی نظروں کے سامنے گھوم گئی اور وہ کھوی گئی ”نہیں..... اس سے بڑھ کر کوئی بھی نہیں۔“ اس کے دل نے کہا۔

”تم بھی بہت اچھی ہو۔ مطلوم نہیں تمہارے سپیڈ نے کیوں ایسا کیا؟“

”کیا؟“ جیسے وہ خواب سے بیدار ہو گئی ہو۔

”یوں مس بلی ہو..... وہ بہت برا انسان تھا۔ تم نے اتنے سال کیوں اس کے ساتھ ضائع کیے۔ اسے دوسرے دن ہی کیوں نہ چھوڑ دیا۔“

”ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔ ہم زندگی کی آخری سانسوں تک دشتہ بھاتے ہیں۔ کوئی کوئی میری طرح راستے میں چھوڑ دیتا ہے۔“

”ویری اسٹریچ..... کس کے انتکار میں زندگی یوں ضائع کی جائے؟“

”شاید کسی بھڑے کے..... مگر ہم جیسوں کے ساتھ بھڑے بھی نہیں ہوتے۔“

”You mean miracles۔“ وہ وضاحت کے موڈ میں ہوا۔

”Miracles۔“

”تو کیا تمہارا اور میرا ملاپ لائسنس اینڈ ویسٹ۔ کیا یہ Miracle نہیں۔“

”ہاں یہ بھی ہے..... لیکن پتھر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ہم کسی اور بھڑے کے خطرہ ہوتے ہیں۔ دعائیں کسی اور کے لیے مانگتے ہیں لیکن کچھ

اور بالکل مختلف ہو جاتا ہے۔ زندگی اتنی مشکل کیوں ہے۔ اس میں اتنے Jerks کیوں ہیں۔ اتنے مختلف موڈ کہ ہم خود ہی حیران ہو جاتے ہیں کہ ہم جا کہاں رہے تھے اور پہنچ کہاں گئے ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”پلیز ہیل ایسی مشکل باتوں سے گل آؤ۔ تم بیچتے ہو اس لیے اتنے اینگلز والی باتیں کرتی ہو۔ میں تمہارا پاسٹ نہیں جانتا چاہتا۔ میں بس یہ جانتا چاہتا ہوں کہ تم خوش ہو کہ نہیں۔ کیا تم میرے ساتھ خوش ہو؟“

”ہاں..... بہت.....“

”کیا تمہارے اندر کوئی کار خالی تو نہیں رہ گیا۔ میں نے تو تمہیں بھر پور محبت دینے کی کوشش کی ہے۔ ایکسٹریم لو.....“ وہ مسکرا کر ہوا۔

”ہاں.....“ وہ آہستہ سے بولی۔

”تھینکس ڈارلنگ، آئی ایم سٹیفنا غیڈناؤ۔“ وہ اس کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے ہوا اور وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ ”تم جسے محبت کا نام

دیتے ہو وہ محبت تو نہیں۔ پیڑ وہ تو کچھ اور ہے۔ میرے اندر محبت کا کاسہ ابھی بھی خالی ہے۔ حیدر کے بعد تو کوئی اس کی طرف دیکھ بھی نہیں سکتا۔ وہ تو ہمیشہ خالی رہے گا۔ تمہاری محبت میں وہ سب کچھ نہیں جو مجھے چاہیے۔“ اس نے آہ بھر کر سوچا اور اس کی طرف دیکھا وہ گہری نیند سو رہا تھا۔

بعض لوگ کیسے آسانی سے مطمئن ہو جاتے ہیں جیسے پیڑ..... جیسے منصفیہ اور بعض لوگ کبھی مطمئن نہیں ہوتے جیسے میں جیسے حیدر۔ وہ اس کی آنکھوں میں گہری ہمدانی دیکھ چکی تھی اور اس گہری ہمدانی کا راز بھی جانتی تھی۔ کیا زندگی بونہی گزر جائے گی۔ اس نے پیڑ کے پورے کھلے پھیلاتے ہوئے سوچا تھا۔

شزا ملک کی پہرا اشارہ ڈال تھی اور ماڈلنگ کے سلسلے میں ہی وہ لندن گئی تھی۔ جب ایک شو کے دوران ملک منصور سے اس کی ملاقات ہوئی۔ ملک منصور کو گھیریں لائف اور گھیریں لوگ بہت پسند تھے۔ اس سے قبل وہ ایک عدد منکر اور ایکٹر لیس کو طلاق دے چکا تھا اور اب شزا سے چوتھی شادی کے سوا میں تھا۔ شہلا کی طلاق کے بعد اسے قدرے دم کا سا لگتا تھا۔ گوکہ پہلے وہ خود بھی یہی چاہتی تھی۔ کیونکہ وہ ابھی تک اس نے شفق اور آفاق کو بہت افسردہ اور تنہا دیکھا۔ شفق اپنی عمر سے زیادہ سمجھتا اور سوچنا شروع ہو گئی تھی اور آفاق روڑا ہوتا جا رہا تھا۔ دونوں باپ کی طرف عجیب نظروں سے دیکھتے۔ اسی لیے اس نے شزا کے ساتھ میریں لائف گزارنے کا سوچا تھا۔ دونوں نے ملک واپس آتے ہی شادی کر لی۔ اخباروں کے خصوصی ایڈیٹر میں ان کی تصویریں شائع ہوئیں۔ شہلا نے بھی ایک دن اخبار میں دیکھا اور آہ بھر کر رہ گئی۔ ملک منصور کے چہرے پر جو خوشی اور مسرت کی جھلک تھی وہ جب اس کے ساتھ منسوب رہی کبھی دیکھنا عیب نہ ہوتی تھی۔

شادی کے بعد دونوں سوئٹزر لینڈ چلے گئے۔ بچے گھر میں بالکل تنہا رہ گئے تھے۔ گاڑیوں سے بڑھی دادی اور ایک پرانا ڈاکٹر نوکر اکرم آ گئے تھے۔ دادی کی قوتِ سماعت بہت زیادہ متاثر ہو چکی تھی۔ چیخ چیخ کر کوئی بھی بات سمجھنا پڑتی تھی۔ بچے دادی سے اسی لیے بات ہی نہ کرتے تھے۔ البتہ اکرم گھر..... کا بہت خیال رکھتا تھا۔ بچے ایک دم شدید تنہائی کا شکار ہو گئے تھے۔ کب تک کچھ بولیں، سوویز اور فریڈ سے جی بہلاتے۔ خود ہی آپس میں باتیں کرتے پھر چپ کر جاتے یا پھر رونے لگتے۔ شفق، لکک کا بہت خیال رکھتی۔ اس کے لیے آپارنگی ہوئی تھی۔ جو سارا دن اس کے پاس راتیں اور رات کو اسے سلا کر چلی جاتی۔ وہ شفق کے پاس ہی سوتی تھی۔

فلک سورہی تھی اور شفق اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ کر ہوم ورک کر رہی تھی کہ وہ ایک دم روتی ہوئی اٹھ گئی۔ وہ ماما..... ماما پکار رہی تھی۔ شفق نے اسے گود میں لیا مگر وہ اس سے سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔

”چپ کرو، کیوں شور کر رہی ہو۔ ہماری کوئی ممانہیں۔ وہ ہماری کچھ نہیں لگتی۔“ شفق نے اسے غصے سے ڈانچا، آفاق ان کی آوازیں سن کر اٹھ آ گیا۔

”کیا ہوا، کیوں شور کر رہی ہو؟“

”ماما کے پاس جانے کی حسد کر رہی ہے۔“ شفق بے بسی سے بولی۔

”اس کو بتاؤ کہ نہ ہماری ممانہیں نہ پاپا۔“

”بھائی تو پھر کون ہے ہمارا؟“ شفق کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”کوئی بھی نہیں۔ دیکھو اس گھر میں کون ہے ہمارا..... نہ ماما..... نہ پاپا۔ شفق کیا گھرا لیے ہوئے ہیں۔ جہاں نہ ممانہیں نہ پاپا۔ صرف

دادی، نوکر اور بچے ہیں۔ شفق جب میں بڑا ہوں گا تو ان کو.....“ غصے سے ایک دم اس کے تنہے پھولے لگے۔

”تو کیا کرو گے؟“

”سب کوشش کروں گا۔“ وہ غصے سے بول رہا ہوا ہر کل گیا۔

ٹھک رو رہی تھی اور وہ اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ٹیلیف سے اپنے سارے کھلونے نکال کر اس کے سامنے رکھے مگر وہ سب کو اٹھا کر پینک رہی تھی۔ صرف ماما..... ماما کی رٹ لگا رہی تھی۔

”اچھا چلو، واوی امی کے پاس چلتے ہیں۔“ وہ اسے زبردستی اٹھا کر لے گئی اور واوی کی گود میں بٹھا دیا۔ وہ نہیں..... نہیں کی ضد کر رہی تھی۔ واوی کی ہڈیاں اور ٹخف و نزار جسم اسے پیسے لگا۔ واوی نے اسے اپنی آغوش میں سینے کی کوشش کی۔ وہ مضرب تھی۔ محبت بھرا کوئی لس چاہتی تھی۔ واوی کے پیار کرنے پر سٹ ہی گئی اور تھوڑی دیر بعد سو گئی۔ شفق ان کے پاس بیٹھی ہوم ورک کر رہی تھی۔ جب رات گئے ملک منصور کا فون آیا تو وہ مجھم آئی۔

”آقا، جلدی سے آؤ۔ پاپا کا فون ہے۔“ وہ خوشی سے چلائی۔

آقا اٹھا اور پھر بیٹھ گیا۔

”آقا بات کرو پاپا سے.....“ اس نے بات کرنے کے بعد فون اسے پکڑا لیا۔

”مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔“

”آقا بد تمیزی مت کرو۔“ شفق بڑی بہن ہونے کے ناتے اسے ڈانٹتے ہوئے بولی۔

”میں کوئی بد تمیزی نہیں کر رہا۔ مجھے کسی سے کوئی بات نہیں کرنی۔“ اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

”پاپا آقا آپ سے ناراض ہے۔ اس لیے باہر چلا گیا ہے۔“ اس نے فون رکھنے سے پہلے کہا۔

”آقا تم اتنے غصے میں کیوں آ جاتے ہو۔ تم کچھ بھی نہیں سمجھتے۔“

”کچھ مت سمجھاؤ۔“ وہ غصے سے بولا۔

”تم پاپا سے کیوں ناراض ہو؟“

”بہت سی باتیں ہیں۔“

”مثلاً.....؟“

وہ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ شفق نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ اس کے ساتھ لگ کر سسکتے لگا۔ ”شفق آئی سیٹ

پاپا۔ آئی مس ماما..... آئی لومما..... بٹ آئی سیٹ ہر.....“ وہ مسلسل بول رہا تھا اور شفق بھی اس کی باتیں سن کر رو رہی تھی۔



منصور اور شزا ایک پہاڑی پر بنے خوبصورت ریسٹورنٹ میں آبشار کے کنارے بیٹھے سو فٹ ڈرنک پی رہے تھے۔ حد لگاؤ خوبصورت

مناظر پہلے ہوئے تھے۔ سبھی کچھ تو قلم نیکوں آسمان، سرسبز اونچے پہاڑ، خوبصورت فضا جس میں جھبک ہی جھبک تھی اور اس کے دامن میں

خوبصورت..... محبت بھرے وجود ادھر ادھر بیٹھے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ شزا کچھ خاموش ہی بیٹھی تھی۔

”منصور آپ کو آپ کی بھاری چھوڑ گئی۔ آپ کو اس کا افسوس نہیں۔“ اچانک شزانے اس سے پوچھا۔
 ”نہیں!“ وہ قدرے بے پروائی سے بولا۔

”کیوں؟“

”کیونکہ وہ کبھی میرے لیے اہم نہ تھی۔ وہ کبھی بھی میری ذات کا حصہ نہ بن سکی۔ میری سوچوں پر حاوی نہ ہو سکی اور میرے وجود کو اپنے سحر اور حصار میں نہ لے سکی۔“

”مگر وہ تھی تو بہت خوبصورت۔“

”ہاں..... مگر اس خوبصورتی میں نہ ادا تھی، نہ دل فریبی وہ دل رجمانے کے فن سے نا آشنا تھی۔ وہ صرف ایک ذمہ دار لاش تھی۔ جس میں زندگی تھی مگر نہ حرارت تھی، نہ خوشبو..... اور نہ ہی کسی قسم کی تخیل۔“

”منصور جب ایک عورت مرد کو دھکا دے۔ اسے یوں چھوڑ جائے۔ کسی اور کے لیے..... تو کیا یہ مرد کے منہ پر طمانچہ نہیں؟“ شزانے معنی خیز لگا ہوں سے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔

منصور نے ایک دم چونک کر اس کی طرف دیکھا اور تھملا کر جگہ بدلی۔ اس نے اس بات پر کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ کیونکہ اس نے کبھی اس کو اہمیت ہی نہ دی تھی۔ شزانی کی بات کسی نشتر کی طرح اس کے دل پر لگی۔ وہ جتنی دیر وہاں بیٹھا رہا۔ شزانی کی بات پر اندر ہی اندر تھملا تا رہا۔
 ”منصور..... مجھ سے قبل آپ کی زندگی میں کتنی عورتیں آئی ہیں؟“

”شزانی آج کسی باتیں کر رہی ہو؟“

”بتائیں؟“ وہ ہنستے ہوئے۔

”اچھا خوشگوار ماحول، ہر طرف حسن ہے۔ خوبصورتی ہے۔ محبت ہے اور تم کسی غنفل بائیں لے بیٹھی ہو۔“ وہ ٹھکی سے بولا۔
 ”یونہی پوچھنے میں حرج ہی کیا ہے؟“

”بہت سی..... مگر اب تو کوئی نہیں۔ اب تو صرف تم ہو۔“

”اور میرے بعد.....؟“ وہ اندر کے خوف سے مجبور ہو کر بول پڑی۔

”پلیز اس ڈپک کو بند کرو۔“

”اچھا تو شہلا کے ساتھ آپ کے کیا اختلافات تھے؟“

”شزانی تمہیں کیا ہو گیا ہے، کیوں وکیلوں کی طرح جرح کر رہی ہو؟“

”یونہی پوچھ رہی ہوں۔ اگر آپ نہیں بتانا چاہتے تو رہنے دیں۔“

”ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ جب مجھے ملی تو اس کا ماضی داندھار تھا۔“

”کیا مطلب؟“

”اس کا اپنے کزن سے اٹھنا تھا۔“

”لیکن ماضی تو آپ کا بھی اچھا نہیں تھا اور شاید حال بھی۔۔۔ مگر وہ تو آپ کے وجود کو برداشت کرتی رہی۔ آپ نے ایسا کیوں کیا؟“

”شزا ہلیر! اگر تم ان فضول باتوں کو نہیں چھوڑ سکتی تو میں جارہا ہوں۔“

”اچھا اب نہیں پرچھتی۔“ شزا خاموشی سے اٹھیا رڈ اٹلتے ہوئے بولی اور پھر دونوں خوبصورت مناظر کی باتیں کرنے لگے۔ محبت کی

خوبصورتی کی اور آنے والی زندگی کی۔ ایسی زندگی جس میں صرف لطف ہی لطف تھا۔ خوشی ہی خوشی۔ شزا تھوڑی دیر بعد اس کی باتوں پر قہقہے لگاری تھی اور وہ ان قہقہوں سے محظوظ ہوا تھا۔

منصور نے اسے جی بھر کر شاپنگ کروائی اور اسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ وہ جس چیز پر ہاتھ رکھتی وہی خرید کر دیتا۔ وہ جو چاہتی دیا ہی کرتا۔ اسے کسی بھی لمحے ملک منصور میں ایسی کوئی بات نظر نہ آئی جو اس کے اندر چھپے خدشات کو توانا کرتی۔

”شزا! میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب تمہارے بعد کسی اور سے شادی نہیں کروں گا۔“ ایک دن ملک منصور نے مسکراتے ہوئے کہا تو جیسے اس کے دل کی کلی کھل گئی تھی۔

”کیا یہ سچ ہے؟“ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

”ہاں، مجھے تم سے وہ سب کچھ مل گیا ہے۔ جس کی میرے دل کو قناعت تھی۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”تھینکس فار کلمینٹ۔“ وہ یوں قاتلانہ مسکرائی جیسے ماری دنیا اس نے فتح کر لی تھا اور اب پوری دنیا پر اس کا ہی راج ہو۔



شہلا کو جب سے جاب ملی تھی وہ بہت معروف ہو گئی تھی۔ صبح اسکول جاتی اور رات کو دیر تک پیٹریک شاپ پر اس کی مدد کرتی۔ زندگی مشین بنی جارہی تھی مگر وہ خوش تھی۔ اپنے آپ کو بھولنا اسے اچھا لگنے لگا تھا۔ ماضی کو وہ کڑوی گولی کی طرح گل جھکی تھی مگر کبھی کبھی وہ بے سبب اداس ہو جاتی۔ کبھی کبھی ماضی راتوں کو خواب میں کبھی فلک، فتنی اور آفاق کی صورت میں تو کبھی حیدر اور سید صاحب کی صورت میں سامنے آ جاتا تو وہ چونک جاتی اور تڑپنے لگتی۔ ماضی کو پرانی مضبوط عمارتوں کی طرح منہدم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ قدم قدم پر پرانی باتیں یاد آتی ہیں۔ کسی طرح فرار ممکن نہیں۔ زندگی سے ماضی سے، آغاز سے اور انجام سے۔

”ہیلو ہینسی۔۔۔“ ایک خوبصورت، ویلی پتلی اور نیلی آنکھوں والی لڑکی کو پیٹرو کچہ کر مسکرایا۔

”ہیلو پیٹرو بہت چنڈم لگ رہے ہو۔“

”اوہ ہینسی۔۔۔“ وہ شرما کر بولا۔ وہ کتابیں شیف میں لگا رہی تھی۔ پیٹریک آواز میں خوشی کو محسوس کرتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھا۔

”میٹ پرانی وائف ٹیل۔ شہلا۔۔۔“ پیٹرو نے اسے اپنی طرف متوجہ کچہ کر اس کا تعارف کروایا۔

”ہاؤٹس، ایسٹرن دسکن“ نیسی حیرت سے بولی۔

”اوہس۔۔۔ تم تاؤ جان کیا ہے؟“

”اس کو میں نے چھوڑ دیا۔ بہت ہرج کر رہا تھا۔ اب میں لوٹی کے ساتھ رہتی ہوں۔“

”کون لوٹی؟“

”مائی ہاس۔“

”آئی سی۔۔۔ کوئی کتاب پسند ہے تو لے لو“ پیٹر نے خوش دلی سے اسے آفر کی۔



نیسی کو دیکھ کر شہلا سوچ میں پڑ گئی۔ پیٹر کیا پیچیدہ انسان ہے۔ یا تو وہ بہت بے وقوف تھا یا بہت ہوشیار۔ ایسی محبت سے اس سے پیش آ رہا تھا، کہیں سے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ اس کی ایکس واکف تھی۔ اگر ایسی محبت اور عزت وہ ان کو اپنی میریل لائف میں دیتا تھا تو پھر دونوں نے اسے کیوں چھوڑا یا اس نے کیوں چھوڑا؟ کیا یہ یہاں کے لوگوں کا الیہ تھا؟ یا پھر یہی زندگی تھی۔ اگر یہی زندگی تھی تو پھر بہت عرصہ تھی۔ وہ نیسی کی طرف دیکھ کر سوچتی رہی۔ نیسی نے ایک کتاب پسند کی تھی اور پیٹر نے خواہ سے اچھی طرح پیک کر کے دی تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔

”شہلا کیا سوچ رہی ہو؟“ پیٹر نے اسے سوچوں میں گم دیکھ کر پوچھا۔

”کچھ نہیں۔۔۔ کچھ نہیں۔“

”اگر تم میرے بارے میں سوچ رہی ہو تو پوچھ لو۔“

”ہاں، میں سوچ رہی ہوں کہ تم سوسن اور نیسی سے اتنی محبت سے ملے ہو تو پھر انہیں کیوں چھوڑا؟“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

”بس اتنی سی بات۔۔۔ سوسن ڈرنک بہت کرتی تھی اور اکثر ٹائٹس گھر کے باہر ہی رہتی تھی۔ میں نے ایک دفعہ غصے سے ڈانٹا تو مجھے چھوڑ کر چلی گئی اور نیسی جان کے ساتھ بہت فریج تھی۔ میری غیر موجودگی میں جان اکثر میرے بیڈ روم میں ہوتا۔ نیسی کو میں نے سمجھا چاہا تو کہنے لگی تھیں چھوڑ سکتی ہوں جان کو نہیں۔۔۔ اور پھر ایک دن بغیر تائے وہ نہ جانے جان کے ساتھ کہاں چلی گئی۔۔۔ آج تین سال بعد ملی ہے۔“

”تو کیا تم ان سے محبت نہیں کرتے تھے کہ وہ اتنی آسانی سے تمہیں چھوڑ کر چلی گئیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”آئی ڈونٹ نو کہ تم محبت کس کو کہتے ہو؟۔۔۔ روٹس کو یا سیکس کو یا پھر کسی اور شے کو۔ اس معاملے میں تم مشرقی عورتیں بہت کھیڑ ہوتی ہو۔ تم لوگوں کے ساتھ مردوں کا رویہ انتہائی ناروا ہوتا ہے مگر تم لوگ پھر بھی نہیں بولتے اور ساری زندگی یونی گزاردیتے ہو۔ کبھی فیملی کی خاطر، کبھی بچوں اور کبھی اپنے والدین کی خاطر۔۔۔ میری مدد بھی یہی ملتی تھی۔“ وہ خاموش ہو گیا اور اسے یوں لگا جیسے پیٹر نے اس کے منہ پر ٹانچہ مارا ہو۔ اس نے تو کسی کا لحاظ کیے بغیر، کسی سے محبت کیے بغیر دونوں کو چھوڑ دیا۔ فیملی کو بھی، بچوں کو بھی اور سید صاحب کو بھی۔ وہ ایسٹرن دسکن کی کشتی گسٹری سے باہر ہو گئی تھی مگر اب ویسٹرن سوسائٹی کا حصہ بننے سے بچھا رہی تھی۔

”کیا بات ہے ٹھیل! تم کن سوچوں میں ڈوب جاتی ہو؟“ پیٹر نے اسے مشکورہ کچہ کر پوچھا۔

”ہاں، سوچ رہی ہوں کہ کبھی تم ان کی طرح مجھے بھی تو تنہا نہیں چھوڑ دو گے؟“

”ہیں..... اتنی سی بات..... ڈیڑہ، اگر تم آج جانا چاہتی ہو تو جا سکتی ہو، میں کچھ بھی نہیں کہوں گا۔ میں تمہیں کیوں روکوں گا، یو آر فری.....؟“ اس نے صاف گوئی سے کہا تو وہ پکٹی پکٹی لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے قطعی توقع نہ تھی کہ وہ اسے یوں جواب دے گا۔ اتنی

زبردست لگی۔ اس کی تو ذرہ بھر بھی اہمیت نہ تھی۔ جیسے اچانک دودھ میں گرے ہال کو کوئی باہر نکال پیسکے۔ ایسے ہی پیٹر اسے ٹریٹ کر رہا تھا۔ کیا ہر عورت، مرد کی زندگی میں صرف اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے؟ اتنی ہی شامی، جسے اتنا مضبوط رشتہ سمجھتی ہے، جس کے لیے اپنی ہستی واؤ پر لگانے کو تیار ہو جاتی ہے۔ مرد کے نزدیک تو کچھ بھی نہیں۔ کیا ہر عورت ایسی تردید برداشت کر سکتی ہے یا مہر وہی..... منصور..... پیٹر..... حیدر..... سید صاحب.....

ان میں سے کسی ایک کے لیے بھی تو وہ اہم نہ تھی۔ ہر کسی نے اسے اتنی آسانی سے نکال دیا تھا اور اب جس کے لیے اس نے اپنی اولاد چھوڑی تھی، وہ سب سے زیادہ مشکورہ لگا تھا۔ خدا ایسی وحکار کسی کے مقدر میں نہ لکھے۔ پہلے دن ہی وہ کسی کی گود سے نکالی گئی تھی پھر کسی کے در سے..... دل سے اور اب تو کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ کبھی وجہ جانے بغیر تو کبھی وجہ بتائے بغیر۔

”ٹھیل! تم میری بات سن کر سوچ میں کیوں گم ہو گئیں؟ ہر شخص اپنی ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا ہارٹ ہے، باڈی ہے، مائنڈ ہے۔ جو چاہے وہ کرے۔ میں سوشل لیڈریز کا قائل نہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ خاموشی سے بیک اٹھا کر باہر نکل آئی۔

شرقی و مغرب کا یہ عجیب تضاد تھا۔ مشرقی مرد عورت پر چلاتا ہے، مگر سے قدم مت نکالنا اور نہ تمہارے نکلے نکلے کر دوں گا اور مغربی مرد کہتا ہے..... جاؤ تم ابھی جاؤ۔ تم آزاد ہو۔ جب مرد نکلتا ہے تو مشرقی عورت کہتی ہے خدا کے لیے مجھے مگر سے مت نکالو۔ میں تمہاری داسی ہوں، جہنم جہنم سے تمہاری باندی۔ میں تو مہر کر کے نکلی تھی کہ تمہارے گھر سے میرا جنازہ نکلے گا۔ تم نکال دو گے تو میں کہاں جاؤں گی؟ مغربی مرد جب مغربی عورت کو روکنا چاہتا ہے تو وہ کہتی ہے، مجھے مت روکنا، میں جا رہی ہوں۔ میں اپنے قول و فعل میں آزاد ہوں۔ اتنا گہرا تضاد.....! وہ کیا

چاہتی تھی، وہ تو مغربی عورت کی طرح اپنا سب کچھ چھوڑ چھا کر آئی تھی اور اب مشرقی عورت کی طرح امداد سے شدید آرزو تھی کہ پیٹر اس کے دوسروں کو روک کر دے اور کہے کہ میں تو تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گا۔ میں تمہاری ڈھال بنوں گا۔ اس کی ڈیمانڈ یہ تو نہیں تھیں..... نہ مشرقی عورت والی، نہ مغربی عورت والی۔ نہ خواہشوں کے عیش جزم سے چاہیے تھے نہ محبت کے بہتے و حارے میں میرا بھونکنے کی تمنا۔ اس کی تو آرزو

ی اور تھی..... وہ تو صرف اپنے وجود اپنی ذات کی شامی اور شاخت کے سطر میں سرگرداں تھی۔ اس کا تعلق نہ مشرق سے تھا نہ مغرب سے۔ وہ تو انسانوں کے جہنم میں اپنا وجود اور شاخت ڈھونڈنے آئی تھی۔ شاید اب یہاں بھی کچھ ممکن نہیں تھا۔ اس نے سر آہ بھری اور پارٹمنٹ کا دروازہ

کھول کر اندر چلی گئی۔ باہر شدید تندہ تھی۔



موسم سرما کی شدید بارشوں نے ہر طرف طوفان برپا کر رکھا تھا۔ کئی دیہات زیرِ آب آ گئے تھے۔ دیہری لہن بخ منستان راتوں میں بچوں کو شدید خوف محسوس ہوتا۔ منصور اور شزا کو گئے ایک مہینے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ شاید وہ ورلڈ فور پ چلے گئے تھے۔ بس نون ہر روز آتا تھا کہ جلد آ رہے ہیں۔ ہر دن، ہر شام انتظار میں کٹ جاتی۔ بچے بھنگلا سے گئے تھے۔ بوڑھی دادی سر شام ہی سو جاتیں۔ بس اکرم ان کا حال پوچھتا اور خیال رکھتا۔ نوکر کام کر کے چلے جاتے۔ اکرم کی بیٹی رانی کھانا پکا کر چلی جاتی پھر دوسروں کو اڑھ سے باہر نہ نکلتی۔ اکرم کٹھنی کے اوپر والی منزل پر ایک کمرے میں رہتا تھا۔ ایسی ہی ایک بخ بستہ رات کو فلک کو شدید بخار ہو گیا، اسے فضا لگ گئی تھی۔ دادی سو رہی تھیں۔ شفق بار بار اس کے کپڑے بدلتی اور وہ بار بار تے کرتی۔ دو ٹک آ گئی تھی۔

”آفاق! کیا مصیبت ہے..... مجھ سے نہیں یہ سنبھالی جاتی۔“ شفق غصے سے بولی۔

”اچھا، میں اکرم چاچا کو بلا کر لاتا ہوں۔ وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتے ہیں۔“ آفاق جلدی سے انہیں بلالایا۔

”کیا بات ہے چھوٹی بی بی! کیا ہوا فلک بی بی کو؟“ اکرم فلک کو پکارتے ہوئے بولا۔

”چاچا! اسے بہت بخار ہے۔ کپڑے خراب کر رہی ہے۔“ وہ روہائی ہو کر بولی۔

”اچھا، میں ڈرائیو کو بلاتا ہوں۔ آپ میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلو۔ فلک بی بی کو میں اٹھالیتا ہوں۔“

اکرم گاڑی میں آگے بیٹھ گیا۔ رات گہری ہو رہی تھی۔ بارش تھوڑی دیر کے لیے تھمی تھی مگر باہر شدید فضا تھی۔ کہیں اکا دکا کھٹک کھٹکے تھے۔

اکرم اسے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے اسے دو تین انجکشن لگائے اور دوائیں بھی دیں۔ جیسے ہی وہ گھر لوٹے تو لائٹ چلی گئی۔ فلک نیند میں بھی بار بار ڈر رہی تھی۔ اکرم اسے پیڑ پر لٹا کر جانے لگا تو شفق نے اسے روک لیا۔

”اکرم چاچا! آپ مت جاؤ۔ باہر بہت اندھیرا ہے اور میں ڈر لگ رہا ہے۔“ شفق نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

”اچھا بی بی! میں ادھر ہی رک جاتا ہوں۔“ وہ نیچے کارپٹ پر لیٹ گیا۔ ایک دم زور سے کھلی کڑی تو شفق فلک کو اٹھا کر اکرم کے ساتھ لپٹ

گئی۔ آفاق دادی کے ساتھ سو رہا تھا۔ صبح آکھ کھلی تو اکرم کے ایک طرف شفق تھی اور دوسری طرف فلک۔ اور وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ شفق کی آنکھوں سے

شدید احساسِ محرومی اور ایک عجیب سے خوف، دکھ سے آنسو نکلنے لگے۔ اگر آج ماما، پاپا ہوتے تو کیا اکرم یہیں ہوتا؟ اور دوسرے ہی لمحے اسے ماں

باپ سے شدید نفرت محسوس ہونے لگی۔ کیا ماما، پاپا ایسے ہوتے ہیں۔ فلک بیمار ہے اور ہم کتنے اکیلے ہیں..... اور وہ دونوں ہمیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔

اسے ان سے شدید نفرت محسوس ہونے لگی۔ وہ آہستہ سے فلک کو اٹھا کر پیڑ پر لے آئی۔ اسے اندھیری اندر کوئی چیز بہت بری لگ رہی تھی۔

”اکرم چاچا! اب آپ جاؤ۔“ وہ قدرے بے درخی سے بولی۔

”اور، میں ادھر ہی سو گیا..... اب فلک بی بی کسی ہے؟ اسے دوائیں دیں، لٹھیک ہو جائے گی۔“ وہ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔

وہ اسے بار بار دوائیں دیتی رہی مگر اس کا بخار کسی طرح کم نہیں ہو رہا تھا۔ سارا دن اسی طرح گزر گیا۔ رات پھر گہری ہونے لگی تھی اور

فلک کو بخار پہلے سے بھی زیادہ شدید ہو گیا تھا۔ وہ اور آفاق اس کے پاس بیٹھے تھے۔ دادی کی بھی طبیعت خراب تھی۔ وہ بھی دوائیں کھا کر لیٹیں تھیں۔

”شفق! اکرم چاچا کو بلا لاؤں؟“ آفاق نے رائے دی۔

”نہیں، کوئی ضرورت نہیں۔“ اس کورات کا اکرم پر بہت غصہ تھا۔

”لیکن فلک اب آنکھیں بھی نہیں کھول رہی۔“ آفاق پریشان ہو کر بولا۔

”تو اکرم چاچا کیا کر لے گا؟“ اس کے اندر نہ جانے کیا چیز ٹھک رہی تھی کہ اب وہ اکرم کے نام سے ہی غرت کرنے لگی تھی اور اس کو قلعی نہیں بلاتا چاہتی تھی۔

”تو پھر کیا کریں؟“ آفاق پریشانی سے بولا۔

”میں پھر سیرپ دیتی ہوں۔“ اس نے اٹھ کر دہروٹی اسے سیرپ کی آدمی شیشی چلا دی۔

”شفق! اتنا زیادہ سیرپ بلا دیا۔“ آفاق نے حیرت سے پوچھا۔

”تو اور کیا کروں..... اسی لیے زیادہ بلایا ہے کہ جلد آرام آئے گا۔“ اس کی حالت آہستہ آہستہ بگڑ رہی تھی۔ کبھی وہ آنکھیں بند کرتی، کبھی

کھولتی ایک دم وہ خاموش ہو جاتی۔ اس کی آنکھیں بند ہو جاتی تھیں۔

”شکر ہے سیرپ سے اسے نیند تو آ گئی۔“ شفق نے کبل اس کے گرد ابھی طرح لپیٹ دیا۔ آفاق بھی اوجھٹنے لگا۔ وہ بھی سارے دن کی

تھکی تھی۔ وہ بھی فلک کے ساتھ لگ کر سو گئی۔

صبح دادی کی آنکھ کھلی تو وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان کے کمرے میں آئیں۔ تینوں بچے سو رہے تھے۔ دادی نے فلک کے جسم پر ہاتھ رکھا

تو چونک گئیں۔ دوسرا کڑا پڑا تھا۔ انھوں نے سانسیں چیک کیں تو وہ بھی نہیں آ رہی تھیں۔ انھوں نے گھبرا کر شفق اور آفاق کو بھینچنا شروع کر دیا۔

”اٹھو..... دیکھو یہ مر گئی ہے۔“ دادی زور زور سے چیختی گئیں۔

”کون.....؟“ شفق ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

”ادھر دیکھو.....“ دادی نے فلک کو بھینچنا شروع کر دیا تو گہری نیند سو رہی تھی۔

”میں نے جنھیں کہا تھا کہ اکرم چاچا کو بلا لاتا ہوں۔ تم ہی نہیں مائیں اور اب فلک مر گئی ہے۔“ آفاق زور زور سے رونے لگا۔ دادی بھی

رورہی تھی اکرم ان کی آواز میں سن کر بچے بھاگتا ہوا آیا۔

”اکرم چاچا! پلیز باپا کو بلاؤ..... پلیز جلدی کرو۔“ شفق روتے ہوئے بولی۔

”ہاں..... ہاں، مجھے ان کا غبر دو۔“ اکرم جلدی سے بولا۔

”اکرم چاچا..... ماما کو بھی فون کرو۔“ آفاق آہستہ سے بولا۔

اکرم باہر نکل گیا منصور کے چتے کو لیکٹ نمبر دے گا۔ ماما نے کوشش کی۔ مگر رابطہ ہو سکا۔ شہلا کا تو کوئی نمبر ہی نہ تھا جس پر وہ رابطہ کرتا۔

کچھ لمحے آ رہا تھا۔ بچے بتائی سے ماما باپا کو بلا رہے تھے۔ ہر آہٹ پر باہر دوڑ کر جاتے۔ اکرم شدید شش و پنج میں مبتلا تھا۔ کیا کرے کسے بلائے؟

سید صاحب فجر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تو خاندانی روایات کے مطابق حیدر سب سے پہلے ان کو سلام کرنے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ "حیدر! بہت دن ہوئے منصور اور شہلا کی کوئی خبر نہیں آئی۔ سب خبریت تو ہے نا۔ ان لوگوں کی طرف سے میں بہت پریشان رہتا ہوں۔" سید صاحب نے مشکرا کر انداز میں پوچھا۔ حیدر صبح سویرے کوئی ایسی بات بتا کر ان کو پریشان نہیں کرنا چاہ رہا تھا مگر اب خود سید صاحب پوچھ رہے تھے تو اسے بتانا ہی پڑا۔

"تایا ابا! منصور نے کسی ماڈل سے شادی کر لی ہے اور اب اپنی بیوی کے ساتھ ہے۔"

"بد بخت.....؟" سید صاحب ایک دم غصے سے بولے۔ ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا "اور شہلا کہاں ہے؟"

"وہ انگلینڈ میں ہے۔"

"کیا بچہ بھی اس کے پاس ہیں؟"

"نہیں..... وہ اکیلی....."

"وہ اکیلی کس کے پاس ہے؟"

"اس نے منصور سے طلاق لے لی ہے اور اب.....؟" حیدر خاموش ہو گیا۔

"اب کیا.....؟" وہ بچے گئے۔

"اس نے کسی انگریز سے شادی کر لی ہے۔"

"کیا.....؟" سید صاحب حلال میں آگئے۔ جہاں کھڑے تھے، وہیں بیٹھ گئے۔ ان کا جسم غصے سے کانپ رہا تھا اور وہ سرخ بلبل کی طرح

ترپ رہے تھے۔ حیدر اندازہ کر رہا تھا کہ وہ کس قدر اذیت میں تھے۔

"بد بخت..... نامراد..... بد ذات....." وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہے تھے۔

"تایا ابا! آپ بیٹھ جائیں..... آپ کا پی پی ہائی ہو رہا ہے۔"

"حیدر! گاڑی نکالو، آج رات میں نے خواب میں اسکے بچوں کو بہت اذیت میں دیکھا ہے۔ نہ جانے کس حال میں ہوں گے۔ میں ان

کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ خدا خیر کرے۔" وہ پریشانی کے عالم میں کمرے کا چکر لگا رہے تھے۔

حیدر گاڑی نکالنے کی راج کی طرف جا رہا تھا کہ فون بج اٹھا۔

"کون..... کب..... کیسے..... اوہ! اہم! ابھی پہنچ رہے ہیں۔" اس نے فون بند کر دیا۔ سارا راستہ وہ خاموش رہا۔ سید صاحب اس کے

ساتھ بیٹھے بار بار پہلو بدلتے رہے تھے۔

"حیدر! کیا بات ہے..... تم کچھ پریشان لگ رہے ہو..... جرنل گاڑی چلاتے ہوئے تم ضرور کوئی نہ کوئی بات کرتے ہو، آج خاموش کیوں ہو؟"

"تایا ابا! آپ نے رات کو جو خواب دیکھا تھا، وہ پورا ہو گیا ہے۔"

”کیا مطلب.....؟“ وہ ایک دم چمکے۔

”اکرم کا فون آیا تھا۔ منصور کی چھوٹی بیٹی فلک رات کو فوت ہو گئی ہے۔“

”کیا..... آف میرے خدایا.....! یہ لوگ کتنے عالم ہیں!“ انھوں نے سر پیٹ کے ساتھ لگا دیا۔ حیدر کی آنکھوں میں بھی آنسو تیر رہے تھے۔

”حیدر اتم ہمیں گنہگار نہ سمجھنا۔ ہم مجبور تھے..... ہم جانتے ہیں تم بھی اپنی ذمہ داری سے خوش نہیں ہو۔ تمہاری بیوی تمہیں کچھ اہمیت نہیں

دیتی۔ اس کی دولت نے اس کا دماغ خراب کر رکھا ہے۔ تم خوش ہو اور نہ ہی شہلا۔ نہ جانے اس نے کیوں اس انگریز سے شادی کر لی۔ درندہ دلی

زندگی۔ وہ ہمارا خون نہیں..... مگر پھر بھی ایک رشتہ تو رہا ہے..... اور میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ اچھی بیٹی تھی، معلوم نہیں قدرت بھی کیسے کیسے

آزماتی ہے۔ تم اور شہلا، مجھے قطعی اس رشتے پر اعتراض نہ تھا۔ اگر تم سادات میں سے نہ ہوتے، ہمیں اپنی جانوں سے زیادہ اپنے آپا کی ناموس کی

پردا ہے۔ میرا دل اندر ہی اندر کٹنا رہتا ہے۔“

”ٹالیا! آپ پریشان نہ ہو کریں۔ میں نے اس جذبے کو اپنے اندر سے ختم کر دیا ہے۔ زندگی کے دن پورے ہی تو کرنے ہیں۔“ حیدر

کے لہجے میں ہلاکی ٹکٹکی اور دکھ تھا۔

”خدا تمہیں اس کا اجر دے.....“ سید صاحب نے رقت بھرے لہجے میں اپنا لہرزاں ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا۔

میت لان میں تھی اور گھر کے چند ملازموں کے سوا وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ داوی اس کے سر ہانے ٹٹھی آہیں بھر رہی تھیں۔ شفق اور آفاق

سبے سبے ادھر ادھر بھر رہے تھے۔ جیسے ہی گاڑی پودج میں داخل ہوئی، حیدر اور سید صاحب باہر نکلے تو بچے چیختے ہوئے ان کے ساتھ چمٹ گئے۔ وہ

اس شدت سے رو رہے تھے کہ دو دو پلار کانپ رہے تھے۔ سید صاحب اور حیدر ان کو گود میں اٹھا کر دلا سادے رہے تھے۔ سید صاحب اور حیدر نے

اس کی تفریق نہ کی تھی۔ ہست کیا اور ان کا جگر گوشہ لہر میں اتار آئے جو دنیا میں اپنے اپنے وجود کے احساس اور محرم میں جھلا تھے۔

”حیدر! ہم بچوں کو ساتھ گاؤں لے جاتے ہیں.....“ سید صاحب نے رائے دی۔

”جہیں ناٹا!..... بھرادی لٹاں گھر میں اکیلی ہوں گی۔ وہ کس کے پاس رہیں گی؟ اگر وہ بھی مر گئیں تو.....“ شفق نے ایک دم کہا تو سید

صاحب چمک گئے۔

”ٹھیک ہے..... پھر میں ہی ادھر دو تین دن تک رک جاتا ہوں..... منصور کو خود اطلاع دو کہ وہ جلدی پہنچے۔ اب میں بچوں کو یوں تمہا چھوڑ

کر نہیں جاسکتا۔“

”ٹھیک ہے ٹالیا! میں شام کو چکر لگا لیا کروں گا۔“

”ٹھیک ہے..... اور بچوں کو بھی اطلاع دینا۔ بچوں کو ان کی ہمدردی کی بھی ضرورت ہے..... اور ہو سکے تو طاہرہ کو بھی لے آنا۔“

”جی اچھا.....؟“ وہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

”شہلا! اتم کہاں ہو؟ کس کا بدلہ کس سے لیا تم تو بہت چمکی تھی۔ پھر جموٹ کو کیسے قبول کیا۔ تم سید خاندان کی ساری روایات بھول گئیں۔ تم

نے پاکیزہ محبت کے منہ پر طمانچہ مارا ہے۔ غلام اور پاکیزگی کے مقابلے میں غلامت اور گندگی کو قبول کیا۔ تم تو کہتی تھیں، حیدر اس نے زندگی میں صرف تم سے محبت کی ہے۔ نہ اس سے پہلے کسی سے اور نہ اس کے بعد کسی اور سے کرسکوں گی تو پھر تم نے دیا ر غیر میں ایک اجنبی انگریز کو اپنے لیے منتخب کیوں کیا؟ کیا واقعی تم اس کی محبت میں اتنی دیوانی ہو گئی تھیں کہ اپنے بچوں کو بھی چھوڑ دیا۔ بچے تو تمہارے اپنے تھے۔ تم نے اپنے آپ کو اس حد تک گمراہ کر دیا کہ تم اتنی سنگ دل کیسے ہو سکتی ہو۔ تم نے حیدر کی ذات کی بھی نفی کر دی اور اپنی ذات کا بھی بھرم کھو دیا۔ تم نے بیٹی کو بھی مار دیا۔ اتنے سال خاموشی سے اذیتیں سہتے سہتے تم نے ہلا خرابیاں فعلہ کیوں کیا؟ کاش..... تم مجھے بھی ملو تو ضرور تم سے پوچھوں کہ تمہاری ساری وقائیں کیوں ایک دم بدل گئیں؟ محبت کرنے والے تو فنا ہو جاتے ہیں مگر یوں جتنا تو نہیں کرتے۔ مجھے تو اب کسی پر اعتبار نہیں رہا۔ میں تو آنکھیں بند کر کے قصص یاد کرتا تھا کہ ظاہر نہ سہی، تم تو مجھ سے سچی محبت کرتی ہو۔ تم نے میری روح کو اپنے حصار میں قید کر رکھا تھا۔ میں تو اب بھی تمہارے بحر میں جھلا ہوں۔ ظاہرہ کے لیے تو صرف جسم ہوں اور تمہارے لیے روح..... میرا دل دماغ تو صرف تمہارا تھا۔ میری سوچوں پر تم حاوی تھی۔ تم نے مجھ سے بھی سب کچھ چھین لیا اور بچوں سے بھی۔ آج تمہارے بچے کیسے بلک رہے تھے..... تم بہت سنگ دل ہو۔ تمہارے وجود کے حصے تو یہاں ہیں اور تم کہاں سرگرداں ہو؟ تم اسکی نہیں ہو سکتی..... میں کیسے تمہارے کٹھن پر یقین کر لوں.....؟“

حیدر اپنے غفل میں اس سے بائیں کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ ڈرائیونگ بھی کر رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس کے ساتھ بیٹھی ہو اور وہ اس سے باتیں کر رہا ہو مگر وہ مکمل خاموشی سے سب کچھ سن رہی ہو۔



ڈاٹ کام

”منصور! آج تو بہت انجوائے کیا ہے۔“ شہزادہ منصور نیا گرافال پر سارا دن انجوائے کر کے لوٹے تھے۔

”ہاں، واقعی۔۔۔ قدرتی مناظر بہت لطف دیتے ہیں۔“

”منصور! اب گھر کب چلیں گے؟“

”کیوں۔۔۔ تمہارا دل بھر گیا ہے؟ اتنی خراب صورت اور حسین چمکوں پر گھونسنے کے باوجود بھی تمہیں گھر کی یاد آ رہی ہے؟“ منصور نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں، گھر تو گھری ہوتا ہے نا۔ اب تو میں اتنا محو چکی ہوں کہ اب کچھ آرام کرنا چاہتی ہوں اور اب میں اپنا گھریٹ کرنا چاہتی ہوں۔“

”اگر تم اتنی اداس ہو رہی ہو تو کل ہی چلے چلتے ہیں۔“

”کل نہیں۔۔۔ چند دنوں تک۔“

”کافی دن ہو گئے ہیں۔ بچوں سے بات نہیں ہوئی۔ ظہیر، ذرا فون کرتا ہوں۔“ ذہن بھڑانے لگا۔ مسلسل بیلز ہو رہی تھیں مگر کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ بہت دیر بعد اکرم نے فون اٹھایا۔

”ہاں اکرم! خیریت تو ہے نا۔۔۔ بچے کہاں ہیں؟ کیا سید صاحب ادھر۔۔۔ نہیں۔۔۔ کیوں۔۔۔ مائی گاڈ!۔۔۔ میں پہنچ رہا ہوں۔“ اس نے اکرم سے بات کر کے فون بند کیا تو آلسو اس کی آنکھوں میں تیر رہے تھے۔

”منصور! خیریت تو ہے نا، آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں؟ پلیز۔۔۔ بتائیں، کیا ہوا۔۔۔ پولیس؟“ شہزادہ مسلسل پوچھ رہی تھی مگر وہ روتا جا رہا تھا۔

”فک۔۔۔ فک مر گئی۔“

”اوہ۔۔۔ گاڈ! کب۔۔۔ کیسے۔۔۔؟“

”میری بچی قبر میں سو رہی ہے اور میں یہاں نیا گرافال۔۔۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گیا۔

”میں ابھی ہینک لگے کرتی ہوں۔ آپ شیٹیں کفرم کروائیں۔ ہم جلدی ٹکسے کی کوشش کرتے ہیں۔“ شہزادے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی، وہ نمبر لانے لگا۔

”منصور! کیا آپ شہلا کو نہیں بتائیں گے، وہ بھی تو ماں ہے۔“

”نہیں، رہنے دو۔۔۔ اس مردود کو۔۔۔ سیاسی ذلیل عورت کی کارستانی ہے۔ میری بچی اسی کی وجہ سے مر گئی۔“ اس کے لہجے میں نفرت ہی نفرت تھی۔ غم اور غصہ بھی۔

”مٹھل! میں بہت دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تم کچھ اور اس ہو، کیا بات ہے؟“ پیٹر نے اسے گم سم دیکھ کر پوچھا۔

”پیٹر اچھے تم سے ایک بات کرنی ہے۔ اگر ہمارا کوئی بے بی ہو جائے۔۔۔۔۔ اس نے اڑتے اڑتے پوچھا۔

”اود۔۔۔۔۔ نو۔۔۔۔۔ نیو یار۔۔۔۔۔ آئی ڈونٹ دانت بیک ہاسٹرا۔۔۔۔۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔ جو انسان کی سروائیول کا باعث بنے تم اس سے اکتائے ہوئے ہو؟“

”مجھے کوئی سروائیول نہیں چاہیے۔ جو انسان کی پرسنل لائف کو اسپائل کر کے رکھ دیں وہ کیا سروائیول کا باعث نہیں گئے؟ بچے تو دیکھن کو

ہیپ کرتے ہیں کہ وہ مین کو ایکسپلیمٹ کرے۔ ایسوی ایل ایڈ فائلٹی۔۔۔۔۔ آئی ہیٹ کنڈز۔۔۔۔۔ وہ اس کی بات سن کر بھڑک اٹھا۔

”تو کیا ساری عمر بچی۔۔۔۔۔؟“

”کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔۔۔ ویسے بھی تو بچے چھوڑ جاتے ہیں نا۔ کون سا آخری عمر میں ساتھ دیتے ہیں۔ میرے قاور نے گریڈ قاور کو چھوڑ دیا

اور وہ اولڈ نرسنگ ہوم میں کب مرا۔۔۔۔۔ کسے معلوم؟ اور میں نے اپنے قاور کو چند سال کی عمر میں چھوڑ دیا تو میرا بے بی تو مجھے دس سال کی عمر میں ہی

چھوڑ دے گا تو کیا فائدہ۔۔۔۔۔“

”تو پھر یہ شادی۔۔۔۔۔ یہ نہ ہی پابندی کیوں۔۔۔۔۔؟“

”شادی کا بچوں سے کیا تعلق۔۔۔۔۔؟“

”پیٹر۔۔۔۔۔ میں تمہاری بات سمجھنے سے قاصر ہوں۔۔۔۔۔ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ ہمارے ہاں شادی تو بچوں کے لیے ہی کی جاتی ہے کیونکہ

انہیں ہی تو انسان کی ایوولوشن اور سروائیول کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور تم اس حقیقت سے انکار کر رہے ہو۔“

”اسی لیے تم لوگ خوار ہوتے ہو۔ تم لوگوں کے گھر مرئی کے ڈربے ہوتے ہیں جو بچوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ تم لوگ اپنی ساری

زندگیاں ان کے لیے برباد کر دیتے ہو اور پھر اسی طرح مر جاتے ہو۔ تم تو ان کی زندگیوں کو مزار بنے ہو تمہاری اپنی زندگیوں کہاں گئیں۔۔۔۔۔ آئی سیٹ

بچ ڈیم لائف!“

”پیٹر! آئی ایم کوئی بچہ تو ہو یور بے بی۔۔۔۔۔! وہ آہستہ سے بولی۔

”وہاٹ! ان سنس۔۔۔۔۔ جسٹہ کل ہم۔۔۔۔۔ کل ہم۔۔۔۔۔ کل ہم۔۔۔۔۔“

”جی ہاں، یہ کبھی نہیں ہو سکا۔ میں خواہ اپنے ہاتھوں سے کیسا سے ماروں؟ نیو یار۔۔۔۔۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”مٹھل! اگر تمہیں کنڈز دینے پسند ہیں تو پھر اپنے بچوں کو کیوں چھوڑا؟ تم ان کے لیے اپنے ہسپتال کے پاس رہ سکتی تھیں۔“ پیٹر کی بات

نے اس کی روح پر چا بک مارا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے اس کے منہ پر طمانچہ مارا ہو۔

تو کیا سب مرد ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ اپنے آپ کو بچانے کے لیے دوسرے کی عزت کو کتنی آسانی سے داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ وہ ہمیشہ

اس کو انڈی ڈیجیٹل بیک کہہ کر اسے اس کے رائٹس کے بارے میں یقین دلانا رہتا تھا۔ اب ایسے ہی ایک انڈی ڈیجیٹل کو مارنے کے درپے تھا۔ اب

تو اس کی ٹون ہی بدل گئی تھی۔

”تو پھر یہ یلغین شپ۔۔۔۔۔؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”اُس میگزین آف ایمریٹل اینڈ سکاٹل انجوائے منٹ۔“ وہ قدرے ڈھٹائی سے بولا۔

”پتھر اس کے علاوہ عورت کی مرد کے لیے کوئی اہمیت نہیں۔۔۔۔۔؟“

”جیہیں۔۔۔۔۔ اور ہونی بھی نہیں چاہیے۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ عورت اور کیا ہو سکتی ہے؟“

”اور وہ جو ٹھنڈس۔۔۔۔۔ احترام، عقیدت، محبت۔۔۔۔۔ در میری کے نام کرتے ہو، وہ سب کیا ہے؟“ اس کی آواز کچکپانے لگی۔

”They're just rituals“ وہ بے باکی سے بولا۔

”بس۔۔۔۔۔ اور کوئی رشتہ نہیں؟“ شہلا نے حیرت سے پوچھا۔

”بالکل نہیں۔“

”پتھر اتم اسے غلط سمجھتا ہے، جو تم ظہر آتے ہو؟“

”ٹھیک! میں نے تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ اگر تم اس وقت بھی گڈزی باتیں کرتی تب بھی میں یہی کہتا۔ میں تو اب بھی یہی کہہ رہا

ہوں۔ اے ویمن از لائیک اے مین۔ تمھیں لیس، تمھیں مور۔ اس کو بھی مرد کی طرح چھینے کا حق ہے۔ نہ عمر رہے، نہ انجائے کرے، نہ گھرے پھرے۔ وہ

آزاد ہے اور اگر وہ یہ چاہتی ہے کہ مرد اس کی پوجا کرے تو یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ آدی کیوں ایسا کرے؟ اس میں کوئی ایسی خاص بات نہیں۔ اگر مرد اپنی

ضرورت پوری کرتا ہے تو وہ بھی تو اپنی Desireا پوری کر رہی ہوتی ہے تو پھر ایسی کیا خاص بات ہے؟ آدی اس کو کیوں سر پر بٹھائے۔ ٹھیک! میں

بے بی کو اون نہیں کر سکتا، اب میں جا رہا ہوں۔ بہتر ہے تم جلد کوئی فیصلہ کر لو۔۔۔۔۔“ وہ قلعیت سے بولا۔

وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اسے اس کی قلعیت سے خوف سا آ گیا تھا۔ پتھر کو تو وہ بہت نازک احساسات کا مالک سمجھتی تھی۔ وہ بھی ایسا ہی نکلا تھا

جیسا مشرقی مرد۔ جو کہتا ہے، اب تمھارے بیٹی نہیں ہونی چاہیے۔ اگر ہوئی تو اس کا بدلہ تم سے لیا جائے گا یا تو تمھیں گھر سے نکال دیا جائے گا یا پھر

اسے ختم کر دیا جائے گا۔ اور مغربی مرد کہہ رہا ہے اسے نہ بیٹا چاہیے اور نہ بیٹی۔ اس نے تو عورت کی حیثیت بالکل ہی منفر کر دی ہے۔ وہاں نئی روایتی

لباوے میں ہوتی ہے اور یہاں نئے کلچر اور نئی ڈیماٹرز کے مطابق۔ لہاؤ کچھ تو اندر سے دونوں ایک سے ہیں، مشرقی و مغربی، شمالی و جنوبی۔ سب۔۔۔۔۔

گارے کے بت ہیں۔ اندر بھی تو خام ہی ہوں گے۔

اولاد آدم بھی کبھی بدل سکتی ہے۔ چاہے مرد ہو یا عورت۔ نہ مرثیت نہ تقاضے، نہ روایات نہ اصول، نہ بندشیں، نہ رسم و رواج۔ تو وہ کس کو

بدلنے لگی تھی۔ اس نے کیسے مان لیا تھا کہ وہ اپنے وجود کی نئی شناخت حاصل کر پائے گی۔ اس نے جو کچھ کھو جا تھا وہ کچھ نیا تو نہ تھا۔ جو کچھ ماضی میں

حاصل کیا تھا اس پر تو اب مہر ثبت ہو گئی تھی۔ جتنا جتنا انسان حقیقت کو کھونچنے لگا ہے، اتنا اتنا بے بس ہوتا جاتا ہے۔ ٹھیک! لیکن اس کو اپنے حصار میں

مضبوطی سے جکڑنے لگتی ہیں۔ کیا فرق تھا نہ ہم پھر کے انسانوں میں اور آج کے انسانوں میں، جن کے اندر آج بھی اسٹون اتچ کے انسانوں جیسے

سخت دل ہیں یا پھر آکس ایج کے انسانوں میں۔ کیا آج کے لوگ وحشی درندے نہیں۔ فرق تو کہیں بھی نہیں۔ تو پھر یہ کیسی کمون تھی، کیسی شہادت تھی۔ وہ کس کو تلاش کرنے لگی تھی۔

اپنے وجود کو، اس کی نسبت کو..... اب سب کچھ گنڈھ ہو رہا تھا۔ وہ تو اس دکھ کو مٹانے لگی تھی جو اس کو اندر ہی اندر کاٹا رہا تھا۔ اس طمانچے کو مٹانے لگی تھی کہ وہ کس کی اولاد تھی۔ وہ تو صرف یہ ایک پلور کرنے لگی تھی کہ وہ ایک ذمہ وجود ہے جسے کسی شہادت کی سہارے کی ضرورت نہیں۔ اسے اپنے ماں باپ پر سخت طعنا رہا تھا۔ نہ جانے وہ کس کے گناہوں کا پھل تھی جو ہر ای نہیں ہو رہا تھا۔ گناہ کا پھل کتنا کڑوا، کیسا اور بدبودار ہوتا ہے، کاش کوئی اس سے پوچھے۔ وہ اندر سے کتنی سزا مند زد تھی۔ کیسی بدبودار..... کوئی اپنا لے کو تیار نہ تھا۔ کاش میں مردہ ہی جنم لیتی اور مجھ میں کوئی شعور بیدار نہ ہوتا۔

”میں کیا کروں؟ میں کیسی وحکاری ہوئی ہوں۔ پوری کائنات سے وحکاری ہوئی۔ مشرق سے بھی اور مغرب سے بھی۔“ اسے شفق، آفاق اور فلک شدت سے یاد آنے لگے۔ نہ جانے کیوں اسے فلک یاد آ رہی تھی۔ وہ رخصت ہوتے ہوئے کتنا تڑپ رہی تھی۔ کتنا دور رہی تھی۔ شفق کتنی ناراض تھی اور آفاق کیسے منہ بسور رہا تھا۔ مگر اس نے بھی سب کو وحکار دیا تھا۔ منصور نے تو بچوں کو اس سے بدظن کر دیا تھا کہ وہ دوسری شادی کرنے جا رہی ہے۔ ان کو کیا معلوم کہ وہ زندگی کے کس عذاب سے گزر رہی تھی۔ وہ تو کچھ اور ہی تلاش کرنے لگی تھی۔ جس کا ملنا اب شاید ناممکن تھا۔ اس نے شدید غصے کا سودا کیا تھا۔ جن کو آج اس نے وحکارا تھا، کل وہ ضرور اسے قدموں تلے روندیں گے۔ اس کے پاس تو اپنا کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ نہ نام تھا وگھر، نہ شوہر، نہ بچے نہ کوئی بچان۔ نہ وہ ماں بن سکی تھی، نہ بیوی اور نہ ہی کسی کی دوست۔ نف ہے ایسی زندگی پر جس میں کسی سے کوئی رشتہ نہ بن سکے۔ کوئی تو اپنا ہوتا چاہیے۔ کوئی ایک تو بھری کائنات میں ہو، کوئی تو تنہائی کے لمحوں میں سرگوشی کر سکے۔ ”پیر، میں تمہارے بچے کو ضرور جنم دوں گی۔ چاہے تم مجھے چھوڑ ہی دو۔“ مستقبل کے لیے کچھ تو ڈپازٹ کر دینا چاہیے۔ اس نے اسے چھوڑنے کا پکارا وہ کر لیا تھا۔ پیر نے کچھ بھی نہیں کہا بلکہ بہت سکون سے اسے طلاق دے دی۔ ایک دفعہ بھی نہیں روکا۔ جیسے یہ اس کے لیے نازل روٹین تھی۔ شادیاں اور طلاقیں۔ تینسی اور سوسن اس کی نظر دے کے سامنے محوم تھیں۔



آدھے گھنٹے سے زیادہ گزر چکا تھا اور وہ چٹاپی سے کالج کے باہر گاڑی کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اس کا منہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اسے بار بار سہیل پر غصا رہا تھا لیکن وہ ایسا بے پروا تو کبھی بھی نہ تھا۔ وہ تو ہمیشہ نام سے پہلے کالج گیٹ پر موجود ہوتا تھا تو پھر آج کیا ہوا تھا؟ وہ ابھی سہیل کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ سہیل نے ایک دم اس کے پاس آ کر بیک لگائی۔ بیک کی تیز آواز نے وہاں موجود سب لوگوں کو چھٹکا دیا۔ سہیل نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور جلدی سے باہر نکل کر گاڑی کا فرنٹ ڈور اس کے لیے کھولا۔ وہ دھڑام سے بیک سمیت بیٹھ گئی۔

”آئی ایم سوری..... ٹریفک جام تھی اور ملک صاحب کو اچانک میٹنگ میں جانا پڑا اس لیے دیر ہو گئی۔“ سہیل نے وضاحت کی۔ وہ منہ پھیلانے بیٹھی رہی اور کار سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

"چلو اب موڈ ٹھیک کرلو۔ کبھی بکھارا یا ہو جاتا ہے۔" وہ پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

"گاڑی میں کتنی اسمبل ہے۔ اے سی کام نہیں کر رہا۔ کتنا جس ہے؟" وہ اسکا کر بولی۔

سمبل نے جلدی سے انٹر فیر شرا سپرے کیا۔ جھسمین کی سوندھی سوندھی خوشبو ہر طرف پھیل گئی۔ شفق کے لبوں پر مسکراہٹ سی پھیل گئی۔ تازگی کا خوبصورت سا احساس اس کے دگ وپے میں سرایت کر گیا۔ اس نے گانگڑ میں سے اسے دیکھا۔ سمبل بھی مسکرا رہا تھا۔ اس نے منہ دوسری طرف کر لیا۔

"انکسپلائٹ کرنا خوب آتا ہے۔" وہ زرب لب مسکراتے ہوئے بولی۔

"اور جو اپنی خوشی سے انکسپلائٹ ہوں تو.....؟" وہ بھی فوراً بولا۔ "شفق انھیں معلوم ہے، آج پی سی میں پارٹی اور کرڈ کی میٹنگ ہے اور تمہارے پاپا پارٹی کے لیڈر منتخب ہو رہے ہیں۔" سمبل پر جوش لہجے میں بولا۔

"ہونہہ..... جو کمر کو نہ سنبھال سکا، وہ ملک کو کیا سنبھالے گا۔" اس کے لہجے میں شدید نفرت تھی۔

"جھسمین تو ہر دوسرے بندے سے بس شکوے، شکایتیں ہی ہیں اور کچھ نہیں۔" سمبل نے کہا تو وہ چرچک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیونکہ یہاں ہر شخص بس دوسرے کو انکسپلائٹ ہی تو کر رہا ہے۔ ہر ایک مفاد پرست اور سلطنت ہے۔ بس اپنی ذات اور انا کی تسکین چاہتا ہے۔ ہر کسی کو بس اپنی ہی خوشیاں عزیز ہیں۔ وہ اپنی خوشیاں چاہتا ہے۔ کسی دوسرے کی کسی کو پروا نہیں۔" وہ غصے میں بولتی لگی۔

"میرا خیال ہے آج واقعی شدید گرمی ہے اور کچھ تمہارے دماغ کو بھی چڑھ گئی ہے۔ گئے کا خطا اس بیوگی؟" سمبل نے جوس کا رنر کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔

"نہیں!" وہ منہ پھلا کر بولی۔

"خدا کے لیے یوں ناراض ہونا چھوڑ دو اور پھر کھانے پینے سے کیسی تازہ ہو گئی۔ ویسے بھی تم اکیلی جان کس کس کو ٹھیک کرو گئی۔ رہنے دو جس حال میں ہے اپنی جان کیوں ہلکان کرتی ہو اب بتاؤ جوس پینا ہے کتنی دیر چلی؟" سمبل نے آہستہ سے گاڑی چلائے ہوئے کہا۔

"لے آؤ....." وہ آہستہ سے بولی۔

"یہ ہوئی ثابت....." وہ دو گلاس جوس کے لے آیا۔ خطا انج جوس پی کر اس کا موڈ قدرے بہتر ہو گیا۔

"کیا کالج میں آج کسی سے لڑائی ہوئی ہے؟" سمبل نے اس کا موڈ بہتر دیکھ کر چھیڑنا چاہا۔

"ہاں..... تم سے....." وہ مسموئی غصے سے بولی۔

"مجھ سے تو تم ہر وقت لڑتی رہتی ہو۔ یہ کوئی نئی بات تو نہیں۔" سمبل نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

گھر قریب آ رہا تھا۔ اس لیے سمبل نے خود بخود گاڑی روکی اور وہ دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ سمبل نے مرزا اس پر بیٹھ کیا۔ بھی ان کا روزانہ کا معمول تھا۔ شفق کو تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا مگر سمبل کو ملک منصور کی ڈانٹ ڈپٹ کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ جب کبھی دوا سے شفق کے ساتھ

ڈرائیونگ کرتے ہوئے دیکھتے تھے۔

”سہیل، کیا شام کو فارغ ہو؟“ اس نے گاڑی سے اترتے ہوئے پوچھا۔

”کیوں؟“

”مجھے کہیں جانا ہے۔“

”نہیں..... بتاؤ تو ہے ملک صاحب کی میٹنگ ہے اور میں وہاں بڑی ہوں۔“

”کل چلیں گے..... اوکے، خدا حافظ!“ وہ کہہ کر مڑی تھی کہ شزا جلدی سے ہارنگلی۔ وہ اس سے ٹکرانے ہی لگی تھی۔ شفق نے مگھڑ کر اسے

دیکھا اور وہ سواری کبھی ہوئی سہیل کی طرف مڑی۔

”سہیل! مجھے بہت جلدی ہے۔ مجھے میرے آفس ڈرائیپ کر دو۔“ وہ جلدی سے جھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”جی جیگم صاحبہ!“ وہ گاڑی ڈرائیونگ کرنے لگا۔

شفق اندر داخل ہوئی تو ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ مکمل ڈسنے والی خاموشی۔ اتنی وسیع و عریض کونجی کے خوبصورت کمروں اور برآمدوں میں ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی اور ایجو ریٹڈ شے رکھی تھی مگر بہت کچھ سب کے لیے بے معنی تھا۔ سب اپنے آپ کو ایک بے جان شے سے زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔ وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی اور بستر پر لیٹ گئی۔ کب تک سوتی رہی، کب آکھ کھلی، اسے کچھ خبر نہ تھی۔ گھر میں کلن آتا تھا، کون نہیں؟ کسے خبر تھی۔ مگر بتایا سرائے؟ ہر کوئی ایک دوسرے کی ذات سے بے خبر تھا۔ ہر کوئی اپنی اپنی مرضی کا مالک تھا۔ کوئی کسی کے دکھ سکھ اور کسی بھی معاملے میں دخل نہیں دیتا تھا۔ صرف شفق اور آفاق آپس میں ایک دوسرے کی ہلکتو کبھی کبھی شیئر کرتے تھے۔ ملک کی وفات کے بعد دونوں شزا سے شدید نفرت کرنے لگے اور ملک منصور سے تو کوئی بھی ڈھنگ سے بات نہیں کرتا تھا۔ شزا نے شادی کے بعد ڈانٹ چھوڑ کر ایک این جی او جوائن کر رکھی تھی۔ اکثر فارن ڈیپلیمیکشن کے ساتھ مصروف رہتی۔ شزا سے منصور کے دو بچے تھے اور وہ دونوں مری کونٹ پر پرنٹیشن میں پڑھتے تھے۔ اس لیے وہ بچوں کے مجنبت سے مکمل آداوت تھی۔ ملک منصور نے شزا سے جو وعدے، اقرار سوز لیٹڈ میں کیے تھے وہ چند ماہ بعد ہی ہوا ہو گئے۔ ہر چند ماہ بعد نئے اسکینڈل سننے میں آتے۔ کبھی کسی سیکرٹری کے ساتھ۔ کبھی کسی ماڈل اور ایکٹریس کے ساتھ۔ شزا اب ان باتوں کی عادی ہو گئی تھی۔ وہ بھی اسے کچھ نہ کہتی۔ اس نے بھی اپنے لیے ایسی بہت سی مصروفیات ڈھونڈ لی تھیں۔ آفاق کہاں گم رہتا، کسے خبر تھی۔ وہ شزا کو فٹ ناپسند کرتا تھا مگر باپ اس کے لیے ہانگلی تا قابل برداشت تھا۔ ملک منصور کروڑوں کی جائیداد کا مالک، مامور سیاسی شخصیت، اولاد کے معاملے میں ہانگلی جی دست تھا۔

پارٹی میٹنگ میں اسے پارٹی کا صدر منتخب کیا گیا۔ آئندہ انتخابات میں اس کی جیت اور فشری کنفرم تھی۔ اس لیے اس کی خوشی ویدتی تھی۔ دورات کو دیر سے آیا تو یہ خبر سنائی۔ آفاق اٹھ کر اندر چلا آیا۔ شفق نے بھی ادھر ادھر دیکھا شروع کر دیا۔ صرف شزا خوش ہوئی کیونکہ اس کی ذات اور مفاد سب کچھ منصور سے وابستہ تھا۔

”تم اٹھ کر کیوں آ گئے؟“ شفق آفاق کے پیچھے آتے ہوئے بولی۔

”تو اور کیا کرتا..... ان کی منافقت پر خوش ہوتا۔ ہمارا باپ کتنا کمینہ شخص ہے۔ شاید پارٹی ورکرز کو معلوم نہیں۔ کیا ایسا شخص دوسروں کے بارے میں ہمدردی سے سوچ سکتا ہے؟ جسے معلوم ہی نہیں کہ انسانیت کیا ہوتی ہے۔ جس کی اولاد سبک سبک کر مر گئی اور وہ پیش کرتا رہا۔ آئی بیٹ کچھ فادر.....“ دو شخصوں سے کمرے کی چیزوں کو ٹھوکریں مارتا ہوا بولا۔

”اچھا چھوڑو اس بات کو..... تم یہ بتاؤ، تم سارا سارا دن کہاں گھومتے رہتے ہو۔ کل رات کو بھی لیٹ آئے اور آج سارا دن تم گھر نہیں آئے۔“ شفیق نے اس کا موڈ دیکھ کر بات بدلنا چاہی۔

”شفیق یہ گھر مجھے کاشے کو دوڑاتا ہے..... یہ کمرہ، یہ دروازہ، یہ سب کچھ۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں کہیں دور چلا جاؤں اور پھر کبھی واپس نہ آؤں۔ لیکن یہی سوچ کر پھر رک جاتا ہوں کہ اس گھر کے دروازے تو ہماری تنہائیوں کے ساتھی رہے ہیں اور کون تھا اس وقت..... شفیق، تمہیں وہ رات یاد ہے نا، وہ تو بچپن..... چلتا..... چلتا..... میرے کانوں میں ابھی تک سب کچھ گونجتا ہے۔ لک کا رونا..... اور ہمارا بے بسی سے ادھر ادھر دے کے لیے دوڑنا۔ دل چاہتا ہے فوراً کہیں بھاگ جاؤں۔“ وہ آہ بھر کر بولا۔

”مجھے چھوڑ کر..... بالکل تنہا..... کس کے سہارے؟“ شفیق نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”یہی بات تو مجھے یہاں سے جانے نہیں دیتی..... ورنہ کب کا جا چکا ہوتا۔“

”مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے تم اپنی اسٹینڈیز میں سیر نہیں نہیں، کیا بات ہے..... کہیں تمہارا بھی تو سیاست جو ان کرنے کا ارادہ نہیں؟“ اس نے ذرا موڈ بدلنے کی کوشش کی۔

”اوہو..... آئی جسٹ بیٹ پو لیکس۔ شفیق، میرا کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہتا..... میرے اندر آہستہ آہستہ بہت تھکی اور اداسی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ مجھے یہ سوچ بہت دلاتی ہے کہ اس دنیا میں ہمارا کوئی بھی نہیں، نہ ماں نہ باپ۔“ وہ دکھ سے بولا۔

”کیوں نہیں..... نا، بلکہ اور خیر رائٹ تو ہمارے اپنے ہیں نا!“

”ہاں، مگر غیر ہو کر بھی کتنے اپنے اپنے سے لگتے ہیں اور اپنے بالکل غیر۔ مگر انھوں نے بھی تو ہمیں کب کا چھوڑ دیا ہے۔ وہ بھی پایا کی بجائے.....“

”اچھا ان باتوں کو چھوڑو اور اپنی پڑھائی کی طرف توجہ دو۔“

”شفیق، میرا دل پڑھائی میں بالکل نہیں لگتا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ بس کسی روز کسی کا میرے ہاتھوں تل ہو جائے گا۔“

”خدا کے لیے آفاق ایسی باتیں مت کرو۔ اگر تم نے کچھ ایسا کیا تو میں زندہ نہیں رہ پاؤں گی۔ میں بھی بہت کمزور ہو چکی ہوں۔“ وہ روہاسی ہو کر بولی۔

”چھوڑو، ان باتوں کو..... اب تم جاؤ۔ میں سونا چاہتا ہوں۔“ وہ کمرے کی لائٹ آف کرتے ہوئے بولا اور اسے چاروٹا چارٹھا چڑا۔

اگلے دن دو دیر تک سوتا رہا۔ ناشتا بھی کمرے میں کیا اور کپیر پری ڈی لگا کر دیکھنے لگا۔ جب سرین صفائی کرنے کے لیے اس کے کمرے میں آئی، وہ کن اکھیوں سے اسے دیکھتا رہا۔ سرین ابی بابا کی بیٹی تھی اور بیچے کو ارڈر میں اکرم کی جگہ دیتی تھی۔ اکرم اب زمینوں کی دیکھ بھال

کے لیے گاؤں چلا گیا تھا۔ کبھی کبھار شہر آتا۔ نسرین اپنے دو چھوٹے بہن بھائیوں اور ماں باپ کے ساتھ کوارٹر میں راتی۔ نسرین جیڑ طراری، لٹس ہٹس کرتی، ناز و فخر سے چلتی تو ہر دیکھنے والا ایک بار ضرور مسکرا کر دیکھتا۔

”صاحب جی! آپ ذرا ہار چلے جائیں، میں صفائی تو کروں۔“ وہ بڑی ادا سے ہماڑن ہلاتے ہوئے بولا۔
”کر لو صفائی..... میں تمہیں کیا کہہ رہا ہوں۔“

”آپ کے یہاں ہوتے ہوئے صفائی ٹھیک طرح سے نہیں ہوتی۔“

”کیوں..... اور ویسے بھی کیا کرتا ہے اتنی صفائی کا؟“ وہ خاموشی سے آہستہ آہستہ سٹنگ کرنے لگی۔

”نسرین! تم میرے ساتھ یورپ کی سیر کو چلو گی؟“ وہ ایک دم بولا۔

”کیوں جی، خیریت تو ہے؟..... اور کس لیے؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”سیر کس لیے کرتے ہیں..... ظاہر ہے، دل خوش کرنے کے لیے۔“

”پر میرا دل تو یہاں ہی بڑا مرضی ہے۔ اماں ہے، گندہ ہے..... نیلو ہے۔ میں ان کے ساتھ کھیلتی ہوں۔ بڑا مزہ آتا ہے۔ میں وہاں جا کر کیا کروں گی؟“

”اچھی طرح سوچ لو؟“

”سوچ لیا.....“ وہ مسمم ارادے سے بولی۔

”اچھا ایک بات بتاؤ۔ اگر تمہاری شادی ہو جاتی ہے اور پھر تمہارے تین بچے ہو جاتے ہیں تو کیا تم ان کو چھوڑ کر دوسری شادی کر لو گی؟“

”نہ جی..... تو بہ استغفار..... اللہ معاف کرے..... مجھے کیڑے پڑیں جی، میں کیوں ایسا کروں گی۔ تو بہ استغفار!“ وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔

”اگر کوئی تمہیں بہت امیر کبیر، پیسے والا آدمی مل جائے تو؟“

”کبھی بھی نہیں، میرا دامخ خراب ہے۔“

”اور اگر تمہارا پہلا شوہرا چھانہ ہو تو؟“

”پھر بھی نہیں جی!“

”کیوں؟“

”اپنے تین بچوں کے لیے..... ان بے چاروں کا کیا تصور..... ان کو کس کے آسرے پر چھوڑ دوں گی..... نہ جی، یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔“

”تم کرو گی..... اور ضرور کرو گی۔ تم جھوٹ بول رہی ہو۔ تم بچوں کو بھی چھوڑ دو گی اور گھر کو بھی۔“ وہ آہستہ آہستہ غصے میں آ رہا تھا۔

”میں کبھی بھی ایسا نہیں کروں گی۔“ وہ بھی ہنسنے لگی۔

”تم ضرور ایسا کرو گی، تم عورتیں ہوتی ہی مکار ہو۔“ اس نے دو تین تھپڑ اسے لگا دیے۔ اس نے جو چلانا شروع کیا، خدا کی پناہ!

”چپ رہو، آواز مت نکالنا ورنہ۔۔۔“ اس نے جیب سے ریوا لور نکال کر اسے دکھایا۔ وہ ڈر کر خاموش ہو گئی اور جلدی سے باہر کی طرف بھاگی۔ اور وہ اس کی اس حرکت پر کتنی ہی دیر ہنستا رہا اور انجوائے کرتا رہا۔ اسے یوں ڈرا دھمکا کر جو لطف آیا تھا وہ پہلے کبھی نہیں آیا تھا پھر اگلے ہی لمحے وہ افسردہ ہو گیا۔ ایک ان پڑھ، جاہل، گنوازی لڑکی اپنے بچوں کو کبھی نہیں چھوڑ سکتی، شوہر کو چھوڑ سکتی ہے مگر بچوں کو نہیں اور وہ تعلیم یافتہ، کلچرڈ عورت۔ ساری اخلاقیات بھول گئی، اس نے ہمیں یوں چھوڑ دیا جیسے ہم انسان کے نہیں، جانور کے بچے ہوں۔

”یا خدا یا! حیرتی اس دنیا میں مجھوں کا اتنا فقدان کیوں ہے؟“ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

”آفاق! تم نے نسرین کو کیا کہا ہے؟“ شفق قدرے غصے میں اس کے کمرے میں آ کر بولی۔

”کچھ نہیں۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں۔۔۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔

”وہ رو کیوں رہی ہے؟“

”مجھے کیا معلوم۔۔۔ بلاؤ اسے میرے سامنے!“

”نسرین! اندر آؤ۔“ شفق اسے اندر بلاتی رہی مگر وہ نہ آئی۔

”میں نے تمہیں کیا کہا ہے۔۔۔ بولو؟“ وہ خود ہی اس کے سامنے گیا تو وہ سہم سی گئی۔

”کچھ نہیں۔۔۔“ وہ ڈرتے ہوئے بولی۔

”آفاق! تم اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ ورنہ میں تمہیں ٹھیک کر دوں گی۔“ شفق غصے سے بولی۔

”تم۔۔۔ اور مجھے۔۔۔ ویسے بھی عورت کسی کو کیا ٹھیک کر سکتی ہے۔ وہ تو صرف تباہ و برباد کرتی ہے۔“

”وباٹ ڈویو مین۔۔۔“ شفق کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

”کچھ نہیں، میں بحث کے موذ میں نہیں۔“ اس نے پاؤں سوکا لوٹ جیب سے نکال کر نسرین کی طرف پھینکا۔ ”بند کرو یہ دانا دھمنا!“ وہ

دھمکی دیتا ہوا باہر نکل گیا اور شفق حیرت سے اسے جانا دیکھتی رہی۔ یہ لڑکا کتنا بگڑ چکا ہے، اس نے دل میں سوچا۔

”نسرین! اب آئیں، تم اس کے کمرے میں کبھی مت جانا۔۔۔ اور یہ پیسے رکھ لو۔ سوٹ سلوا لیتا۔“ شفق نے اسے دلا سا دیا۔

سوٹ کے نام پر وہ اندر ہی اندر خوش ہو گئی اور نوٹ دوپٹے کے پلو میں باندھ لیا۔



”شفق! تمہارے پاپا کے تو وارے نمارے ہو گئے ہیں اور تم بھی۔۔۔“ سہیل اسے کالج چھوڑنے جا رہا تھا۔ وہ ہمیشہ راستے میں اسے

ملک منصور کی ساری باتیں بتاتا کرتا تھا۔ سہیل کو کچھلے پاؤں سالوں سے ملک منصور نے پرسل ڈراما یور رکھا تھا۔ بی اے میں تھا جب اسے باپ کی بیماری

کی وجہ سے تعلیم چھوڑنا پڑی۔ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ خوبصورت، اسارٹ فوجان تھا۔ ہمیشہ ویل ڈریسڈ رہتا۔ بیگٹے پر فیکس لگاتا۔ جب

کالج کے سامنے کھڑا ہوتا تو کسی دیکھ کر اسے سے کم نہ لگتا۔ لڑکیاں اکثر اس کو دیکھ کر سرگوشیاں کرتیں اور جب معلوم ہوتا کہ وہ شفق کا ڈراما یور ہے تو

سب پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹنے لگتے۔ سہیل شفق میں گہری دلچسپی لیتا تھا اور یہ دلچسپی آہستہ آہستہ محبت کی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ شفق کو بھی وہ

اچھا لگتا تھا۔ اس لیے اس کی کڑوی کیلی ہاتوں پر جہاں ناراض ہوتی وہاں مسکرا بھی دیتی۔

”شفق اتم نے پوچھا نہیں کہ میں کیا بات کر رہا تھا؟“

”مجھے کوئی ضرورت نہیں..... سہیل! تمہیں معلوم ہے کہ مجھے پاپا اور ان کی ایکٹیو دیشیز سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے ان کی باتیں مت

سنایا کرو۔“

”آخر تم اپنے پاپا سے اتنی اکٹری اکٹری کیوں رہتی ہو؟“

”تم سے مطلب.....؟“ وہ قدرے درشتی سے بولی۔

”اف تو ب..... کس چیز کا ناشتا کیا ہے، ایف 6 اگنی ہوئی ہو۔“

”اچھا تم مجھ سے ان کے بارے میں کوئی بات نہ کیا کرو۔“

”تو پھر کیسی باتیں کروں؟“

”مجھے نہیں معلوم.....“ وہ منہ پھلا کر بولی۔

”یہی بات تم شفقی شفقی اور میٹک باتیں سننا چاہتی ہو..... اچھا ظہیر وہ میں نے ایک نئی کیسٹ خریدی ہے۔ بہت رو میٹک سوچو ہیں.....“ اس

نے کیسٹ آن کی۔ اس کا سٹ میوزک کر خدا کی پناہ..... اس کی ہنسی نکل گئی۔

”تم خنثی ہوئی اتنی اچھی لگتی ہو..... کیوں ہر وقت خفے میں رہتی ہو؟“ سہیل نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

”سہیل! میرے اعدا صرف نفرت، غم، حسد اور دکھ ہی دکھ ہے۔ جو ہر وقت لاوے کی طرح ابلتا رہتا ہے۔ میں اپنے اعدا ختم لینے والے

حق جندوں سے لڑنا کر تمک گئی ہوں۔ اب سکون چاہتی ہوں مگر سکون کہیں نہیں..... کیا کروں، قصہ نہ کروں تو کیا کروں؟“ اس کی آنکھوں میں آنسو

تیرنے لگے اور اس کی آواز میں شدید دکھ سے پکپکاہٹ ہی پیدا ہو گئی۔

”تم اپنا ہر دکھ مجھے کیوں نہیں دے دیتی؟“ سہیل نے محبت سے اس کے ہاتھ کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔

”کچھ غم صرف انسان کے اپنے ہوتے ہیں۔ وہ نہ تو کسی کے ساتھ شیر کیے جاسکتے ہیں اور نہ ہی دیے جاسکتے ہیں۔ وہ تو ازل سے انسان

کی رگوں میں گردش کرتے لہو کی مانند سفر کرتے رہتے ہیں۔ ہر سانس جب آہ بھر کر نکلتی ہے تو وہ ایسے ہی غموں کا دھواں ہوتا ہے۔ شاید ایسے غم انسان

کی پیدائش پر ہی اسے خدا کی طرف سے امانت کی صورت میں ملتے ہیں جن کو وہ زمانے کی ہوا سے بھی بچا کر اندر ہی اندر سنبھال کر رکھتا ہے..... کیسی

مجیب بات ہے نا.....“ دو موٹے موٹے آنسو اس کے رخساروں پر پھسل گئے۔ کالج آچکا تھا سہیل نے بریک لگائی۔ اس نے ٹشو سے آنسو صاف

کیے اور باہر نکل گئی۔

”سنو شفقی! تمہارے اندر جتنا بھی دکھ، قصہ ہے، ہاں سب سمیت تم مجھے عزیز از جان ہو۔ آئی ریگلی لو یو۔“ سہیل کی آواز میں محبت کی

سپائی تھی۔ وہ بغیر کچھ کہے سنے باہر نکل گئی۔



راہ چلتی لڑکیوں کو تنگ کرنے میں اسے ہمیشہ لطف آتا۔ ہر روز کبھی کسی لڑکی کے پیچھے ہولیتا تو کبھی کسی اور کے پیچھے۔ ان کے بالکل قریب جا کر زور سے ہارن بجاتا اور جب وہ خوف زدہ ہو کر ادھر ادھر بھاگتیں تو ان کے سپہ چہرے کو دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوتی۔ وہ تیزی سے ان کے پاس سے گزر جاتا۔ انھیں یوں تنگ کر کے اسے بہت مزہ آتا۔ پھر کھلکھلا کر ہنستا رہتا۔ آج وہ مسلسل ایک فقیرنی کے پیچھے پڑا تھا۔ اس کے قریب جا کر زور سے ہارن بجاتا۔ وہ گندے سندے کپڑوں میں ملیں کالے رنگ کا پٹا پٹا، بھاری سا تھیلا اٹھائے ہوئے تھی۔ جس میں اس نے نہ جانے کیا گندہ منداور ٹیٹن کے ڈبے باندھے کر رکھے تھے۔ کبھی ایک گندے سے اتارتی تو دوسرے پر رکھتی۔ اسے اس لڑکے کے تیرا پٹے نہیں لگ رہے تھے۔ کبھی سڑک کے ایک کنارے کی طرف چلتی تو کبھی ایک دم دوسری جانب ہو جاتی۔ مگر وہ ہانپتا رہتا تھا۔ تنگ آ کر وہ سڑک پر تن کر کھڑی ہو گئی۔ وہ غصے میں چھری شیرنی کی طرح اس کی طرف آئی۔ آفاق کی آنکھوں میں شرارت تھی اور لہجوں پر شریری مسکراہٹ۔

”اوتے باؤ اڈا مارا ہر تو کل ا“ اس نے جی کڑا کر کہا۔ آفاق اس کی بات سن کر ایک دم چو کا اور باہر نکل آیا۔

”کیا تکلیف ہے تجھے۔ کیوں میرے پیچھے آ رہا ہے؟“ وہ غصے سے بولی۔

”میں نے تجھے کیا کہا ہے، میں تو اپنے راستے پر جا رہا ہوں۔“

”بنو مت..... یہ کبھی ہستی کا راستہ تیرے باپ کے نکل کو نہیں جاتا۔ تو کس کو پاگل بنا رہا ہے۔ اگر تیرا دماغ ٹھیک نہیں تو ٹھیک کر دوں؟“ وہ

غصے سے بولی۔

”تیرا دیک بک بک مت کر.....“ وہ بھی غصے سے بولا۔

”ورنہ.....“ اس نے جی کڑا کر کے پوچھا اس نے تڑاخ سے تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ وہ حیرت سے اپنا کال سہلانے لگی پھر جواب اس نے

بھی ویسا ہی زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ آفاق کو قطعی امید نہ تھی۔ وہ تو لڑکیوں کو تنگ کر کے خوش ہونے کا عادی تھا اور اب جواب دہی کا جواب پتھر سے ملا تو تھلا اٹھا۔

”اب آنا میرے پیچھے..... جیری ہڈیاں کتوں کے آگے ڈال نہ دیں تو منگنی نام نہیں میرا۔ سنا تو نے.....!“ وہ دانت کچکا کر بولی۔

”دیکھ لوں گا.....“ اس نے گاڑی واپس موڑی۔ وہ ابھی تک اپنا کال سہلا رہا تھا۔ وہ تو اپنی ذات کے گھنڈے میں جٹا تھا۔ اس عام سی

فقیرنی نے اس کو کیسے تڑاخ سے تھپڑ مارا تھا۔ اس کا خون کھول رہا تھا۔ جیسے آتش فشاں پھٹ چکا ہو اور لاوا بہنے کو بس راستہ تلاش کر رہا ہو۔ اس کا بدن جل رہا تھا۔ وہ ساری رات نہیں سو سکا۔ رات بھر جاگنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ سخت ذہنی اذیت میں جٹا تھا۔ اذیت پسند شخص جب خود اذیت میں ہوتا ہے تو کتنا تھلا اٹا ہے۔ وہ اب محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنی ٹھکست کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ ساری زندگی ایسے تھپڑ لگنا چاہتا تھا کہ اس کی روح تنگ چلتی ہو جائے اور ساری زندگی ایسے تھپڑوں کی جلن محسوس کرتی رہے مگر وہ بہت کچھ سوچتا رہا۔ مگر سو نہ سکا۔



سمیل اسے لے کر آیا تھا۔ شام کا لگنا تھا اور میرا بچل رہا تھا۔

”اب بولو، کہاں جانا ہے؟“

”زودیا کی طرف.....“

”وہ جوتھاری بھڑی ہوئی سگلی ہے؟ اس کی طرف مت چلنا کرو۔“

”تم سے مطلب.....؟“

”کیوں، مجھے کیوں نہیں..... میرا سب کچھ تو اب تم ہی ہو۔“

”اچھا..... بار بار مت بتلایا کرو۔ مجھے ایسے پوزیشن لوگ بالکل پسند نہیں۔“ وہ آکٹا ہٹ سے بولی۔

”شفق تم ایک نامور سیاست دان کی بیٹی ہو اور پریس تمہارے پیچھے ہے۔ تم جو چاہو کرو، ایسا ہیاب ممکن نہیں رہا۔“ اس نے سمجھانے کی سعی کی۔

”مجھے کسی کی کوئی پروا نہیں اور ستو میرا ہوتا جو ہے۔ میری اپنی ذات اور شخصیت ہے۔ پاپا کی ذات اور ان کی حیثیت میرے لیے قطعی اہم

نہیں۔“ وہ نکلی سے بولی۔

”اچھا، ویسے تمہیں ادھر کیا کام ہے؟“

”ہے نا کچھ۔“

”شفق! وہ ابھی لڑکی نہیں۔“

”کیوں تم کیسے جانتے ہو؟“ اس نے ٹھک کر پوچھا۔

”بس، میں جانتا ہوں نا..... اسی لیے کہہ رہا ہوں۔“

”تم مردوں کا کیا ہے، جو منہ نہ دکھائے اس کو کہہ دیا ابھی لڑکی نہیں۔ تمہارا لوگوں کو جاننے کا بیٹا نا دور ہے اور میرا کچھ اور.....“

”شفق! تم کیوں ہر بات کو الٹا رنگ دیتی ہو؟“

”تم بھی مجھ سے ایسی بات مت کیا کرو۔“

”اچھا بابا نہیں کرتا.....“ وہ ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔

”جب تم سر نہ دگرتے ہوتا تو دنیا کے سب سے اچھے اور عظیم انسان کہتے ہو۔“ وہ خود ہی کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

”چلو تم کسی طرح تو خوش ہوتی ہو، چاہے کسی کی انا کو کچل کر ہی۔“ سہیل نے مسکراتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا اور اسے زودیا کے عظیم

الشان گھر کے سامنے ڈراپ کیا۔ وہ رات آٹھ بجے آنے کا کہہ کر اندر چلی گئی۔

زودیا، سہیل کو بہت نا پسند تھی۔ وہ ایک دو دفعہ شفق کے گھر آئی تھی مگر اس کی حرکتیں اور فیشن ایسا بے ہودہ ہوتا تھا کہ اسے دیکھ کر اسے

کراہت سی محسوس ہوتی تھی۔ وہ کچھ دیر وہاں کھڑا رہا۔ کسی کو آتے جاتے، چلتے پھرتے نہ دیکھا۔ عجیب سا بے اسرار عمل تھا مگر شفق زودیا میں کیونکر

انٹرنیٹ پر بھی، رات آٹھ بجے تک وہ کیا کرے گی؟ وہ سوچتا ہوا واپس چلا گیا۔ زویا اسے دیکھ کر قدرے بگڑتے ہوئے بولی۔
 ”شفیق! تم دیر سے کیوں آئی ہو۔ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ معلوم ہے، آج میں نے تمہارا نئے میوزیکل بیڈ سوئٹھ سے
 تعارف کروانا ہے۔“

”کہاں ہے؟“ شفیق بے چینی سے بولی۔

”آؤ، لطافتی ہوں۔“ وہ اسے گھر کے پیچھے ایک بڑے سے ہال میں لے گئی۔ اس کا گھر پورا کچھل کر کپیسٹریس لگتا تھا۔ نئے نئے جدید موسیقی
 کے آلات، رنگ برنگی جلیبی بجتی لائٹس اور لڑکوں کی ایک عجیب و غریب تعداد وہاں انٹرٹینمنٹ کے سامنے برائے نام تھی۔ ایک حصہ سولہ سو گک کے لیے
 اور دوسرا گروپ ڈانس کے لیے مخصوص تھا۔ عجیب سا ماحول لگ رہا تھا۔ زویا نے سب سے اس کا تعارف کر دیا۔ کچھ یونیورسٹی اور میڈیکل کالجز کے
 بڑے لکھے میز دک کے رسیا لڑکے لڑکیاں تھیں۔ اسے کہیں بھی کوئی بزرگ نظر نہیں آیا۔

”زویا، تمہارے گھر والے کہاں ہیں؟“ شفیق نے حیرت سے پوچھا۔

”کون سے گھر والے...؟“ وہ بے پروائی سے بولی۔

”میرا مطلب ہے تمہاری امی اور بہن بھائی وغیرہ۔“

”یہاں کوئی نہیں، سوائے میرے اور چچا کے۔“

”اتنے بڑے گھر میں تم بالکل تنہا رہتی ہو؟“ شفیق نے حیرت سے پوچھا۔

”شفیق، تم کیا فضول باتیں لے رہی ہو۔ اپنے کام سے مطلب رکھو۔ یہاں بیٹھو، میں تمہاری دیر میں آتی ہوں۔“ وہ کہہ کر نہ جانے کہاں
 چلی گئی۔ وہ زویا کے بارے میں سوچنے لگی۔ زویا سے اس کی جان پہچان تقریباً ایئر کے کاکل ایگزیکٹو میں ہوئی تھی۔ زویا اسے بڑی خوش مزاج، ہنسنے
 بسانے والی زندہ دل لڑکی لگی۔ پھر آہستہ آہستہ دونوں میں دوستی گہری ہونا شروع ہو گئی۔ زویا ہاتھوں کی دوستی تھی۔ ہاتھوں سے دوسروں کو متاثر کرنے کا
 فن اسے خوب آتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے شفیق کو احاطہ میں لے لیا۔ وہ کافی باتیں اس سے شیئر کرتی تھی۔ زویا تو اس کے لیے کسی مہیا سے کم نہ
 تھی۔ وہ اس پر اندھا دھار کرنا شروع ہو گئی تھی۔ وہ جس طرف اسے لگاتی، وہ آسانی سے لگ جاتی۔ زویا کی کسی بات کو چیلنج کرنے کا اس میں حوصلہ نہ
 تھا۔ اب دونوں فوراً تھوڑے ایئر میں تھیں۔ لڑکیاں فائل ایگزیکٹو کے لیے زور و شور سے تیاریوں میں مصروف تھیں۔ دونوں کے پیچھے بھاگ رہی تھیں مگر اس
 پر عجیب ذہن سوار تھی۔ جب سے ملک منصور کی سیاسی حیثیت میں اضافہ ہوا تھا۔ اسے اپنی ذات سے وابستگی پر قلق سارہتا۔ وہ اپنی ذاتی شخصیت
 اور اس کی شہرت کے پیکروں میں تھی۔ وہ خود کچھ ایسا کرنا چاہتی تھی جس سے وہ خود پہچانی جائے۔ اسے کسی کی ذات کی شہسائی اور تعارف کی
 ضرورت نہ تھی۔ اس کے نزدیک تعلیم، دولت اور اسٹیلٹس سب کچھ بے معنی تھا۔ زویا نے جب اسے اپنے سوئٹھ بیڈ کے بارے میں بتایا تو وہ بھی
 اسے جوائن کرنے کے لیے بے چین نظر آنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد زویا آ گئی۔ وہ مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

اس کے پیچھے لہسا سلاز کا تھا۔ کندھوں سے چپے لٹھکی ڈھنس، گلے میں منڈل کے لیے لیے لاکٹس اور چیئر۔ مختلف قسم کی رنگرز... رنگین شیشوں

والی عینک اس نے لگا رکھی تھی۔ عجیب سی بے بھگم شخصیت تھی۔

”اس سے ملو، یہ عابد ہے۔ ہمارے سونٹ کا ہیڈ ماسٹر۔ بہت ہی اعلیٰ میڈیٹیشن ایڈ منسٹر۔“

”ہیلو۔۔۔۔۔“ عابد نے سر جھکا کر کہا۔

”ہیلو۔۔۔۔۔“ وہ بھی آہستہ سے بولی۔

”عابد شفق کوکانے کا بہت شوق ہے۔ مگر اس نے کبھی کچھ گانا نہیں۔ تم تو ٹیلنٹ بھنگ میں ماہر ہو۔ پلیز، اس کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دو۔“ زویا کے لہجے میں اچھا بھی تھی اور تسفیر بھی۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں مگر اس میں وقت تو لگے گا۔ ابھی تو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کی آواز کیسی ہے اور ان کو کتنی ریاست اور پرنکیش کی ضرورت ہے۔ آپ کچھ گانا سنائیں۔“ عابد نے اسے کہا۔

”مم۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ اس وقت۔“ وہ زور سے ہو کر بولی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں، گھبراؤ نہیں۔۔۔۔۔ عابد بہت ہائس ہے۔“ زویا نے اسے تسلی دی۔ بہت مشکل سے اس نے دل دل پاکستان گایا تو عابد نے حیرت سے زویا کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گیا۔

”عابد! تم بولتے کیوں نہیں، کیا یہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتی؟“ زویا نے حیرت سے پوچھا۔

”بہت وقت لگے گا۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”چلو، امید تو بندھی ہے۔ شفق! تم حوصلہ مت بارو۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا اور عابد! پلیز، اس کو اسٹیل انٹینشن دو۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ کل سے کچھ کریں گے۔“ وہ بولی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

”زویا، کیا واقعی میں گاسکوں کی۔۔۔۔۔ اس کے جانے کے بعد شفق نے پوچھا۔

”اور نہیں تو کیا۔۔۔۔۔ آج کل اتنے بے سرے لوگ گروہیں بنا رہے ہیں اور ویسے بھی گروہیں میں سر ملی آواز کم اور میڈیک کا شور ہی اتنا ہوتا ہے کہ پتا ہی نہیں چلتا کہ کون کیا گارہا ہے؟ عابد جب تمہارے ساتھ گائے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آؤ، ہم ان لوگوں کی ریپرسل دیکھتے ہیں۔“ وہ اسے لے کر پیچھے ہال میں چلی گئی، جسے وہ ہال روم کہتی تھی۔

ٹھیک آٹھ بجے سہیل اسے لینے آ گیا۔ وہ قدرے ناراض لگ رہا تھا۔

”سہیل! تم کچھ غافل رہے ہو؟“

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔“ وہ بے چارہائی سے بولا۔

”پھر بھی۔۔۔۔۔ ہوا کیا ہے؟“

”تم یہ بتاؤ کہ یہاں کیوں آئی ہو؟“

”اب تو روز آنا پڑے گا۔“

”کیا مطلب.....؟“ اس نے جھٹکے سے گاڑی روکی اور اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں، بھئی، مجھے کچھ لوٹس تیار کرنا ہیں، اس سلسلے میں روز آنا پڑے گا۔“

”جو وقت تم یہاں آنے جانے میں ضائع کر دو گی۔ مگر بیٹہ کرا رام سے پیاری کر سکتی ہو۔“ وہ تلخی سے بولا۔

”تم اسے تلخ کیوں ہو رہے ہو؟“

”مجھے یہ گھر اور اس کے مکین کچھ ملوک لگ رہے ہیں۔“

”تم کس سے ملے ہو؟“

”زویا کے ساتھ وہ بڑا کون تھا؟ جو تمہیں گیت تک چھوڑنے آیا تھا؟“

”نہیں..... کوئی بھی نہیں..... زویا کا کزن تھا اور اگر تم نہیں آ سکتے تو میں خود آیا کر دوں گی۔“

”نہیں، میں خود چھوڑنے آیا کروں گا۔ تم اس کی نہیں آؤ گی۔“ وہ رعب سے بولا تو وہ خاموش ہو گئی۔

گھر آ کر وہ ساری رات نہیں سو سکی۔ کبھی عابد کے بارے میں سوچتی تو کبھی سہیل کے بارے میں۔ کبھی زویا سامنے آتی تو کبھی سوکھٹ

بیٹہ۔ وہ عجیب لمحے میں پڑ گئی تھی۔ ساری رات سوچتے اور جاگتے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔



ملک منصور کا اپنی بیکری مہینہ گل کے ساتھ زبردست اسکینڈل ہر ایک اخبار کی مسالے دار خبر بنا ہوا تھا۔ شزانے بھی پڑھا اور خاموش ہو گئی۔ ملک منصور دو دن سے گھر نہیں آیا تھا۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ چاہے رات کے دو تین بج جائیں، وہ گھر ضرور آتا تھا۔ شزانے اس کے موبائل پر کالمیکٹ کرنے کی کوشش کی مگر وہ بھی آف تھا۔ وہ کہاں تھا وہ اسے فریس آؤٹ کرنا چاہتی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے شدید عدم تحفظ کا احساس تک کر رہا تھا۔ منصور نے جو وعدے اقرار اس سے کیے تھے، سب وقتی ثابت ہوئے۔ وہ حسن کے سامنے کہاں ٹھہر سکتا تھا۔ کردار کی مضبوطی اور لٹس پر پڑا ہوا اسے کبھی بھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کی فطرت کی رنگینوں سے شادی کے فوراً بعد ہی آگاہ ہو گئی تھی۔ اسے کسی قسم کی کیل ڈالنا محض خود فریبی تھی۔ وہ بہت شاطر مرد تھا، جو عورت کی کمزوریوں سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ وہ جان بوجھ کر ایسی عورتیں منتخب کرتا جو آسانی سے الگ چلا سکتی تھیں۔ شزا کا تعلق معاشرے کے جس طبقے سے تھا، وہاں صرف گیسر وجود زندہ رہ سکتے ہیں اور اب بچے ہونے کے بعد تو ملک منصور نے اسے قطعی ان سرگرمیوں کی اجازت نہیں دی تھی۔ وہ صرف این جی او تک محدود تھی۔ وہ بار بار کمرے کا چکر لگا رہی تھی۔ اسے شاکل اور سیر شدت سے یاد آ رہے تھے۔ نہ نیند آ رہی تھی نہ چھن..... وہ اپنے آپ کو سخت اذیت میں محسوس کر رہی تھی۔ دھجکوں نے اس کی آنکھوں کو سرخ کر رکھا تھا۔ زندگی کا عذاب کس کس صورت میں جھیلنا پڑتا ہے، ہر کوئی اپنی اپنی جگہ اذیت سہہ رہا تھا۔

صبح ناشتے کی ٹیبل پر شزا کی آنکھیں، شفق کی سرخ سوچی آنکھوں کا مشاہدہ کر رہی تھیں اور شفق کی جاگتی آنکھیں آفاق کے افسردہ

ایڑے چہرے پر خند تھیں۔ سب دیکھ رہے تھے۔ اندر ہی اندر کچھ محسوس کر رہے تھے مگر کوئی کسی سے کچھ بھی نہیں پوچھ سکتا تھا اور کیوں پوچھتا، کس ناتے سے پوچھتا۔ ہر کوئی اپنی اپنی جگہ گمشدہ استعارہ تھا۔

آفاق چائے کا کپ نچل پر پیچھے ہوئے جھٹکے سے اٹھا اور گاڑی کی چابیاں اٹھا کر باہر نکل گیا۔ اس کے اندر آگ دہک رہی تھی۔ وہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔ بدلہ لینا چاہتا تھا۔ جب تک بدلہ نہیں لے گا، اس کا اندر بونہی دہکتا رہے گا۔ اس کی سوچیں منتشر رہیں گی۔ اسے کچھ کرنا تھا۔ یہی سوچ کر وہ اسی راستے پر چل پڑا جہاں کل گیا تھا اور چلتے چلتے اس کی جھکی تک جا پہنچا اور اب اسے ادھر ادھر تلاش کر رہا تھا۔

”اوتے بابو، کیا چاہیے.....؟ ادھر کیا اوصاف رہے ہو؟“ ایک موٹا تارو سا کالی رنگت والا آدمی باہر نکلا اور بڑے دھب سے پوچھنے لگا۔

”وہ..... وہ..... یہاں پر.....“ وہ ہٹکانے لگا۔

”کون..... بولو، کیا اوں آں کر رہے ہو؟“ دھبے سے بولا۔

”یہاں پر وہ لڑکی..... کل.....“

”کون..... جھکی.....؟“

”ہاں.....“

”کیا کام ہے اس سے؟“

”اس نے اک کام کہا تھا۔ وہی بتانے آیا ہوں۔“ جلدی سے اس نے بہانہ گھڑا۔

”جھکی اور کام..... کیوں مذاق کرتا ہے۔ وہ اک جھجھکے لگے کی تو سارا کچھ بھول جائے گا۔ وہ لڑکی نہیں پتا ہے۔ چل گیا تا تو لگ پتا جائے گا۔“ وہ قہقہہ لگا کر بولا۔

”کیوں ہاتھ لگائے گی، میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ قدرے جھکی سے بولا۔

”اگر تو نے جھوٹ بولا تا تو تجھے چھوڑے گی نہیں۔ یہ تو سوچ لے۔ بڑی جی وار ہے۔“

”اچھا تم اسے ملو تو دو..... میں جانوں اور میرا کام.....“

”دیکھتا، کوئی ایسی ویسی بات نہ کرنا ورنہ جھکی سمیت یہاں کے لوگ بھی تجھے نہیں چھوڑیں گے۔“ وہ پھر اسے سمجھہ کرنے لگا۔

”اچھا، بلاؤ تو سہی۔“ وہ ہمت کر کے بولا۔ وہ خنکرتا اور خوف زدہ بھی، جب وہ آگئی۔

”اوتے تو..... ٹھہر جا، آج تجھے زعمہ نہیں جانے دیتا۔“ اس نے پاس سے ہی ایک موٹا سا ڈنڈا اٹھایا اور اس کی جانب لپکی۔ اس کا باپ فقیر اس کے پیچھے تھا۔

”اوری بد بخت! مرے تو..... ٹھہر تو جا۔ اسے بات تو کرنے دے، کہتا کیا ہے؟“ فقیر نے اس کے ہاتھ سے ڈنڈا چھیننے ہوئے کہا۔

”میں نے آپ سے بات کرنی ہے۔“ آفاق نے فقیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں..... بول، کسی اچھے گھر کا گلتا ہے۔ ادھر کیا کرنے آیا ہے؟“

”مجھے آپ کی بیٹی سے شادی کرنی ہے اور میں یہ شادی ہر قیمت پر کرنا چاہتا ہوں۔ چاہے آپ مجھ سے پیار لے لیں۔“ اس نے بیٹن کی جیب سے نوٹوں کی دو گلدیاں فقیرے کی جانب بڑھا کیں۔ ”یہ دس ہزار ہیں.....“ مگھتی میرے گھر میں بہت خوش رہے گی۔“

مگھتی کے ہاتھ سے ڈالر ایک دم نیچے گر گیا اور وہ حیرت سے دیکھنے لگی۔ اس کے تو دہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس قدر بے وقوف ہوگا۔

”مگر یہ سب کچھ.....“ فقیرے کے منہ میں پانی آ رہا تھا، کبھی وہ نوٹوں کو دیکھ رہا تھا، کبھی آفاق کو اور کبھی مگھتی کو۔

”ابا یہ بہت برا لڑکا ہے، میں اس کے ساتھ شادی نہیں کروں گی۔“ مگھتی ایک دم اس کے سامنے جا کر بولی۔

”مگھتی! میں اتنا برا بھی نہیں۔“ وہ بڑی ملاکت سے بولا تو وہ خاموش ہو گئی اور حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”تو تو چپ کر مر..... ابھی میں ذمہ دار ہوں، میں ہی فیصلہ کروں گا کہ کیا کرتا ہے۔ چنا، تو ہمیں سوچنے کا وقت تو دے..... اور تیرے گھر والے.....؟“ فقیرے نے اس سے کہا۔

”میرے گھر والے نہیں ہیں اور میں نے شادی بھی آج اور اسی وقت کرنی ہے۔“

”بیٹا! یوں بھٹی پر سرسوں نہیں بھاتے..... شادی بیاہ تو زندگی کے معاملے ہوتے ہیں۔ اتنی جلدی تو سب کچھ طے نہیں ہو سکتا۔“ فقیرے نے پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”دیکھنا بھالنا کیا ہے، میں آپ کے سامنے ہوں۔ مگھتی یہ ہے، مولوی صاحب کو بلائیں اور نکاح کر دیں۔“

”ابا، میں اس سے نکاح نہیں کرنے کی۔ یہ دھوکا ہے؟“ مگھتی پاؤں پٹختی اصرار میں مگھتی۔

”کر لے..... بے وقوفی نہ کر..... نکاح ہی کرے گا۔“ بھگا کر تو نہیں لے جا رہا۔ یہاں رہ کر ساری زندگی کوڑا ہی جمع کرتی رہے گی۔ تو تو بڑے نصیب والی ہے۔ موٹر والا تجھے بیاہنے آیا ہے۔ اس کے گھر میں راج کرے گی۔ ورنہ یہاں کی لڑکیوں کے نصیب بھی راکھ کی سیاحی سے لکھے ہوتے ہیں۔ کوڑے میں پٹتی ہیں اور بیمار ہو کر مر جاتی ہیں۔ کبھی کسی کا اچھا نصیب دیکھا ہے تو نے۔ کس آس پر تو میرے در پر پٹتی رہے گی۔ میں بیمار رہتا ہوں۔ حیرے بھانے چار پیسے دو دے رہا ہے۔ ہم بھی کوئی کنیا سی بنائیں گے۔ میں اپنا علاج کروا لوں گا۔“ فقیرے نے فوراً ہی ساری منصوبہ بندی اسے سمجھا دی۔

”لیکن ابا! مجھ پر لگے ہے..... یہ موٹروں والے بڑے فریبی، دغا باز لوگ ہوتے ہیں۔ حیرتی مگھتی کے ساتھ بھی کچھ دغا کیا تو پھر مر جائے گی۔ دیکھ مگر مگھتی حیرے پر نہ آئے گی۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلکانے لگے۔

”نہ میری دھی ایوں! اس نہیں ہوتے۔ دیکھنا، نیلی چھتری والا کتنا کرم کرے گا۔ تو تو مگھتی ہی نہ رہے گی۔ میری موٹر والی ہم صاب بن جائے گی۔“ فقیرے نے اسے ہنساؤ دکھائے۔

”اچھا، جو حیرتی مرضی.....“ وہ ہتھپڑا ڈالتے ہوئے بولی۔

ہو سکتا ہے آفاق کو واقعی اس سے محبت ہوگئی ہو۔ بے شک وہ گندمی مندی رفتی تھی لیکن بستی میں رہنے والی سب لڑکیوں میں وہ خوبصورت کبھی جاتی تھی۔ مگر وہ فقیرنی بھی تھی۔ وہ عجیب شش و پنج میں جلتا تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ مولوی صاحب کو لے آیا۔ دس ہزار حق مہر کے عوض اس سے نکاح کیا گیا۔ جو اس نے فقیرے کو دے دیے تھے۔ نہ جانے کس کے بوسیدہ سے گوٹے کناری والے کپڑے اسے پہنائے گئے۔ سرخ سرفنی اور کالوں پر لالی خوب بھر بھر کر تھوپی گئی۔

”ابا، ان بچیوں سے علاج ضرور کرائے۔“ وہ گاڑی میں بیٹھے ہوئے یوں۔

”ہاں..... ہاں تو فکر نہ کرو..... تو خوش رہو۔“ فقیر نے اسے دعاؤں کے سائے میں درخواست کیا۔ سارا راستہ خاموشی چھائی رہی۔

”بابو! تو خوش تو ہے؟ کیا تجھے مجھ سے محبت ہوگئی ہے؟“ منگتی نے محبت سے پوچھا۔

”میں کوئی باؤ نہیں، میرا نام آفاق ہے اور تم بھی منجھی نہیں، کچھ اور ہمارے مجھے تم سے کوئی محبت نہیں، سنا تم نے؟“ دو غصے سے جھجکا کر بولا۔
 دو خاموش ہو گئی۔

”اچھا تو کیا نام رکھوں میں، میں تو شروع سے ہی یہی ہوں، آج کیوں اپنا نام بدلوں؟“

”میں نے کہا..... مجھ سے فضول بحث مت کرو اور اپنا نام کچھ اور رکھو۔“

”ایچھا، تو محمود رکھ لوں؟“ وہ خوشی خوشی ہوئی۔

”کیا کچھ اس نام ہے.....“ وہ منہ چڑھا کر پوچھا۔

”تو بھائی رکھ لوں؟“

”شب اب.....ن سنیس“

”اچھا تو مارا خاکے کا کہ ہو رہے ہو“ دو سارا راستہ منہ بسورہ کر بیٹھی رہی۔ جب وہ اسے لے کر گھر آیا تو ہر نظر میں استغناء تھا، حیرانی تھی۔

شوق حیرانی سے نبھی آفاق کی طرف، بلکہ محبت تو نبھی مطلق کی طرف۔ اس کی آنکھیں پہنی کی پہنی رہ گئیں۔

”آقا! کون ہے؟“ شفق نے حیرت سے پوچھا۔

”کون ہو سکتی ہے..... ظاہر ہے میری لہدی ہے عمر!“

”سحر.....!“ منگنی خود ہی بڑبڑائی۔

”مگر.....“ شہزاد نے حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر کچھ کہنا چاہا۔

”کیوں، اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ جب ماڈلز اور ایکٹرز یہاں رہ سکتی ہیں تو یہ کیوں نہیں.....؟“ وہ اس کا دفاع کر رہا تھا مگر وہ

ان سب کے درمیان کھڑی حقیر سا، بے وقعت سا ذرا لگ رہی تھی۔

اسی لمحے ملک منصور اور امجد داخل ہوا۔

”یہ کیا ہنگامہ چا رہے ہیں؟“ وہ غصے میں دھاڑتے ہوئے بولا۔

”یہ میری بیوی ہے۔“

”کیا..... تمہارا دامخ تو ٹھیک ہے؟..... یہ تو شکل سے ہی کوئی بھکارن لگتی ہے۔“ وہ ناک سیکڑ کر بولا۔

”بھکارن تھی..... مگر اب نہیں۔ اب یہ اس گھر کی بہو ہے اور آپ کی عزت۔“

”کیا بھوکاں کر رہے ہو۔ تم کیا سمجھتے ہو تمہاری اس بھوکاں کو میں آسانی سے قبول کر لوں گا۔ پر غور کرو، خواب میں ناٹ کا پیچہ بڑھی نہیں

لگتا۔“ وہ پھر دھاڑا۔

”مگر آپ تو ہمیشہ لگاتے رہے ہیں۔ اڈا لڑا اور ایک ٹرسز کا۔ وہ بھی تو خواب میں ناٹ ہی تھیں.....“

”شٹ اپ، بوسن آف.....“ وہ غصے سے دھاڑا۔

”بس..... ایک ہی دفعہ میں تمہارے لگے اور مت بھولے، میں آپ کا ہی بیٹا ہوں۔“

”دفعہ ہو جاؤ میری نظروں سے..... اور پھر میرے سامنے مت آنا اور سنو، اس کو میں یہاں دو بار ہندو کیوں۔“

”یہ یہیں رہے گی، میرے ساتھ اور میں دیکھتا ہوں کہ یہاں سے کون جاتا ہے۔ ہم نے بھی تو بہت برداشت کیا ہے، ہم بھی تو چاہتے تھے

کہ بہت سے لوگ اس گھر میں نظر نہ آئیں۔ غرور نظر آ رہے ہیں تو پھر یہ بھی نہیں رہے گی۔“ اس نے تجلی سے شزا کی طرف دیکھ کر کہا۔

منصور نے ترائی سے تھپڑ اس کے منہ پر مارا اور پاؤں پٹکتا ہوا اندر چلا گیا۔ ہر کوئی اپنی جگہ تنگ سا کھڑا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے

آفاق کو یوں تھپڑ مارا تھا۔ وہ وہیں پر کھڑا اپنا گال پہلاتا رہا۔ ابھی پہلے تھپڑی الایت کم نہ ہونے پائی تھی، اوپر سے حرید ایک اور اس کو سہا پڑا تھا۔ شزا

بھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”آفاق، یہ تم نے کیا کیا..... ابھی تو تم نے سیکنڈ ایئر کے ایگزاحر دینے ہیں اور تم نے شادی بھی کر لی اور وہ بھی اس سے؟“ شفق اسے

مجبور کر پوچھنے لگی۔

”میرے لیے زندگی میں کچھ بھی اہم نہیں۔ نہ تعلیم، نہ شائیس، نہ کچھ اور..... میرے لیے تو زندگی ہی اہم نہیں.....“ وہ اسی سانہ لہجے میں بولا۔

”تم کیوں ایسا کہہ رہے ہو؟“

”شفق ایہ تم پوچھ رہی ہو..... میں کیوں زندہ ہوں..... کس کے لیے..... ہمارے بولنے کا تو کوئی جواز ہی نہیں، ہم زندہ ہیں اس لیے کہ

ہم ہیں۔ کاش ہم نہ ہوتے، اس ہونے نہ ہونے کے چکر میں انسان کتنا دکھ سہتا ہے، کتنا کرب..... میں بہت ٹوٹ چکا ہوں۔“ اس کی آنکھوں سے

آنسو بہنے لگے۔

”تو کیا تم اس سے محبت کرتے تھے اس لیے۔۔۔؟“

”محبت اور اس سے۔۔۔؟“ وہ طوطیہ ہنسی ہنسا۔

”تو پھر یہ سب کیا ہے؟“

”ایسا بندھن جو میرے ماں باپ میں تھا۔ میں وہی انکسیر پتیس کرنا چاہتا ہوں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ایسا بندھن کب تک چلنا ہے۔۔۔ اس جسٹ این ایڈوچر۔۔۔“

”یہ کیا حماقت ہے۔ تم تو بالکل ہی بہک گئے ہو۔“ شفق ناراض ہو کر بولی۔

”بیدار کی ہی سب سے بڑی حماقت ہے۔۔۔ تم اور کس حماقت کی بات کرتی ہو؟“

”اچھا ادھر بیٹھو۔۔۔ اس غریب کو تم کس بات کی مزاد چنے جا رہے ہو؟“

”مزاتو بیاب ساری زندگی سبھی۔۔۔ میرے ساتھ۔“

”دیکھو پلیز! کوئی زیادتی نہ کرنا۔“ شفق خوف زدہ ہو کر بولی۔

”ادھر بیٹھو، میں کچھ لاتی ہوں۔“ وہ بیٹھنے کے دو گلاس ان کے لیے لائی۔ وہ شوپ شوپ کر کے ایک ہی گھونٹ میں چڑھا گئی۔ شفق

مسلل اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ کسی طرح بھی ان کے ماحول میں فٹ ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اگر اس کی ٹوک پلک سنواری جائے تب بھی نہیں۔ اس کے وجود میں ایسی مزا انداز پوسیدگی، رگ رگ میں مائی مفلکی اور چہرے پر پھیلی حسرت و یاسیت، وہ تو اس گھر کے کونے کدوے میں بھی سامنے کے لائق نہ تھی۔ تو پھر یہ سب کیسے چلے گا؟ وہ حیرت سے سوچتی رہی۔

”آؤ، میں تمہیں جہاز کرا کر اڈا کھا دوں۔۔۔“ شفق کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ ہلا خرا یک دم اسے لے کر آفاق کے کمرے میں چلی

گئی۔ وہ بھی اس کے حکم پر رو بوٹ کی طرح اٹھ کر چل دی۔ آفاق کا کمرہ بدائش و زبائش سے آراستہ تھا۔ اتنا خوبصورت کمرہ تو اس نے خواب

میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ کہاں اس کی گھاس پھوس سے بنی جھونپڑی، ذرا سی تیز ہوا چلتی تو جھولنے لگتی تھی۔ ہارٹس ہوتی تو پرانا لے کی طرح پہنے لگتی۔

فرش تر تہر ہو جاتا، کہیں بیٹھنے کی صاف جگہ نہیں ملتی اور اب ہر طرح سے مکمل خوبصورت آرام دہ کمرہ اس کا ہو گا۔ نرم گداز بستر، خوبصورت مکمل چھت

سے لٹکا جھومر، رنگ برنگ تصویریں، کتنا خوبصورت تھا سب کچھ۔ وہ جھجکتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئی۔ شفق باہر نکل گئی۔ وہ حیرت سے۔۔۔ ہر چیز کو دیکھ

رہی تھی۔ وہ اٹھ کر ٹیبل ایپ کو دیکھنے لگی جس میں سے الکی الکی موسیقی کی آواز آ رہی تھی۔

”اس کمرے کی کسی چیز کو ہاتھ مت لگانا۔“ آفاق ایک دم پیچھے سے آ کر بولا۔ ”اور سنو، اپنی اوقات بھی کسی مت بھولنا۔ چلو ادھر کو نہ

میں سو جاؤ۔ یہ لو چار۔۔۔“ اس نے دور سے چار در سے پھینک کر دی۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اس کے تو سارے خواب ایک دم چکنا چور ہو گئے۔

”کیوں، میں نے کیا گناہ کیا ہے؟“ وہ رو رہے ہوئے قریب آ کر بولی۔

”تمہارے وجود میں بد ہے۔۔۔ تم تو گندگی کا ڈھیر ہو۔۔۔ تم میرے وجود میں نہیں سہکتی۔“

”تو پھر کیوں بیاہ کے لئے ہو؟ کیا تکلیف تھی تمہیں؟“

”تھی بہت تکلیف..... بہت جلد تمہیں بھی اس تکلیف کا پتا چل جائے گا۔“

”میں واپس جا رہی ہوں۔“ وہ گھبراڑتے ہوئے بولی۔

”واپس کا سوچنا بھی مت اور خیر دار..... اوچی آواز میں مجھ سے بات کی.....“

”میں تو چیخ چیخ کر لوگوں کو بتاؤں گی.....“

”کیا بتاؤ گی؟“ اس نے وحشیوں کی طرح اسے مارنا بیٹنا شروع کیا۔ وہ اس کے ہلکے پھلکے وجود کو ہوا میں اٹھا کر یوں زمین پر مار رہا تھا

جیسے وہ کوئی ریز کی گیند ہو اور جیسے ہی وہ آواز نکالتی تو اس کے گلے پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو جاتا۔

”خیر دار! جو تمہاری آواز نکلی، ماسی کمرے میں زندہ گاڑ دوں گا۔“ اس نے جیب سے ریو اور کال کراس کو دکھاتے ہوئے کہا۔

اس کی ناک اور منہ سے خون بہنے لگا تھا۔ جسے وہ اپنے سرخ کونے والے دوپٹے سے بار بار صاف کر رہی تھی۔ وہ بالکل خاموش تھی مگر

رو کر اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کا وجود بری طرح دکھ رہا تھا۔ اتنی اذیت، اتنا کرب دے کر بھی اس کے اندر کی آگ ٹھنڈی نہیں ہو رہی

تھی۔ پہلے وہ اپنا حصہ کسی پر نہیں نکال سکتا تھا۔ اب تو جیتنا جاگتا وجود اس کے ہاتھ لگا تھا۔ جس پر وہ جو چاہے گا کرے گا۔ وہ تھک کر مرنے پر بیٹھ گیا

اور اسے دیکھتے لگا۔ وہ اس کی نظروں سے چھپنے کی کوشش کرنے لگی۔

وہ جتنی شدت سے آنسو بہا رہی تھی، اسے اتنی ہی لطف آ رہا تھا۔ عورت روتی ہوئی کتنی اچھی لگتی ہے۔ شاید اسی لیے قدرت نے اسے

فراوانی سے آنسوؤں کا ذخیرہ دیا ہے۔ جاؤ بھاتی رہو۔ کبھی کم نہ ہوں گے۔ وہ اسے پاؤں سے ٹھوکر مارتا ہوا اپنے بستر میں گھس گیا۔ وہ وہیں زمین پر

بیٹھی کراہتی رہی۔ وہ خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا اور وہ گرم گرم آنسوؤں سے اپنی مرہم پٹی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب وہ بھکارن تھی تو

کتنی خوش تھی۔ بے سکون نیند کے مزے لیتی تھی اور اب اس جیتی مگر کے جیتی کمرے میں اس کی حیثیت ٹولے فرنیچر جیسی بھی نہ تھی۔ اتنی ذلت..... اتنی

رسوائی تو اس نے بھکارن ہو کر بھی زندگی میں نہیں سہی تھی۔ کیسا قید خانہ تھا۔ صرف دس ہزار کے عوض اس کے باپ نے اس کی حیاتی کا سودا کر دیا تھا۔

کتنے زمین اور سرسبز باغ دکھائے تھے جو صرف ایک ہی رات میں راکھ کا ڈھیر ثابت ہوئے تھے۔

صبح جب وہ دیر سے بیدار ہوا تو وہ اسی جگہ پر گھڑی سی بنی بیٹھی تھی۔ رورور کراس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ چہرے پر چٹوڑوں کے

نکات ابھی باقی تھے۔ آفاق نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”تم..... تم ابھی تک یہاں ہو..... کیا ہوا..... اور یہ خون..... یہ سب کہاں سے آیا کیا تمہیں بہت درد ہو رہا ہے؟ انھوں نے پوچھا.....“

اس نے الماری سے مرہم نکال کر اس کے لگایا۔ چین کھڑ دیں اور چائے منگوا کر اسے چائے دی۔ اب تم سو جاؤ۔“ اس نے اسے زمین پر بچھے میٹرز پر

لٹا دیا۔ وہ حیرت سے مسلسل اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یہ کیسا عجیب انسان تھا۔ رات کو وہ کسی وحشی سے کم نہیں لگ رہا تھا اور اب جو اس نے شفیق

انسان کا روپ دھارا تو سارے دُشمن بھرے رستے لگے۔ محبت کا بہلا والے سے اندر کی تمام تکلیف بھرے متحرک ہونے لگیں۔ انسان کیا ہوتا ہے،

اتنا برا بھی اور اتنا اچھا بھی۔

رات کو وہ وحشی درندے سے بھی بدتر لگ رہا تھا اور اب کسی فرشتے سے کم دکھائی دندے رہا تھا۔ اس کے اندر خوف بھی کنڈلی مار کر بیٹھ گیا تھا اور وحشی بھی لنگی روشنی کے مانند تھوڑا سا سرور دے رہی تھی۔ وہ اسے کھل اڑھا کر خود باہر نکل گیا اور وہ گہری نیند سو گئی۔

.....

”آؤ..... میرے ساتھ ہم آواز ہو کر گاؤ۔“ عابد نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

”میں..... کیسے.....؟“ وہ بے اعتمادی سے بولی۔

”میں تمہارے ساتھ ہوں نا.....“ عابد نے اس کے خوبصورت چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”مگر میں.....“ وہ جھینپ کر بولی۔ اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہونے لگا۔

”گاؤ..... سارے..... گا..... پا..... دھا..... نی..... سا..... سات نر کائنات کے سات رنگ، سات زمیں..... سات آسمان۔

کیا میرے اندر کے سات نر تمہارے اندر کے سات نردن کو متحرک نہیں کر سکتے۔ سب کچھ ممکن ہے۔ ہر گلے میں ساڑھے اور ہر آواز میں سوز۔ بے شکم شور میں بھی روم ہوتا ہے اور بے ترتیب لے میں بھی نر۔ مجھے امید ہے کہ تم بہت جلد گانا سیکھ لو گی۔“ اس نے اچانک اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی انگلیاں پیا نو پر رکھیں۔ اس کا وجود دکھنے لگا۔ وہ مکمل طور پر اس کے اختیار میں تھی۔ اس کے اندر برقی روی دوڑنے لگی۔ نچرے سا کھنکھارہ جو اس کی حرکت ہی پیدا ہونے لگی۔

”تم بہت جلد سیکھ لو گی..... تم سب کچھ کر سکتی ہو۔ بس کوشش کرو۔ دیکھنا، بہت جلد میں اپنے نر تمہارے اندر جگا دوں گا اور ہم ایک آواز بن کر دنیا میں پھیل چا دیں گے۔“ عابد نے اعتماد لہجے میں بولا۔

”نہیں، میں منفرد آواز بننا چاہتی ہوں۔“ وہ ایک دم ہاتھ چھڑا کر بولی۔

”کیوں؟“

”اس لیے کہ میرا اپنا وجود ہے۔ میں اپنے ٹیلنٹ کو خود انکسپلور کرنا چاہتی ہوں۔ اپنی شناخت دنیا میں خود پیدا کرنا چاہتی ہوں۔ میرا ٹیلنٹ میری ذات کی شناخت ہے۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ زمانہ مجھے کس حد تک قبول کرتا ہے؟“ وہ بڑے جوش لہجے میں بولی۔

”پھر کیا ہوگا؟“ اس نے حیرت سے مسکرا کر پوچھا۔

”معلوم نہیں..... مگر کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوگا۔“

”تم کیوں ان پکروں میں پڑتی ہو۔ جیسا ہے ویسا ہی چلنے دو۔ اس انکسپلوریشن کا قاعدہ.....؟“

”قاعدہ یا نقصان میں نہیں جاتی۔ میں بس اپنے اندر کی تسکین چاہتی ہوں۔ میرے اندر ایک طوفان برپا رہتا ہے۔ میں کچھ ایسا کرنا

چاہتی ہوں کہ جو سب سے منفرد ہو۔ جس میں میرے باپ کی شخصیت کا عکس نہ ہو۔ میری کامیابیاں صرف میری ہوں۔ میرے اندر بہت اداسیاں اور

بے چہیلیاں ہیں۔ میں اپنے اندر بھی محرومیوں کو ختم کرنا چاہتی ہوں ورنہ زندگی یونہی بربادی میں گزر جائے گی۔“

”تمہاری سوچوں میں توازن کیوں نہیں؟“ عابد نے حیرت سے پوچھا۔

”کبھی بے درجہ سوچوں..... بے ترتیب ذواویں..... آڑی ترچھی لکیروں اور سوچوں کے تصور سے توازن اور ہم آہنگ سوچوں اور مثبت

نظریات نے بھی جنم لیا ہے؟“ وہ بے تکان بولتی گئی۔

”تم کس کی تلاش میں ہو؟“

”معلوم نہیں..... مجھے تو آج تک یہی معلوم نہیں ہوسکا کہ میں کیا ہوں اور مجھے کس شے کی ضرورت اور تلاش ہے۔ میں بس ہوں، جیسے

ریٹکن ہوا کیڑا نہیں جانتا، وہ کس لیے ریگ رہا ہے اور اسے کس کی تلاش ہے اور اسی تلاش میں وہ کسی دن پاؤں تلے آ کر مر جاتا ہے۔ میں نے

زندگی تو یونہی گزار دی مگر اب ایسی بے بسی سے مرنا نہیں چاہتی۔“

”مگر یہ سب تمہارے ساتھ ہی کیوں ہے؟ ذویا تو ایسی نہیں؟“

”آپ کو معلوم ہے جب جنرل ڈسٹرب ہوں تو اب نارملٹی جنم لیتی ہے اور پھر اس سے انتشار جنم لیتا ہے۔ سوچ کا اور فکر کا۔ یہ سب کچھ جنرل

ایر کی وجہ سے ہے۔ یہ اضطراب اور انتشار کو ختم دیتا ہے اور انتشار پاگل پن اور دیوانگی کو۔ میں اور میرا بھائی اس منافقوں کی سوسائٹی کے شاید ایب

نارمل کردار ہیں۔ شیزوفرینک کریکٹرز..... یا پھر بہت نارمل اور پوزیٹو۔“ وہ ایک دم بولنا شروع ہوئی تو بولتی گئی۔

”تمہارا ذہن بہت متحرک ہے، کیا پڑھتی ہو؟“

”نفسیات اور فلسفہ.....“

”شاید اسی لیے..... مگر اتنا کچھ مدت سوچا کرو۔“

”تو پھر کیا سوچوں.....؟“

”کچھ چھا بھی تو سوچ سکتی ہو، خوبصورت.....“

”خوبصورت سوچ، خوبصورت ماحول سے پیدا ہوتی ہے اور میری آنکھوں نے تو کوئی خوبصورتی دیکھی ہی نہیں۔ کانوں نے خوبصورت

باتیں ہی نہیں سنیں اور جسم نے خوبصورت احساسات اور لمس کو کبھی لمس ہی نہیں کیا تو میں ابھی سوچ کہاں سے لاؤں۔“ وہ قدرے بے بسی سے بولی۔

”اچھا..... تم آج میرے گانے کو صرف سنو۔ ایس ایچ ڈاؤنلڈ یعنی آواز کا اتار چڑھاؤ۔ کہاں میوزک سلو آتا ہے اور کہاں فاسٹ۔

کہاں ردم ہوتا ہے اور کہاں آواز..... اور سب کچھ بھول کر سنو۔“

”کیوں..... کچھ پانے کے لیے اپنے آپ کو بھلانا ضروری ہے کیا؟“

”ہاں..... یہی قانونِ فطرت ہے۔ کسی بھی شے کو پانے کے لیے چمکان ضروری ہے اور چمکان کے لیے اپنے آپ کو کبھی بھلانا ضروری ہے۔“

”لیکن میں ان چیزوں کی پروا نہیں کرتی۔ آپ مجھے شروں کے بغیر ہی سکھائیں۔“

”اچھا ہاں!“ اس نے کنارہ کش کر گانا شروع کیا۔ وہ اتنے بڑے جوش انداز میں گارہا تھا کہ وہ واقعی اپنے آپ کو بھول گیا تھا۔ سارا، سارا والد میں مکمل ہم آہنگی بے حد بھلی لگ رہی تھی۔ وہ بہت اچھا گارہا تھا۔ قدرت نے اسے آواز بھی خوبصورت دی تھی یا پھر اس کا پیشہ ہی یہی تھا۔ اس کے باپ اور والدہ بھی شادی بیاہ کے موقع پر بیٹہ ہا ہے بجاتے اور گاتے تھے۔۔۔۔۔ وہ ذات کا مہرائی تھا۔ انسانوں کے جہم میں ریگتا ہوا کیڑا۔ حقیر ذرہ مگر اب وہ میڈلک ماسٹر تھا۔ گروپ انچارج، لے اور سُر کو جاننے والا۔ موسیقی کا رسیا۔

”میں آپ جیسا کبھی بھی نہیں کا سکتی۔“ وہ اس کے گانا ختم کرنے پر بولی۔

”کیوں؟“

”میرے جنم میں طمانیت ہی نہیں۔ موسیقی تو اندر سے جنم لیتی ہے، جب اندر سکون ہو، مناسب ہو، ہم آہنگی ہو۔ مجھے معلوم ہے میں کبھی بھی اچھا نہیں کا سکوں گی۔“ وہ دونوں لہجے میں بولی اور بیک اٹھا کر چل دی۔

”یار اتھارہاری سبیلی تو مجھے پاگل لگتی ہے۔“ عابد نے اس کے جانے کے بعد زویا سے کہا۔

”ہاں، ہے تو سہی مگر تھوڑی سی۔“

”تھوڑی سی نہیں، بہت زیادہ۔۔۔۔۔“

”اے بھئی یہ کیلکٹ چائلڈ ہے۔۔۔۔۔ تو ظاہر ہے، ایسی ہی ہوگی؟“

”کیا مطلب؟“

”فصل بات ہے چھوڑو اسے۔ اب تو اکثریت ہی ایسی ہے۔“ زویا منہ ہٹا کر بولی۔

”ویسے یہ نمونہ تمہیں ملا کہاں سے؟“ وہ ہنسنے ہوئے بولا۔

”کارلج میں ہی جان پہچان ہوئی اور جب مجھے اس کے فادر کا معلوم ہوا کہ وہ زبردست پالنے والی پر سناتی ہیں۔ پھر تو میں نے خود ہی دوستی بنائی۔ تمہیں تو معلوم ہے کیا ایسے لوگوں سے تو میں دوستیاں بنانے میں ماہر ہوں۔“ زویا نے آنکھ دھا کر کہا۔

”آئی سی۔۔۔۔۔ اسی لیے۔۔۔۔۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس دوستی کے پیچھے کیا راز ہو سکتا ہے؟“

”اچھا، یہ تاؤ کہ تمہارا اپنا لہم کب آ رہا ہے؟“ زویا نے اس سے پوچھا۔

”بہت جلد۔۔۔۔۔“

”سپر ہٹ ہوگا۔۔۔۔۔“ زویا خوشامدی لہجے میں بولی۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”میں جانتی ہوں کہ تم نے بہت محنت کی ہے۔“

”لیکن صرف محنت کسی کو شہرت کی بلند یوں تک نہیں پہنچا سکتی۔“

”تو پھر کیا چاہیے؟“

”سکونٹیکٹس۔۔۔ ایڈز ٹرمز۔۔۔“

”کیا مطلب۔۔۔؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”بڑے لوگوں کی اسپانسر شپ اور ان کے سپورٹنگ چنڈا“ وہ مایوسی سے بولا۔

”تو شفق سے بات کیوں نہیں کرتے۔ آخر اس کی دوستی کس کام آئے گی۔ اپنے قادر کو کہے تاکہ وہ تمہیں اسپانسر کریں؟“

”بہت مشکل ہے۔ وہ بہت عجیب و غریب قسم کی لڑکی ہے۔ مجھے اس کی باتوں سے، باپ کے لیے نفرت کی ہوا آتی ہے۔ وہ اپنی فیملی کو بھی

ناپسند کرتی ہے اور شاید اپنے باپ کو بھی۔ میرا نہیں خیال کہ وہ میرے لیے اپنے باپ سے بات کرے گی۔ اس کی انفرادیت معلوم ہے کیا ہے، وہ ان چیزوں کو اہمیت دیتی ہے جنہیں نظر انداز کرنا چاہیے۔۔۔ جنہیں نظر انداز کرنا چاہیے، انہیں دبا لیا جانے لگتی ہے۔ میرا نہیں خیال کہ وہ اس سلسلے میں کچھ کر سکے گی۔“ عابد قدرے مایوسی سے بولا۔

”بات کر لینے میں کیا حرج ہے؟“ زویا نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ کل آئے گی تو بات کروں گا۔ مگر مجھے امید نہیں۔“

”میرے پاپا اور تمہیں سپورٹ کریں گے۔۔۔ اپنی فٹ۔۔۔ جو ہمیں کسی معاملے میں سپورٹ نہ کر سکے وہ تمہیں کیا کریں گے اور ویسے

بھی، وہ صرف اسی بندے کو سپورٹ کرتے ہیں جہاں انہیں کوئی فائدہ مقصود ہو۔ تم تو ان کے لیے قطعی اہم نہیں۔ تم جس خوش فہمی میں مبتلا ہو، سب نکال دو۔“ وہ تہہ بے تہہ لگا کر بولی۔

”اچھا اگر تمہارا الیم بنایا جائے؟“

”میرا الیم۔۔۔ ہاؤ فلی۔۔۔ گانا ڈھنگ کا آتا نہیں، الیم خاک بناؤ گے۔“ وہ بہت بے باک اور منہ پھٹ ہوتی جا رہی تھی۔

”اچھا تو ایک کنسرٹ میں ساتھ دو گی۔۔۔۔۔“ وہ اسے درغلز رہا تھا۔

”مگر یہ سب کیسے ممکن ہے۔۔۔ مجھے تو کسی بھی بات کا کوئی تجربہ نہیں۔“

”اس دلعزیز تم صرف ساتھ دو گی، پھر آہستہ آہستہ تم میں احماد آنے لگے گا تو پھر کوئی مشکل نہیں ہوگی۔“

”ٹھیک ہے، سوچ کر بتاؤں گی۔“ شفق کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

”موتی اچھا ہے۔۔۔ اس کو یوں سوچنے میں ضائع مت کرنا۔“

”ٹھیک ہے، ایک دو دن میں بتا دوں گی۔“

”ٹھیک ہے، میں انتظار کروں گا۔“ وہ مشتاقی سے لہجے میں بولا۔ سہیل اسے لینے آیا مگر قدرے خفا لگ رہا تھا۔

”تم ناراض کیوں ہو۔۔۔ کیا بات ہے؟“ شفق نے اس کے تیردیکھ کر پوچھا۔

"تم مجھ سے کیا پوچھ رہی ہو..... کیا تمہیں خود معلوم نہیں کہ تم کتنی بدل گئی ہو۔ تم پہلے والی شفق نہیں لگتیں..... تمہارے لہجے میں کتنی بے باکی آتی جا رہی ہے اور ہاتھوں میں عجیب سی بناوٹ..... تم وہاں کیا کرتی رہتی ہو۔"

"کچھ بھی نہیں، تم تو خواہ مخواہ میرے بارے میں مشکوک رہتے ہو۔"

"میں نہیں، ملک صاحب پوچھ رہے تھے۔"

"کیا پوچھ رہے تھے؟" اس نے تیزی سے چہرہ کر پوچھا۔

"تم کہاں جاتی ہو..... اور کس لیے....."

"اچھا..... تو انیس فرسٹ ملی گئی.....؟" وہ غریب لہجے میں بولی۔

"ہاں، وہ اکثر پوچھتے رہتے ہیں۔"

"بڑی بات ہے، آج کل ان کی رینج میں اور کوئی نہیں.....؟"

"کیا فضول باتیں کرتی ہو۔" وہ خشکی سے لہجے میں بولا۔

"بات تم نے خود ہی شروع کی ہے۔"

"یہ بتاؤ، تم کب تک یہاں آتی رہو گی؟"

"معلوم نہیں لیکن میں اب خود ہی آیا کروں گی..... میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا.....؟" وہ اب طیش میں آ چکا تھا۔

"زویا کہہ رہی تھی اس کا ڈرا تیر....." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"نام مت لو..... اس غیبیٹ کا میرے سامنے....."

"آخر تم کیوں زویا سے اتنے اربک ہو؟"

"بس تم کہیں نہیں جایا کرو گی..... جہاں بھی جانا ہوگا، میں خود چھوڑ کر آؤں گا۔" اس کے جواب سے اسے سخت کھٹ ہو رہی تھی۔ وہ اس کو کیسے سمجھاتی کہ عابد سے اس کی کنٹنٹ ہے مگر عابد کا نام لے کر وہ اسے حریفہ نہیں دلانا چاہتی تھی۔

"تمہارا سا بگڑا مزکب ہیں؟"

"ابھی ایک دو ماہ ہیں۔"

"شکر ہے یہاں سے تو جان چھوٹے گی۔" وہ اس کا جواب سن کر ایک دم چونکی اور ذہن میں مختلف جواز ڈھونڈنے لگی۔ سبیل اس کی تنہائیوں کا قائل احمد اساتھی رہا تھا۔ وہ اکثر اپنا قصہ اس پر نکالتی اور وہ خاموشی سے سب کچھ برداشت کر جاتا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کتنی تنہا اور اداس تھی۔ وہ اس سے عمر میں دس سال بڑا تھا۔ سمجھدار تھا۔ اس لیے اس کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس کی حماقتوں اور بد تمیزیوں کو نظر انداز کرتا تھا۔ اسے محبت

سے اور ڈانٹ سے سمجھاتا تھا۔ وہ اس سے بے شمار شکوے شکایتیں کرتی۔ اپنی ہر بات اس کو ستانی اپنی سبیلوں کی کالج کی، ٹیچر کی، کوئی بھی بات اس سے نہ چھپاتی۔ مگر جب سے وہ زویا کے گھر جانا شروع ہوئی تھی، وہ اسے کوئی بات نہیں بتاتی تھی۔ نہ زویا کی نہ اپنی مصروفیت کی اور سبیل اس بات کو بہت محسوس کر رہا تھا۔ وہاں ایسا کیا تھا جو وہ بتانا نہیں چاہتی تھی اور اچانک وہاں خود چا کر وہ اسے غصہ نہیں دلاتا چاہتا تھا۔ وہ کیسے اتنی جلدی بدل گئی تھی۔ اس کے سامنے دیکھتے ہی دیکھتے بالکل نیا وجود جنم لے رہا تھا۔



سحر ناز دھوکہ کھاتا رہا، آج تمہارے لیے نئے کپڑے بھی خریدنے ہیں اور تمہیں پارلر بھی لے کر جانا ہے۔“ آفاق نے ایک دم مسکرا کر اس سے کہا تو وہ چونک سی گئی۔

”ہی... تم کتنے اچھے ہو۔“ وہ قدرے خوشی سے چلائی۔

پچھلی رات اس نے زندگی میں پہلی بار جنسی جسمانی لذت سہی تھی، اب اس کی آواز اور خوشی میں اس کرب کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ کس مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ کیا ہر عورت ایسی ہی سخت جاں اور ڈھیت ہوتی ہے۔ اتنی تنخیاں سہہ کر بھی ایک اچھی بات کی خاطر سب کچھ بھول جاتی ہے۔ اندر ہی اندر کہتے پر دگر اڑتا ہے، بلند و بانگ دعوے کرتی ہے کہ اب اس شخص کو کبھی زندگی میں منہ نہ لگائے گی۔ جس نے اس کی انا کو کچلا ہے اس کے وجود کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے اس کے جذبات کو طعنے پہنچانے کے درپے ہے مگر جب مرد صرف ایک دفعہ مسکرا کر دیکھتا ہے تو سارے گلے شکوے، دعوے ہوا ہو جاتے ہیں۔ صرف ایک مسکراہٹ کی خاطر ایک دلا سے کے بدلے، پھر وہی پہلے جیسی دقا، پہلے جیسی عزائیں..... اور محبتیں۔ یہ عورت بھی کیا غلط ہے؟ وہ مجرم بنا گاڑی چلاتے ہوئے خودی سوچ رہا تھا اور وہ اس کی ستم ظریفی پر مسکرا رہی تھی۔ اپنی قسمت پر نازاں تھی۔ اس نے ایک دفعہ بھی شکوہ نہیں کیا تھا۔ ایک دفعہ بھی اسے یاد نہیں دلایا تھا۔ مبادا وہ پھر کہیں ناراض نہ ہو جائے اور اگر وہ ناراض ہو گیا تو وہ زندہ ورگہ نہ ہو جائے گی۔ یہ دنیا اور اس کی زمین اس کے لیے کتنی کم پڑ جائے گی، شاید اس کا کہیں بھی ٹھکانا نہ ہے۔

مرد اور عورت کی کھانسی کتنی عجیب و غریب ہے، نہ سنبھلنے والی تھی اور نہ بچھانے والی۔ کیا ہر عورت ایسی ہی ہوتی ہے، سب کچھ بھولنے والی، ایک فقیرنی، کم ذات عورت میں اتنا حوصلہ ہے تو اس تعلیم یافتہ میں اتنا بھی حوصلہ نہ تھا کہ خاموشی سے کچھ اور برداشت کر لیتی۔ اس نے خود ماں کو باپ سے مار کھاتے دیکھا تھا اس کے ذہن میں سب کچھ نقش تھا اور وہ ایسی ہی مار مٹکتی کو مار کر اپنے بچپن کے شدید پہچانی جذبات کا کھار س کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بھی کبھی منگنی کی طرح لب نہ کھولے تھے تو پھر اچانک وہ کیوں بدل گئی؟ اس نے کیوں اتنا بڑا فیصلہ کر لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو حیرنے لگے۔

”اوائے ہاں تو کوئی بات نہیں کرے ہے..... کوئی اچھی بات کراں.....“ وہ قدرے لاڈ سے بولی۔

”کیا بولوں..... بولنے کے لیے کچھ ہوتا بولوں..... اور سنو تم یہ اپنی زبان تو رابدلو.....“ وہ غصے سے ڈانٹتے ہوئے بولا۔

”میں کیوں بدلوں اپنی زبان..... جو بچپن سے سیکھا ہے وہ کیسے بدل دوں۔ میری بولی میرے علاقے کی ہے، میں کاہے کو بدلوں.....؟“

”اب تمہیں اگر میرے گھر میں رہنا ہے تو اپنی زبان اور بولی کو بدلو..... ورنہ.....“ اس نے غصے سے گھور کر اسے دیکھا۔

”اچھا ٹھیک ہے، کوشش کرو ہوں۔“ وہ ایک دم اس کی دمکی سے ڈر گئی۔ اس نے خود ہی اپنی پسند کے اچھے اچھے کپڑے اسے خرید کر دیے۔ پارک لے کر گیا۔ اس کی کھنگ کروائی، فٹیل کر دیا۔ سب کچھ ہو گیا۔ وہ تھوڑی سی بدلی، زیادہ نہیں۔ وہ پریشان ہو گیا۔ جب وہ بات کرتی، ماضی کی جھلک نمایاں ہو جاتی۔ وہ ماضی میں جس طرح لے میں سب سے اونچی بھرپور آواز لگاتی تھی، تو سوائے ہوئے بھی جاگ پڑتے تھے۔ یہ کم بخت منگتی صبح آ کر بہت تنگ کرتی ہے، بہت شور مچاتی ہے۔ لوگ اسے گھر کتے۔

”ارے کون سا روز روز آتی ہوں۔ منگتی کو دو گے تو اللہ بہت دے گا۔“ وہ ہونٹوں کو پھیلا کر اور منہ کو کھول کھول کر بات کرتی تو اس کا وہاںہہ قدرے پھیل جاتا اور یہ ہانساں اتنا پھیل چکا تھا کہ بات کرتے یا جنتے ہوئے کھٹ سے پورے بتیس دایوں کی قطار کو بھر پور طریقے سے ظاہر کرتا۔

”ماضی کو کمریج کمریج کر صاف کرنا ہوگا۔“ اتفاق نے اس کی طرف دیکھ کر سوچا۔

”ہاؤ کیسی لگوں ہوں؟“ اس نے گاڑی میں بیٹھے ہوئے کہا۔ اس کا بھرا ہوا وجود مختلف قسم کے فنی ہاؤ ای اسپرے، میجر اسپرے وغیرہ سے مغطی ہو رہا تھا۔ وہ کچھ سپانس چاہتی تھی۔ محبت بھر اس..... بھر پور..... پہلے وہ اپنے حقیر وجود کو اس کے قابل نہیں سمجھتی تھی اور آج تو وہ اپنے آپ کو قدرے اہم سمجھ رہی تھی۔ اس کے اندر کچھ خود اعتمادی اور خوش فہمی بھی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ مسکرا رہی تھی..... اور اس کی مسکراہٹ اسے ذہن پرکھ رہی تھی۔

”اپنا آپ مت بھولو.....“ اس نے اسے جھڑکا۔

”ہاں تو کیا ہوا میں..... واقعی میں تو بھول ہی گئی.....“ وہ ایک دم خاموش ہو گئی اور سوچنے لگی۔ کبھی کسی کا ماضی بھی بدلا ہے۔ میں منگتی ہوں، منگتی فقیرنی۔ پہلے دور دور پر مانگتی پھرتی تھی، اب ایک ہی در کی پالتو کتیا ہو گئی ہوں۔ یہ کبھی مجھے سحر کہتا ہے تو کبھی منگتی کا ماضی یاد دلاتا ہے۔ وہ متضاد نام، دو مختلف وجود۔ ایک بدن دو وجود۔ دو شخصیتیں، دو رخ۔ ہر رخ تکلیفوں سے بھرپور، منگتی فقیرنی مر گئی جس دن اس کی شادی ہوئی اور اب وہ سحر ہے۔ اسپروں کی بہو اور اسپر زائے کی دلہن۔ وہی کرنا پڑے گا جیسا وہ کہتا ہے۔ پیلا ذوال ختم، جو فقیر اکہتا تھا وہ کرتی رہی تھی، اب جو اتفاق کہے گا، وہ کرنا پڑے گا۔ اب نہ جانے کیا کیا کچھ بہا پڑے گا۔ اس نے دکھ سے سوچا۔

وہ گھر میں داخل ہوئی تو ہر ایک نے اس کی طرف چونک کر حیرت سے دیکھا۔ وہ پنک کاٹن کے اسٹاکش سوٹ اور باب اسٹائل میجر کٹ میں قدرے مختلف لگ رہی تھی۔

”سحر اتم اچھی لگ رہی ہو۔“ شفیق نے قدرے محبت سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

شرانے بھی حیران کن لگا ہوں سے دیکھا مگر کچھ کہا نہیں۔ اس نے کبھی بھی ان کے معاملات میں نہ داخل اندازی کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی رائے دینے کی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ دونوں بہن بھائی اسے کتنا پسند کرتے تھے۔ اس کی ہر بات کا اظہار مطلب لینے تھے اور اس پر کتنا غور کرتے تھے۔ شادی کے بعد اس نے ایک دو دفعہ فاصلے مٹانے کی کوشش کی مگر اسے برے سپانس کا سامنا کرنا پڑا اس لیے وہ خاموش رہتی تھی۔

اتفاق آنکھیں بند کیے بستر پر لیٹا تھا۔ نہ جانے کیوں، آج اسے اس سے بہت محبت محسوس ہو رہی تھی۔ ایک لمحے کو اپنی ذات اور حیثیت بھولتے ہوئے وہ اس کے قریب جا کر بیٹھ گئی اور دائرگی میں اس کے بالوں میں انگلیاں بھرنے لگی۔ وہ ایک دم چونک کر اٹھا۔ اس کی آنکھیں فٹیل برسا رہی تھیں۔

”تم..... تمہاری یہ حرمت..... میرے بستر پر تم کیوں بیٹھیں..... اور تم کیوں اپنا آپ بھول جاتی ہو۔ یہ کپڑے، یہ میک اپ، یہ خوشبو نہیں کبھی بھی تمہارا سزا مند زدہ وجود نہیں بدل سکتیں۔“ اس نے اس انداز میں جتنا اٹھا کر اسے مارنا شروع کیا جیسے بھین میں اس نے ایک دفعہ باپ کو اس کی ماں کو مارے دیکھا تھا۔ اسے تھوڑا تھوڑا یاد تھا، جب نانا ابا کوئی کاغذات لائے تھے اور اس کی ماں پہلی دفعہ کچھ بولی تھی۔ یونہی اس کے باپ کے بستر پر بیٹھ کر اس نے کچھ کہا تھا اور اسی طرح اس کے باپ نے اس کو دھنک کر رکھ دیا تھا۔ وہ اسے اٹھا اٹھا کر بیٹھ رہا تھا۔ کبھی اس کے گلے پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہوتا، کبھی اس کے بال کھینچا اور وہ بغیر آواز لگا لے روٹی رہی۔ ساری رات دروٹی رہی اور صبح ہونے پر وہ پھر باہر نکل گیا۔

”آئی ایم سوری انہ جانے کیوں تم جب بھی میرے سامنے آتی ہو، میں بدحواس ہو جاتا ہوں۔ سب کچھ بھول جاتا ہوں اور مجھے بہت کچھ یاد آنے لگتا ہے۔ میں بہت ہما ہوں، آئی ایم ریلی سوری اوں کھو، مجھے معاف کر دو۔ اوہ تمہارا تو بہت خون بہہ گیا ہے۔ سر پر اتنی گہری چوٹ آئی ہے۔“ اس نے اس کی بیٹھنیج کی زخموں پر مرہم لگا دیا اور پہلی دفعہ اسے بستر پر لٹایا۔ وہ حیرت سے دیکھتی رہی، وہ اس کے قریب آیا۔

”تم مجھ سے محبت کرنا چاہتی ہو مگر میں..... میں تو محبت ہی نہیں کر سکتا۔ مجھے محبت کرنا آتی ہی نہیں۔ کیا تم جانتی ہو محبت کیسے کرتے ہیں؟ میں نے تو آج تک کسی کو محبت کرتے بھی نہیں دیکھا۔ تم کیوں یہ سب کرنا چاہتی ہو، جو میں نہیں کر سکتا؟“

”کیا میاں بیوی محبت نہیں کرتے؟“ اس نے پہلی دفعہ لب کھولے۔

”کون سے میاں بیوی..... میں نے تو کسی میاں بیوی کو محبت کرتے نہیں دیکھا۔ بس مارتے اور پیٹتے ہی دیکھا ہے۔“ وہ انسر دے سے بولا۔

”کس کو..... کون کس کو مارتا ہے؟“ وہ کچھ نہ کچھ سکی۔

”بس کچھ نہیں..... مجھ سے سوال مت کیا کرو۔“

”میں تم سے کچھ بھی نہیں چاہتی۔ نہ یہ تمہارا خوبصورت کمر، نہ تمہاری چیزیں، نہ دولت نہ گاڑی۔ ہم تو جمونہڑی میں پلنے والے لوگ ہیں۔ تھوڑے پر خوش ہونے والے۔ صرف مجھے ایک چیز دے دو۔“ اس نے التجا سے لہجے میں کہا۔

”کیا.....؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”صرف اپنے قریب آنے کی اجازت دے دو۔ جب تم مجھے دھکارتے ہو تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں انسان نہیں جاںور ہوں۔ کوئی ذلیل لکڑیا ہوں، خداش والی۔ جس سے لوگ دور دور بھاگتے ہیں۔ تم مجھے جتنا مرضی مار لیا کرو، جو مرضی کرو مگر یوں نہ کیا کرو۔“ دور ونا شروع ہو گئی۔

”کیسے..... یہ سب.....؟“ اس نے حیرت سے دیکھ کر کہا۔

”اس طرح.....“ وہ اس کے سینے سے لگ گئی اور رونے لگی۔ محبت اور وارنٹی کا نیا انداز اس کے اندر بیچانی کیفیت پیدا کرنے لگا۔ اس کے اندر جذبہ باتیت کی لہریں دوڑنے لگیں۔ پہلی دفعہ کسی کو اسے قریب پا کر وہ بہت عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔

ہر رات پہلی سے زیادہ اذیت ناک ہوتی۔ وہ وحشی درد مند بن کر اسے خوب، مارنا، پیٹنا، بھتی اذیت دے سکتا، وہ اسے دیتا۔ شام کے چلے اندر میرے پھیلتے ہی اسے یہ خیال تنگ کرنے لگتا۔ ابھی بس ابھی..... چند لمحوں بعد وہ اس کے جسم کو روٹی کی طرح دھنک کر رکھ دے گا۔ اس کا بدن

اب اذیت سننے کا عادی ہو رہا تھا۔ عورت بھی کتنی سخت جان اور اذیت ہوتی ہے۔ صرف روشن اور چمک دار صبح کی خاطر سب کچھ سہتی ہے۔ جب وہ ٹارل ہوتا، اس کی مرہم پٹی کرتا، اسے دوائیں دیتا تو وہ خوش ہو جاتی اور سارا دن پرسکون سوئی رہتی اور وہ باہر گھومتا رہتا۔ یہ کیسی زندگی تھی، جس کا وہ کوئی متعقد تھا، نہ کسی حاصل کی تمنا۔ وہ کیا کر رہے تھے۔ ذمہ داری گز اور ہے تھے یا پھر گزارہ کر رہے تھے مگر وہ مجبور تھے۔ ایک دوسرے کو چھوڑ سکتے تھے۔ آفاق اس کو چھوڑ سکتا تھا مگر وہ نہیں۔ اب تو کسی قیمت پر بھی نہیں۔ وہ اس سے شدید محبت کرنے لگی تھی، ایسی محبت جس میں نفرت زیادہ تھی اور محبت کم۔ جس میں لیس کم اور اذیت زیادہ تھی۔ ایسی محبت جس نے اس کے وجود کو..... اور اس کی روح کو زخمی کر چھوڑا تھا مگر وہ صرف اس کے محبت بھرے لیس کو یاد رکھتی باقی سب کچھ بھول جاتی، اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ ہر مرد، ہر عورت کے ساتھ ایسا ہی کرتا آیا ہے یا پھر صرف وہی؟ مگر اس نے اپنے باپ فقیر کے کو بھی اس کی ماں کو مارتے دیکھا تھا۔ اس کی ماں بھی اس کی طرح اذیت تھی۔ تو مرد چاہے جھوٹا ہی کا ہو یا نکل کا۔ وہ کبھی بھی نہیں بدلتا اور عورت بھی نہیں بدلتی۔ چاہے کٹیا میں سوئے چاہے آراستہ بیڈ پر۔ اس کا وجود ایک جیسا حقیر رہتا ہے۔ نہ کبھی محبت بدلتی ہے اور نہ نفرت۔ وہ زیادہ تر وقت خاموش رہتی، کسی سے بھی کوئی بات نہ کرتی۔ آفاق سے بھی بہت کم.....

”سحرا تم ٹھیک ہوتا؟“ شفق نے اسے بہت دنوں کے بعد دیکھا تھا اور وہ اسے بہت غلط لگ رہی تھی، بہت عجیبہ اور خاموش سی۔

”ہاں.....“ وہ آہ بھر کر بولی۔

”کیا بات ہے؟ تم کچھ بونی نہیں۔“ شفق نے اسے کریدنا چاہا۔

”کیا کہوں..... کہنے کے لیے کچھ بھی تو نہیں.....“

”تم اور اس لگ رہی ہو؟“

”نہیں، ٹھیک ہوں۔“ وہ آہ بھر کر بولی۔

”سحرا تم مجھ سے ہر بات کر سکتی ہو“ شفق نے اسے احاطہ کر لیا۔

”کیا بات؟ کہنے کو کچھ بھی تو نہیں ہے۔“

”آفاق تمہارے ساتھ ٹھیک ہے..... میرا مطلب ہے.....؟“

”ہاں، بہت اچھا ہے۔“ وہ قدرے اسی سے بولی۔

”تم بہت بدل گئی ہو“

”عورت ذات تو بدلتی ہی رہتی ہے، ہر گھڑی..... ہر وقت..... میں پہلے بچی تھی تو اور تھی، بڑی ہوئی تو اور ہو گئی، اب شادی ہو گئی تو اور ہو گئی۔ میں نئے جنم لیتی ہوں تو پہلے والی مرنے جاتی ہوں۔ مرنے تک بدلتی ہی رہوں گی۔ معلوم نہیں عورت ذات کیوں اتنا بدلتی ہے۔“ اس نے السردہ لہجہ میں کہا تو شفق اس کی بات من کر رہے تھی۔

”سحرا تم کیسی باتیں کرنے لگی ہو۔ تم نے..... میرا مطلب ہے کس سے یہ باتیں سیکھی ہیں؟“

”سینکھنی کہاں سے ہیں، یہ تو آپ ہی آپ اندر سے آتی ہیں اور جہانم سے آتی ہیں۔ ان کو سکھانے والا کوئی بھی نہیں ہوتا۔ پتا نہیں کہاں سے آتی راتیں ہیں“ وہ بولتی گئی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ تم صحیح کہہ رہی ہو۔ عورت لمحہ بہ لمحہ بدلتی رہتی ہے۔ نئی سوچ کے ساتھ نیا وجود جنم لیتا ہے۔ پہلا وجود ماضی بن جاتا ہے اور ماضی تو دفن ہی ہونے کے لیے ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اس کا بدلہ تو یہی ہے۔“

شفیق نے کہا تو وہ خاموشی سے سنتی رہی۔



اس کی قربت نے اس کے اندر کو دہلا کر دیا تھا۔ وہ اک نئے لمس سے آشنا ہوا تھا۔ وہ لڑکیوں کو دور دور سے چھیڑنے اور ٹیڑ کرنے کا عادی تھا مگر یوں کسی کو قریب سے محسوس کرنے کا اتفاق اسے نہیں ہوا تھا۔ وہ اکثر خود ہی جھنجھلا جاتا۔ کیا یہ محبت ہے یا بھڑکائیس۔۔۔۔۔ جو بھی ہے، کیا اتنی قربت کے بعد کسی کو چھوڑنا ممکن ہے۔۔۔۔۔ اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود۔۔۔۔۔ وہ اس کے سامنے کارپٹ پر بیٹھی تھی اور وہ مسلسل اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

”کیا دیکھ رہے ہو؟“ اس نے مسکرا کر پوچھا۔

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔ شاید آنے والے دنوں کے بارے میں۔۔۔۔۔ جب تم مجھے چھوڑ دو گی۔۔۔۔۔ یا بھر میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔“

”خدا نہ کرے!“ وہ ٹپ کر اس کی طرف بڑھی۔

”کیوں۔۔۔۔۔ ایسا کیوں نہیں ہوگا؟“

”آفاق۔۔۔۔۔! میں تمہیں سر کر ہی چھوڑ دوں گی۔ میں تمہارے بغیر ایک ہل بھی نہیں رہ سکتی۔“

”جھوٹ مت بولو۔ تم سب گورتیں جھوٹ بولتی ہو۔ تم سب چھوڑ جاتی ہو۔ جھوٹی محبتیں کرتی ہو اور بھر۔۔۔۔۔“

”یہ تم کیسی باتیں کرتے ہو اور کس کی کرتے ہو۔۔۔۔۔؟“

”میری آنکھوں نے بڑی افسردہ باتیں اور کرناک معصوم دیکھے ہیں۔“

”مجھے نہیں بتاؤ گے؟“

”نہیں۔“

”کیوں۔۔۔۔۔؟“

”تم سمجھ نہیں سکو گی۔“

”میرے پاس دماغ ہے جواب پہلے سے زیادہ سوچتا ہے اور سمجھتا بھی ہے۔“

”مگر وہ کچھ نہیں سمجھ سکے گا جو میری آنکھوں نے دیکھا ہے۔“

”آجکیں تو ہر وقت کچھ نہ کچھ دیکھتی ہی رہتی ہیں اور ہر مہر پہلے سے مختلف ہی ہوتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہوتا۔۔۔۔۔؟“

وہ اس کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ وہ واقعی بدل چکی تھی۔ پہلے سے کتنی مختلف۔۔۔۔۔ اس کی آواز ملب و لبجہ، قوت انسان کو بدلنے کے دور پہ ہوتی ہے۔ یہ سڑکوں پر ہاتھ دانی بھکارن۔۔۔۔۔ غلیظ، بدگو، بھیان کئے والی مچھلی۔۔۔۔۔ گندگی اور تیل سے آئی۔ جس کے سائے سے ہی لوگ دور بھاگتے تھے۔ اسے دور سے ہی دھتکار دیتے تھے۔ اسے گندی گالیوں سے نواز دیتے تھے وہ کبھی مسکرا کر گزر جاتی تو کبھی اس سے بھی بدھ کر گالیاں دیتی۔ اب کتنی بدل چکی تھی۔ اس وسیع و عریض گھر میں آنے سے اس کا پہلا وجود مٹ چکا تھا۔ اب وہ اس کے وجود کا حصہ بن چکی تھی۔ اس نے اس کو کیسے خود بخود آپ ہی آپ منتخب کر لیا تھا۔ بے سوچے سمجھے گندگی کو اپنے وجود پر مل لیا تھا، تعفن سے بھر پور۔ سزا دے اٹا ہوا۔ نف ہے تم پر۔۔۔۔۔ ملک آفاق منصوبہ، نف ہے۔ زمی کے اس سفر میں جس میں گندگی کا یہی ڈھیر پسند آیا۔ تم واقعی اس کے ہی قائل تھے۔۔۔۔۔ یا پھر۔۔۔۔۔ تم اس کے عزم میں آ گئے اور خود ہی اسے سحر کا نام بھی دے دیا۔ بہت بے وقوف نکلے، اس کے گلے میں پھانس لی اکتھے گی اور وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔

.....

”شفق! اگر تم ماڈلنگ شروع کر دو تو بہت کامیاب رہو گی۔“ زویا نے مشورہ دیا۔

”میں۔۔۔۔۔ اور ماڈلنگ! اکیس لڑکیاں کرتی ہو۔“ وہ ہنس کر بولی۔

”یقیناً! تو تم ابھی ماڈل بن سکتی ہو۔ تمہارا فیس کٹ۔۔۔۔۔ تمہارے پیچرز۔۔۔۔۔ تمہارا ٹیکہ سب اس سے مطابقت رکھتے ہیں۔“

”زویا! تم کیوں اس کو ایسا کام کرنے کو کہہ رہی ہو۔ معلوم بھی ہے اس کے گھروالے۔۔۔۔۔“ عابد نے معنی خیز اعماز میں جملہ اوجھڑا چھوڑ دیا۔

”عابد! یہ تم کیا ہر بات میں میرے گھروالوں کا ذکر پھیرو دیتے ہو۔ یہ میری لائف ہے اور اس میں انٹر فیر کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں۔“

”اوکے۔۔۔۔۔ اوکے، ڈارلنگ! ریٹیکس۔۔۔۔۔“ زویا نے اسے خطرات کرنے کی کوشش کی۔

”زویا! میں ماڈلنگ ضرور کروں گی۔“ وہ فیصلہ کن لہجے میں عابد کی طرف دیکھتے ہوئے زویا سے مخاطب ہوئی اور پاؤں پٹختی باہر نکل گئی۔

”گڈ! تم نے اس کی کمزوری پکڑ کر واقعی اچھا کام کیا ہے۔“ زویا نے عابد کو داد دی اور دونوں کھٹکھٹا کر ہنس دیے۔ دونوں شاطرا بن رکھے تھے اور مصمم ذہنوں کو کس طرح مسخ کیا جاسکتا ہے، یہ فن انہیں خوب آتا تھا۔ دونوں ہنستے ہوئے اس کے پیچھے باہر آ گئے۔

”آئی ایم سوری امیر! مطلب تمہیں برٹ کرنا تو نہیں تھا۔“ عابد متنبہ کر بولا۔

”اوکے۔۔۔۔۔ اس آل رایت! وہ نظمی سے بولی۔

”تم ہر بات پر کیوں ٹیکر اپ ہو جاتی ہو۔ تم بہت حساس ہو۔ اتنا پیٹی ہونا اعصاب کے لیے بہت خطرناک ہوتا ہے۔“ وہ اب اسے نرمی سے سمجھا رہا تھا۔

”یار! یہ کیا۔۔۔۔۔ تم تو مذاق بھی نہیں سہہ پاتیں؟“ زویا نے بھی ہنسنے لگا۔

”مذاق۔۔۔۔۔ مزاح۔۔۔۔۔ ہٹو یا شوخیلاں۔۔۔۔۔ ان سب کا میری زندگی میں کوئی ملل دخل نہیں۔ اس لیے مجھ سے ہاٹ لہجے میں سیدھی بات کیا کرو۔۔۔۔۔“

”او کے ڈیر! آئندہ کوئی ایسی بات نہیں کریں گے جو تمہیں دکھ دے۔“ عابد نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا تو وہ مسکرا دی۔

”آؤ اب بیڈ مکمل ہو چکا ہے، ایک گانا تو گائیں۔“ عابد نے کہا۔

”کون سا.....؟“ زویا نے پوچھا۔

”وہی.....“

زنگی کی راویں

جڑل جائے تھو سائیں

شفق کا موڈ کافی بہتر ہو چکا تھا۔ عابد گتار لیے اس کے ارد گرد منڈلا رہا تھا اور وہ قدرے محفوظ ہو رہی تھی۔ محفل عروج پر تھی جب سہیل اسے لینے آیا۔

”یار اپنے اس ڈرائیور سے جان چھڑاؤ..... کیا پروانے کی طرح ہر وقت تمہارے گرد منڈلاتا رہتا ہے۔ لگتا ہے تمہارا ڈرائیور نہیں کچھ اور ہو۔ بہت پوزیشنو ہے تمہارے بارے میں۔ اگر یہ یونہی اسی طرح تمہیں راج کرنا رہا تو تم کچھ بھی نہیں کر پاؤ گی اور سنوہ کل کنسرٹ ہے۔ اس کا بندوبست کر کے آؤ.....“ زویا نے قدرے تھکنا لہجے میں کہا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔ سہیل بھی روٹھا روٹھا سا لگ رہا تھا۔ دونوں خاموش رہے۔ وہ ساری رات پلاننگ کرتی رہی۔

اگلے دن وہ پھر اسے چھوڑنے گیا۔ وہ اس کی تیاری دیکھ کر چونک گیا۔ ”کیا آج وہیں کوئی پارٹی ہے.....؟“ سہیل نے اس کی طرف بھڑپو رنگا ہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں تو.....“ وہ اچانک چوری پکڑے جانے پر ہلکانے لگی۔

”سب آؤں.....؟“ اس نے اسے ڈراپ کرتے ہوئے پوچھا۔

”آؤ بچے.....“ وہ مسکرا کر بولی اور وہ گاڑی لے کر آگے چلا گیا۔

”خان..... رات کو آؤ بچے یہ ڈرائیور مجھے لینے آئے تو کہنا کہ میں ابھی گھر چلی گئی ہوں کیونکہ میری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔“

چوکیدار نے اس کی بات پر اسے طویہ مسکراہٹ سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ وہ اندر کی تمام باتوں کو سمجھ گیا ہے۔

”ہاں بھی جارہا سب.....؟“ عابد نے اسے آنا دیکھ کر پوچھا۔

”ہاں۔“ زویا نے مسکرا کر جواب دیا۔

”شفق تم کون سا ڈریس پہنو گی؟“ زویا نے معنی خیز اور تنقیدی نگاہوں سے اس کے لباس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”یہ ٹھیک تو ہیں۔ ابھی کل ہی تو یونیک سے نیا خریدا ہے۔“

”اوہو.....“ کیسے پارٹی ڈریس کنسرٹ کے لیے موزوں نہیں۔ میں ابھی ملاتی ہوں۔“ وہ بلیک لیدی جنر کے ساتھ سلیو لیس نیٹ کا بلاؤز لے کر آئی۔

”کیا میں..... یہ پہنوں گی؟“ شفق نے حیرت سے پوچھا۔

”یاد رہے تو ادا لنگ بھی کرتی ہے۔ اس میں تو بہت مختلف ڈریسز پہننا پڑتے ہیں۔ اگر اس طرح جھجکتی رہیں تو کچھ بھی نہیں کر سکی گی۔“
زویا متہنا کر بولی۔

”میں جھجک نہیں رہی۔ لاؤ ابھی پہنتی ہوں۔“ جب دو ڈریس پہن کر ٹلی تو جھینپ سی رہی تھی۔ جیسے پہلی دفعہ گناہ یا غلطی کرنے پر کسی کا
اعتراف کرنا ہے اور انسان شرمندگی محسوس کرتا ہے۔ وہ بھی مت رہی تھی۔ اپنا نام عریاں جسم دیکھ کر اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

”گٹہ..... بہت خوبصورت لگ رہی ہو..... اور سنو یہ پونی بھی کھول دو۔ میں اپنی بیوٹیشن کو بھلاتی ہوں، وہ تمہارا میک اپ بھی کر دے
گی۔“ اس نے سوبائل پر فوراً نمبر ملا دیا۔ وہ بات کرتے ہوئے باہر نکل گئی۔

”دیری اسارٹ.....“ عابد کن آنکھیں سے اسے دیکھتا ہوا اس کے پاس آ گیا اور اس کے گرد اپنے بازو دھماں کر دیے۔ وہ چونک سی گئی۔
اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی گرفت میں تھی۔

”نیا آپ کیا کر رہے ہیں؟“ وہ گھبرا کر بولی۔

”جب تم ہی مدد ہوش کرنے کے واسطے ہو تو کیا کروں؟“ وہ سرور سا ہو کر بولا۔

”وہ بس آ رہی ہے۔“ زویا بولتی ہوئی اُمید آئی۔ جب تک وہ اس سے علیحدہ ہو چکا تھا اور وہ ٹھیکے اور شرم سے سرخ ہو رہی تھی۔

”یہ تمہیں کیا ہو رہا ہے۔ بااُفرست ہاتھ تم نے یہ ڈریس پہنا ہے۔ اس لیے خروس ہو رہی ہو۔ دھڑکنے لگا اور یہ پانی پیو۔“ اس نے گلاس
میں پانی ڈال کر اس کے آگے بڑھایا۔ پانی پیتے ہوئے اس کے ہاتھ مسلسل کاپ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اس کی بیوٹیشن آئی اس نے تو اس کو بالکل
بدل کر رکھ دیا۔ وہ آئینے میں بار بار دیکھ رہی تھی۔ ہر زاویے سے مختلف لگ رہی تھی۔ نیارخ..... نئی شخصیت..... نیا وجود..... جو نئے احساسات لیے
ابھی ابھی جنم لے رہا تھا۔

”اگر تمہیں زیادہ گھبراہٹ محسوس ہو رہی ہے تو تم میرا بلیک گاؤن اوپر پہن لو۔“ زویا نے اس کی بڑھتی ہوئی گھبراہٹ دیکھ کر کہا۔

”یہ اس طرح تو نہیں چلے گا۔ تمہارا پہلا کنسرٹ ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں پھر گھبراہٹ کیسی۔ تم میرے ساتھ گاؤں گے اور گانا کیا ہے۔
بس میرے ساتھ گنگنا ہی تو ہے۔“ عابد نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ وہ نظریں جھکائے سب کچھ خاموشی سے سن رہی تھی۔ وہ نظریں اٹھا کر اس کی
طرف دیکھتا بھی نہیں چاہتی تھی۔ مبادا کہیں پھسل نہ جائے۔

”سات بجے ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔“ عابد نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں تو نہیں جا رہی۔ میری کٹ مٹ گئیں اور ہے۔“ زویا لٹختے ہوئے بولی۔

”کیا مطلب..... میں تمہارے بغیر قطعی نہیں جاؤں گی۔“ وہ بے صبری سے بولی ”ڈونٹ بی کلی۔ بی کوٹڈنٹ۔ کب تک دوسروں کے
سہارے چلو گی۔ خود چلنا سیکھو۔“ زویا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ خاموشی سے دونوں کی طرف بے بسی سے دیکھنے لگی۔ اس نے اسے یوں

محسوس ہونے لگا جیسے وہ ان دونوں کے درمیان مثل کاک بن گئی ہو۔

”یہ ٹشو پچھ لو اور اپنا پسینہ پونچھو۔ ابھی تو کنسرٹ شروع نہیں ہوا اور تم اتنی زبردستی ہو رہی ہو۔ ویسے آج تو تم قیامت لگ رہی ہو۔ یوں لگ رہا ہے جیسے چاند سارا حسن سمیٹ کر زمین پر اترا آیا ہے۔ مجھے تو قطعی یقین نہیں تھا کہ تم اس قدر حسین بھی لگ سکتی ہو۔ میں تمہیں دیکھتا ہوں تو اپنے آپ پر ہکا بھکا رہتا۔“ عابد بہت دیر تک موز میں بول رہا تھا اور اس کا دل اس کی باتوں پر دھڑک رہا تھا۔ عابد گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اور وہ دھڑکنا اس سے باہر اصرار دیکھ رہی تھی۔

”تم اس قدر زبردستی کیوں ہو رہی ہو؟“

”نن..... نہیں..... شاید یہ میری زندگی کا پہلا شو ہے۔“

”ہاں سمجھتا ہوں..... مگر میں ہوں نا پھر کسی پریشانی۔ جب کرنے لگو گی تو میری باتیں تمہیں خورا سمیٹ لیں گی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا تو وہ مزید گہرا ہو گیا۔ اسے نہ جانے کیوں عابد سے کمن آنے لگی تھی۔ وہ اپنی ٹمپس کر اس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سے قبل اس نے اسے ایک میوزیٹن، منگرا اور زویا کے دوست کی حیثیت سے عزت دی تھی۔ اسے اس سے کوئی محبت نہیں تھی۔ محبت تو وہ صرف سہیل سے کرتی تھی۔ ایک لمحے کو اسے یوں احساس ہونے لگا جیسے سہیل اسے صحیح بات پر ڈانٹتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ کیسے لوگ تھے۔ اسے زویا پر بھی حسد آ رہا تھا۔ جو پہلے تو اسے دلار سے بلاتی تھی اور اب کیسے پیچھے ہٹ گئی تھی۔ پورے میز کے ساتھ اسے اکیلے بھیج دیا تھا۔ اسے زویا کی کوئی چال سی محسوس ہونے لگی۔ اس کے اندر شدید خوف طاری تھا۔ اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ ایک تو اسے ایسا ڈر لیس پہنا دیا تھا اور دوسرے عابد اس کے ساتھ تھا۔ گو کہ اس نے گاؤں پہن رکھا تھا مگر اپنی حیرانی سے وہ اچھی طرح آگاہ تھی۔ وہ بار بار گانہ ٹھیک کر رہی تھی۔

”یہ گاؤں تم اتار کیوں نہیں دیتیں۔ اتنی اسارٹ لگ رہی نہیں۔ خواہو یہ فضول سا گاؤں پہن لیا ہے۔“ عابد اس کی پریشانی بھانپتے ہوئے بولا۔

”جہیں..... میں اسی طرح ٹھیک ہوں۔“ اس نے پہلو ہدل کر کہا۔

”کنسرٹ شروع ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ مختلف بے پرانے گروہس ریہرسل میں مصروف تھے۔ اوہن ایئر میں کافی زیادہ کراؤ جمع ہو رہا تھا۔ اس کی نظریں لوگوں پر ہی تھیں۔ اسے بار بار یوں احساس ہو رہا تھا جیسے اس نے یہاں آکر فاش لٹلٹی کی ہو۔ عابد اس کو بار بار آہرز دکر رہا تھا۔ کنسرٹ سے پہلے سب نے ڈرنک کی۔ عابد نے اسے بھی گلاس تھمایا تو وہ چونک گئی۔

”جہیں..... میں یہ نہیں پین گی۔“ وہ دھڑکتی سے بولی۔

”یہ بہت ضروری ہے۔ سرور اور مستی کے لیے۔ آڈینس جوش چاہتی ہے۔ تحمل چاہتی ہے اور اس کے بغیر ہم لوگ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔“

”تم دیکھنا ایک دم کتنا کونٹریڈکٹس آجائے گا اور تم اپنے آپ کو ہواؤں میں اڑاتا ہو محسوس کر دو گی۔ بہت ادھر پر میرے سنگ..... ہادلوں میں.....“

”خدا کے لیے۔ پلیز آئی ڈونٹ وانٹ اٹ.....“ وہ ملتھیا نا اعداد میں بے بسی سے بولی۔

”یہ بہت ضروری ہے اور یوں سب کے سامنے تقاضا مت ہو۔ لو شاپاں۔“ اس نے ذریعہ قی گلاس اسے تھا پاس کی آنکھوں میں ایک دفعہ پھر بے بسی سے آنسو تیرنے لگے۔

”یہ نی، یہ اداسی سب ختم ہو جائے گی۔ بس ایک دلفیہ پی کر تو دیکھو۔“ اس نے بغیر کچھ کہے سنے دو گلاس پی لیا۔ اس کے بعد وہ کہاں تھی اور کیا کچھ ہوا اسے یاد نہیں تھا۔ بس شور ہنگامہ مستی اور جوش ہی جوش تھا۔ وہ کب اور کیسے گھر پہنچی اسے کچھ یاد نہ تھا۔



باہر عجیب و غریب قسم کی آوازیں آرہی تھیں۔ سر کی آنکھ کھل گئی۔ کوئی گیت کو عجیب انداز سے دھکا دے رہا تھا اور پھر جیسے کسی کے گرنے اور گاڑی کی چرچاہٹ کی آواز آئی۔ اس نے آفاق کی طرف دیکھا وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ تین بج رہے تھے۔ شزا مری بچوں سے ملنے گئی ہوئی تھی اور منصور نہ جانے کہاں تھا۔ اسے شفق کی فکر تھی وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ وہ وہے قدموں سے باہر نکل اور شفق کو گیت کے سامنے دیکھ کر چونک گئی۔ چونکہ آج ہی پمٹی لے کر گیا تھا۔ وہ شفق کو اندر لے کر آئی تو چونک گئی۔ وہ نشے میں دھند تھی۔ گاؤں اس کے ہاتھ میں تھا اور اس کا بلاؤز جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ اس کی حالت کچھ اور سی کہانی سنارہی تھی۔ سر کو اس کی حالت دیکھ کر شدید دھوکہ ہو رہا تھا۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا وہ اس سے بالکل بے خبر تھی۔ وہ اسے اس کے کمرے میں لے کر آئی اس کے کپڑے بدلے اور اسے اس کے بستر میں ملاتا یاد خود اپنے کمرے میں آ گئی۔ شفق کی حالت بار بار اس کے سامنے آرہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ اسے اس گھر میں صرف شفق ہی تو اچھی لگتی تھی اور وہ کس حالت کو جا پہنچی تھی۔ اس گھر کی حالت تو اس کی جھونپڑی سے بھی بدتر تھی۔ اسے یاد تھا جب تک اس کی ماں تھی وہ بہت بڑی ڈھال تھی اس کے لیے شاید یہ بچے تو بغیر کسی سہارے اور ڈھال کے پروان چڑھتے۔

ایسے لوگوں کا کیا مستقبل ہوتا ہے۔ اس گھر کا تو شیرازہ بالکل بکھر چکا تھا اور ابھی نہ جانے کیا کچھ ہونا باقی تھا۔ وہ ساری رات نہ سو سکی۔ دکھ کی شدید لہریں اس کے وجود کو تھمہ بالا کر رہی تھیں۔ یہ کیسا گھر اور کیسے لوگ تھے۔ ایک دوسرے سے بالکل بے نیاز۔ کسی کو کسی کا کوئی احساس نہ تھا۔ نہ تعلق نہ واسطہ۔ ہر کوئی اپنی ذات میں مگن ایسا تو وہاں بھی نہیں ہوتا تھا جہاں سے وہ آئی تھی اور جو معاشرے کا رذیل ترین طبقہ سمجھا جاتا تھا مگر جہاں محبت کسی کھوٹ کے بغیر تھی اور یہ معاشرے کا اعلیٰ طبقہ تھا جہاں نہ محبت کا وجود تھا اور نہ عزت کا وجود بھی بہت مبہم اور مشکوک تھا۔ وہ پھر بارہ بچے آفاق ناشتا کر کے باہر جا چکا تھا۔ اس نے شفق کے بارے میں کچھ بھی نہیں پوچھا اور نہ ہی اس نے بتانا مناسب سمجھا۔ آفاق باہر گیا ہی تھا کہ سہیل پریشان سا کمرے میں داخل ہوا۔

”سحر بی بی، وہ شفق.....؟“ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔

”ہاں، وہ اندر سو رہی ہے۔“ وہ جلدی سے اس کی بات کاٹ کر بولی۔

”اچھا..... کب آئی.....؟“ اس کا چہرہ ایک دم کھل گیا۔

”تمہارے جانے کے فوراً بعد“ اس نے بات گول کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا، میں تو ساری رات پریشان رہا۔ سحر بی بی آپ شفق کو ان لوگوں سے ملنے مت دیا کریں۔ وہ ابھی لوگ نہیں اور وہ زو یا تو پوچھیں مت کہی جہاں ہے؟“ سہیل قدرے پریشانی سے بولا تو وہ اس کو اس کے لیے یوں پریشان دیکھ کر بے تک سی گئی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔“ وہ آدھ بھر کر بولی اور وہ مطمئن سالوٹ آیا۔

وہ اٹھ کر اس کے کمرے میں گئی۔ وہ ابھی تک سو رہی تھی۔ وہ اسے آوازیں دیتی رہی مگر اسے کوئی ہوش نہ تھا۔

شام کے سات بج رہے تھے۔ جب اس کی آنکھ کھلی اس کا سر قدرے بھاری ہو رہا تھا اور آنکھیں سرخ۔ وہ بے دلی سے اٹھ کر باہر آئی۔ سحر لاؤنج میں لیوی دیکھ رہی تھی۔

”ہیلو کیسی ہو؟“ شفق سوئی سوئی آواز میں بولی۔

”ادھر آؤ میرے پاس۔“ سحر نے اسے پیار سے اپنے پاس بلایا۔

”سحر مجھے چائے چاہیے۔“ وہ اس کے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”اچھا میں بابا کو کہتی ہوں۔“ وہ کلب کو چائے کا کپڑا کر اس کے پاس آگئی۔

”شفق تم رات کو کہاں سے آئی تھیں؟“ سحر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیوں؟“ شفق نے حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”یونہی پوچھ رہی ہوں۔ کیونکہ اس سے پہلے تو تمہیں ایسے لباس..... فٹے اور اس حالت میں کبھی نہیں دیکھا۔“

”نشر اور کیسی حالت؟“ وہ ایک دم الجھل کر بولی۔

”تمہارا سارا لباس پٹا ہوا تھا اور تمہاری حالت ناقابل بیان تھی پھر میں نے بیڈریس تمہیں پہنا دیا۔“

”اوہ گاڈ..... یہ سب کیا ہو گیا؟“ وہ شرمندگی سے ہونٹ چبانے لگی۔ خوف، دکھ شرمندگی اور ذلت کے گہرے سائے اس کے چہرے پر

چھانے لگے۔ چائے اس کے سامنے رکھی گئی اور وہ مسلسل رو رہی تھی۔ اس کو کچھ یاد نہیں تھا۔

”کیا تمہیں واقعی کچھ یاد نہیں؟“ سحر نے حیرانی سے پوچھا اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ سحر اسے دلاسا دینا چاہتی تھی۔ اس کی دل جوئی کرنا

چاہتی تھی مگر اس کے پاس ایسے الفاظ ہی نہیں تھے جو دھموں پر مرہم جیسا کام کر سکیں۔ اسے یوں دکھی دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گئی تھی۔ شفق اٹھ کر اپنے

کمرے میں آگئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔ وہ کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ اس کا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ دل پھٹنے کو بے تاب تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے

سب کچھ چھن گیا ہو۔ شرم و حیا، نقل و حرکت، دلجوئی اور راکہ سے بھی زیادہ کم دھت ہو گئی تھی۔ وہ کن لوگوں کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔ وہ جو

معاشرے میں اپنا مقام ڈھونڈنے لگی تھی۔ اپنے آپ کو منوانے، اپنی حیثیت جاننے، اپنے وجود کی تشفی کے لیے..... اور اسے بدلے میں کیا ملا تھا۔

”نف ہے تم پر شفق منصور اتم نے بہت گھائے کا سودا کیا۔“ وہ مسلسل اپنے آپ کو ملامت کر رہی تھی۔ ایسا وہ جو وہ کسی کو نہیں بتا سکتی تھی۔

اس کی روح تک اس سے گھائل ہو رہی تھی۔ ایک دم فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے فون اٹھایا تو عابد بول رہا تھا۔ اس کی آواز میں بہت اکیسا غصہ تھی۔

”ہیلو ڈارلنگ، تمہیں خوشخبری سنانا تھی۔ ہمارا کنسرٹ بہت کامیاب رہا اور تمہارا ڈانس بھی لوگوں نے بہت پسند کیا اور تم نے جو مجھے مدھوش کیا وہ تو میں بتا ہی نہیں سکتا۔ ابھی تک اس کے عرصے میں ہوں۔ کب آ رہی ہو؟ میں بہت بے چین ہوں۔“ اس کی آواز میں مستی سی تھی۔

”بہت جلد..... مگر آؤں گی ضرور۔“ وہ کچھ سوچے ہوئے بولی۔ اسے خود ہی حماقت سی محسوس ہونے لگی کہ اس نے کیوں وہاں دوبارہ جانے کا سوچا تھا۔ جبکہ وہ اس کو دلہل میں اتار چکا تھا۔



وہ آفاق کی آمد کی شدت سے منتظر تھی۔ شام کے سائے رات کی تاریکی کو اپنے وجود میں سیٹھنے کے لیے تیزی سے کوشاں تھے۔ وہ کھڑکی سے باہر پھلتی تاریکی کو دیکھ کر خوف زدہ ہو رہی تھی۔ کہیں آج وہ پھر اسے روٹی کی طرح دھتک کر زندہ کھو دے لیکن نہیں..... آج نہیں۔ آج میں اسے بہت بڑی خوشخبری سناؤں گی۔ شاید وہ مجھ سے محبت کرنے لگے۔ میرے وجود سے اس کی شناسائی ہو جانے لگے۔ میرے وجود کو پھر وہ اپنے اندر سمیٹ لے۔ اس کے لبوں پر آپ ہی آپ مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ آفاق رات کو بہت دیر سے آیا۔ اس کے چہرے پر قدرے مایوسی اور غصہ سا چھایا تھا۔ وہ آ کر اپنے جوتے اتارنے لگا۔ وہ اس کے تہہ کو دیکھ رہی تھی مگر پھر کچھ سوچ کر اس کی طرف بڑھئی اور اس کے جوتے اتارنے میں مدد کرنے لگی۔

”بیچھے ہوئے مجھے یہ سب کچھ پسند نہیں!“ وہ غصے سے بولا۔

”کیوں..... کیا میں تمہاری بیوی نہیں؟“ وہ محبت سے بولی۔

”یہ تم کیا ہر وقت بیوی بیوی کی رٹ لگائے رکھتی ہو۔ مجھے کیا بتانے کی کوشش کرتی رہی ہو۔ پتا نہیں کہاں سے تم میرے پلے پڑ گئی۔ گندگی سے بھر دو جو۔“ وہ کراہت سے بولا۔

”تم خود میری جھونپڑی تک گلے تھے میں تمہارے گلے تک نہیں آئی تھی۔ لڑکیوں کو پھیلنے کا تمہیں خط تھا مجھے لڑکوں کے پیچھے جانے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ آوارہ تم تھے۔ میرا تو دھنسا ہی وہی تھا۔“ وہ بھی بہت دنوں سے ضبط کیے بیٹھی تھی۔ ایک دم غصے سے پھٹ گئی۔ اس کی باتیں سن کر وہ ایک دم ٹپش میں آ گیا اور اس کی ایسی پٹائی کی کہ ساری زندگی کی مار اس کے سامنے کچھ نہ تھی۔ وہ اس کے پیٹ پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا وہ مسلسل درد سے کرا رہی تھی۔ اس کو ایک دم دھکا دے کر وہ باہر نکل اور شفق کے کمرے کی طرف بھاگی۔ شفق اس کو اس حالت میں دیکھ کر چونکی۔ اس کے پیچھے کھڑا آفاق خوں خوار درد منہ لگ رہا تھا۔

”یہ سب کیا ہے؟“ شفق نے زور سے ایک تھپڑ آفاق کے چہرے پر مارا۔

”تم ہمارے درمیان میں نہ آؤ۔“ وہ غصے سے بولا۔

”دفع ہو جاؤ یہاں سے تم سے میں بعد میں بات کرتی ہوں اور تم کیوں اتنا کرا رہی ہو۔ چلو گاڑی میں، میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتی ہوں۔“ وہ اس کا بازو پکڑ کر اسے گاڑی میں بٹھا کر لے گئی۔ وہ درد سے ترپ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی اس کی جان ہی اٹل جائے گی۔

”سحر مت کرو، یہ سب کیا ہے؟“ اس نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

”دوہاپ بننے والا تھا۔“ وہ بے شکل بولی۔

”اوہ گاڈ..... وہ کیسا خالم نکلا۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اسے اسپتال کے ایمر جنسی روم میں رکھا گیا۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ دیا جلتے سے پہلے ہی بجھ گیا تھا۔ مزید یہ کہ وہ کبھی زندگی میں دوبارہ اس نہ بن سکے گی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر روئے۔ پہلے اس نے اپنے آپ کو کبھی بھی اتنا ذلیل اور بے وقعت نہیں سمجھا تھا۔ آج تو واقعی وہ مقلتی ہو گئی تھی۔ در در سے بیک ماسکھے والی خالی جھولی لیے بیٹھی تھی۔ اب کوئی خیرات کسی کام نہیں آئے گی۔ وہ تو اس کے قلم اور سفاکی کو بھی محبت سے تعبیر کرتی آئی تھی۔ اس کی مار پیٹ کو بھی محبت کا ایک رخ جانتی تھی اور کبھی بھی اس سے شکوہ کرنے کا سوچ نہیں کئی تھی۔ اب تو اس نے اس کے وجود کا ثبوت ہی چھین لیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سارے خواب ہی ٹوچ لیے تھے۔ اس کے لبوں کی مسکرائشیں ہی چھین لی تھیں۔ اب تک وہ کتنی دفعہ مری اور کتنی دفعہ دمہ ہوئی تھی مگر اب کی بار تو ایسی مری تھی کہ دمہ ہونا مشکل تھا۔ آفاق آیا تو بالکل خاموش تھا۔ جیسے اس کے سامنے اس کا مجرم کھڑا تھا۔ اس نے نفرت سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ وہ اس سے کبھی نفرت کا سوچ بھی نہیں کئی تھی۔ ہر رات وہ اسے اذیت دیتا تھا مگر وہ کبھی بھی اس سے نفرت نہ کر سکی اور اب نفرت کا ایسا بیج خود ہی اس نے بو دیا تھا۔ نہ جانے کب اس کے اندر سے وحشتیں اور درد بھگی کم ہوگی۔ نہ جانے وہ کیوں اسے لایا تھا اور کون اس کا لڑے دار تھا۔ نہ وہاپ کی سستا تھا نہ بہن کی۔ وہ بار بار اس سے سو رہی کر رہا تھا۔

”آفاق اب کسی قسم کے لحاظ مجھے بہلا نہیں سکیں گے۔“ وہ روتی ہوئی بولی۔

”آئی ایم سوری، مجھے تم نے کچھ بتایا ہی نہیں تھا تو مجھے کیسے معلوم ہوتا۔“

”مجھے کچھ کہنے کا موقع تو دیتے۔ میں تو اسی خوشی میں تمہاری خستہ تھی مگر تم تو بہت بڑے قاتل نکلتے۔ تم نے اس کی بھی جان لے لی اور مجھے بھی جیتے جی زندہ درگور کر دیا۔ میرے وجود سے امید کی کرن بھی چھین لی۔ میں اب کس کے سہارے چھوں گی۔ عورت کی زندگی تو اس کی زرخیزی میں ہوتی ہے۔ غم جو جو کیسے زندہ لاشوں کی طرح پھرتے ہیں تم مردوں کو کیا خبر..... میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔“ وہ روتے ہوئے بولی اور وہ شرمندگی سے سر جھکائے بیٹھا رہا۔

وہ اسپتال سے گھر آ چکی تھی۔ ہر وقت زمین پر بیٹھی کرے کے درد دھار کو دیکھتی رہتی۔ شفق اس کی دل جوئی کرنے کی کوشش کرتی مگر بے سود..... اس کی آنکھوں سے آنسو نہیں چھتے تھے۔

”سحر تمہارے ساتھ جب اس نے پہلی دفعہ ایسا کیا تھا تو تم اس کو چھوڑ کر چلی کیوں نہ گئیں؟“ شفق نے محبت سے اس سے پوچھا۔

”کیسے چلی جاتی اور کہاں چلی جاتی۔ بابا تو میرے دس ہزار موصول کر چکا تھا اور اب میں وہاں جاتی تو وہ مجھے ایک ہل بھی نہ رکھتا کہ کہیں آفاق اس سے پیار نہ چھین لے۔ میرا تو کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ میں کہاں جاتی۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”مجھے قطعی علم نہ تھا کہ وہ اس حد تک دل گرفتہ ہو چکا ہے اور تم نے مجھے بھی کبھی نہیں بتایا۔“

”میں کیسے بتاتی۔ میں تو یہی سمجھتی رہی کہ میاں بیوی کا رشتہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ میں نے بیٹھا اپنے باپ کو ماں کو مار تے دیکھا تھا۔ میری

آنکھوں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ اب میرے ساتھ ہورہا تھا تو مجھے کیسے علم ہوتا کہ جب علم ہوا تب کیا ہو گیا؟" وہ آدھ بھر کر بولی۔
 "اب تم نے کیا سوچا ہے؟"

"سوچتے وہ ہیں جنہوں نے کچھ کرنا ہو۔ میری تو سانس بھی کچی ہوئی ہیں۔ میں کیسے سوچ سکتی ہوں اور کیا سوچوں؟"
 "اس طرح تو زندگی نہیں گزرے گی۔ تم ٹھیک ہو لو میں تمہیں کسی کلب لے کر چلوں گی تاکہ تمہارا دل بہل جائے۔"
 "اب اس دل کا بہلنا بہت مشکل ہے۔" وہ یاسیت سے بولی۔

"اس قدر مایوسی ٹھیک نہیں۔ اپنے آپ میں ہمت پیدا کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ اسے حوصلہ دینے کی کوشش کرنے لگی جبکہ وہ خود بھی ذرہ ذرہ بکھر چکی تھی۔ سبیل باہر آچکا تھا اور اب مسلسل بارش جاری رہا تھا۔
 "سحر تم آرام کرو میں تھوڑی دیر تک آ جاؤں گی۔ میں سبیل کے ساتھ باہر جا رہی ہوں۔" شفق بیک احتیاط سے اٹھاتے ہوئے بولی وہ خالی خالی نظروں سے اسے جاتا دیکھتی رہ گئی۔

"تم آج پھر اس کی طرف جا رہی ہو۔" سبیل نے خوشنکس لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
 "ہاں بس آج آخری بار۔ اس کے بعد پھر کبھی نہیں۔" وہ مطمئن لہجے میں بولی "سبیل تم ادھر ہی کھڑے رہنا۔ بس چند منٹوں کی بات ہے۔ میں آ رہی ہوں۔" وہ بیک کندھے پر ڈال لیتے ہوئے جلدی سے باہر نکل۔

وہ تیزی سے گیٹ عبور کر گئی کیونکہ اس وقت گیٹ پر چوکیدار بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔
 "آؤ، ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔" زویا اور عابد اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر بولے۔
 "مجھے بھی تم لوگوں سے ملنے کی جلدی تھی۔ اس نے جلدی سے ریال اور بیک سے نکال کر سپر عابد پر فائر کیا۔ زویا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور اس کی طرف چھٹنا چاہا مگر اس نے اس پر بھی فائر کر دیا اور ریال اور سمیت جلدی سے باہر نکل اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔
 "گاڑی تیز چلاؤ۔" اس نے سبیل سے کہا۔ اس کی آواز میں شدید کپکپاہٹ تھی۔ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ اور اس کا چہرہ اور ہونٹ خوف سے بالکل سفید ہو رہے تھے۔

"شفق یہ تم نے کیا کیا۔ کیا تم نے زویا کو مار دیا۔" سبیل پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔
 "ہاں، اس کو بھی اور عابد کو بھی۔"

"کون عابد؟" سبیل نے حیرت سے پوچھا۔
 "تمہاں کا شیطان ساتھی۔۔۔۔۔"

"شفق میں تمہیں بہت منع کرتا تھا۔" سبیل نے ٹھکڑا کیا۔
 "اب اس کا خیمہ زوہ میں نے ہی جھٹکا ہے نا!"

”انہوں نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟“ وہ گاڑی تیز دوڑاتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور وہ کچھ نہ بول سکی۔
 سہیل نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا اور آہ بھری۔
 ”اب کہاں جانا ہے؟“ سہیل نے پوچھا۔
 ”تھانے لے چلو۔“
 ”بے قول مت ہو۔ ملک صاحب کے انکیشن سر پر ہیں اور تمہارا مسئلہ کمزور ہوا تو سب کچھ چھوٹ ہو جائے گا۔“ سہیل ہنسنے لہجے میں بولا۔

”کیا تمہیں مجھ سے زیادہ میرے باپ کی سادگی کی فکر ہے۔“
 ”نہیں، تمہاری عزت کے جو پرغے جلسوں میں اڑیں گے۔ میں وہ برداشت نہیں کر سکتا۔“ سہیل نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”میرے پاس اب کہنے کو کچھ نہیں رہا۔“ وہ بے بسی سے بولی اس نے گاڑی خود ہی کچے کچے راستوں کی طرف کردی۔ وہ کہاں جا رہی تھی اسے کچھ خبر نہ تھی۔ وہ اسے کہاں لے کر جا رہا تھا۔ اس نے پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ کون اس کے بارے میں فکر مند ہوگا۔ اسے اس کی بھی پروا نہ تھی۔
 اس کے لیے کچھ بھی پرالہم نہیں رہی تھی۔ نہ زندگی نہ عزت اور نہ اس کے بھانجے اب وہ مکمل طور پر حالات کے رحم و کرم پر تھی۔
 ”رہو اور مجھے دو۔“ سہیل نے رہا انور اس سے لے لیا اور گاڑی کھڑی کر کے اسے ہلکی زمین میں دوایا۔
 ”تم کیوں مجھے بچانے کی کوشش کر رہے ہو؟“ شفیق نے اس سے پوچھا۔
 ”کیونکہ تمہیں میں نے اپنے آپ سے بڑھ کر چاہا ہے۔“ وہ ہلکتے لہجے میں بولا۔

”مسز پیٹر آپ کا لیٹر آیا ہے۔“ وارڈن نے اسے خط دیتے ہوئے کہا۔ وہ خط لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور جلدی جلدی کھول کر اسے پڑھنے لگی۔ وہ جانتی تھی کس کا خط تھا اسے ہمیشہ اسی خط کا تو انتظار رہتا تھا۔ ورنہ اب اس کی زندگی میں اور کیا باقی رہ گیا تھا۔ ولیم نے مزے مزے کی باتیں لکھی تھیں۔ وہ بار بار انہیں پڑھ کر مسکراتے لگی۔ ہر دوسری لائن میں آئی مس یو مام کا جملہ تھا۔ وہ خط پڑھ کر اسے چھٹنے لگی۔ اس کا دل اسے ملنے کوڑ پڑے لگا۔

”مجھے اس سے ملنے جانا چاہیے۔“ اسی سوچ پر سوئی جیسے تاک ہی گئی تھی۔ اس نے اگلے ہی دن کالج میں پیمشی کی درخواست دے دی۔
 ”مسز پیٹر، آپ ایک ہی تو شخص کی پیگھار ہیں۔ اگر آپ بھی چھٹی پر چلی جاتی ہیں تو اسٹوڈنٹس کا بہت ٹائم ویسٹ ہوگا۔ آپ کا فہم الہ بدل بھی تو کوئی نہیں۔“ پرنسپل نے اس کی درخواست پڑھتے ہوئے کہا۔

”میڈم وہ تو ٹھیک ہے مگر میرا بیٹا بہت ڈسٹرب ہے۔ میں آج شام کو جھاؤں کی اور پرسوں واپس آ جاؤں گی۔ لاہور سے مری کا قاصد بھی تو بہت ہے۔ کافی وقت لگ جاتا ہے۔“ وہ بے چینی سے بولی۔ مسز جمال نے انسر دہی کے آثار اس کے چہرے پر دیکھے اور خاموشی سے چھٹی دے

دی۔ وہ خوشی خوشی ہاسٹل واپس آئی۔ اس کے لیے بہت سی چیزیں یکے کیس۔ جو وہ گا ہے بگا ہے اس کے لیے خریدتی رات ہی اور سامان یکے کر کے وارڈن کے پاس چلی گئی۔

”مس افضل! میں ایک روز کے لیے مری جا رہی ہوں۔ میرا بیٹا کچھ اپ سیٹ ہے۔ پرسوں لوٹ آؤں گی۔“
 ”او کے! ہاتھ خیال رکھیے گا اور بچے کو بھی پیار کرنا۔“ مس افضل خوش دلی سے بولیں۔
 ”جھیک بھوس افضل!۔“ وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔

سارا راستہ وہ ولیم کے بارے میں ہی سوچتی رہی۔ ولیم اور پیٹر، ماضی کی کتاب کے صفحات سوچوں کے جھونکے سے بار بار الٹ پلٹ ہو رہے تھے۔ پیٹر بہت بدل گیا تھا جب سے اس نے اسے بتایا تھا کہ وہ ضرور بچے کو جنم دے گی۔ وہ اس سے ٹھیک طرح سے بات بھی نہ کرتا۔ اس نے ایسا رویہ اپنا یا تھا کہ وہ جلدی سے یہاں سے چلی جائے۔

”تم یہاں سے جلدی چلی جاؤ۔“ وہ اس سے جلد از جلد چھکارا پانا چاہتا تھا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے اسے کہی کہتا رہتا۔
 ”کہیں جاؤں؟ اپنے آشیانے کو تو میں نے خود ہی آگ لگا دی ہے۔ اب تو اس کی راکھ بھی ہوا میں منتشر ہو چکی ہوگی۔“ وہ بے بسی سے بولی۔
 ”میں نہیں جانتا مگر تم اب یہاں مزید نہیں رہ سکتیں۔“ وہ سخت لہجے میں بولا۔
 ”پیٹر میں تم سے کچھ بھی طلب نہیں کروں گی۔ بس اس کی شیڈز شپ تو ادھر کی ہو۔“
 ”یہ کبھی بھی نہیں ہوگا تا کہ وہ یہاں آ کر مجھے دوبارہ تنگ کرے۔ تم ایسٹرن ویمن بہت دور کی پلاننگ کرتی ہو۔“ اس کی باتوں اور لہجے میں بلا کا خطر تھا۔

”نہیں، میرا تم سے وعدہ ہے۔ میں اسے کبھی تمہارے بارے میں نہیں بتاؤں گی۔ وہ کبھی تم سے کچھ طلب نہیں کرے گا۔“ اس کے لہجے میں الجھتی تھی۔

”ٹھیک ہے تم! لیجوری تک ادھر رک سکتی ہو مگر بے بی کا سارا خرچہ تم خود افرار کرو گی۔ میں جب اس کا وجود ہی نہیں چاہتا تو اس کے لیے خرچہ کیوں کروں۔“ وہ اس قدر بے باکی سے بولا کہ وہ حیران رہ گئی۔ جانور بھی اپنے فومولوں کی اتنی کینٹر کرتے ہیں اور یہ کیسا عجیب شخص تھا۔ اسے شدید دھچکا لگا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ اس شخص کو نہ جانے کس سے اتنا خوف تھا حالات کی ماری بے بس عورت سے یا اپنے ہی نئے وجود سے جو مستقبل میں اس کے لیے خطرہ بن سکتا تھا۔ اس سے قبل وہ تین بچوں کو جنم دے چکی تھی مگر ولیم کے لیے اس نے جتنی دہنی وجہ سالی مشتتیں اٹھائی تھیں صرف وہی جانتی تھی۔ وہ دو دو جگہ جاب کرتی۔ رات گئے تک پیٹر کے ساتھ اس کی شاپ پر کام کرتی کیونکہ وہ اس کے ساتھ رہ رہی تھی۔ وہ جو مصیبتیں اور اذیتیں اٹھا رہی تھی۔ پیٹر سے شیڈز تک نہیں کر سکتی تھی کیونکہ یہ سب اس کی ختب کر دھیں۔ جیسے جیسے لیجوری کے دن قریب آ رہے تھے پیٹر زیادہ تر باہر ہی رہتا اور جس دن اس نے بچے کو جنم دیا وہ اسے دیکھنے بھی نہیں آیا حالانکہ اس کی شکل و صورت پیٹر پر تھی۔
 وہ جیسے ہی ولیم کو لے کر گھر آئی۔ اس نے کچھ ڈاکو منٹس پر اس کے سائن لے لیے۔

”اب تم مجھ سے اپنے اور بیٹے کے لیے بھی دیماند نہیں کر سکو گی۔“ اس نے طلاق کے کاغذات سائن کر کے اس کے حوالے کر دیے۔ وہ حیرانی سے اس شخص کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ اگر یہ قوم کس قدر شاطر اور ذی ہوش ہوتی ہے کہ خطرات کو پہلے سے ہی سمجھ کر ان کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ ان کی پلاننگ ہمیشہ سے قائل قسین رہی ہے اور اب وہ اس کی قائل ہو گئی تھی۔ ایک دفعہ اپنے وجود کی شناخت کے نشے میں اس نے ایسے کاغذات سنبھالے تھے اور اب اپنے وجود کی بھاکے لیے۔ ماضی پر ت پر ت اس کے سامنے تھا۔ اس کا وجود راکھ کی مانند ہوا میں بکھر رہا تھا۔ عورت بھی سستی سخت جان ہوتی ہے۔ کیسی کہیں ہاتھیں سستی رہتی ہے۔ کیا کچھ اپنے اندر چھپاتی رہتی ہے بھر بھی اسے کچھ نہیں ہوتا۔ روز و شب کا معمول اور زندگی کا سفر جاری و ساری رہتا ہے۔

حیدر بھی یہی کہتا تھا۔ جب وہ آخری بار اسے ملا تھا۔

”کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ماضی کہیں دکن ہو جاتا ہے۔ حال بہت سارے نکاحے کرتا ہے اور مستقبل قریب انیاں مانگتا ہے۔ شہلا جو نوگ زندگیاں گزار کر اب خاک میں پیٹاں ہو گئے ہیں۔ انہیں کون پوچھتا ہے اور کون یاد کرتا ہے کہ انہوں نے کیا کیا کس کس کے تیاگ دیے۔ انہوں نے کیا کیا دکھ اپنے اندر سیٹھے۔ ان کے وجود نے کیا کچھ برداشت کیا۔ وہ بس یادوں کے دفینوں سے ایک جموئے کی طرح بھی بکھی آتے ہیں۔ دل سے ہوک سی اٹھتی ہے اور بس..... کچھ بھی نہیں ہوتا۔ بس یہی زندگی کا گورکھ دھندا ہے لیکن مستقبل تو ہر اک شخص سے متقاضی رہتا ہے۔ ہاں حیدر واقعی مستقبل متقاضی رہتا ہے۔ ماضی کو ٹوٹا ہے۔ حال کو بھنڈوٹا اور کھٹکا ہے اور پھر کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ زندگی کی اس تپتی دھوپ میں صرف حیدر ہی اک شجر سایہ دار تھا جس کے سائے تلے وہ چند لمحوں کے لیے سستانے کو کھڑی تھی اور یہ سایہ اس کے لیے کتنا قیمتی تھا۔ یہ صرف وہی جانتی تھی۔

سرائے مانگیر سے آگے پشوپار کا علاقہ شروع ہوتا تھا۔ اونچی نیچی مٹی کی پہاڑیاں۔ کہیں کہیں گھاس پھوس اور جڑی بوٹیوں سے اٹی ہوئیں۔ اوپر دور تک پھیلا وسیع نیلگوں آستان۔ زندگی بھی تو ایسی ہی ہے۔ نہ جانے ان نیلوں نے کتنے حوادث زمانہ سہے ہیں اور ابھی تک ان سٹ نعوش کی طرح ماضی کی داستانیں لیے کھڑے ہیں۔ حال کو سیٹھے اور مستقبل کا سماں کیے ہوئے زندگی کی طرح.....

کوچ ایک رینٹورنٹ کے سامنے رکی۔ سب مسافر نچے اتر گئے۔ اس نے بھی چائے کا کپ لیا۔ ولیم کے لیے کچھ چاکلیٹس خریدیں اور والیہس کوچ میں آ گئی۔ کوچ میں صرف دو تین مرد تھے مردہ اب کسی سے خوف نہ دے نہیں تھی۔ مشرق و مغرب کے سب تجارت اس کے امداد موجود تھے کئی کا حتیٰ قیجہ ہمیشہ تپتی ہوتا ہے اور اس کا وجود اب بکھر کا ہو گیا تھا۔ چنان کی طرح سخت..... جواب بھی ماضی کی تلخ یادوں کے لاؤٹس ریزہ ریزہ ہوتا رہتا تھا۔ اس نے اپنے کھڑی بالوں پر ہاتھ پھیرا اور سنبھری فریم والی نظریک ہیک دو بارہ صاف کر کے لگا لی اور پھر کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع ہو گئی۔ سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔ شام داخل رہی تھی۔ سربز و شاواب مل کھاتی سڑکوں کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ اوپر نیچے دھولالوں پر موجود گھروں میں برتی قلعے روشن ہو چکے تھے۔ جیسے اندھیرے میں جگنو چمک رہے ہوں۔ مغرب کی اذان کہیں دور آبادی سے سنائی دی تو نانا نانا اس کے ہاتھ دوپٹے کی طرف اٹھ گئے۔ اس نے سر پر دوپٹا رکھنا چاہا اور پھر رک گئی۔ دوپٹا سر سے اٹھک گیا۔ سربزیر اور اذان کی تنظیم..... اس کے امداد کہیں سے طرہ قیجہ ابھرا۔ کوچ میں ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ ڈرائیور نے شوخ و چنچل گانے لگائے ہوئے تھے اور بہت سے لوگ مسکرا رہے تھے۔

”بھائی اس مصیبت کو بند کرو۔ اذان کا وقت ہے۔ کچھ تو خیال کرو۔“ کہیں پیچھے سے آواز آئی تو ڈرائیور نے ٹشمنس لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھا اور ٹشپ بند کر دیا۔ اذان کی تنظیم سے وہ مسلمانیت کے دائرے میں تھا۔ ذرا سی چوں چہ کرتا تو ابھی ایک لمحے میں اس کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا۔ پندرہ منٹ اس نے انتظار کیا پھر آواز اونچی کر دی۔

”بند کرو اس کم بخت کو۔ بزرگ نماز پڑھ رہے ہیں۔“ پھر آواز آئی۔

”یا ایک تو یہ لوگ..... اور ان کی نمازیں!“ ڈرائیور بڑبڑانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پھر آواز اونچی کرنے کی کوشش کی۔

”بند کرو اسے۔ ابھی نماز پڑھی جا رہی ہے۔“ پھر آواز آئی۔

”آپ لوگوں نے ساری قصا نمازیں ابھی ہی پڑھنی ہیں۔“ ڈرائیور جھنجھلا کر بولا۔

”اور تم نے گانے سن کر امتحان دینا ہے۔“ ایک بزرگ کڑک دار آواز میں بولے۔

”باباجی میرے منہ مت لگے ورنہ.....“ وہ اکڑ کر بولا۔

”دروغ کیا ہوئے؟“ بزرگ اس عمر میں بھی خامے صحت مند تھے۔ اسی میں غلطہ اٹھا۔ ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔ اتنے خطرناک راستوں اور بلند یوں کا سفر کرنے والے کتنی پست ذہنیت رکھتے ہیں۔ اس نے سوچا۔ بہت سے لوگوں نے ڈرائیور کو سنبھالا۔ کچھ نے بزرگ کو سمجھایا۔ پھر انگشتا ہی میں صرف ہو گیا۔ ابھی خامی دیر ہو گئی تھی۔ اب وہ قدرے لیٹ پیچھے کی اسے یہ سوچ سوچ کر کولت ہو رہی تھی۔ ان لوگوں کی چھوٹی سی بات اس کے لیے کتنے بڑے نقصان کا باعث بنے گی۔ اسے غصہ بھی آ رہا تھا۔ وہ جو دقت سوچ کر آئی تھی۔ اس تک پہنچ جاتی تو وہ ہم اس کے ساتھ رات گزار سکتا تھا مگر اب تو اسے خود بھی رہائش کا مسئلہ ہوگا۔ لوگوں نے سمجھا بھجا کر دونوں میں صلح کروائی اور پھر گاڑی چلنے لگی۔ اب باباجی آہستہ آہستہ نرم لہجے میں نصیحتیں کر رہے تھے اور ڈرائیور منہ پھلانگتے سن رہا تھا۔ اس کا مؤذخت آف تھا۔ گانے بند ہو چکے تھے اور گاڑی اب فرار لے بھرتی جا رہی تھی۔ اچانک کوئی گاڑی سامنے آئی تو وہ ایک دم بدست بریک لگا تا۔

”خدا کے لیے بھائی غصہ تھوک دھاوا آ رام سے ڈرائیور کرو۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ساتھ ہیں۔“ ایک آدمی بولا۔

”چھوٹے چھوٹے بچے ہیں تو مری میں کیا کرنے جا رہے ہو مگر بیٹھنا تھا۔“ ڈرائیور ہڈ کوئی میں خاصا ماہر تھا۔

”بھئی بچوں کو ہی تو گھمانے کے لیے لے کر جا رہا ہوں۔“ وہ آدمی منہ تپایا۔

”تو اب کرنے دو انھیں حرام“

”بھائی اس کے منہ نہ لگو۔ بڑا ہی منہ پھٹ ہے۔ بد لحاظ۔“ وہ بزرگ دوبارہ بولے۔

”بزرگ تو آپ پھر ناگ اڑا رہے ہیں۔“ وہ گاڑی بند کر کے باہر نکل گیا۔ سب لوگ سخت پریشان ہو رہے تھے۔

”باباجی، آپ بھی خاموش نہیں رہ سکتے۔“ وہ آدمی دوبارہ بولا۔

”بھائی خدا کے لیے آ جاؤ۔ بہت دقت ہو گیا۔ کب مری پہنچیں گے۔“ ایک اوجیز عمر عورت نے اس کے پاس جا کر کہا۔

”ٹھیک ہے ماں مٹی۔ آپ کی عزت کرتا ہوں ورنہ“ اس نے گھور کر بڑے میاں کو دیکھا اور سرے ٹٹا لیا۔
 ”بھائی آپ کے اس جھگڑے میں میرا کتنا نقصان ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ آپ کو تو معلوم نہیں۔ مجھے اپنے بیٹے سے ملنے جانا ہے اور اب اس قدر دیر ہو گئی ہے۔“ وہ ٹھگ آ کر بولی۔ ڈرائیور نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور پھر خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے گاڑی بند کی اور قدرے خاموشی سے جیو ڈرائیو کرنے لگا۔

رات بارہ بجے وہ مری پہنچی۔ موسم قدرے ٹھگ ہو رہا تھا۔ ہلکی ہلکی دھند نے سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک ہوٹل میں اس نے کمر الیا۔ کھانا کھا کر وہ کمرے میں آ گئی اور کمزری سے پردہ ہٹا کر نیچے دھادی میں دیکھنے لگی۔ باہر کی مٹی میں جھنڈوں کے مانند ٹٹا لاتی روشتیاں مری کی خوبصورتی میں اور اضافہ کر رہی تھیں۔ نیچے ٹٹا لاتی سڑکوں پر ابھی تک لوگوں کی جھل پھل جا رہی تھی۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کھلو، ہتے مسکراتے ہوئے اور تھیمے لگاتے ہوئے ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سب کی بندیں جیسے غائب ہو چکی تھیں۔ سب انجوائے کرنے کے موڈ میں تھے۔ یہ بھی تو زندگی کا ایک رخ ہے کتنا خوبصورت، کتنا حسین، کتنا دل فریب۔۔۔۔۔ مگر صرف چند لوگوں کے لیے۔ اس نے پردہ آگے سرکا دیا اور خاموشی سے آ کر بیڈ پر لیٹ گئی۔ ولیم اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ وہ ابھی اور اسی وقت اس سے ملنا چاہتی تھی مگر بے بس تھی۔ اس وقت تو وہ خود بھی گہری نیند سو رہا ہوگا۔ کتنی جلدی وہ لو مولو بیچے سے چند من لو جو ان بن گیا تھا۔ وہ مری کو لوٹ میں پڑھ رہا تھا، اولیول کا اسٹوڈنٹ تھا، ذہین و فطین، مشرق و مغرب کا حسین احراج، اس کے نقوش اسٹر پکچر سب پیڑ پر تھا اور آکھیں اور بال ماں پر۔ وہ پہلی ہی نظر میں خوبصورت نو جوان لگتا تھا۔ وہ بالکل کارنر لگتا تھا۔

.....
 ڈاٹ کام

دوستی تھا اور بے آسرا تھی۔ جب وہ گود میں اسے اٹھائے دو بار وہ اپنے ماضی کی طرف لوٹی تھی۔ دو بار وہ اپنی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ جب وہ گئی تھی تو کتنے لوگ اس کے اپنے تھے اور اب لوٹی تھی تو دور دور تک بھی کوئی شناسا نظر نہ آیا۔ وہ تو بالکل ہی مختلف وجود لیے لوٹی تھی۔ یہ کیسا شناخت کا سفر تھا جس میں ایک بھی جاننے پہچاننے والا باقی نہیں رہا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے ورنگ و پین ہاسٹل میں پناہ لی اور بہت جگہ دو دو کے بعد ایک پرائیویٹ کالج میں جاب شروع کر دی۔ پہلے پہلے تو اتنی حسرت و تنگ دستی میں دن گزرے کہ ولیم جو بھی خواہش کرتا وہ کبھی پوری نہ کر پاتی پھر اس نے نیشنل یونیورسٹی شروع کر دی اور حالات بہتر ہو گئے مگر اب ولیم کوئی خواہش نہیں کرتا تھا۔ وہ سمجھ دار ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے پرانے کھلونوں کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ وہ بچپن سے ہی بہت ویل میزڈ اور سمجھ دار بچہ تھا۔ کبھی کوئی بد تمیزی نہ کرتا۔ سب لوگ اس سے مل کر بہت متاثر ہوتے تو وہ اسے اپنے لیے اعزاز سمجھتی۔ اور نہ اس سے قبل ملک منصور کے بچے تو کسی شے سے محروم نہیں رہے تھے۔ وہ جو خواہش کرتے وہ ضرور پوری کرتا۔ ولیم کو یوں محروم دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہوتا، آٹھ سالوں سے وہ مری میں چڑھ رہا تھا اور اب اسے بہت مس کرتا۔ اسے بھی دکھ ہوتا اس کا تو سارا بچپن تنہائی کی تر ہو گیا تھا۔ اسے اپنے پہلے بچوں کے لیے اتنا دکھ محسوس نہیں ہوتا جتنا ولیم کے لیے۔ ان کے پاس ملک منصور تھا۔ ان کی ہر خواہش پوری کرنے والا۔ ولیم کے پاس تو صرف ماں تھی اور وہ بھی تنگ دست..... وہ کیسا بے بس اور محروم بچہ تھا جس کے صدمے میں مجتہب بھی پوری طرح نہیں آئی تھیں۔ اسی لیے وہ سب سے زیادہ ولیم سے محبت کرتی۔ کبھی کبھی لٹک کی یاد بھی بہت ستاتی۔ وہ بہت چھوٹی تھی جب اس نے اسے چھوڑا تھا مگر شفق، آفاق اور ملک منصور کا سوچ کر مطمئن ہو جاتی۔ رات اس کی خیالوں میں لگتی۔

”پلیئر ویٹ..... ہی از رنگ!“ ایک نن اسے وزیئر زروم میں بٹھا کر بولی۔ وہ بے چینی سے پہلو بدلتے لگی۔ جب وہ لاہور سے چلی تھی تو طبیعت میں ایسی بے گلی نہ تھی اور اب منزل پر پہنچ کر اتھارنا ممکن ہو رہا تھا۔ شاید اتھارنا فلسفہ ہی یہی تھا کہ جب تک جائے منزل تک پہنچ کر انسان کی بے چینیوں آخری حدود کو نہ چھو لیں تب تک اس کا وجود مکمل نہیں ہوتا۔ ولیم اندر داخل ہوا تو وہ چمک سی گئی۔ وہ اس سے قدم میں کافی لمبا لگ رہا تھا۔ لمبا ترنگا خوبصورت نوجوان۔

”ولیم مائی ڈارلنگ..... مائی سوٹ ہارٹ۔“ وہ اسے والہانہ انداز میں چوم رہی تھی۔ خوشی اور جدائی سے اس کی آنکھوں سے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔

”آج تم پورا وطن میرے ساتھ گزار دو گے۔ میں نے پریشانی لے لی ہے۔“

”رنگی! وہ خوشی سے اچھلا۔

”ہاں ڈیئر۔“ وہ ہلکا سے گلے لگاتے ہوئے بولی۔

”مام..... میں یو پیٹارم پہنچ کر کے آتا ہوں۔“

”لو، آئی ایم دینک!“ اس نے اپنی نم آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے کہا اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ایک خوبصورت جگہ اسٹارٹ ہوئی اسے وہ بچوں کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی۔ اسے چہرہ کچھ شناسا سا لگا۔ بار بار ذہن کے پردے پر شبیہ کی نمودار ہوتی۔ وہ اپنے ساتھ

دھیروں چیزیں لائی تھی اور بچوں کو دے رہی تھی۔

”یہ کون ہو سکتی ہے؟“ وہ مسلسل سوچ رہی تھی۔

”مما پاپنیں آئے۔“ پھولی بچی روٹھتے ہوئے بولی۔

”وہ مصروف تھے تم جانتی تو ہو۔“ ماں نے اسے سمجھایا۔ اس کی آواز سن کر وہ چونک گئی۔

”اودہ کا ڈ..... شزا.....“ ایک دم یہ نام اس کی زبان پر آ گیا اور اس کے لیے وہاں رکنا محال ہو گیا۔ وہ اس سے چھپنا چاہتی تھی۔ جیسے ہی

ولیم آ یا وہ اس کو لے کر جلدی سے باہر نکل گئی۔

”مما پاپا کو لے کر آتا تھا۔ آئی مس ہم.....“ وہ روتے ہوئے پاؤں پٹختی باہر نکل گئی۔ وہ بہت خدی ہو گئی تھی۔

”سیر جاؤ بہن کو بلا کر لاؤ۔ میں اتنی دور سے آئی ہوں۔ اسے بلو ماما سے تلو۔ کیا ماما یومی چلی جائے گی۔“ اس کی خوبصورت نیلی

آنکھیں آنسوؤں سے ٹھٹھلانے لگیں۔

”او کے ماما۔“ وہ چھوٹا تھا اس لیے کچھ نہ سمجھ سکا اور بہن کو منانے چلا گیا۔

”مائیں بچوں کے لیے کتنی مشکلات اٹھاتی ہیں اور باپ..... ان کے باپ کو تو ان کی پروا بھی نہیں اور بچے باپ کے لیے کس قدر ترپ

رہے ہیں۔“ اس نے اک ادا سے ٹٹو پیچے سے آنکھیں صاف کیں تاکہ مسکرا کر بھل نہ جائے۔ شکل منہ ہورتی ہوئی اندر آ گئی۔

”ادھر آؤ مائی چاٹھ سوئے شزل۔“ وہ اسے لاؤ سے منانے لگی۔ اس کا موڈ ابھی تک سخت آف تھا اور وہ ماں سے بات بھی نہیں کرنا چاہ

رہی تھی۔

”آج میں تم کو لوگوں کو بہت گھماؤں گی۔“ شزای یہ خوش خبری انھیں کوئی خوشی نہ دے سکی۔ ڈرا پیہر باہر کھڑا تھا۔ وہ ان کو لے کر باہر آ گئی۔

ولیم کے ساتھ قدم سے قدم ملائے ہوئے اسے بہت خوشی ہو رہی تھی۔ ایسی خوشی جو ایک ماں ہی محسوس کر سکتی ہے جب اس کی ننھی سی کوئیل

تکاور درخت بنتی ہے۔ اس کے ماہ و سال کی محنت اس کے سامنے ہوتی ہے وہ لمحے اس کے لیے کتنی بڑی نوید لاتے ہیں۔ جب وہ ان کو تکاور دیکھتی

ہے۔ ولیم مسلسل ہاتھیں کرتا رہا تھا۔ اتنے قصے کہا دیں اور وہ مسلسل سن سن کر ہنس رہی تھی۔ وہ بالکل نہیں بول رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ بس

سننا چاہتی تھی۔ وہ اسے اتنا پیارا لگ رہا تھا کہ اس کا بار بار پکار کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ ولیم بہت اچھے اور شائستہ لہجے میں اس سے باتیں کر رہا تھا۔

اس کا لہجہ بہت دھیمہ اور دشتہ تھا۔ وہ اسے لے کر کافی دیر گھماتی رہی پھر شاپنگ کے لیے چلی گئی۔ وہ کائنات جی چیزوں سے بھری پڑی تھیں اور لوگ

دھڑا دھڑا شاپنگ کر رہے تھے۔ موسم بہار آلود تھا۔

”ولیم آج تم اپنی پسند کی چیزیں چاہو خرید سکتے ہو۔ آج تمہاری ماما فوراً کر سکتی ہے۔“ اس نے مسکرا کر اسے کہا تو وہ بھی مسکرا دیا۔

”او کے ماما..... چاہے وہ کتنا ہی مہنگا کیوں نہ ہو۔“ اس نے مسکرا کر سوال کیا۔

”اٹ کین بی ا“ اس نے چپتے ہوئے جواب دیا۔ وہ ہر شاپ پر مختلف چیزیں الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ ہر شاپ پر اسٹینڈ میں مختلف قسم کے

لاکٹ نکلے نظر آ رہے تھے۔ کچھ اسٹارز کے مطابق تھے۔ کچھ پرانڈہ لوگوں کے نام، جانوروں کے ٹکڑے، اسکو، ایلمینٹ اور بہت سی چیزیں مٹی ہوئی تھیں۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ وہ ہر چیز کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ جیسے کسی خاص شے کو ڈھونڈ رہا ہو۔ چلتے چلتے وہ ایک دکان پر رکا اور ایک اسٹینڈ سے صلیب والا لاکٹ اتار اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا چھوٹا سا مجسمہ تھا۔

”مام، آئی لوٹ، اس ریلی کی ٹی ٹی فل!“ اس نے لاکٹ چم کر جلدی سے گلے میں بہن لیا۔

وہ ایک لمبے کولر سی ٹی اور جلدی سے پہنٹ کر دی۔ اس کا ذہن منتشر ہو چکا تھا۔ ہونٹ میں کھانا کھانے کے دوران اس کی نظریں کراس پر تھیں۔ ولیم آج بہت خوش تھا۔ اس نے بہت سی مین پسند چیزیں خریدی تھیں۔ وہ ایک دم اس کی نظروں کا مرکز دیکھ کر لاکٹ کی طرف متوجہ ہوا۔

”مما..... آئی لوکرائسٹ..... اور میں کب سے ایسے لاکٹ کی تلاش میں تھا۔ سیکل کراس قول جاتا تھا مگر میں کرائسٹ والا چاہتا تھا۔ مما مجھے کرائسٹ سے بہت شدید محبت محسوس ہوتی ہے۔ مما صرف وہ لوگ ہی تو میرے دل میں رہتے ہیں۔ آپ اور کرائسٹ.....“ وہ مسکرا کر بتا رہا تھا اور وہ اس کی باتوں سے اندر ہی اندر خوف محسوس کر رہی تھی۔ وہ ایسے باتیں کر رہا تھا جیسے کوئی سمجھدار، عقل مند مرد ہو۔ وہ جتنی دیر اس کے پاس رہی۔ اس کی سوچیں پریشان ہی رہیں۔ وہ جتنی خوش آئی تھی۔ اتنی خوش واپس نہیں جا رہی تھی۔

”مما..... آپ پریشان مت ہوا کریں۔ میں ہوں نا۔ آپ کو ہر روز خط لکھا کروں گا۔ میں آپ کو بہت مس کرتا ہوں۔ میں کراس پر لاہور آؤں گا تو ہم دونوں بہت انجوائے کریں گے۔ آپ کے اس وزٹ سے میں بہت فریٹ ہو گیا ہوں۔“ وہ بار بار اسے چوم رہا تھا اور پھر ہائے بائے کہتا اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اس کا دل بہت افسردہ ہو رہا تھا۔ اب جدائی کے ساتھ ساتھ ایک اور خدشہ بھی اندر ہی اندر کلک رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کوئی کاٹھا سادل میں چھپ گیا ہو اور سارا جسم اضطراب میں مبتلا ہو گیا ہو۔ سارا سراسی حالت میں کتا۔ ورنہ وہ جب بھی اس سے مل کر آتی تو سارا وقت اس کی یادوں اور باتوں سے خوش ہوتی رہتی مگر اب اسے ولیم کی کوئی بات بھی یاد نہ تھی یا جتنی تو صرف اس کی وہی ایک حرکت۔ اس نے تو ولیم کو کسی بھی مذہب کی کوئی تعلیم نہیں دی تھی۔ اس نے جب سے ملک منصور اور بچوں کو چھوڑا تھا اس کے ساتھ ساتھ ہر اس شے کو بھی چھوڑ دیا تھا جن سے وہ جتنی میں وابستہ رہی تھی۔ جب تک دو سید صاحب کے گھر تھی۔ خدا اور اس کی خدائی پر یقین رکھتی تھی۔ ملک منصور کے گھر آئی تو خدا پر ایمان تو تھا مگر خدائی پر سے یقین اٹھ گیا تھا اور جب پیٹر سے شادی کی تو نہ خدا پر ایمان رہا نہ خدائی پر یقین۔ مذہب کے خانے پر اس نے شیاخت کا بھڑا آویزاں کر دیا اور اسی شیاخت کے لیے اتنے بڑے اسٹینڈس لے لیے مگر اب شیاخت کا وجود بھی نہیں رہا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ اب اسے نہ مذہب کی ضرورت ہے نہ شیاخت کی۔ بس اب زندگی کی سائیں ہی پوری کرنی ہیں۔ دانستہ یا نادانستہ۔ اسے تو یہ بھی پکائی نہیں تھا کہ جب دوبارہ ہوئی تو اس کا کوئی مذہب بھی تھا۔ اس نے تو وہی کچھ اپنا یا جو سید صاحب کا تھا مگر پیٹر نے اسے کچھ بھی اپنانے کے لیے نہیں کہا تھا۔ اس لیے اس نے کچھ بھی نہیں اپنایا۔ وہ مزہ پیٹر کے نام سے بھجانی جاتی تھی۔ اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ وہ جتنی میں شہلا منصور تھی اور اب مزہ پیٹر مگر اس کی یہ خام سوچ کس طرح ایک آزمائش بن کر اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے ولیم کو کسی بھی مذہب کی کوئی بھی تعلیم نہیں دی تھی۔ صرف اسے اخلاقیات سکھائی تھی۔ وہ نہ تو کبھی اسے چرچ لے کر لگتی اور نہ

ی مسجد..... وہ صرف اور صرف اسے ایک اچھا انسان بنانا چاہتی تھی۔ ایک عظیم انسان جس میں کوئی مذہبی تعصب نہ ہو صرف اپنی ذات اور اپنی خوبیوں پر اصرار ہو۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ نہ جانے ولیم نے کیوں کہا اور کس وقت اپنے آپ کو کرکین مان لیا تھا۔ اس نے تو کبھی اس سے مذہب کے بارے میں سوال نہیں کیا تھا پھر یہ سب کیسے ہو گیا۔ شاید اس نے اپنے نام سے ہی یہ اخذ کر لیا تھا۔ کیا جو چیز بھی انسان کو پیدا کئی طور پر ملتی ہے وہ اس کے بارے میں اتنا پورا سیو ہو جاتا ہے کہ پوچھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ وہ نہ جانے کیا کچھ مان بیٹھا تھا۔ اس کا دل اب کڑی کڑی ہو رہا تھا۔ وہ کہ اس اور کرائسٹ کے بارے میں کس قدر بڑی ہو گیا تھا۔ ان سے شدید محبت اور عقیدت کی لہر اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔ کیا یہ سب فطری تھا یا جبلی۔ اس نے کئی سال جس چیز کو انور کر دیا تھا وہ یوں اس طرح اچانک مستحاضی ہو جائے گی۔ مستقبل ایک سوالیہ نشان بن کر اس کے سامنے کھڑا تھا اور وہ اندر ہی اندر خوف سے کانپ رہی تھی۔ وہ سوچوں کے گھنور میں پھنسی تھی۔ وہ اسے کیسے اور کس طرح منع کرے۔ وہ شدید تذبذب میں تھی۔

زندگی میں آخر کیا کچھ مستحاضی ہے؟

محبت.....؟

شیانت.....؟

بقا.....؟

وجود.....؟

یا پھر کچھ بھی نہیں۔

اب وہ ہستی کے مذاہب میں جھلا ہو رہی تھی۔ سخت اذیت میں تھی، ایسی اذیت جو پچھلی تمام تکلیفوں اور اذیتوں سے بڑھ کر تھی۔ نہ جانے ابھی کیا کیا کچھ اسے آزمانے کو منتظر تھا۔

ولیم لب کی ہاں بہت خوش تھا ایک تو اسے ماں مل کر گئی تھی اور اس کے لئے ہر اسے کرائسٹ والا کس بھی مل گیا۔ اس کی اپنی امداد و صوبج تھی۔ "ولیم تمہاری ماما جلی گئیں؟" شائل نے اس کے ہر مسرت چہرے کو دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں..... اور میں انھیں بہت مس کر رہا ہوں اور تمہاری ماما....."

"وہ ابھی ادھر ہی رہیں گی۔ کشمیر پوائنٹ پر ہمارا بہت خوبصورت گھر ہے۔ ماما جب بھی آتی ہیں وہیں رہتی ہیں پھر ہم بھی ان کے ساتھ رہتے ہیں۔ میرا ماما کے ساتھ ہی گیا ہے۔"

"تمہاری ماما ادھر ہی کیوں نہیں رہ جاتیں....."

"وہ بہت سوشل ہیں۔ لاہور میں ان کو بہت سے کام کرنے ہوتے ہیں لیکن جب بھی ادھر آتی ہیں تو پھر کافی دن رہتی ہیں۔"

"تمہارے پاپا نہیں آتے.....؟"

"آتے ہیں..... لیکن....." ولیم کے سوال پر وہ اندر دبی ہو گئی۔

”کیا مطلب.....؟“

”دو فخر ہیں۔ اس لیے ان کے پاس نام نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ مگر وہ ہم سے بہت محبت کرتے ہیں۔ کبھی کبھی آ بھی جاتے ہیں۔ وہ ہم تمہارے

ویدی کہاں ہیں؟“

”ان کی لڑتھ ہو چکی ہے۔“ وہ بہت سکون سے بولا۔

”تہنکاری مہما بہت پہا اور خاتون ہیں۔“

”ہیس، آف کورس!“ دھڑکنے لگا اور میں بولا۔

”ولیم تم نے پر کس گلے میں کیوں پھین رکھا ہے؟“

”اوہ.... نظر آرہا ہے۔“ اس نے جلدی سے جھک کر دیکھا اور پھر اسے شرٹ کے اندر کر لیا۔

”آئی لوٹ، اس پارس آف مائی سول۔“ وہ محبت سے بولا۔

”رنگی..... سوانح ” ٹیکل نے حیرت سے کہا۔

”تم مہا کے ساتھ کیوں نہیں گئیں؟“ ولیم نے اس سے پوچھا۔

"میں ان سے ناراض ہوں۔" وہ منہ ہٹا کر بولی۔

“کے لیے“

"بس ہوں..... کسی بات پر۔"

”سہلی کرل مہاسے ناراض نہیں ہوتے۔ مہما از لاکھ در میری اینڈ ہنو۔ در میری لوز آل۔۔۔ شی از سہلی آف لو، اوئی لو تمک ایس۔“

”وہاٹ ڈوپو مین؟“ شک کی نے حیرت سے پوچھا۔

”مما سے صرف محبت کرنی چاہیے۔ غصہ نہیں ورنہ کاغذِ ناراض ہو جاتا ہے۔“ شاکل کو اس کی بات اچھی لگی اور وہ اٹھ کر چلی گئی۔ موہاں اس

کے ہاتھ میں تھا اور وہاں کانبر ملاری تھی۔ ولیم ہنستہوا اپنے روم میں چلا گیا۔

لاہور جانے سے پہلے شہزادہ اس سے خصوصی طور پر ملنے آئی۔ جب سے شہنشاہ کا مولود ٹھیک ہوا تھا اور اس نے اسے ولیم کے بارے میں بتایا

تھا۔ وہ اس سے ملنا چاہتی تھی۔ دو جب آیا تو اس نے اسے بہت پیار کیا وہ اس کے لیے کافی نگلٹس بھی لائی جو شکاں نے خود اس کے لیے پسند کیے تھے۔

”ولیم بیٹا آپ کی ماما کیا کرتی ہیں؟“ شہزاد نے محبت سے پوچھا۔

”وہاں لڑائی میں شہید ہوئے۔“

”اوہ آئی سی، جب آپ لاہور آؤ تو ان کے ساتھ ہمارے گھر ضرور آنا۔“

”اگلے آئی۔“

”اور تمہارے پاپا کی ڈیڑھ کب ہوئی؟“

”میری برآمدہ سے پہلے۔“

”آپ اپنے پاپا کو کس نوکرتے ہو گئے۔“

”نہیں آنٹی، میں جانتا ہوں کہ میں پاپا کو اس دنیا میں نہیں مل سکتا تو پھر ان کو یاد کر کے ماما کو کیوں ڈسٹرب کروں۔ میں اپنی ماما کو بالکل ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا۔ وہ میرے لیے سب کچھ ہیں۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی میرے لیے قربان کی ہے۔ میرے لیے تو وہ سب کچھ ہی ہیں۔ ماما بھی اور پاپا بھی۔ ہاں پاپا کو میں اب جمنشن میں مل لیتا ہوں۔ ان سے بہت ساری باتیں کر لیتا ہوں۔“ وہ اس کی باتیں سن کر مکتوظ ہو رہی تھی۔ وہ بچی طور پر کتنا مستعد تھا۔ اسے اس سے باتیں کر کے اچھا لگ رہا تھا۔

”اوہ، کے بیٹا، اب میں چلتی ہوں۔ لاہور آتا تو مجھ سے ضرور ملتا۔ بلکہ میں خود تم سے ملنے آؤں گی اور آپ کی ماما سے بھی ملنا چاہوں گی۔ جنھوں نے تمہاری سوچ کو اتنا پوزیٹو رکھا۔ اب میں چلتی ہوں۔“ اس نے باری باری سب کو پکارا کیا اور پھر باہر نکل گئی۔

جب سے وہ مری سے لوٹی تھی۔ گم سم ہی تھی۔ اس کے اندر کیا کیا کچھ ٹوٹ ٹوٹ کر نکھرا تھا وہ کسی کو نہ بتا سکی۔ اس کا دل فکار اور سوچیں منتشر ہو رہی تھیں۔ زندگی کس کس رنگ میں انسان کو آزما تی ہے کبھی محض ایک سوچ ساری زندگی کے لیے وہاں بن جاتی ہے تو کبھی کوئی ایک احساس شدید زیاں کی صورت اختیار کر لیتا ہے اتنی خاموشی تو وہ زندگی میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ایسی خاموشی جس میں کرب ہی کرب تھا نہ سکوت تھا نہ سکون بلکہ شوریٰ شورا اور دکھ ہی دکھ۔ وارڈن نے بھی اس بات کو نوٹ کیا۔ وارڈن کے ساتھ اس کی بہت گہری دوستی تھی۔

”مسز پلیر کیا بات ہے آپ کچھ پریٹن سی لگ رہی ہیں۔ وہ تو ٹھیک ہے نا؟“ ڈنر کے بعد سس اففال نے اس کے کمرے میں آ کر پوچھا۔

”ہاں، وہ تو ٹھیک ہے۔“ وہ پھر خاموش ہو گئی۔

”پھر آپ کیوں اپ سیٹ ہیں؟“

”ایسی کوئی بات نہیں مس اففال..... مگر نہ جانے کیوں زندگی میں کچھ ایسے موڑ اچانک آ جاتے ہیں کہ انسان کی سوچ اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ مصل خود حیران رہ جاتی ہے اور انسان بھی ہولناک سا دیکھتا رہ جاتا ہے۔ یہی کچھ میرے ساتھ ہوا ہے جو میں نے سوچا نہیں تھا۔ جس کو میں نے زندگی میں نظر انداز کیا۔ شاید اب وہ میری زندگی کی سب سے بڑی آزمائش بن جائے۔“ وہ بے خیالی میں بولتی گئی۔

”میں سمجھی نہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“ مس اففال نے حیرت سے پوچھا۔

”میں خود بھی نہیں سمجھی۔ میں تو شاید زندگی کو ہی نہیں سمجھ سکی۔ میں تو یہی نہیں جان سکی کہ زندگی میں اہم کیا ہے۔ سب سے اہم کس کو فرسٹ

کنگری میں رکھوں۔ مس اففال آپ نے جب گھر چھوڑا تو آپ کے لیے سب سے اہم کیا چیز تھی؟“ اس نے پوچھا۔

”میرے لیے میری ماں اور چھوٹے بہن بھائی۔ ابا کی حادثے میں جان چلی گئی تو میں سوچ میں پڑ گئی کیا کروں۔ کچھ سمجھ نہ آیا تو شہر چلی آئی۔ نہ کوئی راستہ تھا نہ کوئی منزل۔ سیدھی اس ہاسٹل میں آئی اس وقت یہاں کی انچارج مسز میم تھیں۔ انھوں نے میری بڑی مدد کی یہاں میں نے

ایک آفس میں جاب شروع کر دی۔ ہر مہینے گھر پر پیسے بھیجتی رہی۔ میرا اور گھر کا رشتہ پیسے کی ڈوری میں بندھ گیا۔ میں یہاں کس کرب، اذیت اور تنہائی میں وقت گزارتی ہوں۔ کوئی بھی اس کا اندازہ نہ کر سکا پھر سب کسی نہ کسی قابل ہو گئے۔ اماں نے ایک ایک کر کے ان کی شادیاں کر دیں۔ مجھے انھوں نے شاید ہر جذبے پر ضرورت سے ماری سمجھا۔ میں تو بس پیسہ چھاپنے والی مشین یا پھر روٹ بن گئی تھی یا پھر جن نظروں سے اوجھل رہتا ہے وہ ہر طرح سے ناموں و مظلوم رہتا ہے۔ مجھے کسی نے نہ پوچھا کہ میری زندگی میں کسی اور شے کی خواہش ابھی باقی ہے یا نہیں۔ سب کی شادیاں ہو گئیں۔ اہاں دو سال پہلے فوت ہو گئیں۔ بھائی نے آہائی گھر چل دیا اور خود کینیزہ چلا گیا۔ اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ میں بڑھا پا کہاں اور کس کے سہارے گزاروں گی۔ کہنے لگا۔

”آپ میں آپ کو باقاعدگی سے خرچہ بھیجتا رہوں گا۔“ سال ہو گیا ہے نہ اس کا محلہ آیا اور نہ ہی خرچہ۔ اب تو اس ہاسٹل کے سوا میرا کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔ شاید میرا میکا اور سسرال یہی ہے۔ گھر والوں نے سمجھا شاید میں ساری زندگی کے لیے ہی چلی گئی ہوں۔ اب ان کی زندگیوں میں نہ میری اہمیت ہے نہ جگہ۔ پہلے ان کے لیے کتنی قہمی اور اب شاید..... نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے لیے۔ میں کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ شاید وہ لمحہ جب میں نے گاؤں سے شہر کی دہلیز پر قدم رکھا۔ میری زندگی میں آنے والی خوشیوں کو نگل گیا۔ کبھی کبھی کوئی ایک لمبا انسان کو کتنا تباہ کر دیتا ہے اور وہی لمحہ ماضی کی بھینک پر چھائی بن کر مستقبل کی کھات میں لگا رہتا ہے، نہ پھر حال رہتا ہے اور نہ ہی مستقبل۔ اب میں کہاں جاؤں۔ کوئی بھی تو نہیں پوچھتا۔ زندگی کے تیس سال یہاں گزار دیے اپنی جوانی کا خود اپنے ہاتھوں لگا گھونٹ دیا اور جن کی خاطر سب کچھ کیا ان کو احساس بھی نہیں۔ ”آنسو ان کے جھریوں زدہ چہرے پر شکستہ راستے بنانے لگے۔“ ”محبوبوں اور قربانیوں کا یہ انجام بہت بھینک ہے سبز پتھر، دکھ اندر ہی اندر کس طرح ہر وقت کچھ کے لگا رہتا ہے۔ کاش کوئی جان سکے۔ زندگی کے اس مقام پر کھڑی ہو کر سوچتی ہوں کہ زندگی کا حاصل کیا ہے؟“

”آپ دنگی نہ ہوں۔ مس انفصال میرا جودھ ہے وہ میں کسی کو جتنا بھی نہیں سکتی مگر اس کی جہنم اتنی شدید ہے کہ میرا جودھ کر پٹی کر چکی ہو رہا ہے۔ اس آگ سے میرا بدن جل رہا ہے۔ شاید وہی پیش محسوس کر کے آپ میرے پاس آئی ہیں۔“

”لیکن آپ کچھ تو بتائیں؟“ مس انفصال نے اصرار کیا۔

”کیا کہوں؟ کہنے سے میں اپنے آپ کو مزید محرم سمجھوں گی۔ بس ایسا دکھ ہے جو ٹیکس کی طرح میرے وجود کے گوشے گوشے کا احاطہ کر رہا ہے لیکن میں کہہ نہیں سکتی۔ آپ کا دکھ بالکل شگاف اور بکھوٹے والا ہے اور میرا بہت عجیبہ نہ بکھوٹے والا۔ اسی لیے تو میں آج تک کسی سے اپنا دکھ شیئر بھی نہیں کر سکی۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

”سبز پتھر ایک بات کہوں۔ اگر برا نہ مانیں تو.....“

”ہاں..... ہاں ضرور.....“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”دیے تو یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے مگر میں یہ ضرور کہوں گی کہ آپ دیے تو بہت اچھی ہیں مگر نہ تو کبھی چرچ مچی ہیں نہ دیے عبادت کرتی ہیں۔ زیادہ تر کرچہ کو سٹڈے کے سٹڈے چرچ جاتے ہیں۔ آپ کو تو کبھی جانتے نہیں دیکھا۔ خدا کو یاد کریں مشکلات میں اک وہی تو آسرا نظر آتا

ہے۔ وردہ ہم خائماں لوگوں کے پاس اب کیا رکھا ہے؟“ مس افضل نے اس سادگی سے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا کہ وہ تھلانے لگی۔ شاید زندگی کا اذیت ناک مرحلہ شروع ہو چکا تھا۔

”مگر میرا کسی پر یقین نہیں رہا۔“ وہ مشکل سے بولی۔

”ایسا ہوتا ہے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ جب بہت کرائس ہوں تو خدا پر بھی ایمان ڈولنے لگتا ہے مگر پھر اسی کی طرف لوٹتا ہوتا ہے۔ کیا کریں۔ اس کے محتاج جو ظہیر ہے اس نے ہمیں اتنا بے بس بتایا ہے کہ ہر لمحہ ہر وقت اس کو مدد کے لیے پکاریں۔ یہی وہ چاہتا ہے۔“

”مگر میں نے اس کو پکارنا عرصے سے چھوڑ دیا ہے۔ مجھے معلوم ہے نہ میری کوئی دعا میری قسمت بدل سکے گی اور نہ ہی کسی کی دعا میری تقدیر تو پھر اس امید اور آس کا کاندہ؟“ وہ بے بسی سے آہ بھر کر بولی۔

”آپ شدید ڈسٹرب ہیں لیکن میں آپ کے لیے ضرور دعا کروں گی۔“

”شکریہ مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“ مس افضل نے ہر ممکن طریقے سے اس کو مطمئن کرنے کی کوشش کی اور پھر واپس چلی گئیں۔

مردیوں کی چھٹیاں شروع ہو چکی تھیں اس کے ساتھ ساتھ کرس کی تیاریاں بھی کرس ڈیزائنرز اور فیکشنز بھی شروع ہوتے۔ ولیم لاہور آٹا چاہ رہا تھا۔ ہر سال وہ کچھ دنوں کے لیے لاہور آتا تو اس کے پاس ہی ظہیر تانگرا اب وہ قد کاٹھ سے ایک بھر پور جوان لگتا تھا اس لیے اب وہ مین ہاسٹل میں ظہیر اناقدہ سے ناممکن نظر آ رہا تھا۔ یہ شدید ٹینشن ہو رہی تھی کہ وہ اسے کہاں ٹھہرائے۔ وہ انہی سوچوں میں کم مس افضل کے پاس پہنچی تھی۔

”مس افضل، ولیم لاہور آٹا چاہتا ہے۔ کچھ نہیں آ رہا اس کو کہاں ٹھہراؤں۔ ظاہر ہے وہ ہاسٹل میں تو نہیں رہ سکتا۔ اگر آپ کی نظر میں کوئی جگہ ہو تو پلیز بتائیے۔ صرف چند دنوں کی تو بات ہے۔“ مس افضل اس کی بات سن کر سوچ میں پڑ گئیں۔

”ٹھیک ہے میں مس حیدر کو فون کرتی ہوں۔ شی از ناٹس لیڈی کوئی نہ کوئی راستہ تو نکل ہی آئے گا۔ آپ پر یقین مت ہوں۔“

”کون۔۔۔۔۔ مس۔۔۔۔۔ حیدر۔۔۔۔۔ حیدر۔۔۔۔۔ بہت عرصے کے بعد پیام سن کر وہ ایک دم چمک سی گئی تھی اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

”مسٹر حیدر ویلیئر فمشر ہیں۔ بہت اچھے انسان ہیں۔ بہت ہی کٹا پرینٹ۔۔۔۔۔ ان کی بیٹی مس حیدر بھی بہت سوشل ہیں ویل ایجوکیٹڈ اور ٹائٹ۔ ان جیسے چند لوگ اس شہر میں اور ہوں تو یہ شہر جنت بن جائے۔ وہ این جی اوڈ کو بھی سپورٹ کرتی ہیں اور عورتوں کے فلاحی ادارے بھی ان کی سپروائزنگ میں ہیں۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ آپ ان سے بات کریں۔“

”آپ اطمینان رکھیں۔ کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائے گا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

مانشی کی ایک اور چنگاری اس کے دامن میں بجی گئی تھی۔ مانشی سے فرار ناممکن تھا۔ حال ہی میں مانشی کو کیوں جمنیوز تارہتا ہے اور مستقبل ایک سوال بن کر حال اور مانشی کو مشکوک لگا ہوں سے دیکھتا رہتا ہے۔ حیدر تو مانشی میں کہیں گم ہو چکا تھا۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے خود گم کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ اس میں کامیاب نہیں رہی تھی مگر وہ اس کے پرانے وجود کی شناخت کی ایک اہم کڑی تھا۔ اس کا جز تھا۔ اس کی روح کا

صبر تھا۔ اس سے اس نے ایسی محبت کی تھی جو کسی سے نہیں کر سکتی تھی۔ اگر اس کی زندگی میں کہیں محبت کا وجود تھا اور اس کو محبت سے شناسائی ہوئی تھی تو وہ صرف اور صرف حیدر کی وجہ سے ہوئی تھی۔ جب وہ شہلا تھی اور جب وہ شہلا منصور بنی تب بھی مگر جب سے وہ مسز پیٹر بنی تھی۔ اس نے سارے حوالے خود ہی فن کرنے کی کوشش کی تھی۔ گو کہ وہ ایک سایہ سائیں کرکھی کبھی ابھرتا تھا مگر اب پیٹر کا تعلق سب سے زیادہ مضبوط سمجھا جاتا تھا کیونکہ وہ ولیم کا باپ تھا اور وہ اس کی بھو کی حیثیت سے زندہ تھی۔ ولیم کی صورت میں وہ ہمیشہ اس کے سامنے زندہ تھا مگر اس نے کبھی اسے اتنا اہم نہیں سمجھا تھا۔ وہ اس کی شناخت ضرور بنا تھا مگر محبت نہیں..... مگر جو شناخت نہیں بن سکا وہ محبت بن کر روح کی گہرائیوں تک میں زندہ تھا۔ ہمیشہ کے لیے وہ اس کی سانسوں میں سما گیا تھا۔ حیدر کے نام نے ہی اس کو جنم دیا رکھ دیا۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی اور حیدر ہو۔ یہ محض اتفاق بھی تو ہو سکتا ہے اور زندگی اتفاقات کا دوسرا نام ہی تو ہے۔

”مسز پیٹر، ہاسٹل کے پیچھے انیس ہے۔ جب کبھی فارن فیلنگ سٹنڈ آتے ہیں تو وہ ہیں ٹھہرتے ہیں۔ مس حیدر مان گئی ہیں۔ چند روز کے لیے میں آپ کو وہ کھول دیتی ہوں۔“ مسز افضل نے خوشی خوشی اسے بتایا۔

”جینک، یو میری پیس افضل۔ میرا بہت بڑا مسئلہ مل ہو گیا ہے۔“ وہ خوش ہو کر بولی۔

”ہاں، مسئلہ تو مل جاتا ہے مگر پھر بھی نہ جانے کیوں اپنی جگہ جوں کے توں بھی رہ جے ہیں یا شاید زندگی خود ہی بہت بڑا مسئلہ ہے یا سمما۔“ وہ قدرے ناچوسی سے بولی۔

”مس افضل، آپ تو ملی چھوڑ نہ کریں۔ آپ تو ہمیشہ ہمارے لیے سوس آف انسپرنیشن رہی ہیں اور اب آپ ہی.....؟“ اس نے انہیں دلاسا دینے کی کوشش کی گو کہ وہ خود بھی جانتی تھی کہ یہ افلاطون محض ڈھکوسلا ہیں۔

”کیا کریں..... کبھی کبھی.....“ وہ ہلکا سا کھنکھناتے ہوئے کہنے لگی۔

ولیم آیا تو بہت خوش تھا۔ یوں لگ رہا تھا وہ پہلی دفعہ کمرس مٹانے لا ہوا آیا ہو۔ وہ اپنے ساتھ ڈیروں گلفس لایا تھا جو اس کے دوستوں نے اسے دیے تھے۔ اس نے بھی اس کے لیے سٹے کپڑے خرید کر رکھے تھے۔ ولیم نے کمرے میں چھوٹا سا کمرس فری ہالیا۔ اس پر چھوٹے چھوٹے گلفس لٹکائے۔ رنگ برنگی لائنیں لگائیں۔ شیش کے اسے خوب صورت سامنا کا ڈزائن کیا تھا۔ وہ ہر کام بہت اچھا سمجھتا ہو کر رہا تھا اور وہ اس کو یوں بڑے جوش و کھمبارا سوچ رہی تھی۔

یہ بڑی جنون اس میں کہاں سے آ گیا تھا۔ نہ پٹر نہ ہی تھا اور نہ ہی وہ۔ نہ اس نے اسے ایسی کوئی تعلیم دی تھی اور نہ ہی کسی اور نے۔ تو پھر یہ سب..... اسے سوچ سوچ کر وحشت ہی ہونے لگی۔

”مما، آپ ٹیک لے آئیں گی یا پھر میں واپسی پر لیتا آؤں۔“

”تم کہاں جا رہے ہو؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ آج رات جرج نہیں جاتا۔“

”اوہ..... میں بھول ہی گئی۔ کل.....“ اس نے ہاتھ اٹھوری چھوڑ دی۔

”آپ تو بس۔ میں خود ہی ہوا تا ہوں۔“ وہ بغیر کچھ کہے باہر نکل گیا۔ وہ اس کو بھی روکنا چاہتی تھی مگر کیا کہے اور کیسے کہے۔ عجیب شخصے میں پڑ گئی تھی۔ یہ لڑکا اس کے لیے پہنچنا چلا جا رہا تھا۔ اگر وہ کل اسے چرچ جانے کے لیے کہے گا تو وہ کیا جواب دے گی۔ وہ عجیب شش دہچ میں جٹا ہوا گئی تھی۔ ساری رات نہ سو سکی۔ کب اس کی آنکھ لگی اور کب وہ آیا مگر وہ صبح چار ہو کر اسے اٹھا رہا تھا۔

”مما اٹھیں نا۔ آج تو چرچ چلیں۔“ وہ نئی پینٹ شرٹ اور نیوی بلیو سوئٹر میں بہت پینڈم لگ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ یوں لگ رہا تھا بیڑ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”بیٹا میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ میرے پیٹ میں شدید درد ہو رہا ہے مگر کبھی چلی جاؤں گی۔“

”آپ تو بس۔ نہ جانے کیوں ایسا کرتی ہیں۔“ وہ منہ مٹاتا ہوا کہہ کر باہر نکل گیا اور وہ اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ اس کے جانے کے بعد اس افضال خوبصورت بو کے اور ولیم کے لیے گفٹ لے کر آئی۔

”ہائے مسز پیٹر، یہ کیا۔ آپ نے کپڑے بھی نہیں بدلے۔“

”وہ اصل میں میری طبیعت خراب ہے نا۔ اس لیے.....“

”آئی سی۔ یہ ولیم کے لیے ہے۔“ انھوں نے گفٹ اسے دیتے ہوئے کہا۔

”آپ نے یہ کلف کیوں کیا؟“

”مسز پیٹر اب میری زندگی میں ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے علاوہ اور کیا باقی رہ گیا ہے اب تو صرف دوستوں سے ملاقاتیں باقی رہ گئی ہیں اور ہاں آج کھانا میں آپ لوگوں کے ساتھ کھاؤں گی۔ اب میں چلتی ہوں۔ نیچے کچھ لڑکیاں آپ کو دس کرنے آئی ہیں۔ ان کو اوپر ہی بھیج دوں۔“ اس افضال باہر نکلتے ہوئے بولیں۔

”کون ہیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”شاید آپ کی اسٹوڈنٹس ہیں۔“

”اچھا، ٹھیک ہے ان کو اوپر بھیج دیں۔“ اس نے قدرے حیرت سے کہا۔ کیونکہ اس سے قبل کبھی بھی کوئی بھی اسے کرسس دس کرنے نہیں آیا تھا۔ آٹھ، دس لڑکیاں بوکے، ٹیک اور گفٹس لے کر ”میری کرسس“ کہتی ہوئیں اندر داخل ہوئیں۔

”جیک یو، آپ لوگ..... ادھر بیٹھیں۔“ اس نے ان کو چھتر زد دیتے ہوئے کہا۔

”میڈم یہ کیا آپ نے آج ڈریس بھی پہنچ نہیں کیا۔“ اس کی ایک شوخ چیخ سی اسٹوڈنٹ افرابولی۔

”بس یو ٹی، میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ آپ لوگ بیٹھیں میں جائے لاتی ہوں۔“

”نہیں میڈم آپ آرام کریں۔ ہم خود ہی بنا لیتے ہیں بلکہ بنا کر آپ کو بھی پلاتے ہیں۔“ دو لڑکیاں جلدی سے اٹھ کر کچن کی طرف چلی

دیں۔ انھوں نے اہتمام سے نچل سہائی ناشتے کے لیے کچھ چیزیں فریج سے نکالیں۔ ایک کات کر رکھا اور پھر سب چائے پیئے لگیں۔ خوب رونق ہو رہی تھی۔ ان کے قہقہے پورے کمرے میں گونج رہے تھے جب ولیم اعدہ داخل ہوا۔

”ولیم ان سے ملو۔ یہ میری اسٹوڈنٹس ہیں۔“

”ہیلو۔“ وہ سر کو قدرے جھکا کر بولا اور اعدہ کمرے میں چلا گیا۔

”میزم آپ کا بیٹا تو بہت اسمارٹ ہے۔ بالکل قارئین گٹا ہے۔“ طیبہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔“ وہ آہستہ سے بولی اور ہونٹ چبانے لگی۔ تھوڑی دیر بعد سب لڑکیاں چلی گئیں تو وہ اس کے پاس آئی۔

”آؤ بیٹا ناشتا کرو۔“

”مما مجھے بھوک نہیں۔ اب میں سونا چاہتا ہوں۔“ ہاں شام کو مجھے جلدی افشا دیجئے گا۔ میں نے Supper کے لیے قادر جاسن کے پاس

جاؤں۔“

”کون قادر جاسن؟“ اس نے تھوڑی چڑھا کر پوچھا۔

”مما آج چرچ میں میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ پریز کے دوران وہ مسلسل مجھے دیکھتے رہے۔ جب سب لوگ جانے لگے تو وہ خود

میرے پاس آئے۔ مجھے بہت یاد رکھا۔ گلے لگایا۔ مجھ سے مختلف باتیں پوچھتے رہے۔ کہنے لگے آؤ Supper میں ان کے ساتھ ہی کروں اور میں

نے وعدہ کر لیا ہے۔ وہ چرچ کے پیچھے ہی تو رہتے ہیں۔ ان کی شخصیت بہت متاثر کن ہے۔“ اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ اس کی

آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ جیسے اس نے کوئی انوکھی قیمتی شے پالی ہو۔ وہ مسکراتا ہوا سونے کے لیے چلا گیا اور وہ پریشان سی صوفے پر بیٹھ گئی۔

ہر طرف چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ کمر میں غری کے ساتھ کاوا کا گلاس لٹک رہا تھا۔ نچل پر ایک اور برتن بکھرا ہوا تھا۔

یہ سب کیا ہو رہا ہے، یہ کیسا امتحان شروع ہونے والا ہے۔ انسان نے جن باتوں کے بارے میں کبھی سوچا نہیں ہوتا وہی کیوں ہوتی ہیں۔

ولیم کی باتوں سے اسے خوف آ رہا تھا۔ وہ کتنی سنجیدگی سے ساری گفتگو کر رہا تھا۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ بچو رنگ رہا تھا۔ وہ اسے روکنا چاہتی تھی مگر اب

سب کچھ ناممکن لگ رہا تھا۔ اس کے اعدہ جو شعلہ بھڑک رہا تھا وہ بس آتش لٹاؤ بننے کو تیار تھا۔ اس نے جو کچھ ولیم کے لیے سوچا تھا وہ اس سے بالکل

مختلف سوچ رہا تھا جو کچھ وہ دیکھ رہی تھی بہت مبہم، غیر واضح اور دھندلا تھا۔ اس کے برعکس ولیم ہر مہر کو صاف اور واضح دیکھ رہا تھا۔ وہ ذہنی کے ہر

مفہیم کے بارے میں مشکوک تھی اور وہ تجسس کو بھی حقیقت کا عملی جامہ پہنانے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ وہ ایسے موڑ پر کھڑی تھی جہاں کوئی راستہ بھی کسی منزل

کی طرف نہیں جاتا تھا۔ ماضی عذاب تھا تو مستقبل کرناک۔ وہ کتنی ہی دیر گفتگوں پر سر رکھے گمبیری سوچ میں ڈوبی رہی۔ ولیم مقررہ وقت پر گھر سے نکل

کر جا چکا تھا اور وہ اسے جاتا دیکھتی رہی۔

وہ اپنے آپ کو بہت دیک پر سنائی تصور کر رہی تھی جو اپنے بیٹے کو کسی بھی بات کے لیے نہیں روک سکتی تھی۔ چرچ کے پیچھے ایک کچا راستہ

جس پر کہیں کہیں سرخ ناک لگے تھے اور جس کے دونوں اطراف گھٹی ہاڑیں تھیں۔ مل کھانا ہوا یہ راستہ قادر کے گھر کی طرف جاتا تھا۔ ارد گرد سرد و اماں

جاسن اور ہائل پرش کے درخت خصوصی طور پر نمایاں تھے۔ ابھی دھند اتنی گہری نہیں ہوئی تھی مگر پھر بھی وہ قدرے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ اچانک لکڑی کا ایک چھوٹا سا چھانک نظر آیا۔ اس نے ہلکا سا اسے دھکا دیا تو وہ کھٹک چلا گیا۔ پختہ راہداری کے دونوں اطراف خوبصورت وسیع لان تھے۔ ان میں چھوٹے برقی قہقہے روشن تھے۔ ٹھنڈی بخ ہوا کا جھوٹا اس کے جسم سے ٹکرایا اس نے جھرجھری سی لی اور پرانے سینٹ کے کھڑے ہوئے فرش کے آگے بٹے ہوئے برآمدے میں داخل ہوا۔ چھوٹا سا برآمدہ تھا اس میں ایک کمر کی اور ایک دروازہ تھا۔ جس پر سفید اور زردی بال پینٹ ہوا تھا۔ البتہ برآمدے کی دیواروں کو کرسس کی خوشی میں چھوٹے رنگ برنگی قہقہوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ خاصا عجیب سا اور افسردہ سا ماحول تھا۔ اس نے ادھر ادھر ڈھونڈنے کے بعد بیل بجائی۔ ایک بوڑھا سا آدمی باہر نکلا۔

”قادر سے ملتا ہے؟“

”کیا کام ہے؟“ وہ قدرے درشتی سے بولا۔

”انہوں نے مجھے بلایا ہے۔“

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”ولیم..... ولیم ونگ۔“

”اچھا اندر آ جاؤ۔“ وہ اسے تاریک کشادہ کمرے میں لے گیا اور آگے بڑھ کر لائٹ آن کی۔

”بیٹھو، ابھی وہ مصروف ہیں۔ کچھ وقت لگے گا۔ باہر سردی ہے چائے پیو گے یا کافی۔“

”کافی۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ میں بیٹر آن کر دیتا ہوں۔ اس کے پاس بیٹھ جاؤ۔“ اس نے آتش دان میں رکھے بیٹر کو آن کیا اور باہر نکل گیا۔ کمرے کی آرائش واضح طور پر نشان دہی کر رہی تھی کہ قادر کو جس سے کس قدر محبت تھی۔ کمرے میں رکھی کوئی بھی ایسی چیز نہ تھی جو ان کی مادیت پرستی کی طرف اشارہ کرتی سوائے کونے میں رکھے ایک کپینڈر کے۔

کمرے میں مختلف پینٹنگز لگی تھیں۔ ایک دیوار پر بہت بڑی پینٹنگ آویز تھی۔ اس نے اس کے نیچے ڈیٹ پڑھی جو شاید چند سوئی صدی میں بنائی گئی تھی۔ پینٹنگ میں جیسر، مدد میری ان کے شوہر جوزف۔ ان کے گرد جانور، بھیلرین، مقامی گڈریے اور فرشتے خاص طور پر نمایاں تھے۔ فرشتے خدا کی حمد اور جیسر کی پیدائش کی خوشی منا رہے تھے۔ پینٹنگ میں ہر طرف نیلا رنگ نمایاں تھا جو خصوصی طور پر ہشتی رنگ سمجھا جاتا ہے۔ ایسی ہی پینٹنگ وہ مری اسکول میں نمائش کے دوران دیکھ چکا تھا اور اسے تب بھی یہ پینٹنگ بہت اچھی لگی تھی اور اب بھی۔ وہ آگے بڑھا تو مختلف اقسام اور اشکال کے بے شمار چھوٹے بڑے کراس بڑے قرینے سے فیلٹ پر سجائے گئے تھے۔ کارٹر میں مدد میری کا پلاٹرا آف پیرس کا بہت بڑا مجسمہ رکھا تھا۔ وہ دو تین سالہ جیسر کو اٹھائے ہوئے مسکرا رہی تھیں۔ ان کے سر پر سنہری تاج انہیں کوئن آف پوجن کا برکر ہوا تھا۔ دیوار پر ایک بہت بڑی پینٹنگ تھی جس نے پوری دیوار کا احاطہ کر رکھا تھا۔ جس میں جیسر کو صلیب پر لٹکا یا گیا تھا۔ وہ ایک طرف کوٹڑا۔ ایک لمبی سی مگر چھوٹی سی جیسر پر لٹھا سا

کر اس رکھا تھا اور اس کے کٹوں کے اندر جان، لیوک، مارک اور میتھی کی تصویریں بنی تھیں جو نیوٹریسٹ کی چار کتابوں کے آخر ڈیکھے جاتے ہیں۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ خاصی دیر ہو چکی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا تو در کے آنے کے ابھی تک کوئی آواز نہ تھی۔ کافی بھی نہیں آئی تھی۔ البتہ بیڑی کے سہ سے کمر اتر رہے گرم ہو گیا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گیا اور سامنے دیوار پر چھوٹی سی پینٹنگ دیکھنے لگا جس میں ان کے ہاتھوں اور پاؤں پر پتھوں کے نشانات تھے اور ان سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں لرزا جذبات سے آنسو تیرنے لگے۔ کمرے میں ایسی ہی پینٹنگز جا بجا آویزاں تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ملازم کافی لے کر آ گیا۔

”قادر کب فارغ ہوں گے؟“ اس نے قدرے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”کافی پیو، تھوڑی دیر تک آ جائیں گے۔“ وہ کہہ کر باہر چلا گیا اور وہ کافی پینے کے بعد پھر کمرے میں انہی پینٹنگز کو دو بار دیکھنے لگا جیسے سب کچھ اپنے حافظے میں محفوظ کر رہا ہو۔

”ہیلو مائی سن، آئی ایم سوری۔“ جیس ویٹ کرنا پڑا۔ ”قادر نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا اور اس کا ہاتھ چوما۔

ایک بیٹی سی لہر اس کے رگ و پے میں مراہت کر گئی۔ ایسا بیٹھاس اس نے اس سے پہلے اپنی زندگی میں کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

”مائی سن میں نے تمہاری آنکھوں میں ایک خاص چمک دیکھی ہے جو آج کل کے نوجوانوں میں بہت کم ہے۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے گاؤں نے تمہیں سلیکٹ کر لیا ہے۔“

”سلیکٹ اور مجھے..... کس لیے قادر؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”تم محسوس کرائسٹ سے کتنی محبت کرتے ہو؟“ قادر نے اچانک پوچھا۔

”قادر بہت..... بہت زیادہ۔“ وہ شفقت و محبت سے بولا۔

”میں مائی سن اوس از دی ریزن..... یو آراے فرو کر تھن! جب کرائسٹ کسی سے محبت کرتے ہیں تو وہ محبت آنکھوں کے دیے روشن کرنے لگتی ہے اور تمہاری آنکھوں میں جو چمک ہے وہ ہر ایک کو کہاں نصیب ہوتی ہے۔ وعدہ کرو..... مائی سن! وعدہ کرو کہ تم صرف اور صرف کرائسٹ کے بن کے رہو گے تم سوچو گے تو صرف کرائسٹ کو..... تم کام کرو گے تو صرف کرائسٹ کے مشن کے لیے..... تم محبت کرو گے تو صرف کرائسٹ کے لیے..... تم جیو گے تو کرائسٹ کے لیے، جب تم لوگوں کی مشکلات کم کرو گے تو پھر دیکھنا، خداوند یسوع مسیح تمہیں کیا کچھ عطا کریں گے۔ یہ دنیا تمہاری مٹھی میں آ جائے گی اور تم زمین و آسمان کی تہ سے آزاد ہو جاؤ گے۔ تم چلو گے تو یوں محسوس کرو گے جیسے کرائسٹ تمہارے ساتھ چل رہے ہیں۔ بات کرو گے تو وہ تمہارے ساتھ بولیں گے..... مائی ڈیر سن، یو آر سلیکیٹڈ۔“ انھوں نے پھر اسے گلے لگایا۔

قادر کے الفاظ اور شخصیت میں جانے کیا عطا طبیسی کشش تھی کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ابھی بہت سارے الفاظ کے معلوم سے وہ ٹالہ تھا مگر جیسے کوئی شے روح میں اتر گئی تھی، وہ عجیب سے لڑاؤں میں تھا۔

”اچھا ادھر آؤ..... یہ بتاؤ تم نے لیوچر کے لیے کیا پلاننگ کی ہے؟“

”مما مجھے پائلٹ بنانا چاہتی ہے۔“

”اور تم خود کیا چاہتے ہو؟“

”میں نے ابھی کچھ ڈیپائٹ نہیں کیا۔“

”تو ابھی ڈیپائٹ نہ کرو۔ مائی سن کہ تم نے جیسو کے مشن کو آگے بڑھانا ہے۔ پائلٹ بن کر تم آسمان پر تو اڑدے مگر دلوں پر حکومت کرنا اور انہیں تسخیر کرنا زیادہ مشکل اور ایڈوانس ہے۔ آؤ اب ڈنر کرتے ہیں۔“ وہ اسے محبت سے ڈانٹتے ہوئے کہنے لگے۔

ڈنر سادہ تھا مگر بہت لذیذ تھا۔ کھانے کے دوران میں وہ اس سے اس کے حلقے مختلف سوالات پوچھتے رہے جو کچھ مائے اسے بتاتا تھا اور اس کے حافظے میں محفوظ تھا وہ بتاتا رہا۔

”گنا ہے تم جہاز بہت کم جاتے رہے ہو۔“ قادر کے اس سوال نے اسے چونکا دیا۔

”نہیں..... میں قادر..... پر ہیچس.....!“

”اس لیے تم کرکٹ میچ کے بارے میں بہت کم جانتے ہو۔ خیر تم بس اسی پر سوچو کہ جیسو تم سے کچھ چاہتے ہیں۔“

”لیکن قادر میں کیا کر سکتا ہوں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”تم مجھ سے ٹیٹ پر رابطہ رکھو اور اپنا ڈیٹا مائل کو کہ تم نے جہاز جو اٹن کرنا ہے، اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی اہم کام نہیں۔“

”لیکن ماما.....!“

”میرے خیال میں اگر وہ بھی کرائسٹ سے محبت کرتی ہیں تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ کھانے کے بعد انہوں نے اسے کافی لٹریچر پڑھنے کے لیے دیا اور خود اسے گاڑی میں چھوڑنے اس کی انجینسی تک آئے۔

”اوہ مائی سن، گڈ بائے..... اپنی ماما کو بھی جہاز لے کر آنا۔“

”اچھا..... لیکن وہ جہاز نہیں جاتی ہیں۔“

”کیوں مائی سن! وہ ایک نئی جہاز کی ضرورت ہے؟“

”قادر!..... شی ازا!“ وہ اس بات کی تردید کرتے ہوئے کچھ کہنا چاہتا تھا۔

”تو مائی سن!..... نوا کسکے ڈ.....!“

”اوہ..... قادر!“ وہ جیسے تھکرا ڈالتے ہوئے بولا۔ قادر کے الفاظ اس کے دل پر جیسے نقش ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے حافظے پر زور ڈالا۔

مما کبھی بھی تو جہاز نہیں گئی تھیں اور آج بھی نہیں۔ اس کا مطلب ہے ماما کو جیسو سے محبت نہیں۔ وہ انہی سوچوں میں گم بیڑ میں چڑھا ہوا

کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

”ولیم! مائی ڈیئر..... تم کہاں رہ گئے تھے۔ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“ وہ پریشانی سے بولی۔

”مما.....! میں فادر کے ساتھ بیڑی تھا۔ میں آپ کو بتا کر تو گیا تھا۔“

”انہوں نے تمہیں کیوں بلایا؟“ اس نے بے تابی سے پوچھا۔

”مما، میں جج جوائن کرنے جا رہا ہوں۔“

”نوبائی سن! میں نے تمہارے لیے دن رات پلاننگ کی ہے، وہ سب..... تمہیں یہ کھیل نہیں ہو سکتا..... تمہیں صرف اور صرف پائلٹ بننا

ہے اور آئندہ ہم قادر سے بھی نہیں ملو گے..... تمہیں صرف اور صرف ہواؤں میں اڑنا ہے۔“ وہ قدرے سختی سے بولی۔

”اوکے ممما..... گڈ نائٹ!“ وہ اس کو نظر انداز کرتا ہوا چلا گیا۔

وہ وہیں بیٹھی سوچتی رہی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا، کیا کرے جو وہ سوچتی تھی، کہہ نہیں سکتی تھی۔ وہ زندگی میں جن جن لوگوں سے جو بھی کہتا

چاہتی تھی کبھی نہ کہہ سکتی تھی۔ جو سوچتی تھی، وہ وہاں ہی رہ جاتا۔ بہت کچھ ہونے کے باوجود وہ خاموشی سے سرخڑ کر دیتی اسے معلوم تھا کہ وہ کسی کو

بھی کنوئس نہیں کر پائے گی تو خاموش رہنا ہی بہتر ہے اور اسی خاموشی کے آگے اس نے بار بار اٹھنا ڈالے تھے ہر بار خود ہی مجرم ٹھہری۔ جب وہ

یونیورسٹی میں تھی تو قدرے کوئی فٹنٹ تھی مگر حیدر سے تعلق ٹوٹنے کے بعد اور اپنی ذات کی ذلت کے بعد اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے پاؤں

تسے سے زمین ہی سمجھتی نہ تھی۔ وہ ہر بات کہتے ہوئے ڈرتی۔ ہر فیصلہ کرتے ہوئے جھجکتی اور ہر فیصلہ کرنے کے بعد پھپھکتی۔ وہاں ہونے کے

باوجود اپنا حق استعمال کرنے کا حوصلہ نہیں کر پاتی تھی۔ وہ اسے ڈانٹ ڈپٹ کر مجبور نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے خیالات اس تک پہنچانا چاہتی تھی مگر

کس طرح..... اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ولیم اور اس کے درمیان کیونیکیشن گپ تھا۔ اسے شدید پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اس نے اس کا اسلامی نام

کیوں نہیں رکھا۔ اس نے ولیم کا نام پیلر کے بتائے ہوئے نام پر کیوں رکھا۔ جو شخص اس کے وجود کا خواہاں نہیں تھا۔ جسے اس میں رتی بھر دلچسپی نہ تھی تو

اس نے کیوں کھرا سرا کر لیا تھا۔ وہ اس لیے پیلر کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے تو ولیم کو ایک نظر بھی نہیں دیکھا تھا اور اس نے نادانستہ امتحانہ طور پر

نام کے سلسلے میں اس کی رائے لے لی۔

”یہ تمہارا بچہ ہے، میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ تم جو نام چاہو رکھو، تمہیں پورا اختیار ہے۔“ وہ بدلتی سے بولا۔

”مگر رائے دینے میں کیا حرج ہے۔ میرے پاس یہ تمہاری یاد اور نشانی ہوگا۔ کیا ہی اچھا ہوا اگر تم اسے نام دے دو۔“ نہ جانے کیوں وہ

جذباتی ہو رہی تھی۔

”ٹھیک ہے، ولیم بیگل رکھ لو۔“ وہ بجا جھٹائی سے بولا۔

”کیوں.....؟“

”یہ میرے گریڈ پا کا نام تھا۔ وہ میرے باپ سے بہتر تھا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تمہارا بیٹا مجھ سے اور میرے باپ سے بہتر ہو۔“

یہی دہلہ تھا جس نے اس کے لیے مسائل کھڑے کر دیے تھے۔ اسے اپنے امتحانہ فیصلے پر فحسوس ہو رہا تھا۔ اگر وہ اس وقت اپنا فیصلہ سناتی

اور اپنے فیصلے پر قائم رہتی اور ولیم کے بجائے کوئی مسلم نام رکھتی تو آج وہ اس دور سے پر نہ کھڑی ہوتی۔ اس کی اپنی فطرتی اتحاد اعدا اب بین کر سامنے آئے

مکی اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اب میں کیا کروں؟ وہ مجھتا رہی تھی۔ مجھے قادر سے مل کر بات کرنی چاہیے، ان کو ساری بات بتا دینی چاہیے۔ شاید وہ کچھ کر سکیں لیکن میں کس طرح اور کیسے ان کو ساری بات بتاؤں گی۔ کہاں سے شروع کروں گی اور ولیم کا ریلیکشن کیا ہوگا؟ وہ بہت ساری باتوں کو ترتیب دیتے لگی اور پھر انہیں ترتیب سے جملوں میں پرونے لگی۔ ان کا سیاق و سباق قادر کے سوالوں کا جواب..... ولیم کی تسلی کیسے کرے گی؟ وہ جتنا سوچ رہی تھی، اتنا ہی بھجولا رہی تھی..... ایک انجانا سا خوف دل میں سا گیا۔ ولیم کی جتنی بھی چٹھیاں تھیں، وہ ہر روز قادر سے ملنے جاتا۔ مٹھنوں نہ جانے وہاں کیا کیا کرتا رہتا۔ وہ کتنی دفعہ اسے روکنے کی کوشش کرتی مگر نہ پاتی۔ وہ اس کے معصم ارادے اور آنکھوں میں پرمعزم چمک دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتی۔ ولیم اس کے بارے میں قدرے مشکوک تھا۔ اس سے کرختی کے بارے میں مختلف سوالات کرتا رہتا اور وہ ادھر ادھر نال جاتی۔

آج صبح وہ ولیم کو بتائے بغیر باہر چلی گئی تھی۔ کالج میں تو وٹنر ہائیڈر تھیں اور وہ کبھی بھی ولیم کو بتائے بغیر باہر نہیں جاتی تھی۔ وہ سو رہا تھا۔ ڈور ٹیل کافی دیر سے بنا رہی تھی۔ وہ منہ بسورتا ہوا غلاور و رازہ کھولا۔ اس کے سامنے ایک دیلی پتلی سائونلی سی لڑکی کمری تھی۔ وہ خامی پریشان لگ رہی تھی۔

”م..... میں اندر آ جاؤں؟ میڈم کہاں ہیں؟“ وہ قدرے گھبرائی ہوئی تھی۔

”وہ تو گھر نہیں ہیں، آپ کون ہیں؟“

”میں جوزفین ہوں۔ میم کی اسٹوڈنٹ، وہ کہاں گئی ہیں، مجھے ان سے بہت ضروری کام ہے۔ اگر آپ اسٹڈنٹ کریں تو میں انتظار کر لوں؟“

”شیوہ!“ اس نے اسے راستہ دیا۔

وہ لاونج میں صوفے پر بیٹھ گئی اور وہ اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ فریش ہو کر آیا تو وہ بے چینی سے صوفے پر پھیلو بدل رہی تھی۔ اس نے بخور دیکھا تو دور دور رہی تھی۔

”کیا بات ہے..... آپ پریشان لگ رہی ہیں؟“

”نن..... نہیں تو.....“ اس نے جلدی سے آنکھیں اپنی پتیلیوں سے فلک کرتے ہوئے کہا۔

”اگر آپ کو کوئی مسئلہ ہے تو بتا دیں۔ مما تو نہ جانے کب آنکھیں کی؟“

”وہ..... میری امی کی طبیعت بہت خراب ہے اور ہمارے پاس جیسے نہیں، ان کو اسپتال لے کر جاتا ہے۔ میم اکثر کالج میں میری سہیلپ کرتی رہی ہیں۔ اس وقت مجھے کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے میں ادھر ہی آ گئی۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”اوہ گاڈ! تو آپ نے پہلے نہیں بتایا۔ اتنی دیر آپ انتظار کرتی رہی، آپ چلیں میرے ساتھ۔“ اس نے دروازہ لاک کیا جاپی گیٹ کپڑے کو دی اور اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے اپنے آپ کو بہت محفوظ محسوس کر رہی تھی۔ وہ اسے شہر سے دور گندی سی جگہ بستی میں لے گئی۔ ایک کمرے اور برآمدے پر مشتمل گھر میں لے جاتے ہوئے اسے جھجک بھی محسوس ہو رہی تھی مگر وہ مجبور تھی۔ ولیم کو دیکھ کر ارد گرد کے بچے اور لوگ یوں اکٹھے ہو گئے جیسے کوئی شہزادہ راستہ بھول کر ادھر آ نکلا ہو اور ہر کوئی شہزادے کی ایک جھلک دیکھنے کو بے تاب ہو۔ جوزفین کی چھ پینٹیں تھیں اور ایک دو سالہ بھائی۔ باپ ایک سال پہلے ٹیکسٹری میں کام کرتے ہوئے ساتویں منزل سے گر کر مر گیا تھا۔ اب کمائی کا کوئی بھی آسرا نہ تھا۔ ماں لوگوں

کے گھروں میں کام کرتی تھی۔ ٹھنڈک جانے سے اسے شدید غموں کا شکار ہو گیا تھا۔ ساری رات اس نے شدید الہیت میں گزاری۔ ولیم جلدی سے ٹیکسی لے آیا اور جرنلین کے ساتھ اسے اسپتال میں لے گیا۔ اسے فوراً اسپتال میں ایڈمٹ کر لیا گیا۔ کچھ ضروری مل ادا کرنے کے بعد اس نے پانچ سو روپے جرنلین کے حوالے کیے۔

”میں ماما کے ساتھ دوبارہ چکر لگاؤں گا۔ اس وقت میرے پاس صرف بچی پیسے ہیں، آپ رکھ لیں۔“ اس کے لہجے میں نہایت مٹھاس اور نرمی تھی۔ جرنلین کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ صرف چند آنسو گرا کر اس کا شکر یا ادا کیا۔

”جینک یو..... آئی دل ریٹرن یوسن.....“ وہ بے شکل بولی۔

”ڈونٹ ڈری.....“ وہ کہہ کر باہر نکلا۔ اس کا دل عجیب سی خوشی اور سرور سے لبریز تھا۔ ایسی خوشی اس نے کبھی محسوس نہیں کی تھی اسے قادر کے الفاظ یاد آنے لگے۔

”جب تم لوگوں کی مشکلات کم کرو گے تو پھر دیکھنا، خداوند یسوع مسیح تمہیں کیا کیا عطا کریں گے۔ یہ دنیا تمہاری مٹھی میں آ جائے گی۔ تم چلو گے تو یوں محسوس کرو گے جیسے کرائسٹ تمہارے ساتھ چل رہے ہیں۔ مائی سن ایڈ آریسٹیکٹڈ..... یو آر سلیکٹڈ.....“ اس کے لبوں پر مسکراہٹ سی پھیل گئی۔ قادر کے الفاظ اس کے ذہن میں مسلسل گونج رہے تھے۔ اسے آج جو خوشی ملی تھی وہ اس نے پہلے کبھی بھی زندگی میں محسوس نہ کی تھی۔ اسے گاڈ اور کرائسٹ سے محبت تو تھی ہی، اب کرائسٹ اس کی ذات کا سب سے اہم حصہ بن گئے تھے اور قادر..... تو جیسے کسی بیش بہا نعمت سے کم نہیں لگ رہے تھے۔ اس کے اندر کچھ کچھ گزرنے کا عزم جواں ہو چکا تھا۔ وہ وہی کرے گا جو قادر کہیں گے اور قادر جو کچھ بھی کہیں گے وہی سچ ہوگا۔ قادر پر اتنا اعتماد کرنے کو دل چاہنے لگا۔ وہ واپس آیا تو ان کو دیکھ کر چٹکا۔ اس کی طبیعت بہت خراب تھی۔

”ماما، کیا ہو..... آپ صبح کجاں چلی گئی تھیں؟“

”میں مس انفال کے پاس گئی تھی مگر تم کدھر چلے گئے تھے بغیر بتائے۔ میں تمہارے لیے پریشان ہو رہی تھی۔“

جواب اس نے جرنلین کی ساری کہانی اسے سنائی۔

”اچھا کیا..... وہ بے چاری بہت دیکھی لڑکی ہے۔ کوئی بھی تو آسرا نہیں۔ ہم شام کو اس کی ماں کو دیکھنے اسپتال پہنچیں گے۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”ہاں، میں نے جرنلین سے وعدہ کیا تھا کہ میں ماما کو لے کر آؤں گا۔“ جرنلین کی ماں کی حالت اب قدرے بہتر تھی۔ جب وہ اسے اسپتال ملنے گئے تو وہ بیڈ پر بیٹھی بچوں کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ جرنلین اسے دیکھ کر کھل اٹھی۔

”ہمم! آپ..... آپ..... جینک یو..... جینک یو.....“ وہی گج۔ ”اسے الفاظ نہیں مل رہے تھے کہ وہ ان دونوں کا شکر یہ کیسے ادا کرے۔“

”بیٹا! آپ پریشان نہ ہوں۔ خدا سب ٹھیک کرے گا۔ شکر ہے ولیم گھر پر تھا اور آپ کی مدد کر سکا۔“

”ہاں..... میں ان کی بہت شکر گزار ہوں۔“ احسان مندی اور شکر گزاری کے بوجھ تلے اس کی آنکھیں نہیں اٹھ رہی تھیں۔

”اٹس آل رائٹ..... آپ کی مدد سے مجھے جو خوشی ملی، وہ میرے لیے سب سے بڑا گفٹ ہے۔“ ولیم کے لہجے میں اعتماد اور غلوں تھا وہ

مسکرا کر بولا۔ ولیم کی جتنی چٹخیاں باقی تھیں۔ وہ روزانہ قادر کو ملنے جاتا اور اب جانے سے پہلے بھی وہ ان کو ملنے جا رہا تھا۔ ہاں کو بھی اس نے اصرار کر کے ساتھ لے لیا تھا۔ قادر کی بات فلفلہ ہو رہی تھی۔ وہ واقعی ٹرو کر بچن دیکھن تھی۔ اس کا دل قدرے مطمئن ہو گیا۔ قادر ان سے بہت محبت سے پیش آئے۔ سب نے شام کی جائے اکٹھے ہلی۔ قادر نے اسے ہائل کالینسٹ ورژن دیا۔

”اور سبز پیرا یہ آپ کے لیے ہے۔“ انھوں نے ایک خوبصورت کراں اور مدد میری کی لائف ہسٹری پر ایک کتاب اسے تحفہ دی۔

”جھجک یو قادر..... میں آپ سے ملنے دوبارہ آؤں گی۔“ اس کی زبان کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

”ضرور..... اور آپ جرج بھی باقاعدگی سے آیا کریں۔“

”ہاں..... لیکن میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی اس لیے بہت کم باہر نکلتی ہوں۔ کالج اور ہاسٹل..... بس یہی میری مصروفیت ہے۔“

”خداوند خدا! آپ پر رحم کرے..... اور آپ کو شفا بخشے۔ خداوند یسوع مسیح آپ کا حامی و ناصر ہو۔“ انھوں نے ایک دم ہاتھ اٹھا کر دعائیں شروع کیں تو ولیم نے بھی ہاتھ اٹھا لیے اور نادانستہ اسے بھی ہاتھ اٹھانے پڑے۔ اس کا ذہن عجیب نگلش میں مبتلا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ اس نے ایک لمبے عرصے کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تھے گو کہ دل ابھی بھی یکسوئی سے خالی تھا۔ پیر سے شادی کے بعد تو اس نے خدا سے اپنا ناتانہ بالکل منقطع کر لیا تھا۔ جب دعائیں نہ میرا مقدر بدل سکتی ہیں اور نہ ہی شناخت تو یہ سب کچھ بے معنی ہے۔ خدا سے کیا رابطہ کھا جائے؟ جب وہ میرا دکھتے ہوئے بھی اسے کم نہ کرے۔ میری آزمائشوں میں میرا ساتھ نہ دے تو پھر سب قلعہ بے معنی ہیں۔ اے بس سانس پوری کرنی تھیں اور وہ کر رہی تھی۔

”آپ دیکھیے گا، آپ کی روح کو سکون آ جائے گا۔“ قادر وثوق سے بولے۔

”خاک سکون آئے گا بلکہ سب کچھ اور منتشر ہو جائے گا۔“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ولیم سرور تھا کہ قادر کی اور ماما کی ملاقات بہت خوشگوار ماحول میں ہوئی تھی۔ اگلے دن وہ واپس مری چلا گیا اور وہ انفرادی بھر کھوئی کھوئی رہنے لگی۔ اور ہاسٹل واپس آ گئی۔

”مسز پنیر کیا بات ہے؟ آپ بہت دنوں سے ابھی ابھی لگ رہی ہیں۔ کرمس والے دن بھی آپ بے حد پریشان لگ رہی تھیں۔ ایسی کیا پریشانی ہے کہ آپ شیر بھی نہیں کر سکتیں۔“ مس افضال نے اسے راستے میں روک کر پوچھا۔

”مطموم نہیں مگر طبیعت بہت بوجھل رہتی ہے۔ نہ جانے کیسی پریشانی ہے شاید آخری وقت قریب آ گیا ہے۔ آخری وقت میں ایسی ہی اواسی اور پریشانی چھائی رہتی ہے۔“ وہ مایوسی سے بولی۔

”اللہ نہ کرے..... یہ آپ صبح کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ حوصلہ مت ہاریں، ابھی تو ولیم کو آپ کی بہت ضرورت ہے۔“ مس افضال نے اسے تسلی دینا چاہی۔

”کسی کو کسی کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ کوئی کسی کے لیے اہم نہیں ہوتا۔ سب ذمہ دہر چے ہیں کوئی کسی کے لیے نہیں مرنا۔“ وہ آہ بھر کر بولی۔

”اچھا، آپ پریشان نہ ہوں۔ شام کو سب خواتین کی ایک میٹنگ ہے۔ آپ نے بھی کامن روم میں پہنچنا ہے۔ آپ کی شرکت بہت

ضروری ہے۔ ایک اہم پروگرام ڈسکس کرتا ہے۔" مس افعال نے اسے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔
 "ٹھیک ہے، ابھی چلتی ہوں۔ کالج سے دیر ہو رہی ہے۔" وہ بوجھل قدموں سے گیٹ سے باہر چلی گئی اور مس افعال اس کی باتوں پر دل
 مسوں کر رہ گئیں۔

شام کو سب خواتین مس افعال کے ہمراہ کاسن روم میں موجود تھیں۔ انچارج مسز شائستہ جبیں بھی ان کے ساتھ بیٹھی تھیں۔
 "مس حیدر، کافی سوشل لگتی ہیں۔ انہوں نے خصوصی طور پر لیئر بھینچا ہے کہ درکنگ دیکھنے کے لیے بھی کچھ تفریح ہونی چاہیے۔ ایک فن فیکر
 ٹائپ فنکشن اور ہاں، اس کے ساتھ کچھ ایسا سٹکس بھی ہوں جو ان خواتین کے مسائل سے مدد دے گا۔" مسز شائستہ نے کہا۔
 "لیکن مس حیدر کو اس میں اتنی دلچسپی کس لیے ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ان کے بارے میں تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے مگر دوسری جگہات تو نمبر بنانے کے چکروں میں رہتی ہیں۔ ان کے لیے تو یہ سب ان کے
 سپورٹرز کی پوزیشن اسٹریٹجک کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ ورنہ ان کے دل تو غلوں سے خالی ہوتے ہیں۔ بہر حال مسز پٹیل، آپ کالب دلچسپ بہت اچھا
 ہے۔ آپ کپیٹرنگ کریں گی اور ایک اسٹیک بھی آپ تیار کر لیں۔ اور باقی کچھ ٹریڈیشنل پروگرامز ہوں گے۔ اس کے علاوہ اسٹار بھی کر لیں گے۔"
 مسز شائستہ نے کافی دیر ان سے پروگرام ڈسکس کیا اور مطمئن ہو کر چلی گئیں۔

"میڈم اچیف گیٹ کون ہوگی؟" ایک خاتون نے جاتے جاتے انہیں روک کر پوچھا۔

"ظاہر ہے، مس شہلا حیدر ہی ہوں گی۔" ایک اور منسٹر کی مسز بھی ہیں۔ اگر ایک کو بلایا جائے اور دوسری کو نہ بلایا جائے تو پھر دونوں میں
 ٹھن جاتی ہے اور پھر پتے تو ہم جیسے لوگ ہیں۔ آپ لوگ چار پانچ روز میں مجھے فائل کر کے بتادیں، پھر دعوت نامے بھی بھیجے ہیں۔ ہاسٹل کی ٹیمنٹ
 کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ ہوں گے۔ جو ڈیفینڈرسٹ چلاتے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے بہت بڑی کپیٹرنگ ہوگی۔"

شہلا حیدر نام جانا پچھانا سا بھی لگ رہا تھا اور نہیں بھی۔ وہاں بیٹھی خواتین کیا کیا پروگرامز بتاتی رہیں، اسے کچھ یاد نہ تھا۔ اس کا ذہن تو
 ایک نقطے پر اٹک گیا تھا۔ اسے جیسے کوئی پچاس سی چھ گئی تھی۔ وہ بے چینی سے معذرت کرتی ہوئی اٹھ گئی۔

"آج کل مسز پٹیل کچھ ڈسٹرب ہیں۔" مس افعال نے اس کے جانے کے بعد کہا۔

"ہاں..... شاید....." کوئی بھی کھنڈ نہ کر سکا کیونکہ وہاں رہنے والی ہر خاتون ہی ڈسٹرب تھی اور ہر ایک کو اپنا غم دوسری سے زیادہ لگتا تھا
 اور یہ بھی مسز پٹیل نے کبھی بھی اپنی کوئی بات کسی سے شیئر نہیں کی تھی۔ سب یہی جانتے تھے کہ ان کے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے اور وہ اب بیٹے کو پال
 رہی ہیں۔ اس سے مزید کسی نے بھی جاننے کی خواہش نہ کی اور اس نے بتانے کی۔

کس طرح اس نے فنکشن کے لیے اسٹیک تیار کیا، کس طرح وہ بدلی سے اس سارے کام میں ایکٹو رہی، یہ صرف وہی جانتی تھی۔ کئی بار
 دل چاہا کہ مس افعال سے ایکسکس ڈکر لے کہ وہ کوئی کام نہیں کر سکتی مگر وہ ان سے کچھ بھی نہ کہہ پاتی۔ خاموشی سے بنا کچھ کہے لوٹ آتی۔ مس افعال
 اور ہاسٹل کی دوسری خواتین بہت اکیسا پھرتھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے بہت عرصے کے بعد ان کی یکسانیت سے بھرپور زندگیوں میں خوشی کا کوئی لمحہ آیا

ہو۔ کچھ پیٹر، پلیٹ، پیڑ، سب لوگ کچھ مختلف سوچ رہی تھیں۔ کپڑوں کے بارے میں، گیٹ اپ کے بارے میں..... اور بہت کچھ۔
 ”سز پیٹر! شام کو دعوت دے لکھتے ہیں۔ آپ دو تین لڑکیوں کو لے کر آجائیے۔ لسٹ میں نے بتائی ہے، یہ کام بھی ہو جائے تاکہ کل ہی دعوت دے بھیج دیے جائیں۔“ مس افضال نے کہا۔

”جی ہجر..... ہم لوگ شام کو آجائیں گے۔“

شام کو وہ مدرخ اور نیلہ کے ساتھ مس افضال کے کمرے میں چلی گئی۔ مدرخ اور نیلہ دونوں ہی بہت اکیٹو اور سوشل لڑکیاں تھیں۔ جنہیں ہاسٹل آئے ابھی چند روز ہی ہوئے تھے اس لیے ہاسٹل کی یکسانیت اور اداسی کا اثر ابھی ان پر نہیں ہوا تھا۔

”سز پیٹر! آپ نے کیا ڈریس پہنایا ہے؟“ مدرخ نے ہڈ جوش انداز میں پوچھا۔

”بھئی کال لوں گی کوئی پرانی سا ڈریس۔“ وہ بے دلی سے بولی۔

”اور تم نے؟“ اب کی بار نیلہ نے اس سے پوچھا۔

”میرے پاس آج خرید کر دیں گے۔“ مدرخ اک ادا سے بولی۔

”کیا مطلب..... تمہارے پاس.....؟“ نیلہ کی آنکھوں میں شوخی تھی۔

”اتنا کام کرتی ہوں۔ کیا بھیک سوٹ خرید کر دے دیں گے تو کوئی احسن تو نہیں کریں گے۔“ مدرخ نے قہقہہ لگا کر کہا تو دونوں ہنس دیں۔

”کاش..... میرے بھی کوئی ہاس ہوتے۔ میں تو ایک پرائیویٹ اسکول میں جاب کرتی ہوں۔ وہاں کی پچھڑی پر پہل بات سیدھے منہ سے کرتی نہیں سوٹ خرید کر دیتا تو ناممکن اور دو کی بات ہے۔“ سز پیٹر ان کی باتیں سن کر مسکرا دیں۔

”سز پیٹر! لسٹ لے لیں، ہمارا احتیاط سے سب کے نام لکھوائیے گا اور وی آئی پیٹر اور چیف گیٹ کے نام آپ خود لکھیں گے۔ بہت احتیاط سے..... میرا مطلب آپ سمجھ رہی ہیں نا.....“ مس افضال نے ناموں کی لسٹ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”آپ بے فکر رہیے..... میں خود ہی یہ کام کرتی ہوں۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ میں اسٹور میں جا کر راکر آ کر چیک کر لوں۔“ مس افضال اٹھتے ہوئے بولیں۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ لسٹ لے کر پڑھنے لگی۔ ایک نام پر تو اس کا دل جیسے زور زور سے دھڑکتے لگا۔ سز شزا منصور۔ تو کیا یہ وہی شزا ہے جو انگلینڈ میں..... اس دن اور اب چیف گیٹ..... ماڈل..... اور اب چیف گیٹ..... اس کا جنم کھپکانے لگا۔ اسے اس بات کا انہوں نے تھا کہ وہ

کیا بن چکی تھی، لڑائی تھا تو اس بات پر کہ وہ کس طرح اس کے سامنے اپنے وجود اپنی شناخت کے لیے منصور اور اس کے بچوں کو دھکا دے رکھی تھی اور آج وہ کہاں کھڑی تھی ورنگ وین ہاسٹل میں۔ اکیڈمی کم کالج میں ایک ادنیٰ ٹیچر اور پھر عام سی ٹیچر..... کیا یہی وہ مقام تھا جس کو حاصل کرنے کے وہ

در پہ تھی۔ اس وقت اس میں کتنی اتنی تھی۔ کتنا اعتماد اور خود داری تھی اور سب کچھ اتنا لگائی اور عارضی ثابت ہوا کیونکہ یہ سب اس کی ذات کی خصوصیات

نہیں تھیں۔ وہ تو شروع سے ہی بزدل اور ڈر پوک تھی۔ نہ جانے اس وقت اس میں اتنی ہمت اور قوت کہاں سے آگئی تھی؟ اور اب شزا اسے دیکھ کر کیا

سوچے گی؟ وہ اس کا سامنا نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ کاش وہ نہ آئے۔ اسے کوئی ضروری کام پڑ جائے اور وہ نہ آ سکے۔ دل ہی دل میں نہ جانے اس نے کتنی بار دعا کی۔ فنکشن تک وہ بدلی اور بے اطمینانی محسوس کرتی رہی اور جس دن فنکشن تھا، وہ سخت بے چینی سے ادھر ادھر پھرتی رہی۔ اس افعال اور مزہ شائستہ جہیں صبح سے بھاگ دوڑ میں مصروف تھیں۔ خواتین کے مختلف اسٹائر پر خوب رونق تھی۔ باقاعدہ تقریب کا آغاز ہو چکا تھا۔ مس حیدر کو دیکھ کر وہ چمک سی گئی۔ وہ وہی تھی جو وہ سمجھ رہی تھی۔ وہ حیدر کی ہی بیٹی تھی کیونکہ وہ کافی حد تک باپ پر تھی۔ وہی نین نقش اور دائیں آنکھ کے پاس سیاہ گل۔ بے اطمینان کا فیڈنٹ اور گرلین گل۔ اس کی شاندار پرستائی کے سامنے ہر ایک بچے نظر آ رہا تھا۔ وہیں بائیس برس کی دھان پان ہی لڑکی تھی۔ اسے دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوئی مگر وہ آگے جا کر اسے مل نہ سکی۔ البتہ سزا فنکشن میں بہت دیر سے آئی تھی۔ اس کی لڑائیوں کا مرکز وہی تھی، وہ مہمان خواتین کے ساتھ اس قدر باتوں میں مصروف تھی کہ سزا نے اس کی طرف بہت کم دھیان دیا۔ ویسے بھی گردن لایم نے اس کو قدرے بدل کر رکھ دیا تھا۔ سزا کے بجائے منصور بھی ہوتا تو اسے بھی پہچاننے میں چند لمبے لگتے۔ اس نے اس افعال کی کہانی پہنچائی ایک مسکراہٹ تیار کیا تھا جو خصوصی طور پر ان کی مرضی اور اجازت لے کر کیا گیا تھا۔ اس کی ایک تنگ اتنی جامعہ تھی کہ سب بہت متاثر ہوئے۔ ہاسٹل میں رہنے والی کئی خواتین تو باقاعدہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ مس حیدر نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو خاموشی سے آہ بھر کر رہ گئی۔ اس کے چہرے پر بھی افسردگی خصوصی طور پر نمایاں تھی۔ فنکشن کے اختتام پر سب نے اس کی ایک تنگ اور کمپیئرنگ کو بہت سراہا۔

”درنگ۔ دیکھن کے کتنے مسائل ہوتے ہیں، ہم لوگ تو کبھی جان ہی نہیں پاتے۔“ مس حیدر نے مزہ شائستہ جہیں سے کہا جو اس کا تعارف اس سے کر رہی تھیں۔ اس کی نظریں تو بس مس حیدر کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ کسی طور بھی ادھر ادھر نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ کتنا خوبصورت کتابی چہرہ ہے اور اس چہرے سے وابستہ اس کی یادیں بھی کتنی خوبصورت تھیں۔

”مس حیدر ان لوگوں کے لیے ضرور کچھ کرنا چاہیے۔“ سزا نے منصور کے لہجے میں عجیب سا طعنا تھا جسے مس حیدر اور دوسری خواتین بھی محسوس کیے بغیر نہ دیکھیں۔

”میرا خیال ہے این جی اوز بھی کافی فنڈز کما چکی ہیں، اب ان کو بھی عوام کی فلاح و بہبود کے لیے متحرک ہونا چاہیے۔“ مس حیدر نے بھی جلدی سے جواب دیا تو سزا منہ بٹا کر رہ گئی۔ وی آئی پی خواتین خوب ایک دوسرے کو لپیٹ لپیٹ کر سن رہی تھیں۔ ایسے مواقع تو کبھی کبھار ہی ان کو ملتے تھے جب وہ اپنے دلوں کی بھڑاس نکالتی تھیں۔ اس فنکشن نے تو ان کو اچھا موقع فراہم کر دیا تھا۔

”مزہ بنو، مجھے آپ کا چہرہ اور نام کچھ شناسا سا لگ رہا ہے۔ میں کب سے ذہن پر دھاؤ ڈال رہی ہوں مگر یاد نہیں آ رہا۔ میں نے آپ کو کہاں دیکھا ہے۔۔۔۔۔ اصل میں میری یادداشت بہت خراب ہو چکی ہے۔ جب سے شادی ہوئی ہے۔ بچوں، گھر داری اور آفس کی مصروفیات کی وجہ سے ہر وقت ڈسٹرب رہتی ہوں۔“ وہ جھجکا ہٹ آمیز انداز میں بول رہی تھی۔

”چلیں چھوڑیں، کبھی کبھی بہت سے چہرے ناقابل یقین حد تک ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے ہیں۔ یقیناً آپ نے کسی اور کو دیکھا ہوگا۔ وہ جلد از جلد اس سے جان چھڑانا چاہ رہی تھی اس لیے معذرت کرتے ہوئے جلدی سے وہ مس حیدر کی طرف مڑی جو اس افعال سے باتوں

میں مصروف تھی۔ مبادا وہ کہیں اسے پہچان نہ لے۔ وہ دل علی دل میں اس سے چھٹکارا پانے کی پلاننگ کرنے لگی۔
 ”میں پاپا سے کہوں گی کہ وہ ہاسٹل کا وزٹ ضرور کریں۔ ظاہر ہے، وہ وظیفہ خیز مفسر ہیں تو جب تک خواتین کی بہبود کے لیے کام نہیں ہوگا۔
 معاشرے کی فلاح کیسے ممکن ہوگی۔“ وہ شستہ انگریزی میں حیرت بول رہی تھی۔ اس کے بولنے کا انداز..... اور لہجے میں ٹھہراؤ بہت حد تک سید صاحب اور حیدر سے ملتا تھا۔

”ہاں..... ضرور لیکن آنے سے پہلے ہمیں فون ضرور کرویں۔“ مسز شائستہ جہیں فوراً بولیں۔
 ”آپ بے فکر رہیں۔ وہ کسی پروڈکٹ کے کائل نہیں۔ اچانک وزٹ پر یقین رکھتے ہیں۔ اس طرح حالات کا بہتر طور پر پتہ چل جاتا ہے۔“
 ”ہاں، ان کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے..... ان جیسے لوگ بہت کم ہیں۔“ مسز شائستہ نے تعریفی لہجے میں کہا۔
 ”ہاں، جب سے مفسر بنے ہیں وہ تو جیسے مگر کو بھول ہی گئے ہیں۔ برداشت کچھ کرنے کا جذبہ ان کو جین سے نہیں بیٹھتا۔“ مس حیدر بھی باپ سے بہت متاثر نظر آ رہی تھی۔

”ہم ان کی آمد کے ٹھہر رہے ہیں۔“ مس انفصال نے مسکراتے ہوئے کہا۔
 ”اور آپ کی تو میں بہت تعریف کروں گی۔ آپ کی ایکٹنگ واقعی کمال کی تھی اور موضوع بھی بہت مناسب تھا۔ کیا نام ہے آپ کا؟“
 اس نے اپنے سر میں نازک ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔
 ”مسز پیٹر..... یہ بہت ٹائٹلڈ خاتون ہیں۔“ مس انفصال جلدی سے بولی تھیں۔
 ”وہ تو نظر آ رہا ہے۔ میرا دل تو چاہ رہا ہے کہ کچھ دیر اور رک جاؤں مگر ایک اور فنکشن بھی اٹینڈ کرنا ہے۔ جب سے پاپا مفسر ہوئے ہیں۔
 خواتین کے فنکشنز مجھے ہی اٹینڈ کرنے پڑتے ہیں۔“
 ”کیوں..... مسز حیدر کہاں ہیں؟“ مسز شائستہ نے ایک دم پوچھا۔

”در اصل میری پیدائش کے دو سال بعد ان کی ڈیوٹی ہو گئی۔ اس لیے مجھے ہی پاپا کو سہولت کرنا پڑتا ہے۔“ وہ افسردہ لہجے میں بولی۔
 اسے ظاہر کی وفات کا سن کر قدرے صدمہ ہوا۔ وہ مس حیدر سے بہت کچھ سننا چاہتی تھی۔ بہت سے لوگوں کے بارے میں جانتا چاہتی تھی مگر سب کچھ ذہن سے جیسے محو ہو گیا تھا۔ مہمان خواتین جا چکی تھیں۔ وہ بھی واپس آ گئی۔ انتہائی تھکاوٹ کے باوجود بھی اس کا ذہن بہت متحرک تھا۔ شہلا حیدر، ذہن تو جیسے محو ہو گیا تھا۔ نام پرانے سا گیا تھا..... تو حیدر اسے بھول نہیں پایا تھا۔ ظاہر تو اس کا نام سننا گوارا نہیں کرتی تھی اور حیدر تو شاید اسی نام کے سہارے جیتا تھا اسی لیے تو اس نے اپنی بیٹی کو یہ نام دیا تھا۔ اسے حیدر کی یاد آگئی بھی لگ رہی تھی اور وہ بھی ہو رہا تھا۔ کوئی کہاں سے کہاں پہنچ چکا تھا اور وہ دل میں جھنجھکی مچ رہی تھی۔ اسے مس حیدر پر بہت پیارا آ رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اسے لے جائے، اسے گلے سے لگائے اور اس سے ڈیڑھوں باتیں کرے مگر وہ تو ان سب کے لیے شاید مر چکی تھی۔

شہلا بار بار اس کی نظروں کے سامنے محو رہی تھی۔ اس نے جب سے منصور کو چھوڑا تھا، اس نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ وہ بچوں کو بھی بھلا

دے۔ بہت بھلانے کے باوجود وہ اس کے ذہن میں محفوظ تھے۔ نہ جانے آج کیوں اس کا دل شدت سے بچوں کے لیے بھی تڑپنے لگا۔ جب تک ولیم اس کے پاس رہا۔ اس نے ان کو قدرے بھلائے ہی رکھا مگر اب اس کا دل جیسے اس کو سرزنش کر رہا تھا کہ اس نے ولیم کو بھی کیوں اپنی اولاد سمجھا، انہیں کیوں نہیں۔ شفق، آفاق..... اور فلک۔ فلک کتنا روتی رہتی تھی اور جاتے ہوئے شفق اور آفاق کتنے ناراض تھے۔ اس نے تو پلٹ کر بھی ان کی خبر بھی نہ لی اور ان کو مٹانے کی کوشش بھی نہ کی۔ نہ ہی ان سے کوئی رابطہ رکھا۔ آخر وہ اس کے بچے بھی تو تھے۔ اس نے پرانا ولیم الماری میں سے نکالا اور ان کی تصویروں کو پیار کرنے لگی۔ آنسو غریب جذبات سے اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔ اسے بچوں سے اتنی شدید محبت محسوس ہو رہی تھی جو اس سے پہلے شاید کبھی اس نے محسوس نہ کی تھی۔ ایک دم نہ جانے سید صاحب کہاں سے ذہن کے پردے پر نمودار ہوئے۔ وہ تو سب کو بھلانے کی کوشش میں تھی مگر سب اپنی اپنی جگہ پر جوں کے توں موجود تھے۔

”کیا ماضی سے کبھی بھی فراموش ممکن نہیں..... حال ہمیشہ ماضی کی طرف کیوں دھکیلتا ہے.....؟ اور مستقبل، ماضی اور حال سے تصدیق کیوں چاہتا ہے؟ اس نے اپنے ماضی سے نجات پانے کے لیے اپنے آپ کو کہاں کہاں گم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی مگر ماضی پھر اس کے سامنے سوالیہ نشان بن کر کھڑا تھا۔ اس کا مطلب ہے اپنے وجود سے فراموشی کی ساری کوششیں بیکار ہیں..... اتنے برسوں میں اسے کسی نے کوئی طعنہ نہ دیا مگر اب یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی قوت رفتہ رفتہ اسے ماضی کی طرف لے جا کر اس کو کھوجنے کی ہدایت میں تھی۔

”یا خدا یا..... یہ تو نے میرے ساتھ کیا کیا..... مجھے ہستی کے عذاب میں کیونکر مبتلا کیا..... کیوں کیا؟ میرے پاس نہ کوئی راستہ ہے اور نہ ہی کوئی منزل۔ ہم جیسے بے خانماں اور بکھرے وجود کہاں جائیں۔ ہمارے لیے بھی تو اپنی اس زمین پر کوئی جائے پناہ رکھنا۔“ وہ سسکتے لگی۔ ایک دم ولیم اس کی نظروں کے سامنے آ گیا۔ ولیم جن راستوں پر چل نکلا تھا وہ اس کی منزل تو نہیں..... اس کا مطلب ہے ولیم بھی ڈوب رہا ہے۔ کیا وہ بھی اپنی ماں کی طرح یونہی ساری ذمہ داری منسخر رہے گا؟ نہیں، میں ولیم کے ساتھ ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ مجھے اس کے لیے تو کچھ کرنا چاہیے؟ مجھے قادر سے جلد از جلد ملنا چاہیے۔ اس نے پکا ارادہ کر لیا کہ وہ اگلے دن ضرور قادر سے ملے گی۔

اس نے اپنے آپ کو بہت سمجھایا۔ بہت سے جملے ترتیب دیے۔ اپنے آپ کو ٹیپ لوز نہ کرنے کی ہدایت کی۔ میں آج ہر قیمت پر ولیم کو واپس لے کر رہوں گی۔ اس نے مصمم ارادہ کیا اور واپسی پر قادر سے ملنے چلی گئی۔

”مجھے قادر سے ملنا ہے۔“ اس نے بوڑھے ملازم کو کہا۔

”کیوں.....؟“ وہ بہت سوالات کرنے کا عادی تھا۔

”ان سے کہیے..... ولیم کی ہمارے آئی ہیں۔“ وہ قدرے بددھماکے انداز میں بولی۔

”آپ بتائیں، میں بلاتا ہوں۔“ وہ بے چینی سے ایک پرانے کاؤچ پر بیٹھی پہلو بدلتی رہی۔

”خیریت ہے مسز بیٹر، آپ یوں اچانک.....؟ ولیم تو ٹھیک ہے نا؟“ قادر اسے دیکھ کر قدرے حیران ہوئے تھے۔

”ہاں سب ٹھیک ہے..... لیکن میں آج آپ سے بہت اہم بات کرنے آئی ہوں۔“ اس نے لہجہ مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

”مخبر فرمائیے، میں سن رہا ہوں۔“ قادر بھی تجسس لہجے میں بولے۔

”قادر..... ولیم کو اپنے راتے سے مت ہٹائیں۔ اسے تعلیم مکمل کرنے دیں۔ میں اسے ہائلٹ بنانا چاہتی ہوں۔ میں نے زندگی میں صرف یہی ایک خواب دیکھا ہے۔ خدا کے لیے مجھے اس خواب کی حقیقت دیکھ لینے دیں۔ میں اس کے لیے کس قدر جدوجہد کر رہی ہوں۔ آپ شاید اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے اور میں نے جس طرح مشکل حالات میں اسے زمین کی بھول بھلیوں میں الجھا رہے ہیں۔“ وہ قدرے روہائی ہو کر بولی۔

”مسز پیٹریا یہ میرا نہیں گاؤ کا فیصلہ ہے۔ آپ کے بیٹے کی سول تمام لوگوں سے مختلف ہے۔ آپ فضاؤں کو تغیر کرنے کی بات کر رہی ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ دلوں کو تغیر کرے گا۔ خداوند نے اسے عام انسانوں سے ممتاز کیا ہے۔ اسے جو شمن سونہا جا رہا ہے وہ ہر ایک کو تو نہیں سونہا جا سکتا۔ گاؤ اپنے کچھ آتش لوگ دنیا میں بھیجتا ہے جنہیں اہم کام کرنے ہوتے ہیں اور ولیم بھی گاؤ کا آتش بل بندہ ہے۔ آپ نے جن حالات کا ذکر کیا ہے تو گاؤ کے آتش بل بندے انہی حالات میں سے گزرتے ہیں، کیا آپ کرائسٹ کی لائف اور مدد مہری کی مشکلات بھول گئی ہیں۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے، ولیم وہ کام کرے گا جو لاکھوں پائلٹس بھی نہیں کر سکتے۔ اور ولیم سے گاؤ کی محبت کرتے ہیں۔ وہ کرائسٹ کے مشن کو پھیلانے گا۔“ قادر کے لہجے میں نہ جانے کیا تھا کہ وہ مزید کچھ نہ بول سکی۔ وہ جو بہت کچھ کہنے آئی تھی، بالکل محرومت نہ کر سکی۔ وہ ولیم کو ہر قیمت پر واپس لینے آئی تھی اور پہلی ہی گفتگو میں ہتھیار ڈال دیے۔ وہ قادر کو کنوئس نہ کر سکی۔ وہ قادر کو یہ بھی نہ بتا سکی کہ آپ کس سے مشن کو آگے بڑھانے کی بات کر رہے ہیں۔ جس کا کوئی نہ بھول نہیں۔ عیسائیت کی رو سے تو وہ عیسائی بھی نہیں، آپ صرف نام سے دھوکے میں آ گئے۔ وہ سوچوں میں گم لفظوں کو پھر ترتیب دینے کی کوشش کر رہی تھی کہ قادر نے اسے پھر چوکا دیا۔

”مسز پیٹریا آپ کہاں سے تعلق رکھتی ہیں؟“ قادر کے اس سوال پر وہ گڑبڑا سی گئی۔ اسے اس غیر متوقع سوال کی قطعی امید نہ تھی۔

”میں پاکستان سے.....“ اس نے خشک لبوں پر زبان بھیری۔

”وہ تو میں جانتا ہوں..... مگر کس شہر سے.....؟“

”لاہور سے۔“

”میرا مطلب ہے..... آپ کے پیرائے.....؟“

”سب مر گئے.....“ وہ بے اطمینانی سے بولی۔

”آپ میرا مطلب نہیں سمجھ رہیں..... کس چرچ سے ان کا تعلق تھا اور آپ کی تصویق ہیں یا پرنسٹن؟“ قادر کے اظہارے جملے میں

بہت سے معنی پوشیدہ تھے۔

”میں اب چلتی ہوں، میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔“ وہ قادر کے کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتی تھی۔

”اوکے..... مسز پیٹریا..... آپ ریلیکس رہیں..... اور ٹھہرنے کریں۔ قدرت نے ولیم کو خود منتخب کیا ہے اس کے لیے راستہ بھی خود ہی بتائے

گی۔“ وہ ہلکڑاتی ہوئی بس اسٹاپ تک پہنچی۔ قادر نے ایک ہی وار میں اسے چاروں شانے چت کر دیا تھا۔ اچانک اس کے منہ پر وہی طمانچہ مارا تھا

جس کی جگہ وہ اپنے اندر کی سالوں سے محسوس کرتی آ رہی تھی۔

ماضی سے نرا ممکن نہیں..... حال ہی میں ماضی کی طرف دیکھتا ہے اور مستقبل دونوں سے سوال کرتا ہے۔

انسان اس دنیا میں ایسی مخلوق ہے جس کا ماضی قدم قدم پر اسے منہ کے ملے گراتا ہے کسی اور مخلوق کا ماضی اسے اتنی تکلیف نہیں دیتا جتنا انسان کو..... تنہا ہے اس زندگی پر۔ اس نے اپنے وجود کی شناخت اور مقام کے لیے بڑے سے بڑے قدم اٹھانے سے دریغ نہیں کیا تھا اور حاصل.....؟ وہ تو حاصل اور نام حاصل کے چکر میں بری طرح پھنس گئی تھی۔ وہ وہیں کھڑی تھی جہاں سے پہلی تھی۔ وقت کے ساتھ نظریات تو بدلتے ہیں مگر حقیقتیں کبھی نہیں بدلتیں۔ زمانہ چاہے کتنے رنگ بدلے مگر انسان کا وجود اس کا بیکر اور کائنات میں اس کا مقام کبھی بھی نہیں بدلتا۔ وہ وہی رہے گا جو ازل سے متعین کر دیا جاتا ہے۔ چاہے وہ غلاموں کو تسخیر کر لے یا آسمان کی دستکوں کو چھو لے۔ کبھی بھی کچھ نہیں بدلتا۔ زندگی کے دکھ نہ سکھ نہ احساسات نہ جذبات، نہ کبھی آنسو خون بن سکتے ہیں، نہ خون کبھی آنسو نہ ہوا پھول کھلا سکتی ہے اور نہ دکھ دلوں کو خوش کر سکتے ہیں۔ ازل ہی حقیقتیں سب اپنی جگہ پر قائم رہتی ہیں۔ اس نے جو جو سوچا تھا، ایسا تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کا ہر قدم الٹا ہی پڑا تھا۔ خسارہ تب بھی تھا اور اب بھی مگر تب اس کا وجود ایک معما تھا اور اب ایک سوال..... تب اس کی حیثیت مشکوک نہ تھی اور اب حیثیت بھی مشکوک تھی اور وجود بھی۔ اب کس کو انکسپلو رکھنا تھا، کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔ وہ انہی کے سب راستے مسدود ہو چکے تھے۔

ولیم کے لیے وہ کچھ نہیں کر سکی تھی، اس کا اسے شدید قلق تھا۔ اب وہ دوسرے بچوں کے بارے میں جاننے کے لیے فکر مند تھی اور ان تک پہنچنے کا واحد ذریعہ شزا تھی۔ شزا کو دیکھنے کے بعد اس میں بچوں سے ملنے کی تڑپ شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ وہ شزا سے ملنا چاہ رہی تھی۔ جلد از جلد..... اس نے ہاسٹل سے ہی اس کا فون نمبر لے کر رابطہ کیا مگر وہ مسلسل انجیج جا رہا تھا۔ جیسے جیسے فون بڑی ملتا، اس کا دل اتنی ہی بے تابی اور بے چینی سے دھڑکنے لگا جانے کیوں وہ ہر صورت میں اس سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ کافی دیر بعد مل گئی تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ شزا کی میسر ٹری نے فون اٹھایا تھا۔

"سبز شزا سے بات کرتی ہے۔"

"میڈم تو نہیں ہیں، ضروری کام کے سلسلے میں باہر گئی ہیں۔" دوسری جانب سے آواز آئی۔

"مجھے بہت ضروری کام تھا۔ کس وقت ان سے بات ہو سکتی ہے؟" وہ بے تابی سے بولی۔

"آپ ان کے موبائل پر رابطہ کر لیں۔" اس نے جلدی سے موبائل نمبر نکھوا کر فون بند کر دیا۔ موبائل نمبر لے کر وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ کیا واقعی اسے ضروری کام تھا؟ وہ کیسے اس سے بات کرے گی؟ کہیں شزا اس بات کو مانڈے ہی نہ کر لے۔ وہ اسی کشمکش میں جھلا تھی جب رشیدہ اسے بلانے آئی۔

"میڈم صاحبہ جلدی سے آفس پہنچیں گی..... بڑی میڈم صاحبہ بلا رہی ہیں۔ جلدی کریں گی..... دیر نہ کریں۔" رشیدہ پکھلائی ہوئی تھی۔

"کیوں..... خیریت تو ہے نا۔" وہ رشیدہ کی بدحواسی دیکھ کر بولی۔

”بس جی، کوئی بڑے مہمان آئے ہیں۔“

”کون بھی..... کون آگیا؟“ وہ بھی ذرا حیرت سے بولی۔

”پتا نہیں جی آپ کوئی بڑے بڑے لوگ ہیں اور پولیس بھی ساتھ ہے۔“

”اچھا.....“ وہ سوجھ بوجھ میں گم وہاں پہنچی تو مسز شائستہ جبین کے آفس کے باہر ٹھکھکا سا لگا ہوا تھا۔ اس سے نقل تو کوئی بڑا آدمی یوں

اچانک نہیں آیا تھا، کون ہو سکتا ہے؟“ وہ حیران ہوتی ہوئی اندر پہلی گئی، وہ جہاں تھی وہیں رک گئی۔

”آجے مسز پیرا حیدر صاحب آئے ہیں۔“ مسز شائستہ جبین کے لہجے میں فخر و انبساط تھا۔

اس نے ایک نظر اسے دیکھا تو دیکھتی ہی رو گئی۔ اس کا جسم بری طرح لرزنے لگا۔ اس کے سامنے سید ضار الدین حیدر ڈھلتی عمر، سرخ و

سفید دھت، کچھڑی بالوں اور سفید کٹن کے اکڑے سوٹ میں اعلیٰ اجلی نگہری شخصیت کے ساتھ ہر اجماع تھا۔ حیدر نے بھی اسے پہچان لیا تھا اور ایک دم نظر میں جھکا لی تھیں۔

”ادھر بیٹھے مسز پیر.....“ مس انضال نے اسے اپنے ساتھ بٹھایا۔ وہ بار بار مسز پیر کے نام پر چونک رہا تھا۔ وہ خاموشی سے بیٹھ کر ان کی

باتیں سننے لگی۔ ایک دفعہ اس نے نظر میں اٹھا کر دیکھا تو حیدر کی آنکھوں میں سرخی ہی نمودار ہونے لگی۔ وہ انہی طرح جانتی تھی کہ یہ آنکھیں کب سرخ

ہوتی تھیں۔ اس کی آواز میں ارتعاش بھی پیدا ہو رہا تھا۔ جو چند لمحے قبل بہت بڑے اعتماد لہجے میں ان سے باتیں کر رہا تھا۔ ان کے مسائل سن رہا تھا۔

اب اندر ہی اندر جھنجھٹ سے مغلوب ہو کر رہے ہوئے گلے کے ساتھ ان کے مسائل بے دلی سے پوچھ رہا تھا۔ اس نے اس کے وجود کو نظر انداز

کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس کا وجود تو جیسے اپنے میں نہا گیا تھا۔

”مسز پیر، آپ بھی تو کچھ مانتیں نا.....“ مسز شائستہ نے اچانک اس سے کہا تو وہ چونک سی گئی۔

حیدر ایک دم اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کا لرزیدہ وجود کتنا بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کے سفید بال، نظر کی ٹینک اور پڑھو چھو..... کسی طور

بھی اس شہلا سے مماثلت نہیں رکھتا تھا وہ جس شہلا کو جانتا تھا۔ وہ تو حسن و جمال کا یکسر عکس اور اب ایسا علیحدہ اس نے تو کبھی تصور میں بھی شہلا کو ایسا نہ

دیکھا تھا۔

”میں کیا بتاؤں..... حیدر صاحب، بہت ہمدرد انسان ہیں۔ آپ انہیں بتائیے نا کہ آپ نے جو لمبا عرصہ یہاں گزارا ہے؟ آپ کو کون

مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ حکومت ان مسائل کو کیسے حل کر سکتی ہے۔“ مس انضال نے اسے حوصلہ دینا چاہا۔

”آپ کب سے یہاں ہیں؟“ حیدر کے اچانک سوال پر وہ مزید بیکھلا گئی۔

”غالبا سولہ ستر سال سے.....“ وہ نظریں چرا کر بولی۔

”کسی کے بارے میں بھی رائے دینے کے لیے یہ عرصہ کافی ہوتا ہے۔“ حیدر کے لہجے میں رعب اور اعتماد نمود کر رہا تھا۔

”ضروری نہیں، بعض اوقات انسان ساری زندگی گزارنے کے باوجود بھی کسی کے بارے میں اپنی رائے نہیں دے پاتا۔ یہ تو اپنے اپنے

تجربے کی بات ہے۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"سبز پتھر کچھ تو کہیے؟" سبز شائستہ نے پھر اصرار کیا۔

"میڈم۔۔۔ کیا آج تک کوئی کسی کے مسائل حل کر سکا ہے؟ کسی کی مشکلات ختم ہو سکی ہیں۔ یہ سب بے معنی اور فضول ہے۔ میرے خیال میں کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ جو لوگ خود مجبور ہو بے بس ہوں، مصلحتوں اور مجبوریوں کی ڈوروں سے بندھے ہوں وہ دوسروں کے لیے کیا کر سکتے ہیں، یہ شخص دعوے ہیں۔ الفاظ کا گورکھ دھندا۔ سب سے زیادہ نقصان تو ہم جیسے مجبور اور لاچار لوگوں کا ہوتا ہے۔ جوان باتوں کے واؤ میں آ کر سنہرے خواب بنا شروع کر دیتے ہیں مگر جب حقیقت کھلتی ہے تو ہم اپنے آپ کو پہلے سے بھی زیادہ بے وقعت اور کمزور پاتے ہیں۔ میرے خیال میں ایسی میٹنگز کا کوئی فائدہ نہیں۔" وہ تندرستہ سے تکی سے بولی۔

"لگتا ہے آپ کو زندگی کا بہت سا تجربہ ہوا ہے۔" حیدر کی بات نے اسے شدید دھچکا لگایا۔

"زندگی بذاتِ خود بہت تلخ ہے۔ تجربے بھی تو ویسے ہی ہوں گے۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"اودہ میڈم! آج تو میرے پاس وقت کچھ کم ہے لیکن جب انکی آمد آؤں گا تو تفصیلات بات ہوگی۔ آپ ہر قسم کے مسائل کے سلسلے میں مجھ سے رابطہ کر سکتی ہیں۔" وہ انھیں سب لوگ اس کے ساتھ اٹھ گئے۔ جاتے ہوئے بھی اس کی نظروں کا محور وہی تھی۔ سب لوگ اسے باہر تک چھوڑنے آئے مگر وہ نہ نالی۔

"سبز پتھر! آپ کو اتنا تلخ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ ہمارے مہمان تھے اور ویسے بھی انسان کو ایک دوسرے کا لحاظ رکھ کر بات کرنی چاہیے۔" سبز شائستہ کے لہجے میں قدرے غلغلہ تھا۔

"میڈم! میں اس لیے اصرار کر رہی تھی کہ مجھے بولنے پر مجبور مت کریں کیونکہ سچ تو ہر حالت میں کڑا سچی لگتا ہے۔ ویسے آپ بے فکر رہیے، میں ہر طرح کے نتائج جھٹکنے کے لیے تیار ہوں۔" وہ انھیں لہجے میں بولی اور باہر نکل گئی۔

اس کے بعد کتنی چہ میگوئیاں ہوئیں، کتنے لوگوں نے اسے موردِ الزام ٹھہرایا۔ اسے قلعی پروا نہیں تھی۔ اسے یاد تھا تو بس حیدر۔ جو اس کے حواسوں پر چھایا رہا۔ وہ بدل بھی چکا تھا اور نہیں بھی۔ اس کی ذات، اس کی شخصیت، اس کا رتبہ۔ اس کی حیثیت سب کچھ پہلے سے منفرد تھی۔ سب کچھ بدل چکا تھا شاید اس کا اندر نہیں۔ اس لیے وہ اسے دیکھ کر بے چین ہو گیا تھا۔

کیا ماضی سے واقعی فراق ممکن نہیں.....؟ کیا حال ہمیشہ ماضی کی طرف دھکیلتا ہے؟ اور مستقبل دونوں سے حقیقت کا متقاضی رہتا ہے، سوالیہ نشان بن کر؟

دو رشتہ رشتہ چاروں طرف سے آزمائشوں کے زخموں میں آ رہی تھی۔ جن تمام چیزوں کو وہ قصہ پارینہ سمجھ کر بھلا چکی تھی، اب اور مستحکم پوزیشن میں نہیں حقیقت بن کر اس سے سوال کر رہی تھی۔ حیدر ہمیشہ اس کے حافلے میں ٹھہر سادہ انکی طرح موجود رہا تھا۔ جس کے سامنے میں سستانے کے لیے وہ چہرہ لکھوں کے لیے رکتی تھی۔ جب کبھی بہت گھبراہٹ تو آنکھیں بند کر کے یا د کرتی اور وہ اسے تسلیاں دیتا۔ دلا سے دیتا۔ وہ ہمیشہ اس کے وجود کے

اندرا اس کی سانسوں میں موجود رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ج بھی تھا جب وہ پلیر..... کے ساتھ ہوتی تھی اور جب بھی جب ملک منصور کی قربت میسر ہوتی۔
موجود ہوں، اور مصطلحیں انسان کی ذات کو دور تولے جاسکتی ہیں مگر یادوں پر کسی کا بس نہیں اور وہی ایک یاد تھی جماسے معطر رکھتی تھی۔

کانچ میں انگریز امر ہو رہے تھے اس لیے وہ بچہ زچھیلائے ان کی چینگ کر رہی تھی جب رشیدہ کا رالیس فون پکڑے اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

”میڈم جی، آپ کا فون آیا ہے۔“ رشیدہ نے اسے فون دے دیا۔

”مہر فون.....“ وہ قدرے حیران ہو کر بولی کیونکہ اسے کبھی بھی سہ پہر کے وقت فون نہیں آیا تھا۔ ولیم جب بھی فون کرتا تو رات کو در سے کرتا تھا اس نے لرزے ہاتھوں سے فون پکڑا اور پتلا کہا تو جھٹک گئی۔

”میں حیدر بول رہا ہوں..... مجھے جانتی ہو کہ سب کچھ بھلا دیا ہے۔“ وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔

”میں کسی کو نہیں جانتی..... سو رہی.....“ اس نے کہہ کر فون بند کر دیا پھر بیلا ہوئے لگیں۔

”کب تک باہمی سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرو گی..... میں تمہارا کل تھا اور اب آج بن کر تم سے سوال کر رہا ہوں.....“ وہ قدرے رخ لہجے میں بولا۔

”سوال کرنے کا حق میں نے کسی کو نہیں دیا.....“ اس نے بھی تکی سے جواب دیا۔

”کب تک حقائق سے نظریں چراؤ گی..... مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی تھیں۔ بولو کہ اس ملو گی.....؟“ حیدر دو ٹوک لہجے میں بولا۔

”کہیں نہیں..... مجھے نہ آپ سے کچھ کہنا ہے اور نہ ملنا ہے۔“

”کوئی بحث نہیں..... میں تمہارا انتظار کروں گا..... اور اگر تم نہ آئیں تو تمہارے باطل آ کر تمہارے کمرے میں تم سے بات کروں گا۔“
حیدر نے مجھے ہوئے سیاست والی طرح اسے انکسپلائیٹ کرنے کی کوشش کی تھی اور قاتیما اشار ہوئی کا ایڈریس بنا کر فون بند کر دیا۔

حیدر کتنا پونڈے سوہو رہا تھا اس کا مطلب ہے وہ بھی کسی قدر بدل گیا ہے۔ وہ اس سے خوف زدہ نہیں تھی۔ پونڈی دنیا میں صرف وہی شخص تو تھا جس سے بات کرتے ہوئے اسے کبھی خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ زندگی میں اسے جتنے بھی مردوں سے پالا پڑا تھا، وہ ان سب سے مختلف تھا۔ ایسا مرد جس پر اندھا اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ ایسا مرد جس کی ذات سے دوسروں کو صرف سکون مل سکتا ہے..... ایسا مرد جس کی صرف پذیرائی کی جاسکتی ہے اور ایسے شخص سے بھرپور محبت بھی کی جاسکتی ہے۔ صرف ایک وہی شخص تھا جس کی وابستگی اور تعلق اسے ہمیشہ سمجھو رکھتا تھا اور نہ ملک منصور اور بیٹا بیٹہ کانوں کی طرح اسے چھو رہے تھے۔ شزا اور ولیم بیک گراؤڈ میں چلے گئے، اب صرف حیدر اس کے سامنے تھا اور حیدر سے ملنے کے لیے وہ اتنا بائین رہی تھی۔ الفاظ ترتیب دے رہی تھی۔ کیسے اور کس طرح اسے جوابات دینے ہیں، ذہن مسلسل الجھا ہوا تھا۔ وہ قدرے نرم ہو رہی تھی۔

وہ کانچ سے سہمی ہوئی بچی اور ریپٹنٹ سے کمرے کا پوچھ کر اس کمرے کی طرف بڑھی، اس کے قدم ڈنگا رہے تھے، وہ جو محبت اور حوصلہ نکجا کر آئی تھی، اسے لگ رہا تھا سب کچھ بھر پوری ریت کی طرح ڈھے جائے گا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ ناک کیا۔ پہلی ہی دنگ پر

درد وادہ کھل گیا۔ حیدر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے خاموشی سے اسے راستہ دیا۔ وہ بیگ اور کتابوں کا ڈھیر اٹھائے اندر داخل ہو گئی۔

"بٹھو....." حیدر نے اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا اور بتل بجائی۔ ویٹر کو کوئلہ ڈربک اور کھانا لانے کو کہا۔

"جلدی سے پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو..... میرے پاس وقت بہت کم ہے۔" وہ غصے سے جراتے ہوئے بولی۔

"مجھے پہلے دیکھنے تو دو کہ شہلا کدھر ہے اور سبز پتھر کہاں ہے اور میں کس سے بات کروں.....؟" حیدر کے لہجے میں جبین تھی اور آنکھوں

میں غصہ۔ اس نے نظریں اٹھا کر حیدر کو دیکھا۔ وہ اس سوال کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

"میں صرف سبز پتھر ہوں۔" وہ ہڑا ہوا لہجے میں بولی۔

"کیا تم عیسائی ہو چکی ہو؟" حیدر نے قدرے غصے سے پوچھا۔

"کیوں؟"

"اگر تو تم عیسائی ہو چکی ہو تو پھر مجھے تم سے نہ کچھ کہنا ہے اور نہ کچھ پوچھنا ہے، تم جاسکتی ہو۔" وہ دیوار کی طرف منہ کر کے بولا۔ وہ اس کے

سوال پر بھونپکا رہ گئی۔ اسے کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے، وہ بے چینی سے صوفے پر پہلو بدلتی رہی اور سوچتی رہی۔ وہ جو کچھ سوچ کر آئی تھی۔ حیدر تو ان

میں سے کوئی بات نہیں پوچھ رہا تھا۔ وہ بھی خاموش رہا اور وہ بھی خاموشی سے پہلو بدلتی رہی۔ پھر کھانا لے کر آیا گیا تھا اور اس نے ٹیکل پر کھانا لگا دیا تھا۔

"مٹرا کچھ اور....." ویٹر نے باادب لہجے میں پوچھا۔

"نہیں..... تم جاؤ۔" وہ بارعب انداز میں بولا۔

"کھانا کھاؤ....." اس نے منہ اس کی طرف کر کے کہا۔

"مجھے بھوک نہیں۔"

"یہ ہماری مہمان نوازی کا حصہ ہے۔"

"مجھے بھوک نہیں۔"

"مجھے ہار ہا۔" نہ سننے کی عادت نہیں رہی۔ "وہ غصے میں اس کی طرف مڑا۔ اس کی آنکھیں اب بھی سرخ ہو رہی تھیں اور ان میں نمی بھی

تھی۔ وہ ڈری گئی۔ وہ کرسی سمجھ کر ہانکل اس کے سامنے بیٹھ گیا اور ہر زاویے سے اسے آہنہ رو کرتا رہا۔

"کب تک اپنے آپ سے جھوٹ بولتی رہو گی؟" حیدر نے سکوت توڑا۔

"میں نے نہ کسی سے جھوٹ بولا اور نہ ہی اپنے آپ سے....."

"اگر سچ کہنے کی ہمت ہے تو بتاؤ کیا تم عیسائی ہو چکی ہو؟"

"نہیں....." وہ اچانک بول پڑی۔

حیدر نے یہ سنتے ہی زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ وہ اس کی قلعی توقع نہیں کر رہی تھی۔ وہ حیرت سے گال سہلانے لگی۔ اس کی آنکھوں

سے آسودہاں ہو گئے۔

”تم نے مسلم ہو کر ایک غیر مسلم سے شادی کی..... تم اس قدر بے خمیر ہو سکتی ہو، تم مر جاتیں مگر یہ نہ کرتیں۔ یہ تمہیں سید صاحب کی طرف سے ہے اگر وہ زندہ ہوتے تو وہ یہ تمہیں خود مارتے۔ میں نے جو کیا ان کی وجہ سے کیا۔ اگر تم کہیں کہ تم عیسائی ہو چکی ہو تو انہیں اتنا دکھ نہ دیتا جتنا یہ جان کر۔“ حیدر کی آنکھوں میں جیسے خون اتر رہا تھا۔ ”تم نے ان کی محبت و شفقت کا تو مذاق اڑا لیا ہے، میری محبت کی بھی تو جن کی ہے۔ میں نے پوری دنیا میں صرف ایک قسمی ہی تو چاہا تھا۔ میری پہلی اور آخری محبت تم ہی تھیں۔ میرا گھر تمہاری وجہ سے منتشر رہا۔ طاہرہ کبھی بھی مجھے معاف نہ کر سکی..... اور تم نے یہ سب..... یہ سب کر کے مجھے کس مقام پر کھڑا کیا ہے، کیا تم جانتی ہو.....؟“ اس کے لہجے میں اب فکستگی اور مایوسی تھی۔ ”میں نے اپنی بیٹی کو تمہارا نام دیا..... تمہیں زندہ رکھا اپنی یادوں میں، اپنی سوچوں میں..... میں نے دوسری شادی نہیں کی۔ پہلی شادی میری مجبوری تھی اور دوسری میں نے تمہارے لیے نہیں کی۔ کیونکہ طاہرہ میرے نام پر بیٹھی تھی مگر تم..... میں تم سے بے وفائی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں کسی زندگی گزار رہا ہوں، کاش تم اندازہ کر سکو..... تم..... تم نے تو اپنا خمیر ہی بیچ..... دیا، میرے ساتھ بھی بے وفائی کی۔“ وہ فیسے میں بول رہا تھا اور وہ خاموشی سے سن رہی تھی۔ آئسو مسلسل اس کی آنکھوں سے برس رہے تھے۔ وہ جواباً ایسی ہی باتیں اس سے کہنا چاہتی تھی مگر..... مگر اس میں حوصلہ تھا نہ صحت۔

”یوہو..... جواب دو، تم نے یہ سب کیوں کیا؟“

”کیا.....؟“ وہ ہنگامی لیتے ہوئے بولی۔

”مجھ سے بے وفائی کیوں کی؟“

”میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی.....“

”تو پھر یہ سب.....؟“

”کیا شادی ہو جانے سے روح کا تعلق ٹوٹ جاتا ہے؟ جنسوں کو قید کرنے سے روح تو قید نہیں کی جاسکتی اور آپ..... آپ تو میری روح کا حصہ ہیں.....“ وہ نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔ حیدر ایک دم نرم پڑ گیا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا..... اور پانی کا گلاس اٹھا کر ایک ہی بار میں ختم کیا۔

”تو پھر تم نے یہ سب کیوں کیا.....؟“ اس کے لہجے میں اب قدرے نرمی تھی۔

”کیا کرتی..... کب تک ذلت برداشت کرتی۔ اذیت تو میں سہہ لیا رہی تھی مگر جب منصور دوسروں کے سامنے ذلیل کرنے پر اتر آیا تو میں سہہ نہ پائی..... حیدر! میں نے اس کے طعنے سہ..... تمہیں کھائے..... بے عزتیاں کیں..... کبھی وہ جائزہ اور ناجائزہ کے چابک مار کر میرے بیٹھے اویڑتا..... تو کبھی آپ سے تعلق کو بنیاد بنا کر الزامات کی بوچھاڑ سے میرا وجود چھلکی کر دیتا..... آخر میں بھی انسان تھی۔ اس کے ساتھ گزارا ہوا ہر لمحہ میرے لیے کسی عذاب سے کم نہ تھا۔ وہ ہر وقت میری آدائش میں رہتا۔ اس نے تو مجھے سولی پر لٹکا رکھا تھا۔ آخر کب تک کوئی اتنی ذلیل برداشت کرے۔ سید صاحب، ان کا گھرانا..... اور میرا وہاں پلٹنا بھی میرے وجود پر لگی گندگی اور حقارت کو نہ محسوسا۔ آپ جاننا چاہتے ہیں کہ میں نے یہ سب

کیوں کیا..... صرف ایک کتاب خریدنے پر منصور نے مجھے دیا وغیر میں انہی لوگوں کے سامنے اتنا دلیل کیا کہ میں برداشت نہ کر سکی۔ پھر اس بک شاپ کا مالک تھا۔ اس نے میری دلجوئی کی اور ان کمزوروں میں میری حوصلہ افزائی کی۔ انسان ہونے کے ناتے اس نے میری ہمت بندھائی۔ میری غلطی تھی کہ میں نے بغیر جانچے اس کے لفظوں پر یقین کیا۔ اس کے لہجے کی نرمی کو اپنے رستے رخصوں کا مرہم سمجھا۔ اس کی پذیرائی نے مجھے اعتماد بخشا اور..... میں نے منصور کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر میں اس وقت پٹری کی حقیقت بھی نہیں جانتی تھی۔ حیدر میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے۔ میں جو قدم بھی اٹھاتی ہوں۔ وہ الٹا پڑتا ہے۔ قدرت کیوں میرا ساتھ نہیں دیتی۔ کیا میں خدا کی اس دنیا میں اتنی دلیل اور ادنیٰ مخلوق ہوں، کبھی تو کوئی مہرہ میرا بھی ساتھ دے۔ بعض لوگوں کے نصیب کیوں کالی راتوں کی کالی روشنائی سے لکھے ہوتے ہیں۔ ان کے لیے کبھی بھی کوئی جگہ نہیں، کبھی بھی کوئی روشنی نہیں، کاش سید صاحب مجھے وہیں گاڑی سے نکل دیتے یا پھر نظر انداز کر کے چلے جاتے۔ کاش وہاں کے آوارہ کتے ہی میرے وجود کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے تو آج میں یہ زندگی کا عذاب نہ سہتی۔ میں ایسی بد نصیب ہوں جسے نہ شناخت ملی، نہ محبت اور نہ ہی سکون۔ کاش ہم جیسے لوگ پیدا ہی نہ ہوں۔“ اس کے لہجے میں ہلاکت تھی وہ پھوٹ پھوٹ کر دردناک شروع ہو گئی۔

وہ کتنی ہی دیر بچیاں لیتی رہی۔ اس نے اچانک کسی کالس اپنے کندھے پر محسوس کیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ حیدر سرخ انگوٹھ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت مشکل سے اپنے آنسو روک رہا تھا۔ وہ ہاتھ اٹھا کر اس کے گلے لگ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہی۔ وہ کچھ نہ کہہ سکا، نہ جلی دے سکا نہ دلجوئی کر سکا۔ وہ بھی اسی غیر متوقع صورت حال سے متذبذب میں پڑ گیا۔ اس کے آنسو گھونٹے میں نہیں آ رہے تھے۔ زندگی میں اس نے اپنا فٹم آج تک کسی کے ساتھ شیئر نہیں کیا تھا۔ اپنے دل کی بات کبھی کسی سے نہ کہی تھی۔ اپنا فٹم صرف اپنے تک ہی رکھا تھا اور اب جو بکھرے پر آئی تو کرچی کرچی ہو گئی۔ ایک دم وہ پیچھے ہٹی جیسے اسے کرنٹ لگا ہوا یا پھر وہ اپنے حواس میں واپس آئی ہو۔ اس نے حیدر کی طرف دیکھے بغیر اپنا بیگ اور کتابیں اٹھائیں اور جلدی سے باہر نکل گئی۔

حیدر نے اسے روکنا چاہا مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ شاید اس کا جانا ہی بہتر تھا۔ کوئلہ ڈرگس اور کھانا وہاں کا وہ ہیں پڑا تھا۔ وہ خود بھی کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کا دل بھی شدت جذبات سے پھٹے کو تھا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے جو لوگ کبھی مل نہیں سکتے، وہ زندگی کا حصہ کیوں بن جاتے ہیں نہ بھلائے جانے کے قابل۔..... حیدر نے دکھ سے سوچا۔ وہ واپس آ کر بہت شرمندہ بھی تھی اور افسردہ بھی۔ وہ گھٹی ٹپل کر رہی تھی۔ اسے اپنے جذبات پر تپاؤ کیوں نہیں رہا تھا۔ وہ کیوں ایک ہی لمحے میں بہک گئی اس کا سارا بھرم خاک میں مل گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو کوس رہی تھی۔ یہ سب کیونکر ہو گیا۔ وہ تو اسے کونسل کرنے لگی تھی۔ اپنی باتیں بنا کر اسے قابل کر لے گی مگر وہ تو کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ کچھ بھی نہ بتا سکی، بہت کچھ ادھر اسی رہا۔ ہر طرف میرے ساتھ ایسا ہی کیوں ہوتا ہے۔ اس نے دکھ سے سوچا۔ تھوڑی دیر بعد شیدہ اس کے پاس کارڈ لیس لے کر آئی۔

”میڈم جی! آپ کا فون ہے.....“ وہ فون پکڑا کر چلی گئی۔

”شہلا، میں حیدر بول رہا ہوں۔ کل تمہارے کالج میں میرا آدھی، تمہیں موبائل دے جائے گا۔ اسے رکھ لینا..... اور ہاں، تم لوگوں اور حیثیتوں کے بارے میں غلط اندازے کیوں لگاتی رہی ہو۔ منصور کو چھوڑنے کے بعد اگر تم واپس لوٹ آتمیں حیدر تمہیں سید صاحب کی بیٹی کی حیثیت

سے سر آنکھوں پر نہ بٹھاتا تو پھر تم کوئی انتہائی قدم اٹھائیں، تم نے یا حیدر کو نہیں سمجھایا پھر اپنے آپ کو..... تم سن رہی ہوں.....“ اس نے چہرے لیے توقف کیا۔

”ہاں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”ادب.....“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر پوچھا۔

”اب ہماری زندگی میں کسی بھی شے کی کوئی اہمیت نہیں۔“

”ہم چاہے جتنے بھی دعوے کریں..... جن کی اہمیت ہوتی ہے، وہ اپنا پورا حق لے لیتے ہیں۔ میں جانتا ہوں تم نے زندگی میں بہت

مشکلات کا سامنا کیا ہے۔“

”ہاں، کچھ لوگ صرف پیدایں اس لیے ہوتے ہیں اور شاید ابھی بہت کچھ باقی ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“

”بہت سی آزمائشیں ابھی ہماری منتظر ہیں۔ خدا جانتا بھی ہے کہ میں ثابت قدم نہیں ہوں۔ میں تو بہت کمزور اور شکستہ وجود ہوں پھر بھی.....“

تدجائے کیوں وہ مجھے بار بار آزماتا رہا ہے۔“

”اب کس آزمائش کی بات کر رہی ہو..... کیا تم.....؟“

”ولیم کی صورت میں.....“

”کون ولیم.....؟“

”میرا بیٹا ہے، مری میں پڑھتا ہے۔“

”اوہ آئی سی..... اے کیا ہوا ہے؟“ حیدر نے شکر لہجے میں پوچھا۔

”شاید بہت کچھ ہونے والا ہے۔“

”کیا تم سب جانتی ہو؟“

”جہیں..... مگر میں دیکھ رہی ہوں مگر میں کچھ نہیں کر سکتی۔“

”سب کچھ دیکھنے کے باوجود.....“

”ہاں..... میں نے کہا تھا۔ میں بہت کمزور اور بے بس وجود ہوں..... بس خاموش تماشا شائی.....“ وہ ہنست چہا کر بولی۔

”اور میں کچھ..... خیر چھوڑو۔“ اس نے فون رکھ دیا۔ اس کا ادھورا جملہ اس کے لیے عذاب بن گیا۔ وہ جانتا چاہتی تھی وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔

اس نے فون بند کر کے رشیدہ کے حوالے کر دیا۔ وہ بہت مضطرب تھی۔ ایک طرف ولیم تھا۔ دوسری طرف حیدر تھا اور پھر ان کے درمیان شزا اور اس

کے اپنے بچے تھے۔ وہ عجیب سے دورا ہے پر کمزوری تھی۔ ہر طرف الجھنیں تھیں۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے دور رفتہ رفتہ گلاب میں پختی جا رہی ہو۔

اگلے دن حیدر کا ملازم اسے نیا موہل سیٹ دے گیا۔ اس کے جاتے ہی حیدر نے اسے فون کیا۔ ”آپ نے یہ سب کیوں کیا؟“ وہ آہستہ سے بولی۔

”میں اب تمہیں کھانا نہیں چاہتا۔“

”یہ سب کچھ بے معنی ہے۔“

”بعض اوقات بے معنی چیزیں بھی زندگی میں اہمیت رکھتی ہیں۔ تم اس سے انکار نہیں کر سکتیں۔“

”حیدر..... خدا کے لیے مجھے مزید آزمائش میں مت ڈالیں۔“

”میں تمہیں ہر آزمائش سے نکالنا چاہتا ہوں۔ تمہارا حیدر کبھی بھی کمزور نہیں تھا۔ اس وقت میں روایات کے ہاتھوں مجبور تھا، اب نہیں۔“

شہلا تم اپنا بروکھ مجھ سے شیئر کر سکتی ہو۔ شہلا، تم مجھ پر اعتبار تو کرو۔“ ابھی وہ بات کر رہا تھا کہ ایک دم فون بند ہو گیا۔ وہ پریشان ہو گئی۔ فون کٹ گیا تھا یا پھر حیدر نے خود ہی فون بند کر دیا تھا۔ اس نے فون ملایا تو نوٹیفکیشن کی ٹیپ سن کر وہ پریشان ہو گئی۔ ضرور کوئی ایسی بات ہوئی ہوگی جو حیدر نے یوں اچانک فون بند کر دیا تھا اور نہ وہ تو بہت بڑا اعتماد اور کنفیڈنٹ شخص ہے اس طرح فون بند کرنا، اسے کچھ سمجھ نہ آیا۔

حیدر اپنے پیئر دم میں تھا، جب وہ شہلا سے بات کر رہا تھا کہ اچانک شہلا حیدر کسی کام کے سلسلے میں اس کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اسے کسی کو فون کرنا دیکھ کر وہ اس کے قاریغ ہونے کی شکرت ہی۔ جب اس نے حیدر کے منہ سے یہ الفاظ سنے تو چونک گئی۔ حیرانی کے ساتھ ساتھ اسے شاک بھی لگا۔ اس کا باپ اس عمر میں کس قدر بے بسی ہو گیا تھا اور وہ بھی اس کی کسی ہم نام سے۔ اس کے لیے وہاں ٹھہرنا مشکل ہو گیا اور وہ پاؤں پٹختی باہر نکل گئی۔

شہلا نے غصے سے دو واڑہ بند کیا اور باہر نکل گئی اور حیدر اب نام سا کھڑا تھا۔ اسے کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیا تو جھجھات پیش کرے۔ زندگی کا اتنا لمبا عرصہ بے سکنی سے گزارنے کے بعد چند گھنٹوں کے لیے اسے شہلا کی جو قربت نصیب ہوئی تھی اس نے اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا تھا۔ وہ حراحت نہیں کر پا رہا تھا یا شاید یہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی شکستہ روح جیسے بدستی پھوار میں چند گھنٹوں کے لیے ترہوار و مطر ہو گئی تھی۔ کاش وہ وقت ٹھہر جاتا..... اور وہ دونوں یونہی.....؟

وہ ساری رات نہیں سو پایا..... وہ ہمیشہ بھی سمجھتا آ رہا تھا کہ اس نے اپنے اندر سے محبت جیسے جذبے کا وجود ہی ختم کر دیا تھا۔ ظاہر یہی اس کی ذات کا اور روح کا حصہ نہیں بن سکی تھی اور ظاہرہ کے بعد وہ تجربہ کی زندگی گزار رہا تھا۔

شہلا کو اپنے باپ پر کبھی بھی ترس بھی آتا تھا جو ہر وقت کام اور صرف کام میں لگا رہتا تھا اور کبھی کبھی فخر بھی محسوس ہوتا مگر اب باپ کا بدلہ روپ دیکھ کر اسے شدید صدمہ ہوا۔ اس نے کبھی بھی ایسا نہیں سوچا تھا کہ اس کا باپ بھی ان تمام سیاست دانوں کی طرح یوں دلیا لگی دکھائے گا..... وہ بھی کسی عورت کے لیے یوں بے چین ہو رہا تھا جو اس کی ہی ہم نام تھی۔ اسے شدید غرت ہی محسوس ہونے لگی۔ وہ کمرے کا دروازہ بند کر کے شدت سے دروازہ ہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ایک دم بہت نیچے گر گئی ہو۔ بے وقعت ہو گئی ہو۔ وہ جو سراٹھا کر چلتی تھی، اپنے باپ کا نام فخر سے لیتی تھی،

اپنے نام کے ساتھ اپنے باپ کے نام کو لوٹ انگ سمجھتی تھی، اب یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے دونوں میں گہری دراڑ چٹکی ہو۔ وہ ہمیشہ اپنے باپ کو خاص الخاص سمجھتی آئی تھی۔ وہ بھی بہت عام مرد نکلا۔ اس کا اعتماد لوٹ رہا تھا اور جب اعتماد لوٹ رہا ہوتا ہے تو دل کس طرح ٹھکڑے ٹھکڑے اور کربھی کربھی ہوتا ہے، وہ اندازہ کر رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا، ذہن پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے یا پھر وہ خود ہی خود کٹی کر لے۔ اب وہ باپ کا چہرہ بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ بار بار غصے میں مٹھلیاں سمجھ رہی تھی۔ وہ نیچے کارپٹ پر بیٹھی رہ رہی تھی جیسے کسی بہت عزیز از جان کی مرگ پر کوئی غرتا ہے، بلکہ ہے، روتا ہے مگر کچھ کرنے میں پاتا۔ ایسی ہی بے بسی وہ محسوس کر رہی تھی۔

آخر میرا باپ بھی تو انسان ہی ہے نا۔ وہ اپنے آپ کو بہلانے کی کوشش کرتی۔ نہیں، نہیں..... میرا باپ ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ اور فطرت..... اُف خدایا! میں کیا کروں، کاش میں یہ دن دیکھنے کے لیے نہ ہوتی۔ جس شخص کی پارسائی کی زمانہ گواہی دے، جس کی شخصیت میں، میں نے کبھی کوئی معمول نہ دیکھا ہو۔ کبھی بھی بڑی بڑی رکاوٹیں اور آزمائشیں اسے راہِ راست سے نہ ہٹا سکی ہوں، کیا وہ فطرت کرے گا؟ یہ نہیں ہو سکتا لیکن وہ باپ سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بہت پیچیدہ اور ریشیل بھی جاتی تھی اور اب اس قدر ریشیل ہو رہی تھی۔ اتنی پیچیدہ۔ اسے خود بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنی وہ وی شہلا تھی۔ وہ تو بیا اعتماد انداز میں باپ کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتی آئی تھی اور اب کیسے چل پائے گی؟ جبکہ باپ کے قدم ڈگمگائے ہوں۔ آپ کوئی بھی برا کام کر لیتے، مجھے دکھ نہ ہوتا مگر کسی عورت کے چکر میں تو نہ پھنسنے۔ اسے قصداً رہا تھا..... اس عورت پر..... وہ کون عورت ہو سکتی ہے؟ یہ سوچ کر اسے سخت غصہ آ رہا تھا کبھی دل چاہتا کہ اسے جا کر شوٹ کر آئے، کبھی دل چاہتا کہ باپ کو ہی شوٹ کر دے اور کبھی اپنے آپ کو اس بدنامی کے ساتھ وہ کس طرح جی پائے گی۔

اس نے کچھ سوچ کر اپنا سامان پیک کیا۔ وہ کہیں جا رہی تھی۔ کہاں جا رہی تھی، وہ خود نہیں جانتی تھی، وہ رات کو ہی گھر سے نکل گئی۔ حیدر بدھاسی میں ادھر ادھر اسے تلاش کر رہا تھا۔ وہ شدید ذہنی لاپرواہی سے دوچار تھا۔ وہ اسے ڈھونڈنا چاہتا تھا، بغیر کسی کو بتائے اور اس کو سب کچھ بتانا چاہتا تھا۔ وہ اس قدر مشتعل ہو سکتی تھی، اس نے سوچا بھی نہیں تھا اور وہ خود بھی جذبات کے ہاتھوں اس طرح بہک سکتا تھا، اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا۔ وہ سڑکوں پر مار مارا پھر رہا تھا۔ شہلا کا اتنا وسیع سوشل سرکل تھا کہ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کہاں ڈھونڈے۔ وہ قدرے پاگل ہو رہا تھا۔

سبز پنیر (شہلا) کا دل کہہ رہا تھا کہ حیدر کسی مصیبت میں ہے۔ وہ اس کے موبائل پر بار بار فون کر رہی تھی مگر وہ بند تھا۔ حیدر یوں بات ادھوری چھوڑنے کا عادی تو نہیں تھا اور وہ بھی اس وقت۔ اسے اس کے لیے اور لشکروں سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کوئی اہم فیصلہ اسے سنانے والا ہے۔ اس سے قبل کہ وہ اسے کچھ سنانا، ایک بار پھر کوئی شے یا غیر مرئی قوت اس کے راستے میں حائل ہو گئی۔ اس کا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ وہ کہاں جائے، اس کی تلاش میں؟ وہ ہاسٹل سے باہر سڑک پر آ گئی اور دونوں کی طرح ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ موبائل اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ہر آنے والی بھیڑ کو گھور گھور کر دیکھتی، کئی ایک نے تو اس کے قریب آ کر زبردست ہر یک لگائے تو وہ چونک گئی۔ رات گہری ہو رہی تھی۔ وہ وہاں ہاسٹل آگئی اور اپنے کمرے میں آ کر شدت سے رونے لگی۔ ہاتھوں کو بائیں سے قہقہہ دینے لگی۔

”میں بچوں سالوں سے نہ تھا رے آگے جھکی ہوں، نہ تھکے نہ دماغی ہے اور نہ حیرت عبادت کی ہے..... مگر آج بھی میں اپنے لیے نہیں“

صرف اور صرف حیدر کی خبر سے کہ لیے جھکتی ہوں۔ اس کے لیے تیری مدد چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ اور اس کے لیے حیرے آگے سر تسلیم خم کرتی ہوں۔ میں سرکش نہیں، ہانی نہیں۔۔۔۔۔ مگر جب تو نے مجھے پھوڑ دیا تو میں بھی تجھے بھول گئی۔۔۔۔۔ تو نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ہے، اس نے میرا حیرتی ہستی پر اعلا و ختم کر دیا ہے لیکن آج۔۔۔۔۔ آج تو نے مجھے اس ہنگامہ لاکڑا کیا ہے کہ میں پھر حیرے آگے جھک رہی ہوں۔ جو تجھے بھلاتے ہیں، تو انہیں ایسے دوسرا ہے پر لاکڑا کرتا ہے کہ وہ خود بخود حیرتی طرف لوٹ آتے ہیں۔ تو انسان کی اکڑ اور غرور کیسے کیسے خاک میں ملاتا ہے، آج مجھے اس کا احساس ہو رہا ہے اور سب کچھ بھولتے ہوئے میں آج صرف حیدر کے لیے حیرے آگے جھکی ہوں۔ میں نے اپنی ساری زندگی میں تجھ سے کچھ بھی نہیں مانگا۔ بس حیدر کو اپنی امان میں رکھ۔ اگر حیدر کو کچھ ہو گیا تو پھر وہ دن میری زندگی کا بھی آخری دن ہوگا۔ یہ میرا تجھ سے وعدہ ہے۔“ وہ قدرے جذباتی ہو کر بڑبڑا رہی تھی۔ وہ حیدر کے لیے کس قدر مٹی تھی، اسے آج اندازہ ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی نامعلوم جذبے اور نامعلوم منزل میں انسان کو کس قدر کھوکھلا کر دیتی ہیں۔ وہ اس لیے اپنے آپ کو بالکل کھوکھلا اور خالی وجود محسوس کر رہی تھی۔ ایسا خالی وجود جس میں صرف حیدر کے نام پر ایک دل دھڑکتا تھا۔ وہ ساری رات نہ سو سکی۔ ساری رات وہ اس کے موبائل پر فون کرتی رہی مگر کوئی بھی فون نہ میسج نہیں کر رہا تھا۔ حیدر کا موبائل کس طرح آف ہو سکتا ہے اور وہ بھی ساری رات۔۔۔۔۔ یقیناً وہ بہت بیمار ہے۔ وہ خود ہی اندازے لگا رہی تھی۔

اگلے دن کالج میں بھی قریبی عزیز میں دوبارہ فون کر رہی تھی۔ وہ کالج سے واپس آ رہی تھی جب اس کے فون پر بیل ہوئی۔ اس نے جلدی سے فون اٹھایا، حیدر بول رہا تھا۔

”آپ ٹھیک تو ہیں؟“ وہ قدرے بے مہری سے بولی۔

”ہاں، میں ٹھیک ہوں اور تم۔۔۔۔۔؟“ وہ ٹھکرتے لہجے میں بولا۔

”آپ میری پھوڑیں اور اپنی تائیں۔۔۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ بس۔۔۔۔۔“

”حیدر! کیا بات ہے۔۔۔۔۔ پلیز، مجھے صحیح بتائیں؟“

”کچھ نہیں۔“

”کچھ تو ہے۔“ وہ کرپتے ہوئے بولی۔ ”آپ کو۔۔۔۔۔ آپ کو۔۔۔۔۔ شہلا کی قسم۔۔۔۔۔“

”مجھے کسی بھی شہلا کی کوئی قسم نہ دو جبکہ وہ دونوں ہی میرے پاس نہیں۔“

”تنگ۔۔۔۔۔ کیا۔۔۔۔۔؟“ ابھی وہ کچھ بھسنے کی کوشش کر رہی تھی کہ حیدر نے فون بند کر دیا۔



سہیل گرفتاری دے چکا تھا اور یہ خبر اخباروں میں بھی چھپ چکی تھی۔ ملک منصور کی راتوں کی نیند اڑی ہوئی تھی۔ ایکشن سرہ تھے۔۔۔۔۔ اب دو چیف منسٹر کے عہدے تک پہنچنے کی تک دو کر رہا تھا کہ اس ظلم نے اس کے سارے پان کا بیڑا فرق کر دیا۔

”دو بد بخت ہے کہاں۔۔۔۔۔؟“ ملک منصور نے سرگوشی کے انداز میں سہیل سے پوچھا۔

”میرے گاؤں میں۔۔۔۔۔ میری ماں کے پاس۔ آپ بے فکر رہیں، وہ وہاں ہر طرح سے محفوظ ہے۔“ سہیل نے اسے تسلی دی۔

”میں اس کے کٹڑے کھڑے کر دوں گا۔“ وہ طیش میں بولا۔

”اس وقت ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھائیے۔ زویا اور عابد کے پیچھے کوئی ایسا نہیں جو مقدمہ بہت اوپر تک لے جائے۔ صرف ان کے لواحقین کو خرابہ نہ پڑے گا۔۔۔۔۔“ سہیل نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”اور وہ کم بخت عابد کا دوست۔ جس نے شفق کو گاڑی میں بیٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔ شکر ہے اس وقت چوکیدار گیٹ پر نہیں تھا اس کو میں ہر ممکن طریقے سے خرابہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ابھی تک تو وہ روکا ہوا ہے۔ اگر اس نے زبان کھول دی تو۔۔۔۔۔ اس وقت میں شدید اسٹریس میں ہوں۔ میں ملک منصور، جو بڑی سے بڑی آلتوں سے نہیں گھبرا یا، اس نامرابطہ کی وجہ سے اپنے ہوش و حواس کھو رہا ہوں۔“ وہ قدرے بے بسی سے بولا۔

”ملک صاحب! آپ فکر نہیں کریں۔ جب میں اقرار جرم کر رہا ہوں تو پھر۔۔۔۔۔ پھر کسے اعتراف ہے۔۔۔۔۔ اور ویسے بھی یہاں پر ایمان تک بکنے کو تیار ہوتا ہے ایک شخص کی گواہی کیا معنی رکھتی ہے؟ اگر نہیں مانتا تو۔۔۔۔۔“ سہیل کے ادھر بے جملے نے اسے سب کچھ سمجھا دیا۔

”اس کو میرے بندوں نے اغوا کر لیا ہے۔ اسی لیے تو وہ تھانے تک نہیں پہنچ پایا۔“

”ملک صاحب! اس نے شفق کو کسی کو مارتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔“ شفق جب گاڑی میں بیٹھ رہی تھی جب وہ پیچھے سے آ رہا تھا اس کا بیان اتنا محسوس نہیں اس نے گاڑی کا نمبر نوٹ کیا تھا اور ظاہر ہے گاڑی میں چلا رہا تھا۔ اب میں نے گرفتاری دے دی ہے۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”لیکن۔۔۔۔۔ پولیس بار بار یہی پوچھ رہی ہے کہ شفق کہاں ہے کیونکہ عابد کے دوستوں اور چوکیدار نے یہی بیانات دیے ہیں کہ شفق کا وہاں بہت آنا جانا تھا۔ ظاہر ہے شفق کی غیر موجودگی خود بخود اسے مشکوک بنا رہی ہے۔“

”تو آپ اوپر ہات کیوں نہیں کرتے؟“

”کر تو رہا ہوں۔ آج کل میں منسٹر شپ سے استعفیٰ دے چکا ہوں۔ میری وہ حیثیت نہیں ہے جو منسٹر ہوتے ہوئے تھی۔ اب ایکشن کے دن ہیں اور مخالف پارٹیاں ہر ممکن طریقے سے مجھے نچا دکھانے کی کوشش کریں گی۔ ہر جھگڑا اپنا نہیں گی۔ شفق کی بجائے بھی ان کے کانوں تک پہنچی تو پھر۔۔۔۔۔ پھر سب کچھ میری اتنے سالوں کی محنت اور سب کچھ برباد ہو جائے گا۔“ ملک منصور کچھ کھوجانے کے شدید خوف سے تھلا رہا تھا۔

”آپ شفق کو گھر لے آئیں۔“ سہیل نے رائے دی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔“

”کیوں؟“

”وہ بہت خود مر اور ضدی ہے۔ اگر اس نے ابھی کوئی الٹا سیدھا بیان دے دیا تو میں نہ کسی کو متہ دکانے کے قائل رہوں گا اور نہ ہی دوبارہ ایکشن میں کھڑا ہوں گا۔ میرا لیو جے تھو دیر باد ہو جائے گا۔ میرا تو دل چاہتا ہے اس کو بھی شوٹ کر دوں۔“ ملک منصور غصے سے بول رہا تھا۔

”کیا.....؟“ سہیل حیرت سے اس کی طرف بے یقینی کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ اسے قطعی یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ شخص اس قدر سنگدل اور بے رحم ہو سکتا ہے۔ وہ اس کے سارے کرتوتوں سے واقف تھا۔ لہٰذا وہ اس کی بدلتا اور موقع کی مناسبت سے گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا تو اس کی فطرت کا خاصہ تھا۔ مگر اولاد کے بارے میں اس کا یہ رویہ پہلی دفعہ سامنے آیا تھا۔ اس شخص کو صرف اپنا کیریئر عزیز ہے۔ نہ اولاد اور نہ ہی کوئی دوسرا شخص اس کا مطلب ہے کہ وہ سہیل کو ایک مہرے کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ اس نے کسی قدر غصے ہو کر بے لوث اس کی خدمت کی تھی۔ بتا اس کے کبے شفیق کی خاطر ڈھیرے قتل کا الزام اپنے سر لیا تھا اور اس شخص نے ایک دفعہ بھی نہ اس کا شکریہ ادا کیا نہ اس کی رہائی کے سلسلے میں کوئی امید دلائی۔ وہ تو بس اپنی ساکھ اور ایکشن کی بات کرتا رہا۔ سہیل اس کی باتیں سن کر سوچ میں پڑ گیا۔

.....

سہیل کی ماں اور اس کی دونوں بہنیں اس کی ہر طرح سے خدمت کر رہی تھیں۔ اس کی دلجوئی کرنے کی کوشش کرتیں مگر وہ کم مہم ہی پریشان ہر وقت کمرے میں بیٹھی رہتی۔ وہ شہرے ڈپریشن میں تھی۔ عابد نے جو کچھ اس کے ساتھ کیا تھا، اسے اس کا شاید دکھ تھا اور اب اس نے جو کچھ زویا اور عابد کے ساتھ کیا تھا، وہ اس کا بھی عذاب سہہ رہی تھی۔ سونے کی کوشش کرتی تو عابد کی گندی باتیں اس کے دل و دماغ میں آگ لگا دیتیں اور کسرت والی رات..... اس رات کیا کچھ ہوا تھا۔ وہ یاد کرنے کی کوشش کرتی، یاد نہ آتا مگر شاید کچھ بہت ہی بھیاںک ہوا تھا۔ اس کا جسم اس کا گواہ تھا۔ اس کے بازوؤں پر سگریٹ کے جلے کے نشانات اور بہت کچھ اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ اسے تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ وہ اندر ہی اندر ان لمحوں کو کتنی ہی جب اس نے زویا کو دوست بنایا، اس پر اندھا دیکھا، سہیل اسے کتنا سمجھاتا تھا۔ کتنا ڈانٹتا مگر وہ کب شفیق تھی۔ سہیل نے اس کے لیے نہ جانے کیا کچھ کیا تھا۔ وہ اس کے غلوں کو نہ جان سکی۔ سہیل نہ جانے کن حالوں میں ہوگا۔ اس کے گھر والے بھی لاطم تھے یا شاید اسے اتنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ کس سے پوچھے۔ چند ساتھیوں کے لیے اس نے سونے کی کوشش کی مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی پھر بھی اس نے آنکھیں بند کر کے ایک کوشش کی کہ شاید بھولے بیٹھے نیند کی وادیوں میں سے کوئی ہری اک لمبے کے لیے اس کی طرف آ جائے۔ آج اسے شہلا بار بار یاد آ رہی تھی۔ اگر ممبا پانچک ہو جے تو شاید وہ ان حالات کا شکار نہ ہوتی مگر وہ دونوں تو..... اپنی اپنی ذات کو چاہنے والے تھے۔ اولاد کو تو کوئی بھی نہیں چاہتا تھا۔ فلک کس طرح بے بسی کی حالت میں مرگئی اور میں بھی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤں گی۔ دونوں میں سے کسی کو بھی المیوں نہ ہوگا۔ ہم کتنے بے وقعت وجود ہیں۔ جنہیں نہ محبت مل سکی نہ تحفظ۔ جیسے خزاں میں اڑتے آوارہ چنے۔ ادھر ادھر، بے ضرر، بے حقیقت، مردہ اور بے جان۔ آنسو آنکھوں سے بہہ بہہ کر چکے ہیں جذب ہوتے رہے اور اس طرح اس کی آنکھ لگ گئی، ابھی اس نے نیند کی وادی میں قدم رکھا ہی تھا کہ کسی کی سسکیوں نے اور رونے کی آواز نے اسے اٹھا دیا۔ وہ گھبرا کر اٹھی اور باہر جھانکا۔ سہیل کی ماں اور بہنیں رو رہی تھیں۔ وہ ان کے پاس بھاگتی ہوئی گئی۔

”کیا ہوا.....؟“ آپ لوگ کیوں رو رہی ہیں؟“

”میرا بیٹا ایسا نہیں ہے۔۔۔۔۔“ اس کی ماں روتے ہوئے بولی۔

”کیا۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔؟“

”وہ کسی کو نہیں مار سکتا۔“

”مگر اس نے کس کو مارا ہے؟“ اس نے بے مبری سے پوچھا۔

”یہ دیکھو اخبار۔۔۔۔“ سہیل کی بہن عذرا نے اخبار اس کے سامنے رکھا۔ وہ ذمہ دار کی حویلی میں کام کرتی تھی شاید وہیں سے لائی تھی۔ اس

نے جیسے ہی اخبار سیدھا کر کے پڑھنے کی کوشش کی تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ سہیل اس کی وجہ سے یہ سب برداشت کر رہا ہے۔

”وہ بے گناہ ہے۔۔۔۔۔ وہ بے گناہ ہے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”آپ کیسے جانتی ہیں؟“ عذرا نے جلدی سے پوچھا۔

”میں جانتی ہوں۔۔۔۔۔ میں ہی تو سب کچھ جانتی ہوں۔۔۔۔۔ وہ ایسا نہیں۔۔۔۔۔ وہ بے گناہ ہے۔۔۔۔۔ مجھے کسی طرح تھا نے پہچاؤ۔۔۔۔۔ میں گواہی

دوں گی۔“

”جیسی، سہیل بھائی آپ کی سخت حفاظت کا کہہ کر مجھے ہیں اور یہ کیا آپ باہر نہ نکلیں۔“

”یہ تب تھا جب وہ خود لاک اپ میں نہیں تھا۔ اب میرا باہر جانا مجبوری ہے۔۔۔۔۔ مجھے کسی طرح شہر پہنچاؤں۔۔۔۔۔“ تینوں ماں جھٹوں نے ایک

دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر خاموش ہو گئیں۔



ملک منصور منظر بے سار کرے کا چکر لگا رہا تھا۔ مگر میں ہر طرف سنا سنا ہی سنا تھا۔ شہر اپنے کاموں میں مگن رہتی تھی۔ آفاق نے آج کل

ٹیکسری جانا شروع کر دیا تھا اور وہ اب رات مجھے تک واپس آتا۔ سحر کہاں ہوتی، کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس کا موبائل بار بار بج رہا تھا وہ نمبر دیکھ کر فون رکھ

دیتا۔ تھوڑی دیر بعد پھر فون بجتا۔ اب کی بار اس نے نمبر دیکھا تو فوراً ہی کو کہا۔ دوسری طرف اس کا بی اے تھا۔

”ہاں کہو۔۔۔ کیا بات ہے؟“

”سرسشتی تھا نے پہنچ گئی ہیں اور انھوں نے اقبال جرم کرنے کی کوشش کی ہے۔“

وہ غصے میں گالیاں بکھرنے لگا اور موبائل اٹھا کر دروازے پر پیچکا۔ چند لمحوں کے بعد وہ خود ہوا پھر کچھ سوچ کر باہر نکل گیا۔ اس کی

آنکھوں میں خون اتر اٹھا تھا۔ ایسی ناخوار اولاد سے تو میں بے اولاد ہی رہتا تو بھرتا تھا۔ اب چیف فسر بننے کی ساری جگہ وہ داکار ت جائے گی۔ یہ ایکشن

نہیں جوا تھا اور اس میں اس نے ساری جمع پونجی لگا دینے کا سوچا تھا اور کافی کچھ لگا بھی دیا تھا۔ ٹیکسری بھی رہن رکھی تھی۔ پارٹی والے نمبرے خوب

دکھانے میں کسی طرح بھی پیچھے نہیں تھے۔ ملک منصور کے چیف فسر بننے کی دیر ہے پھر سب کے دارے بند ہو جائیں گے۔ جیسے کامیاب جا رہے

تھے۔ ایکشن کمپن میں زبردست کامیابی کے دعوے کیے جا رہے تھے۔ اب جبکہ فصل پک کر تیار ہو چکی تھی، بس کٹنے کی عیادت تھی کہ شہر کا یہ قدم حیران

آندھی کے باعث ثابت ہوا۔۔۔۔۔ میں تمہیں تیار کر کے رکھ دوں گا۔ وہ نہ جانے کیا کچھ سوچ رہا تھا اور بو بوا رہا تھا۔ گاڑی تھانے میں داخل ہوئی۔

”ملک صاحب! میں آپ کو بہت دیر سے فون کر رہا تھا مگر آپ کا فون ہی نہیں مل رہا تھا۔“ انسپکٹر اسے دیکھ کر تباہی سے بولا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں، مجھے معلوم ہے۔“ شفیق کہاں ہے؟“ وہ کچھ شے کے موڑ میں نہیں تھا۔ اس لیے یہ اطمینانی سے بولا۔

”وہ کمرے میں ہے۔“

”میں اس سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”ہاں جی۔۔۔۔۔ ضرور۔۔۔۔۔“

”اوتے ندیہ۔۔۔۔۔ بی بی کو ملک صاحب سے ملوا دوئے۔“ انسپکٹر نے ایک سپاہی کو آواز دیا۔

”ابھی ہم نے ان کو لینڈی پولیس کے حوالے نہیں کیا۔ بس آپ کے حکم کے منتظر تھے۔ ابھی ان کی گرفتاری مکمل میں نہیں آئی۔ وہ خود ہی تھانے میں پیش ہو گئی ہیں اور ابھی پرچہ بھی نہیں سنا۔ اس لیے ابھی معاملہ اپنے ہاتھ میں ہے۔“ انسپکٹر کی رال منکنے کو تیار تھی۔ ملک منصور نے جیب سے ہزار ہزار کے نوٹ نکالے سب انسپکٹر کے سامنے رکھے اور سپاہی کے ساتھ اندر چلا گیا۔

شفیق ایک چاند میں لپٹی بیٹھی تھی۔ باپ کو دیکھ کر اس نے سر جھکا لیا۔ ملک منصور خوشخوار لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”تم بھی اپنی ماں کی طرح گندا خون ہی نکلی۔ تم نے مجھے تیار کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی مگر میں تمہارا ہر پلان ٹیل کر دوں گا۔ تم زندہ رہو گی جب تا۔۔۔۔۔ اس نے ریپ اور نکال کر دو تین قاز کیے۔ دو وہیں فرش پر تر پڑے گی۔ وہ تھوڑے اطمینان سے باہر آیا۔

”بائی معاملہ خود سنبھال لینا۔“ اس نے انسپکٹر کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

”ملک صاحب۔۔۔۔۔؟“ جیسے وہ کچھ کہنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہا تھا۔

”اس واقعے کی خبر نہ پولیس میں جائے اور نہ کسی اور کو یہاں کچھ نہیں ہوا ہے۔“ وہ الفاظ پر زور دے کر جیسے وارننگ دے رہا تھا۔

”مگر۔۔۔۔۔؟“

”بس کچھ نہیں۔۔۔۔۔“ وہ فرمایا۔

انسپکٹر شدید شش و پنج میں تھا۔ اسے کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟

اتنا اہم واقعہ۔۔۔۔۔ اور سب کچھ چھپانا کیسے ممکن ہو گا؟ اس کی نوکری بھی جاسکتی تھی اور ملک منصور کی سیاسی حیثیت سے بھی وہ اچھی طرح

واقف تھا۔

سبیل خٹہ میں ماں کے ساتھ جھگڑا رہا تھا اور وہ اس کی تیس کر رہی تھی۔ اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”آپ نے ایسا کیوں کیا۔۔۔۔۔ جب میں نے آپ سے کہا تھا کہ اسے باہر نہیں جانے دینا اور آپ اسے تھانے تک لے آئیں۔ آپ کو نہیں معلوم کہ اس کی جان کو کتنا خطرہ ہے۔“ سبیل خٹہ سے بولا۔

”مجھے کیا معلوم..... مجھے اس نے کچھ بھی تو نہیں بتایا۔ کہنے لگی وہ تھانے میں تم سے ملنا چاہتی ہے..... اب بتاؤ میں کیا کرتی..... تھانے آتے ہی وہ سیدھی پولیس کے پاس چلی گئی، میرا کیا تصور ہے؟“

”اماں..... اماں، میں آپ کو کیسے سمجھاؤں؟“ وہ جھنجھلا کر بولا۔ ”اور اب دو کہاں ہے؟“

”تھانے میں.....“

”اور آپ کو جیل میں کس نے آنے دیا؟“

”اسی نے جیسے سے بات کر کے مجھے ادھر بھجوا دیا ہے۔“ اسی لمحے ملک منصور جیل میں اس کے پاس آ گیا۔

”سمیل، میں نے اسے تھکانے لگا دیا ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“ سہیل کے قدموں تلے سے جیسے زمین نکل گئی۔

”وہ تھانے میں پیش ہو گئی تھی اور میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ابھی پرچہ نہیں کٹا تھا اور کسی کو بھی خبر نہیں ہوئی تھی۔ میرے پی اے نے مجھے فون پر اطلاع دی..... اور میں نے اسے قسم کر دیا۔“

”ملک صاحب..... ملک صاحب ایسا آپ نے کیا کیا..... اتنا بڑا قدم.....؟“ وہ مزید کچھ نہ کہہ سکا۔

”میں نے کہا تھا..... اس کے علاوہ میرے پاس کوئی اور راستہ نہ تھا اور اب تم اپنی بات پر قائم رہنا۔“

”کون سی بات.....؟“

”زودیا اور عابد علی..... کہ یہ قتل تم نے کیے ہیں۔“

سہیل اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔ ملک منصور جا چکا تھا اور سہیل کی ماں حیرت سے دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

”اماں..... میں نے کہا تھا کہ اس کو یہاں مت لانا..... اب دیکھو اس کے سگے باپ نے ہی اس کو مار ڈالا ہے..... اماں، یہ آپ نے کیا کیا.....؟“ وہ تاسف سے بولا۔

”کیا کوئی باپ بھی اپنی اولاد کو مار سکتا ہے؟“ اس کی ماں نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ دنیا ہے اماں..... اور یہاں سب کچھ ہوتا ہے۔ اب خود ہی دیکھو، کیا ہو گیا ہے؟“ وہ قدرے دکھ سے بولا۔

”بی بی..... ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہے۔“ ایک پولیس والے نے اس کی ماں کو باہر نکلنے کو کہا اور وہ اس ادھوری ملاقات سے مزید پریشان ہو کر باہر نکل آئی۔



جب سے دو کلب جانا شروع ہوئی تھی، زندگی کا ایک نیا روپ اس کے سامنے آیا تھا۔ وہ عورتوں کی چال بازیوں اور چلتروں کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی تھی۔ ظاہری طور پر خوبصورت، اسٹارٹ، ویل ڈریسڈ اپر کلاس کی چار رنگ خواتین اندر ہی اندر کس کس طرح ایک دوسرے کو فریب دینے کی کوشش کرتی تھیں۔ وہ دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ سزا اس کے سامنے تھی۔ مگر ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی وہ اس سے ناواقف تھی اور شفق ایسی نہیں تھی۔ وہ اپنی ہی زندگی میں کن رہتی۔ شفق کی دلوں سے گھر سے غائب تھی اور کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ اس نے آفاق سے پوچھنے کی کوشش کی تو اس نے بھی لاپٹی کا اظہار کیا۔

”آفاق، وہ تمہاری بہن ہے جسے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کہاں ہے۔“ سحر نے قدرے ٹھسے سے اس سے پوچھا۔

”وہ اکثر ٹریس پر یو جی بتائے بغیر چلی جاتی ہے۔ کچھ دنوں تک وہ اس آجائے گی اور جانے گی بھی کہاں؟“ وہ بے پروائی سے بولا۔

اسے اندر ہی اندر کتر مکی کیونکہ وہ شفق کو جس حالت میں دیکھ چکی تھی، اسے خوف تھا کہ وہ کوئی انتہائی قدم نہ اٹھائے مگر آفاق اور دوسرے گھر والے کچھ بھی نہیں جانتے تھے اس لیے مطمئن تھے۔ جب سے اس کے ساتھ یہ حادثہ ہوا تھا۔ آفاق اب آہستہ لہجے میں اس سے بات کرنا جیسے اس کا غم غلط کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ گھر میں بیٹھے بیٹھے اس کی تھی۔ شفق نے سب کچھ بھلانے کے لیے اسے کلب جوائن کرنے کو کہا تھا اور اس نے کافی دلوں سے کلب جوائن کر لیا تھا۔ پہلے پہل تو خواتین نے اس کا خوب مذاق اڑایا۔ فر فر انگریزی بولنے والوں میں وہ اردو بھی پنجابی لہجے میں ڈر کر بولتی۔ کبھی وہ اس کی پریشانی کا مذاق اڑاتیں تو کبھی اس کے لب و لہجہ کا۔ وہ ان کے درمیان مذاق بن گئی تھی۔ اسے اندر ہی اندر شرمندگی بھی ہوتی تھی۔ اس نے فوری طور پر نٹھارہ لڑائی کی۔ وہ گھر آ کر اسے میرز بھی سکھاتی۔ پڑھاتی بھی اور سوسائٹی میں سود کرنے کے طریقے بھی بتاتی۔ ذہین تو وہ تھی ہی..... ہر چیز کو اس نے چند دلوں میں ہی پک کر لیا۔ بس انگریزی میں کسریاتی تھی..... اور اس کے لیے وہ بھرپور کوشش کر دیتی تھی۔ وہ زیادہ تر وقت انگریزی فلمیں دیکھنے میں گزارتی۔ ساتھ ساتھ ٹیوٹر اسے سمجھاتی رہتی۔ اس نے عام بول چال کے جملے سکھا دیے تھے۔ اس کا ایکسٹنٹ بھی آہستہ آہستہ بہتر کرنے کی کوشش کی۔ اس کے کپڑوں کے اسٹائل میں بھی فرق آچکا تھا..... اور ان چیزوں کے ساتھ ساتھ اس کے احماد میں بھی کافی اضافہ ہوا تھا۔ ساتھ ساتھ ان خواتین کی خامیوں پر بھی اس کی نظر تھی۔ وہ ان کے درمیان بیٹھ کر ایک دوسرے کی تعریفیں اور بھر خامیاں منتی رہتی۔ کس کو کہاں لیٹ ڈاؤن کرنا ہے اب یہ فن بھی اس کو آ گیا تھا۔ ہاتوں ہاتوں میں طر اور گھٹیا جملے پھینکنے میں وہ ایسی ماہر ہو گئی تھی کہ خواتین حیران رہ جاتیں۔ جیسے جیسے وہ کونفیڈنٹ ہوتی جاتی تھی۔ اس کی نظریں اور حرکتیں بھی بے باک ہو دیتی تھیں۔ جب وہ منگنی تھی تو کالی سی چادر کبھی سر سے بننے نہ دیتی تھی۔ اپنی طرف براٹھنے والی بے باک نظر کو ایسا نشتر چھوڑتی کہ دیکھنے والا ہلکا ہلکا ہوتا۔ وہ تو ساری آبادی میں چاند مشہور تھی اور اب اپنی نظروں کو خود ہی اس نے بے باک کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ جن خواتین میں اٹھ بیٹھ رہی تھی۔ وہ بیگمات کا مخصوص سرکل تھا۔ جن کے لیے ہر بات فن اور ایڈیوٹر سے کم نہ ہوتی تھی۔ ان میں سے اکثریت تو خاندانوں کو چھوڑ چکی تھیں اور کچھ ظاہر آشوبہروں والیاں تو تھیں مگر اندر سے دل رہ جانے اور نام پاس کرنے کے بہت سے فٹل پال رکھے تھے۔ وہ جیسے جیسے ان کے قریب ہوئی تو ویسی ہی عادتیں اپنانے لگی۔ دو مخالف گروہوں کے درمیان دو ٹوٹل کاک بین گئی۔ اسے ایک دم اپنا آپ بہت اہم اور معتبر محسوس ہونے لگا۔

وہ ایک گروپ کی باتیں دوسرے کو بتاتی اور پھر جو کچھ ہوتا اسے خوب انجائے کرتی۔ اس کے لیے زندگی تو اب کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔
 محض ایک فن۔۔۔ ایک شغل۔۔۔ اس کے علاوہ اس کے لیے زندگی میں کچھ بھی باقی نہ تھا۔ وہ آفاق کو چھوڑ نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ اب اس کے پاس کوئی اور راستہ نہ تھا۔ جس ماحول سے وہ نکل تھی اب وہاں جانا تو کیا سوچنا بھی ایک مستحکم فیئر خیال لگتا تھا۔ وہ اسے روپیہ پیسہ بھی کھلا دیتا۔ وہ جو چاہتی کرتی۔ ان کا رشتہ محض نام کا رہ گیا تھا۔ اس واقعے کے بعد آفاق میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ وہ اس پر ہاتھ بھی کم اٹھاتا تھا اور خود بھی اس نے فیکٹری جانا شروع کر دیا تھا۔ زندگی کی طرف اس نے سنجیدگی سے قدم بڑھایا تھا۔ اس بات کو ملک منصور نے بھی بہت خوش آئند سمجھا تھا اور سر کے لیے بھی یہ کسی اعتراض سے کم نہ تھا۔ وہ بات بھی دیکھے لکھے میں کرتا اور اس کی بہت سی ناممقول باتوں پر بھی خاموش رہتا۔

اس کا موڈ سخت آف تھا۔ نہ کچھ کھانے کو بی جاہر ہاتھ نہ پینے کو۔ باہر گلابا سا اندر جیرا بھیل چکا تھا۔ وہ کمرے میں لائٹ آف کیے کر سی پر بیٹھی سگریٹ کے کمرے کمرے کش لے رہی تھی۔ آج سگریٹ بھی خامی بدحوہ لگ رہی تھی اس نے سگریٹ بری طرح توڑ مروڑ کے الٹش ٹرے میں پھینکی اور سگریٹ کیس سے نئی سگریٹ نکالی پرس میں سے ایک چھوٹی سی ڈبلی نکال کر اس کے ترہا کو میں چرس بھرنے لگی اور پھر کمرے کمرے کش لینے لگی۔ ہار کا تھن پھر بھی کم نہیں ہو رہا تھا۔ گوکہ ذہن اونچی اڑا نہیں بھرنے لگا اور اس میں نئی نئی آسکیمیں آنے لگیں۔ سز سلیم انتہائی عجیبی اور کہینی عورت ہے۔ آج اس نے ضرور پتا بدلا ہو گا ورنہ میں کیسے ہار سکتی تھی۔ میرا تعلیم یافتہ نہ ہونا ان لوگوں کو اکثر قاعدہ دے جاتا ہے۔ ورنہ میں آج ہار ہی نہیں سکتی تھی۔ سز سلیم، سز اکرام اور سز زہیر بڑی گھاگ اور زہریلی عورتیں ہیں۔ شاطر و چال باز انھوں نے میرے خلاف مل کر پلاننگ کی ہوگی۔ یہ ہمیشہ مجھے چھانے کے چکروں میں رہتی ہیں۔ اسے ان پر سخت غصہ رہا تھا۔ آج وہ پچاس ہزار جوئے میں ہار کر آئی تھی۔ وہ ہر طرح سے لیس ہو کر آج میدان میں اتری تھی۔ اس نے خصوصی طور پر سز زہیر سے سارے ٹکس سکھے تھے۔ چنے سارے اس کے پاس تھے۔ یقیناً چنے بدلے گئے ہوں گے وہ بار بار سارا منظر ذہن میں لا رہی تھی اور جیسے ایک دم کچھ ذہن میں آ گیا۔ جب اس کا سگریٹ کیس نیچے گرا تھا اور وہ اٹھانے کے لیے جھکی تھی۔ تب سر اٹھاتے ہوئے اس کی نظر سز زہیر پر پڑی تھی اس کی آنکھوں میں خاص چمک تھی اور لہجوں پر مسکراہٹ اور اس نے سز اکرام کو آکھ بھی ماری تھی۔ اچھا تو یہ گیم تھی۔ میں بھی ان کو نہیں چھوڑوں گی۔ اس نے ریڈ ٹکری ہلاک ٹیکل کی اونچی ایڑی والی جوتی اتار کر دور پھینکی۔ اس کا خون غصے سے کھول رہا تھا۔ انھوں نے مجھے ہمیشہ شکست دینے کی کوشش کی ہے۔ ہر بات میں۔ اب میری ہاری ہے ان سے اپنی ہار کا بدلہ لینے کی اور اب یقیناً وہ پلی، سی میں ڈنر کے لیے گئی ہوں گی۔ وہ ان کی عادتوں اور روٹین سے اچھی طرح واقف تھی۔

وہ اک نئے مزم کے ساتھ اٹھی۔ سگریٹ الٹش ٹرے میں مسلی اور آئینے میں اپنا سراپا دیکھا۔ شولڈر کٹ ہالوں کو برش کیا۔ لپ اسٹک کا ڈبرا کوٹ کیا۔ ماؤتھ واش سے منہ صاف کرنے کے بعد ماؤتھ اسپرے کیا۔ جسم پر پرلیوم کا بھرپور چھڑکاؤ کرنے کے بعد وہ گاڑی لے کر پنی سی کی طرف روانہ ہوئی۔ پنی سی میں کوئی خاص فنکشن تھا۔ اس لیے مرد و خواتین جوتی در جوتی جدید فیشن، بعل لمبوسات اور ملی علی خوشبوؤں سے منظر ہشتے مسکراتے داخل ہو رہے تھے۔ اس نے ہال میں نگرہ دوڑائی کوئی شٹا سا چہرہ نگرہ آ یا۔ موسم گرما کی آمد آدھی اس لیے مقامی کیشیاں اپنی پروڈکٹس کی ایڈورٹائزنگ کے لیے ہر سال کی طرح اس دفعہ بھی بہت وسیع اور جدید خطوط پر یہ شوز منعقد کروا رہی تھیں۔ تقریباً تمام بڑے ہوٹلوں میں بھی

سرگرمیاں جاری تھیں۔ فیشن اور ماڈلنگ کے نام پر ایک مخصوص انجمائے صوفیہ مخصوص طبع کو فراہم کی جا رہی تھی۔

ہال قدرے بھرا ہوا تھا۔ رنگ برنگی روشنیاں نیم عریاں ماڈلز کے جسموں اور چہروں پر پڑتیں تو عجیب سا تاثر پیدا ہوتا۔ لوگ خوب انجمائے کر رہے تھے۔ وہ تینوں اسے ایک کونے میں بیٹھی نظر آئیں۔ تینوں قہقہے لگا رہی تھیں اور اچانک اس سے آنکلی نکل پر اس کی نظر پڑی وہ جہاں کمزری تھی وہیں بیٹھ گئی۔ اس میں ایک قدم بھی اٹھانے کی ہمت نہ تھی۔ آفاق ایک خوبصورت سی ماڈل اسکا ڈائریکٹر کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا اور دونوں کسی بات پر قہقہے لگا رہے تھے۔ وہ ان قہقہوں کا شور اور گونج اپنے دل و دماغ میں سن رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر کی اور پھر خالی خالی قدموں سے واپس لوٹ آئی۔



دلیم کو قادر کی طرف سے ایک میل موصول ہوئی تھی اور اب وہ بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ قادر نے ہر ممکن طریقے سے دو سالوں میں اس کی برین واشنگ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب اس کے اے، لیڈر کے ایگزیکٹو بھی ہونے والے تھے اور ان سے قادر نے ہونے کے بعد قادر نے اس کے بارے میں کوئی اہم فیصلہ کرنا تھا۔ قادر نے خود ہی اس کا ایڈیشن لاہور میں کروا دیا تھا۔ شہلا ان تمام باتوں سے بے بہرہ تھی۔ دلیم نے کئی دنوں سے ماں سے بالکل رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ حیدر کی وجہ سے سخت پریشان تھی۔ سندھ اسے مل رہا تھا نہ کوئی اس سے بات ہو رہی تھی۔ وہ حقیقت معلوم کرنا چاہتی تھی مگر سب کچھ اس کی ریٹخ سے باہر تھا۔ رشید نے اسے اطلاع دی کہ کوئی اس سے ملنے آیا ہے۔ اس کا دل ذرہ ذرہ سے دھڑکنے لگا۔ یقیناً حیدر ہی ہوگا مگر اس وقت اس نے گھڑی دیکھی رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ وہ پریشان سی منتشر سوچوں کے ساتھ جب دزیز زروم میں داخل ہوئی تو چونک گئی۔ دلیم سامنے بیٹھا تھا۔

"دلیم تم..... اور ہوں اچانک پھر بتائے۔ خیریت تو ہے۔" اس نے بدولی سے اسے گلے لگایا اور سوالات پوچھنے شروع کر دیے۔

"ہاں..... وہ..... مما....." اسے جیسے پوری بات بتانے کے لیے ماحول ساز کا گھنٹا لگ رہا تھا۔ "مما..... آپ نہیں، میں آپ کو بتا رہی ہوں۔"

"کیا خیریت تو ہے؟"

"ہاں وہ قادر نے کہا ہے کہ میرا اب لاہور میں رہنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ اس لیے اب میں لاہور شفٹ ہو رہا ہوں۔ انھوں نے میرا ایڈیشن بھی یہیں بہت اچھے کالج میں کروا دیا ہے اور میرے رہنے کا بندوبست بھی کر دیا ہے۔" دلیم آہستہ آہستہ اسے بتا رہا تھا۔ شاید اسے اس کے روجل سے خوف آ رہا تھا۔

"دلیم..... میں قادر سے سخت تنگ ہوں۔ انھوں نے تم میں اور مجھ میں دراڑ ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور تم نے ماں کو اہمیت دینا تو بالکل ہی چھوڑ دیا ہے۔ قادر جو بات بھی کرتے ہیں تم فوراً مان لیتے ہو۔ کیا تمہاری ماں مر چکی ہے اور تم بے آسرا ہو گئے ہو جو تمہیں ہر بات میں ان کے مشورے کی ضرورت ہے۔ دلیم تم اب کسی بھی بات میں مجھ سے مشورہ کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ اب جبکہ سب کچھ ہو چکا ہے تم صرف مجھے بتانے کے لیے آئے ہو۔ ٹھیک ہے تم جو چاہو کرو۔ میں کون ہوں تمہیں کسی بھی بات میں مشورہ دینے والی۔ تمہارے لیے اب سب کچھ قادر ہی ہیں۔"

دو حصے سے بولتی ہوئی باہر نکلتے گی تو ولیم اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”مما۔۔۔۔۔ یوں نہیں۔ میں جانتا تھا آپ ناراض ہوں گی اور آپ کو ہونا بھی چاہیے۔ مما میں نہ آپ کو ناراض دیکھ سکتا ہوں نہ قادر کو۔ آپ میری ماں ہیں اور میں جانتا ہوں کہ آپ نے کن تکیوں سے مجھے پالا ہے۔ مما آئی رینگلی لویو۔“ اس نے ماں کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”مگر مما، قادر میرے لیے ایک رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آئی آسو لو ہم۔ میں کیا کروں۔ میں آپ دونوں کو نہیں چھوڑ سکتا۔ مما۔ میرے لیے جویشن کو مشکل نہ بنائیں اس طرح میں کھلیکٹ کا شکار ہو کر ڈسٹرب ہو جاؤں گا۔ کیا آپ چاہیں گی کہ میں ڈسٹرب ہو جاؤں۔“ وہ استغیاہامی انداز میں اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”نہیں، میں کبھی بھی نہیں چاہوں گی۔ میں کبھی بھی تم کو ڈسٹرب نہیں دیکھ سکتی۔“ اس کی آنکھوں میں بھی نمی سی تیرنے لگی۔ وہ ولیم کی بات سن کر شدید جذبات سے مغلوب ہو چکی تھی اور سخت غصے کے باوجود اسے نہ روک سکی۔ اس کے اندر لاوا اٹل رہا تھا۔ کبھی دل چاہتا اسی لمحے ساری حقیقت اسے بتا دے اور کبھی مسئلے کو مزید الجھنے سے بچالے۔۔۔۔۔ مگر پھر وہ اس سے کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ جا چکا تھا اور اسے اپنے آپ پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ ہر بار ایسا کیوں ہوتا ہے۔ وہ کب تک مصلحتوں کا شکار ہوتی رہے گی۔ کب تک۔۔۔۔۔ یوں حالات کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنی رہے گی مگر میں کیا کروں۔ کیا کہوں اور کس طرح اسے ہمیشہ نتائج سے خوف آتا تھا اس نے حالات کو یوں ہی چلنے دیا۔

ولیم ہاسٹل شفٹ ہو چکا تھا۔ جب سے قادر سے اس کا ملنا جلتا ہوا تھا اس کی سوچ بہت بدل چکی تھی۔ وہ عام لڑکا نہیں رہا تھا۔ قادر کی مملو نے اس کی بہت بریں واضح کر دی تھی۔ وہ بہت جمیدگی سے زندگی اور اس کی جھنجھٹوں کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ وہ ہر بات کے ہر پہلو کو پہلے ذہن میں رکھتا پھر کوئی قدم اٹھاتا۔ اس کے نرم و نازک ذہن کو قادر نے مذہب کے سخت فکریں میں بکڑ دیا تھا۔ وہ گناہ اور ثواب کے فلسفے میں الجھا رہا تھا۔ ہر بات کو کہنے سے پہلے سوچتا کہیں گناہ کے زمرے میں تو نہیں آتی اور ہر کام کو کرنے سے پہلے الجھن کا شکار رہتا کہ اس کا ثواب بھی ہوگا کہ نہیں۔ اس کے ہم عمر زندگی کو کیسے کیسے انجوائے کر رہے تھے۔ ہنسی مذاق کرتے لڑکے لڑکیوں کے گروپ انجوائے منٹ کے حلقے پلاز بٹاتے رہتے۔ ٹریس اور شیج کرتے۔ ایکٹریشن پر جاتے۔ فیشن شو دیکھنے کے لیے پروگرامز جتنے۔ تھیز جاتے۔ شاپنگ کے لیے جاتے اور وہ یا تو اپنی اسٹڈیز کرتا یا پھر بائیکل چڑھایا پھر سیر پر قادر سے چیت کرتا۔ وہ جب بھی الجھتا قادر اسے ایک نئی سوچ دے کر اس کے ذہن کا وھار بدل دیتے۔ قادر بہت ماہر اور فطین شخص تھے۔ جن کی زندگی کا مشن ہی نئے ٹیکنٹ کو چرچ کے مفادات کے لیے استعمال کرنا تھا۔ قادر سے ملنے سے پہلے وہ برا بیکھوٹی میں آؤٹ اسٹینڈنگ سمجھا جاتا تھا۔ کسی بھی پروگرام میں اس کی شرکت ادارے کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی اور اب وہ ان سب چیزوں سے الگ تھلگ رہتا۔ اس کے کلاس فیوڈ اور روم میٹس نے بھی اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا بلکہ اب وہ اس کی کمپنی کو بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ لڑکیاں اسے ”گاڈ قادر“ کہہ کر تھیز تھیں اور اس کا خوب مذاق اڑاتیں۔ وہ کالج کا سب سے چنڈم لڑکا تھا۔ لڑکیاں اس کے پیچھے دیوانہ وار فدا ہوتیں۔ جب تک وہ مری میں تھا ہر لڑکی اس سے دوستی کی خواہش تھی اور جب لاہور آیا تب بھی وہ سب اس کی تاک میں رہیں مگر جیسے ہی اس کی پرستاشی کا یہ پہلو سامنے آتا تو سب بدک کر پیچھے ہٹ جاتیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنا بیوچر بھی انھیں تار یک لگنے لگتا۔ بات بدھنے سے پہلے اس کو قسم کر دینا بھرتا ہے۔ ہر بڑھتا قدم

رک جاتا۔ ماں کے ساتھ بھی اس کے تعلقات سرد مہری کا شکار تھے۔ دوستوں کے محلے میں بھی کسی آگئی تھی۔ اب اس کی ذات کو صرف اور صرف قادر نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ وہ پورا کا پورا قادر کے کنٹرول میں تھا اور قادر اسے اپنے اشاروں پر چلا رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ خود ہی الجھ جاتا۔ جو کچھ وہ کر رہا تھا وہ سب ٹھیک تھا یا پھر.....؟ اس کے آگے اس کا ذہن کچھ نہ سوچ پاتا۔ ہر طرف الجھنیں ہی الجھنیں تھیں اور وہ کسی ٹیکس کی طرح اس کے سارے وجود کو جکڑے ہوئے تھیں۔ اس کا وجود تضادات کا شکار ہو رہا تھا۔ سکون کے بجائے انتشار ختم لے رہا تھا۔ جب سے اس نے یہ محسوس کرنا شروع کیا تھا کہ ماں اس کو اور قادر کے تعلقات کو ناپسند کرتی ہے۔ وہ مزید ڈانٹ رہا ہو گیا تھا۔ ماں کے خواب چکنا چور ہو رہے تھے اور اس کی اپنی سوچ ڈانٹ رہی.....



شہلا ناٹ کوچ سے پشاور پہنچتھم کے پاس گئی تھی۔ وہ اسے یوں اچانک صبح سویرے دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔
 ”شہلا خیریت تو ہے نا بیٹی۔ تم اس طرح اچانک..... بغیر کسی فون اور اطلاع کے گھر میں سب ٹھیک ہے نا۔“ تبسم اسے یوں پریشان اور چرمروہ دیکھ کر مضطرب ہی ہو گئیں۔
 ”ہاں سب ٹھیک ہے۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”شہلا جی جی بتاؤ۔ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔“ وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولیں۔
 ”اے بیٹی کوناشتا وغیرہ تو دوبارہ پوچھ لیتا۔“ ان کے شوہر سید منیٹ الدین نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔
 ”السلام علیکم اکل۔“

”وہیکم السلام بیٹی۔ کیسی ہو۔ حیدر بھائی کیسے ہیں؟“
 ”ٹھیک ہیں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”تیکم اس کو فریٹ تو ہونے دو۔ جاؤ بیٹی آپ فریٹ ہو جاؤ پھر ناشتا کھٹے کرتے ہیں۔“
 ”جی اکل۔“ وہ ایک لے کر اندر کمرے میں چلی گئی۔

”تیکم، آپ نے آئے ہی اسے پریشان کرنا شروع کر دیا ہے۔ آپ کو اس کے چہرے پر پھٹکی مایوسی اور پریشانی سے خود ہی اندازہ کر لینا چاہیے۔ وہ بہت ڈانٹ رہی ہے۔“ منیٹ صاحب نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں..... اسی لیے تو میں پریشان ہو گئی ہوں۔ وہ نہ تو کبھی یوں اچانک آئی ہے اور وہ بھی کوچ سے اور نہ ہی اس طرح کبھی اسرود کھائی دی ہے۔“

”آپ ناشتا لگوائیں۔ بعد میں اس سے پوچھ لیتا لیکن پہلے میں حیدر کو تو فون کر کے بتا دوں کہ وہ خیریت سے پہنچ گئی ہے۔ وہ بھی پریشان ہو رہا ہوگا.....“ انھوں نے جلدی سے فون ملا لیا۔

”حیدر بھائی، کیسے ہیں آپ۔۔۔ ٹھیک تو ہیں نا؟“ وہ خوش کن لہجے میں بولے۔

”کون مغیث بھائی! آپ ٹھیک ہوں۔“ وہ قدرے یاسیت سے بولا۔

”آپ کو اطلاع دینی تھی کہ شہلا جی خیریت سے بخیر تھی۔ مگر کرنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ اپنی ہی لے میں بولے۔

”شہلا۔۔۔ ادھر۔۔۔ ہے۔“ حیدر کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

”ہاں بھئی۔ کیوں یقین نہیں آ رہا۔ بات کرواؤں۔ ابھی ابھی وہ بچکی ہے اس لیے واپس روم میں ہے۔“

”اچھا اس کو کچھ نہ بتائیے گا میں خود ادھر آتا ہوں۔“

”خیریت تو ہے نا؟“ مغیث صاحب کو شک سا ہو گیا۔

”بس آپ فون کے بارے میں کچھ بھی نہ بتائیے گا۔ وہ کچھ ناراض ہے۔“ حیدر نے فون بند کر دیا۔

”خدا یا تیرا شکر ہے کہ وہ ادھر چلی گئی۔ ورنہ میں تو پاگل ہی ہو جاتا۔“

شہلا زندگی میں پہلی دفعہ اس سے روشنی تھی اور اس کا یوں رونگٹا اس کے لیے سخت جان لدا ثابت ہو رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی دنیا ختم ہو رہی ہو۔ محسوس کا یہ لہجہ لہجہ لاشی اور نازک جال انسان کو کیسے کیسے جکڑے ہوتا ہے۔ کبھی کبھی یہ نازک جذبے بھی انسان کو کس قدر بے حوصلہ اور مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ زندگی سکتا ہے نہ مر سکتا ہے۔

”مجھتیں۔۔۔ مصلحتیں، مجبوریاں اور بے بسی۔“ انسان الجھتا ہی چلا جاتا ہے۔ ہر کوئی الجھ رہا تھا اور جو جھٹتا جھٹتا الجھ رہا تھا اتنا اتنا ترپ رہا تھا۔ جھٹتا جھٹتا ترپ رہا تھا۔ اتنا ہی زیادہ بے بس ہو رہا تھا اس نے فوراً پٹا دور کے لیے سیٹ بک کروائی تھی۔

اس نے ناشتا بہت بے دلی سے کیا۔ اب مغیث الدین معاملے کی نہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ اس کا بخور جائزہ لے رہے تھے۔ تبسم اپنی جگہ پریشان بیٹھی تھیں۔

”بیٹی آپ ناشتا کیوں نہیں کر رہیں۔۔۔ اور حیدر بھائی کیوں نہیں آئے؟“

”وہ۔۔۔ اکل ان کی میننگز۔۔۔ وہ بہت معروف ہیں۔“ وہ بے ربط لہجے میں بولی ”پچھو۔۔۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔ آرام کرنا چاہتی ہوں۔“ شاید اس نے مغیث الدین کی نگرانی میں چھپا ہوا سوال اور مشکوک لہجہ کو بچان لیا تھا۔ اس لیے ان کے سوالوں سے بچنے کے لیے وہ آرام کا بہانہ بنا رہی تھی۔

”آؤ۔۔۔ میرے ساتھ۔۔۔ پچھو سے گیسٹ روم میں لے گئیں۔“

”پچھو گھر میں اتنی خاموشی کیوں ہے۔ کہاں ہیں سب لوگ؟“

”رینا نے اسلام آباد میں ہاؤس جاب شروع کی ہے۔“ حیف کالج ٹرپ کے ساتھ بھونٹن گیا تھا اور اطہر کی پوسٹنگ آج کل کوئٹہ میں ہے۔“

”شہلا مجھے کچھ بتاؤ۔ کیا بات ہے۔ تم بہت پریشان لگ رہی ہو۔ اس قدر پریشانی تو میں نے تمہارے چہرے پر کبھی نہیں دیکھی ہے۔“

”پھو..... میں بہت پریشان ہوں۔ پاپا..... پاپا نکس رہے۔ آئی ٹین..... سی اذان لو..... اور یہ میرے لیے بہت شاکنگ ہے۔“

”کیا فضول کجاس ہے۔ حیدر ادا لائی باتیں۔“ پھو ہنسنے ہوئے ایک دم سیریس ہو گئیں۔

”یہ تو میرے لیے دکھ کی بات ہے۔ وہ میرے سامنے شروع سے ایک شٹاف موتی کی طرح رہے ہیں۔ ان کی زندگی مکمل کتاب کے مانند ہے مگر اب وہ اس قدر بدل گئے ہیں۔“

”تم یہ سب کیسے جان پائیں؟“

”میں نے خود ان کو فون پر باتیں کرتے ہوئے سنا ہے۔ ان کا لہجہ..... مائی گاڑ..... پھو..... وہ کہہ رہے تھے۔ شہلا تم اپنا ہر دکھ مجھ سے شیئر کر سکتی ہو۔“

”کیا کہا..... کیا..... شہلا زندہ ہے.....؟“ پھو کو جیسے ایک دم کرنٹ لگا۔

”کیا آپ انہیں جانتی ہیں.....؟“ شہلا کے لہجے میں حیرانی کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں بے شمار سوالات بھی تھے۔

”ہاں..... وہی تو ہے۔“ پھو کے لہجے میں ہر تعاش پیدا ہو گیا۔

”کون..... بتائیں نا کون.....؟ جس نے میرا سکون برباد کر دیا ہے۔“

”حیدر کی محبت.....“ وہ آہستہ سے پولیس اور اسٹھ کر باہر چلی گئیں۔

”پھو پھو..... آپ نے بات ادھوری کیوں چھوڑ دی۔ آخر آپ کیوں بتا نہیں چاہے ہیں؟“ وہ ان کے پیچھے بکھن میں آ گئی۔

”تم کیا کر دگی سن کر؟ جن باتوں کو دہرانے سے سوائے تاسف کے اور کچھ نہ حاصل ہو تو ان کا فائدہ؟“

”مگر پھو پھو..... اس عورت کو کوئی حق نہیں کہ ہماری بے سکون زندگی کو یوں جاہ کرے..... پاپا کو اس سے پہلے میں نے اتنا مضطرب بھی نہیں دیکھا۔ ان کا بدلا ہوا لب و لہجہ..... مجھے تو وہ اپنے آپ ہی میں نہیں لگے۔“

”آخر تم اس بحث سے کیا نتیجہ نکالنا چاہتی ہو؟“ وہ قدرے درشتی سے پولیس۔

”پھو پھو! آپ ناراض ہو رہی ہیں، آپ کو اندازہ نہیں کہ میں کتنی ہرٹ ہوئی ہوں۔ جس شخص کو ہم اپنی ذات سے بڑھ کر چاہیں۔ اس کا ایجنج ایک دم ختم ہو جائے تو کیا ہوتا ہے..... تو کیا ہوتا ہے شاید آپ کو نہیں معلوم۔“

”شہلا..... تم صرف اپنا ہی سوچ رہی ہو۔ اگر دو لوگ ایک دوسرے کو بہت چاہیں اور مصلحتیں، روایتیں انہیں نہ ملنے دیں۔ ایک کانٹوں بھری زندگی گزارے اور ایک ہیلانوں جیسی دیں..... تو اس کو تم کیا کہو گی.....؟“ تبسم نے آہ بھر کر اسے دیکھا۔

”تو یہیں کہیں نا قسمت نے انہیں نہیں ملا یا..... مگر پاپا کا اس سے کیا تعلق؟“

”تم جانتی ہو..... تمہارا یہ نام بھی کسی کی عطا ہے..... شہلا کو قسمت نے اس سے چھینا تھا یا پھر وہ کھو گئی تھی۔ مگر وہ تمہاری صورت میں بھی بھی اسے کھو نہیں چاہتا تھا۔ ہم سب خاموشی سے سب کچھ دیکھتے رہے۔ کوئی بھی کچھ نہ کہہ سکا اور نہ کر سکا۔ شاید قسمت اسی کو کہتے ہیں..... نہ ہانا نہ

حیدر۔۔۔۔۔ شہلا اور نہ ہی کوئی اور۔۔۔۔۔“

”آپ مجھے تفصیل سے سب کچھ کیوں نہیں بتاتی ہیں۔۔۔۔۔؟“ انہوں نے ساری تفصیل اسے بتادی۔

”پھوپھو۔۔۔۔۔ اس عورت نے میری ماں کو بھی پورا حق نہ لینے دیا۔ میری ماں میرے باپ کی بچی اور پھر ہرجیت کو ترستی مرگئی اور اب وہ مجھ

سے میرا حق چھیننا چاہتی ہے۔“

”شہلا اتہا ہاری ایسی سوچ۔۔۔۔۔ ہم جو حیدر کے کزنز ہیں، اسے نگے بھائی سے زیادہ عزیز جانتے ہیں۔ اس کے لیے ہمارا دل اتنا دکھتا ہے

اور تم کس قدر بے اعتنائی کا مظاہرہ کر رہی ہو۔ تمہیں اس شخص نے اتنی محبت دی ہے اور تم کیسے اس کے اور شہلا کے خلاف بول رہی ہو۔“ وہ ناراضی سے بولیں۔

”پھوپھو۔۔۔۔۔ محبت میں شراکت داری مجھے قبول نہیں، جب وہ عورت یہاں نہیں تھی تب بھی اس کی وجہ سے میری ماں ڈسٹرب رہی اب وہ

ند جانے کہاں سے آگئی ہے تو اب میرا اور میرے باپ کا رشتہ کمزور کر رہی ہے۔ ایسے لوگ بس دوسروں کو اذیتیں دینے کے لیے جہنم لیتے ہیں۔“

”شہلا مجھے تم سے پر امید نہیں تھی۔۔۔۔۔ تم تو پورے خاندان میں بہت مختلف اور پیار کرنے والی مشہور ہو۔ تمہارے منہ سے یہ باتیں سن کر

مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے۔“

”پھوپھو۔۔۔۔۔ مجھے زندگی میں صرف ایک ہی رشتہ ملا ہے۔ ماں میری پیدائش کے دو سال بعد مر گئی۔ نہ بہن، نہ بھائی، نہ دادا نہ نانا۔۔۔۔۔ اور

آپ لوگ بھی دور دور رہتے ہیں۔ میرے پاس صرف ایک ہی رشتہ ہے جسے میں اپنا سب کچھ سمجھتی ہوں۔ وہ مجھ سے چھن جائے، ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ میں اس چھیننے والے سے ہی اس کا سب کچھ چھین لوں گی۔۔۔۔۔“ وہ قدرے غصے میں بولی۔

”شہلا۔۔۔۔۔ آرام سے میری بات سنو۔ جس سے تم اتنی محبت کرتی ہو، اگر اس کی خوشی ایک ذات سے وابستہ ہو اور تم وہ بھی اس سے چھیننا

چاہو تو کیا تم خود غرض نہیں کہلاؤ گی؟“

”پھوپھو! اب اس عمر میں وہ کیا کرتا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔ شادی۔۔۔۔۔ کیا انہیں بیٹے کی ضرورت ہے؟ اگر وہ شادی کریں گے تو کیا میں موسائلی میں

منہ دکھانے کے قابل رہوں گی۔ اگر ایسا ہوا تو پھر انہیں میرا جنازہ ہی اٹھانا پڑے گا۔۔۔۔۔“ وہ اس قدر ہڈ باتی ہو کر بول رہی تھی اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ کچن سے باہر کرل مغیث الدین اس کی ساری باتیں بہت توجہ سے سن رہے تھے۔

”ہرجیت کو مشروط نہیں بناتے پٹا۔۔۔۔۔ تم کمرے میں جا کر آرام کرو۔ حیدر ایسا کچھ نہیں کرے گا۔ تم سے زیادہ ہم اسے جانتے ہیں۔ جو

غصہ اپنی جوانی تیاگ دے وہ بڑھاپے کو کیونکر وارخ وار کرے گا۔ تم اطمینان رکھو۔“ مغیث الدین اخبار پکڑے کچن میں آئے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ وہ ایک دم خاموش ہو گئی اور خاموشی سے کمرے میں چلی گئی۔

”تبسم حیدر! ابھی یہاں تک پہنچنے والا ہے۔۔۔۔۔“ انہوں نے بیوی سے کہا۔

”وہ کیسے۔۔۔۔۔ اور آپ کو کس نے بتایا؟“ وہ حیرت سے بولیں۔

”میں نہیں جانتا تھا کہ شہلا ناراض ہو کر اسے بغیر بتائے یہاں چلی آئی ہے، میں نے تو شہلا کے بچنے کی اسے اطلاع دینا چاہی تو اس نے ہی بتایا کہ وہ خود اسے لینے آ رہا ہے۔ شہلا بہت جذباتی لڑکی ہے۔“ وہ قدرے افسردہ لہجہ میں بولے۔

”شدید محبت، انسان کو جذباتی بنا دیتی ہے مگر دیکھیے، ہر رشتہ اپنا حق کیسے دھوئیں اور رعب سے اٹکتا ہے اور جو بے چارے نہیں مانگ سکتے، وہ ساری زندگی اذیتیں ہی سہتے ہیں۔ اس وقت بھی سید خاندان کے بہت سے لڑکوں نے فیروں میں شادیاں کر لی تھیں مگر حیدر نے خاموشی سے بابا کی بات مانی۔ اگر وہ ذرا بھی مختل ہوتا یا چوں چرا کرتا تو بابا کیا کر سکتے تھے اور وہ یہ بات خود بھی جانتا تھا۔۔۔ مگر بابا کی پرورش اور ان کی محبت کو جھٹکا کروہ احسان فراموش بھی نہیں کہلاتا چاہتا تھا بس یہی قسمت ہے۔۔۔۔۔“ وہ افسردہ ہو رہی تھیں۔

”وہ اپنا قصہ مکمل کر آرام سے سو رہی تھی۔ جسم کے میاں کرتل مغیث الدین سی ایم ایچ میں سائیکاٹرسٹ تھے اور آج کل ان کی پوسٹنگ پشاور میں تھی۔ چھٹی کا دن تھا اس لیے وہ گھر پر تھے۔ بیٹے میں بڑی بنانے میں مصروف تھا اور وہ خود دوسرے سے منگائی وغیرہ کر رہی تھیں۔ جب حیدر پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر وہ خوش بھی ہوئیں اور پریشان بھی۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ ساری رات نہیں سویا تھا۔ پریشان حال چہرہ، سوجی سرخ آنکھیں، جسم کا قول ہی لرز گیا۔

”حیدر بھائی۔۔۔۔۔ کیا آپ نے کیا حالت بنا رکھی ہے۔۔۔۔۔“

”بس آپ۔۔۔۔۔ میں شہلا کی وجہ سے بہت پریشان رہا ہوں۔ یہ بغیر بتائے ہی آ گئی۔ کیا اس نے آپ سے کوئی بات کی؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ سب باتیں ہو چکی ہیں۔ وہ تمہارے بارے میں بہت زیادہ پوچھ پچھا کر رہی ہے۔۔۔۔۔ اور ہاں، شہلا تمہیں کہاں سے ملی، اسے سالوں

کے بعد۔۔۔۔۔ سنا تھا اس نے منصور سے طلاق لے کر کسی انگریز سے شادی کر لی تھی اور اب یہاں۔۔۔۔۔؟“ آپ نے استغہامیہ انداز میں پوچھا۔

”بس، مصائب کی پہلی میں پس رہی ہے۔ وہ پہلے جیسی شہلا نہیں رہی ہے۔ نہ وہ جو درد ہا چا اور نہ ہی نام۔۔۔۔۔“ وہ افسردگی سے بولا۔

”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“ آپ نے چونک کر پوچھا۔

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔ شہلا کہاں ہے؟“

”سو رہی ہے۔۔۔۔۔؟“ آپ نے بتایا۔

”حیدر بھائی۔۔۔۔۔ آپ اب گھر نہ بیٹھو، آرام سے بات کرنا۔ وہ اس وقت بہت جذباتی ہو رہی ہے۔“ مغیث الدین نے انہیں سمجھایا۔

”آپا، ہر دفعہ نہ جانے میں ہی کیوں آزما یا جاتا ہوں۔۔۔۔۔“ حیدر کی آنکھوں میں آنسو جھرنے لگے۔

”ہاں۔۔۔۔۔ بعض لوگوں کو قدرت بار بار آزماتی ہے۔ نہ جانے کس بھئی کے لیے انہیں تیار کر رہی ہوتی ہے۔ شاید زیادہ آزمائش انہی کے

لیے ہوتی ہیں جنہیں وہ زیادہ پیار کرتا ہے۔“ آپ نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”آپا، میں جتنا اپنے ماضی سے دور بھاگتا چاہتا ہوں، وہ بھاگ بھاگ کر میرے قدموں سے لپکتا ہے۔۔۔۔۔ نہ جانے شہلا کہاں سے آ

چکی۔۔۔۔۔ میں اس کی تکلیفیں اور مصیبتیں دیکھ کر پریشان ہو گیا۔۔۔۔۔ بس یہی مجھ سے غلطی ہو گئی۔“ وہ پریشانی سے ہونٹ چبانے لگا۔

”اچھا۔۔۔ تم گھر نہیں کرو۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جھکے ہوئے ہو، آرام کرو۔ منیٹ آپ انہیں اطہر کے کمرے میں لے جائیں، میں ذرا کھانا وغیرہ بنا لوں۔“

”آہ، حیدر بھائی!“ وہ خاموشی سے کسی معمول کی طرح ان کے پیچھے چلنے لگا۔

دو دنوں رات گئے تک سوتے رہے۔ نہ دوپہر کا کھانا کھایا اور نہ شام کو چائے پی۔ تبسم آپانے ڈانٹنگ ٹیبل پر کھانا لگا دیا تھا اور ان کو اٹھا کر اپن کا انتظار کر رہی تھیں۔ حیدر فریٹ ہو کر ان کے پاس بیٹھا تھا۔ جب وہ کمرے سے باہر نکلی، باپ کو دیکھتے ہی اس نے نظریں جھکا لیں اور آہستہ سے سلام کر کے ٹیبل کی دوسری طرف بیٹھ گئی۔

”باقی سب باتیں بعد میں ہوں گی۔ پہلے اطمینان سے کھانا کھائیں۔“ منیٹ الدین نے ان کے چہروں پر پھیلی ناگواری دیکھ کر کہا۔ سب خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔

”کریم خان، برتن اٹھا لو۔۔۔ اور چائے لاؤنج میں ہی لے آؤ۔“ تبسم آپانے بیڈ میں کوآواز دی اور سب لوگ لاؤنج کی طرف چلے گئے۔ دو دنوں خاموشی سے ایک دوسرے سے جیسے نظریں چرا رہے تھے۔

”شہلا، تم حیدر بھائی کو بغیر بتائے کیوں آئیں؟“ تبسم پوچھو نے کافی دیر انتظار کے بعد کہا۔

”میں ان سے ناراض تھی۔“

”اگر ناراض تھیں تو مجھ سے کہا ہوتا۔۔۔ یوں گھر چھوڑ کر آنے کی کیا تک تھی اور میں کس طرح مارا مارا لاہور کی سڑکوں پر ساری رات تھیں ڈھونڈتا رہا ہوں۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے؟“ وہ قدرے درشتی سے بولا۔

”میں بہت ڈسٹرب تھی۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”کس بات سے ڈسٹرب تھیں۔۔۔ کم از کم مجھ سے کوئی بات تو کی ہوتی۔۔۔“

”مجھے لگا جیسے آپ دوسری شادی کر رہے ہیں اور میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکی اس لیے ادھر چلی آئی۔“

”تمہاری ماں کو بھی ساری زندگی یہی دوسوے اور خدشات رہے۔ آپا، ان لوگوں کو نہ جانے میں کیوں اتنا بے اعتبار لگتا ہوں۔ سنو، اگر میں نے یہی کچھ کرنا ہوتا تو نہ مجھے تمہاری ماں کی اجازت کی ضرورت تھی اور نہ تمہاری۔ میں نے تو جانتے ہی جیسے سب کچھ اپنے ہاتھوں سے ختم کیا تھا اور پھر

یہی تم لوگ میرے بارے میں مشکوک رہے۔ ظاہر مرنے دم تک اپنا ذہن صاف نہ کر سکی اور اب تم میرے لیے مسائل کھڑے کرنا چاہتی ہو۔۔۔“

”پاپا۔۔۔ میں آپ کے لیے کوئی مسائل کھڑے نہیں کرنا چاہتی لیکن میں یہ بھی نہیں برداشت کر سکتی کہ وہ عورت جس نے پہلے میری ماں کا بیٹا حرام کیے رکھا تھا، اب میرا بھی کرے۔۔۔ ماضی میں وہ آپ کے لیے جو کوئی بھی تھی، اب اس کا آپ سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کی ایک

سیاسی حیثیت ہے اور میری بھی معاشرے میں یکساں ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ معاشرہ آپ کی وجہ سے مجھ پر انگلیاں اٹھائے۔“ وہ قدرے غصے میں بولی۔

”آپا۔۔۔ آپ اس کی باتیں سن رہی ہیں۔۔۔ باپ آج اس کی نظروں میں مشکوک ہو گیا ہے۔ ایک لمبے میں تم نے میرا بیچ تباہ کر کے

رکھ دیا ہے۔ میں نے تم سے اپنی سچوں کا کوئی صلہ تو نہیں مانا..... تم مجھے کس کا بدلہ دے رہی ہو؟" وہ بھی نصیحتوں میں پہنکا رہا۔
 "پھر پھو..... آپ بھی دیکھیے، محبت بھری نظریں اور پیار کتنے والی زبان آج کسی صلے اور بدلے کی باتیں کر رہی ہے۔ یہ کس کی وجہ سے ہے، یہ اس عورت کی وجہ سے ہے جس نے میری ماں کی زندگی میں بھی زہر گھولا تھا۔ مجھے سب ظلم ہے آپ دونوں نے کیسی زندگی گزار دی ہے اور اب وہ مجھ سے میرا باپ بھی چھیننا چاہتی ہے۔ ہمارے رشتے میں راز تو اس نے ڈال ہی دی ہے..... اب نہ جانے اس نے اور کیا کچھ کر دیا ہے۔" وہ نصیحتوں سے بولتی چلی گئی۔

"شہلا اپنی! باپ سے اس لہجے میں بات نہیں کرتے....." منیٹ انگل نے اسے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔
 "اور انگل، آپ بھی انھیں بتائیں کہ ایسی باتیں کر کے وہ میرا بھرم..... میرا اعتماد، میرا سب کچھ تھمیں رہے ہیں۔ اس وقت میں ریڑھ پر زہر ہو رہی ہوں..... کاش، یہ اعزاز و کرسیں....." وہ رونے لگی۔

"حیدر بھائی، آپ بھی لہجہ کو نرم رکھیں۔ نصیحتوں سے مسائل حل تو نہیں ہوتے....." منیٹ الدین نے انھیں بھی سمجھایا۔
 "آپا، آپ اس سے پوچھیں، یہ میرے بارے میں کیا کچھ معلوم ہے؟" حیدر نے تھم آپا کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔
 "تو آپ نے اس سے فون پر کیا کہا تھا؟"

"اُف خدایا..... تو کیا میں اسے شادی کے لیے کہہ رہا تھا..... تم کس قدر ناتواں ہو..... آپا، آپ اندازہ نہیں کر سکتیں کہ وہ کس قدر غم زدہ زندگی گزار رہی ہے۔ ہاسٹل میں چند روز نہیں سال سے وہ خواہ ہو رہی ہے۔ بیٹا، اس کا کہیں ہے، وہ خود کہیں ہے۔ میں تو صرف یہ چاہ رہا تھا کہ اتنی بڑی حویلی خالی ہے، ادھر آ جائے۔ نوکر چاکر ہیں اور پھر ماضی میں اس تعلق کے علاوہ ایک اور تعلق بھی تو تھا۔ وہ تاپا لہا کی بیٹی بھی تو تھی۔ اس نانا سے بھی اس کا پر راق ہے کہ وہ وہاں رہے۔ اس نے مجھ سے کچھ پوچھا نہیں اور خود ہی فیملہ کر لیا۔ آپا، جہاں اتنے مزارعے ہماری زمینوں سے رزق کھاتے ہیں، فیکٹریز میں ملازمین اور ان کے بچے اتنے فوائد اٹھا رہے ہیں، اگر وہ اور اس کا بیٹا ہمارے پاس رہ جائے گا تو کوئی قیامت تو نہیں آ جائے گی اور ویسے بھی یہ سید صاحب کی وصیت تھی۔" حیدر اب دو گھنٹے لہجے میں بولا۔

"ہاں، اس میں کوئی قباحت نہیں۔" آپا نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔
 "مجھے کوئی اعتراض نہیں..... وہ آئیں اور رہیں لیکن پاپا، میں اپنا کچھ بھی ان سے شیئر کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔ آپ کو بھی نہیں۔" وہ غصے میں بولتی ہوئی اندر چلی گئی۔

"بھروسہ بات..... تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔" حیدر غصے میں بولا۔
 "حیدر..... اسے یہ غلط فہمی ہے کہ اس کے آنے کی وجہ سے تمہاری توجہ اس کی طرف ہو جائے گی اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ تمہاری شیئرنگ کسی صورت میں نہیں چاہ رہی۔ نہ تمہاری محبت، نہ تمہاری توجہ..... اور نہ ہی کچھ اور..... اگر اس نے فوراً سا بھی کچھ ایسا دیکھ لیا تو اس کی شخصیت بکڑ جائے گی اس لیے میرا مشورہ یہی ہے کہ شہلا جس حال میں ہے، اسے رہنے دو۔ جہاں اس نے زندگی کے اچھے سال گزار لیے ہیں، اب بھی

گزار لینے دو۔ تمہاری ہمدردی اور توجہ شاید اسے تو کچھ سکون دے دے مگر تمہاری بیٹی کا سکون برہاد ہو جائے گا۔“ مغیث بھائی نے اسے سمجھایا تو وہ خاموشی سے ان کی طرف خالی خالی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ آپا نے حیدر کی طرف دیکھا۔ اس لمحے انھیں وہ بے حد مجبور، بے بس اور لاچار باپ لگ رہا تھا۔ آپا بھی مصلحتاً خاموش رہیں۔

اگلے دن ان کی واپسی تھی۔ آپا اور مغیث الدین نے دلوں کو طیحدہ طیحدہ بھی سمجھایا اور ایک دوسرے کے سامنے بھی۔ دلوں خاموشی سے سنتے رہتے۔ ایک نے دوسرے سے کچھ نہ کہا۔ سارا راستہ خاموشی سے کٹا۔ نہ جانے کیا ہوا تھا کہ ایک دم دلوں میں جیسے صدیوں کا قاصد بڑھ گیا تھا۔ وہ قدم بڑھاتے ہوئے جھجک رہی تھی اور وہ اس کی طرف شکر مگر حیران کن لگا ہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ایک دو دفعہ موہاں پر تپل بجی۔ حیدر نے نمبر دیکھا اور فون آف کر کے رکھ دیا۔ اس کو اعماذہ ہو گیا تھا کہ فون کس کا ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔



شفیق خون میں لت پت اسپتال لائی گئی تھی۔ اس کی حالت بہت نازک تھی ملک منصور کے قاتل کے بعد وہ گر کر ترچے پنے گی۔ سارا عملہ وہاں اکٹھا ہو گیا۔ کوئی بھی یوں اسے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ تھانے دار کی جان پر بنی تھی۔ اس نے فوراً ایمرینس منگوا کر اسپتال بھجوا دیا۔ تھانے میں یوں بے باکی سے قتل اور اس پر چشم پوشی اس کے لیے ہزار ہا مسائل کھڑے کر سکتی تھی۔ ڈاکٹر ہر ممکن طریقے سے اسے بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ رات بھر آپریشن کے بعد گولیاں اس کے پیٹ سے نکالی گئیں۔ ساتھ ہی انھیں اس کا آپریشن بھی کرنا پڑا۔ پوری کوشش کی جا رہی تھی کہ یہ خبر اخبار میں نہ لگے۔ صحافیوں کو ڈراما بھی بھک پڑ جاتی تو ملک منصور نے جو طوقان پر پا کرنا تھا، اس کا سامنا کرنا کسی کے بس میں نہیں تھا۔ اس کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ کئی دن گزر گئے تھے۔ وہ ہسپتال پر لاڈلائوں کی طرح پڑی تھی۔ اس کے گھر اطلاع دینا گویا ملک منصور کو حریف مفتعل کرنا تھا۔ اس کی جان کو اب بھی اس سے خطرہ تھا۔ جو شخص خود اسے بے دردی سے قتل کر کے پھینک گیا، وہ دوبارہ اس کے ذمہ ہونے کا سن کر غصے سے پاگل ہونا چاہتی تھا۔ مگر اس کے پاس بھی کسی کا ہونا بہت ضروری تھا۔ کچھ دنوں بعد اس کی حالت کچھ بہتر ہوئی تو نرس نے کسی کو بلانے کے لیے اس سے ایڈریس مانگا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ کون ہوگا جو اس وقت اس کے پاس آئے گا۔ شزا سے اس کے تعلقات ایسے نہ تھے کہ وہ اس مشکل وقت میں اس کا ساتھ دیتی۔ ملک منصور کو تو بلانے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی اور آفاق..... نہیں..... سحر..... ہو سکتا ہے سحر آ جائے۔ اس نے بہت سوچنے کے بعد سحر کو بلانے کو کہا اور اس کا موہاں نمبر لکھ کر دیا۔

آفاق رات بھر گھر نہیں آیا تھا اور وہ سخت غصے میں رات بھر نہیں سوتی تھی۔

وہ کہاں تھا اور کس کے ساتھ تھا، وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ اس سے بھرپور جھگڑے کے موڑ میں تھی۔ ایک طرف لیڈیز سے ہارنے کا ہتھن تھا تو دوسری طرف آفاق کی بے وفائی جو شاید اس کے خون میں شامل تھی۔ وہ ہار ہار اپنے آپ کو سمجھاتی۔ ایک دن تو ایسا ہونا تھا۔ وہ کب تک اس کے بنجر و جود کو برداشت کر سکتا تھا لیکن نہ جانے اندر ہی اندر کسی شے کے ٹوٹنے کا اسے شدید صدمہ ہوا تھا۔ شاید ایسے میاں بھئی میں جو نام لہا درشت ہوتا ہے، اس کے ٹوٹنے کا دکھ تھا یا پھر اپنی ذات کی لٹی تھی۔ دوسری عورت جب پہلی کی جگہ لیتی ہے تو پہلی اپنے آپ کو کس قدر کمتر اور بے وقعت سمجھتی

ہے۔ شاید یہ سوچ کر اسے اس بے قدری کا دکھ تھا مگر کچھ ایسی چیز تھی جو اندر ہی اندر اسے چیر رہی تھی۔ وہ لاکھا پتے آپ کو تسلیاں دیتی۔ اپنے آپ کو قاتل کرنے کی کوشش کرتی مگر آفاق اور اس لڑکی کا تعلق لگا تا چہرہ اس کے سامنے گھوم جاتا۔ آفاق کی خوشی دیکھتی تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلی مسرت نے اسے ایک لمحے کے لیے چمکادیا تھا۔ اس نے شادی سے اب تک ایسی خوشی کبھی بھی آفاق کے چہرے پر نہ دیکھی تھی۔ اس کا مطلب ہے وہ اس لڑکی کو دل سے پسند کرتا ہے۔ اس کی صحبت اس کے لیے خوشی کا باعث ہے، اسے اپنا آپ سزا مند زندہ اور بد بھدار لگا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے قیمتی پرلیوٹر، ہاڈی اسپرے، اس نے اٹھا اٹھا کر زمین پر مارنے شروع کر دیے۔ وہ اپنے اندر کے غم دھمکے کا اظہار اسی طرح کرتی تھی۔ جب کسی پر بس نہ چل رہا ہوتا ہے جان چیزیں انسان کے ذریعہ اب آکر اپنے وجود کی اہمیت کو خود بھی منواتی ہیں۔ اس نے آفاق کو سواگل پر کاٹکٹ کرنے کی کئی بار کوشش کی مگر وہ آف تھا۔ اس کا مطلب تھا آج وہ اس لڑکی کے ساتھ تھا۔ صبح ہو چکی تھی مگر وہ نہیں آیا تھا۔ اس نے موبائل اٹھا کر دور پیچھا۔

”اسی لمحے اس پر قتل ہونے لگی۔ اس نے اٹھا کر نمبر دیکھا مگر سمجھ نہ آیا۔ اس نے بیلو کھا۔ فون اسپتال سے تھا۔ نرس نے اسے شفق کے بارے میں بتایا اور وہ آنے کو کہہ رہی تھی۔

اگلے لمحے وہ اسپتال جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ شفق کو کسی نے گولیاں مارنی تھیں۔ شایان لوگوں نے، جن کے ساتھ وہ اٹھتی بیٹھتی تھی اور اس رات..... وہ جلدی سے اسپتال پہنچی۔ شفق بستر پر بالکل لاوارثوں کی طرح پڑی تھی۔

”شفق، جیسے یہ کیا ہوا..... اور کس نے کیا؟“ وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔

”پاپا نے.....“ شفق بے شکل بولی۔

”کیا..... مگر کیوں؟“ وہ انتہائی حیران ہو رہی تھی۔

”سحر، میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ پاپا اس حد تک ظالم ہو جائیں گے۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر دنا شروع ہو گئی۔

”مگر انھوں نے یہ سب کیوں کیا؟“

”کیونکہ میں نے سہیل کو بچانے کے لیے سچ بولنا چاہا۔ سحر، عابد اور زویا کو میں نے قتل کیا ہے مگر پاپا نے سہیل کو مجبور کیا ہے کہ وہ انعام اپنے سر لے لے کیونکہ میں ان کے لکھنؤ کے لیے بہت بڑا خطرہ بن چکی ہوں۔ ان کو بس اپنا عہدہ اور شان و شوکت عزیز ہے۔ نہ ان کو اولاد سے محبت ہے اور نہ ہی کسی اور سے۔ وہ کسی سے بھی غلط نہیں۔ بچپن میں، میں انھیں بہت عزیز تھی مگر اب ہم سب ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ ہم کیسے حقیر لوگ ہیں۔ ہمیں کوئی بھی نہیں چاہتا۔ نہ ہمارے حصے میں محبت آئی، نہ شفقت۔ نہ خلوص، نہ ہمدردی اور نہ ہی پیار۔ یہ دردن جو میں نے اسپتال میں گزارے ہیں، میں نے اپنے آپ سے بڑھ کر اس وارڈ میں کسی کو تکلیف پہنچا کر اور لاوارث نہیں سمجھا۔ کوئی ایک بھی تو میرے پاس نہیں آیا.....“ وہ چھت کو دیکھ رہی تھی اور آنسو اس کے گتھے میں جذب ہو رہے تھے۔

”معلوم نہیں..... اس گھر پر کس کی غصہ ہے یا کسی کی بددعا ہے۔ کوئی بھی تو کسی کا نہیں..... نہ اولاد ماں باپ کی، نہ شوہر بیوی کا، نہ بھائی بہن کا، سب کیسی منتشر اور آوارہ زعم گیاں گزار رہے ہیں۔“ سحر دکھ سے بولی۔

”میں تمہاری منگور ہوں کہ تم آگئیں، اگر تم بھی نہ آتے تو۔۔۔“

”تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب میں تمہارے پاس ہی رہوں گی۔“

”سحر، میں ٹھیک ہونے کے بعد کہاں جاؤں گی۔۔۔ پاپا تو مجھے گھر میں گھسنے دیں گے اور نہ ہی زعمہ چھوڑیں گے۔“ وہ سخت گرمندی سے بولی۔

”تم ٹکرنہ کرو، کوئی نہ کوئی راستہ تو نکل ہی آئے گا۔“ اس نے اسے دلاسا دیا مگر خود اس کا دل کس قدر افسردہ تھا، یہ وہی جانتی تھی۔ وہ باتیں

شفق سے کر رہی تھی مگر ذہن میں آفاق تھا اور وہ لڑکی؟ سحر سن تو شفق کو رہی تھی مگر قیصران کے سن رہی تھی۔ اس کا ذہن دونوں صورتوں سے دوچار تھا۔

”محبت بہت بے معنی شے ہے۔۔۔ اور بہت بے وقعت۔۔۔“ ہار ہار یہی جملہ اس کے دل کے نہاں خالوں سے اٹھتا اور اس کے دل و

دماغ میں گونجنے لگتا۔ وہ سردی آور مگر شفق کو دیکھتی رہی جواب میڈم سوکھا کر سونے کی کوشش کر رہی تھی۔ شفق کی باتیں اس کے ذہن میں گونج رہی

تھیں۔ واقعی، شفق اسپتال کے بعد کہاں جائے گی۔ ملک منصور کیسا باپ تھا، اپنے مستقبل کے لیے اسے اولاد کو بھی واؤ پر لگانے سے گریز نہیں کیا تھا۔

کیا اب وہ اسے کسی قسم کا تحفظ دے سکے گا؟ کبھی نہیں بلکہ اس سے کوئی بھی امید وابستہ کرنا حماقت ہوگی اور خود اس کا باپ، اس نے کیسے جلدی جلدی

میں اس کے بدلے میں نوٹ کمرے کیے تھے۔ اولاد دہشتے، ناتے، محبت سب کچھ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اس نے بھی دوبارہ مڑ کر انھیں نہیں دیکھا تھا،

جنھیں بیروں سے محبت، اولاد سے بڑھ کر تھی۔ رشتوں کو کیا ہوتا جا رہا ہے؟ اور اب جیسے جیسے وہ ماڈرن سوسائٹی کی ایک سرگرم رکن بن رہی تھی، حریہ

خارج نہیں کھل کر سامنے آ رہی تھی۔ ہم سب کس طرف جا رہے ہیں؟ کس کس کی تلاش ہے۔ سب دوڑ رہے ہیں، بھاگ رہے ہیں۔ مگر کوئی کسی

کے لیے ٹھہر نہیں رہا۔۔۔ مگر ٹھہر رہے ہیں، معاشرہ نوٹ رہا ہے اور انسان منتشر ہو رہا ہے۔ ہر کوئی اپنے آپ کو دوسرے سے برتر ثابت کرنے کی جنگ

دو میں آخری حد تک دور نکل گیا ہے۔ وہ بھی سوچ رہی تھی، کوئی ایسا ٹھکانا۔۔۔ مگر دور دور تک کہیں بھی کوئی منزل نظر نہیں آ رہی تھی۔ سب کچھ اب

قسمت پر تھا، وہ جہاں اسے لے جائے۔

آٹھ دس دن میں وہ کافی حد تک بہتر ہو چکی تھی۔ انیس ایچ او ہار ہار چکر لگا رہا تھا۔ اس کے نزدیک ابھی وہ ایک قیمتی مہرہ تھی جسے وقت

آنے پر ملک منصور کے خلاف استعمال کیا جاسکتا تھا۔ مگر اس کا بیان ابھی تک قلمبند نہیں ہوا تھا اور سحر نے ہی کسی طرح اسے بتایا تھا کہ سہیل کو عمر قید کی

سزا ہوئی ہے۔ ملک منصور نے چوٹی کا وکیل کر رکھا تھا اور یہ سب اس کا کمال تھا۔ شفق کون کس بہت دکھ ہوا۔

”میں اس کے خلاف احتجاج کروں گی۔“ وہ غصے سے بولی۔

”شفق، بے وقوفی مت کرو۔ تم بستر پر ہو۔ اسپتال میں ہو، کیا تم نہیں جانتیں کہ تمہارے باپ نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟ بہتر

ہے کہ تم یہ بھی سوچ لو کہ وہ آئندہ تمہارے ساتھ کیا کر سکتا ہے؟ سوچ کچھ کر قدم اٹھانا لیکن پہلے یہ تو سوچو کہ جانا کہاں ہے اور اس تھانے وار سے بھی

جان چھڑاؤ۔“

”سحر کسی طرح اس شخص کا پتا کر داؤ۔ یہ میرے نانا کے بیٹے ہیں۔ انکل حیدر یہ بھی خسر تھے۔ ان کا کامیٹ نمبر کہیں سے لو۔۔۔ ہو سکتا ہے

یہ میری کچھ مدد کر سکیں۔ نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا ہے کہ صرف یہی ایک شخص ہے جو میری مدد کر سکتا ہے۔ وہ ہم سے بہت محبت کرتے تھے۔ اب تو

عرصہ جواب جان سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ معلوم نہیں اب کیا سلوک کریں مگر تم ان سے رابطہ ضرور کرنا۔" وہ بہت سوچنے کے بعد بولی۔

"کہیں یہ شہلا حیدر کے والد تو نہیں۔۔۔۔۔؟" سحر نے ذہن پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

"نک۔۔۔۔۔نک۔۔۔۔۔کون شہلا؟" وہ بڑبڑا گئی۔

"مس شہلا حیدر!۔۔۔۔۔جڑی ایکٹو، گریس فل سوشل ورکر ہے۔۔۔۔۔ہر جگہ باپ کے ساتھ وہی جاتی ہے اور ہماری کلب کی میٹنگز میں اکثر

آتی ہے۔ سوسائٹی میں اس کا بڑا نام ہے۔ تمہیں بھی ملناؤں گی۔"

"شاید۔۔۔۔۔وہی ہو۔" اس نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔ اس نام پر جیسے اس کی سوجھیں اٹھل پھٹل ہو گئی تھیں۔ بہت سی یادیں اس کے

ذہن کو جنم دینے لگی تھیں۔ وہ جس نام سے اربک تھی۔ شاید وہی اس شخص کی بیٹی کا نام تھا۔ اسے ماں اور حیدر کے تعلق کا اندازہ تو تھا کیونکہ ملک

منصور اکوٹھ میں انہیں جب ماں کے طے دیا کرتا تھا تو حیدر کی ذات کو بھی اس میں لپیٹ لیتا تھا۔ وہ یہ نام سن کر مضطرب ہو گئی۔ کوئی شے اندر ہی

اندھک کرنے لگی۔

"میں کفرم کر کے ان سے رابطہ کروں گی بلکہ نمبر لے آؤں گی، تم خود ہی بات کر لیں۔۔۔۔۔" سحر اٹھتے ہوئے بولی۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟"

"میں ذرا گھر جا رہی ہوں۔ آفاق کی بھی۔۔۔۔۔خیر چھوڑو، تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟"

"نہیں۔۔۔۔۔کچھ نہیں چاہیے۔"

"میں ایک دو کھینچے تک آ جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے۔"

شام ہو رہی تھی، جب وہ گھر پہنچی، آفاق کی گاڑی پورچ میں کھڑی تھی۔ یہ وقت آفاق کے آنے کا تو نہیں تھا وہ کیسے اس وقت آ گیا تھا۔

وہ قدرے حیرانی میں اپنے بیندوم میں داخل ہوئی۔ آفاق ابندھے منہ سو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بے حد تھکاوٹ کے آثار تھے۔ وہ خاموشی سے

باہر آگئی اور خانساہی کو شفق کے لیے سوپ بنانے کو کہا اور خود چائے کا کپ لے کر بیٹھ گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آفاق سے کس طرح بات کرے۔ اسی

لحظے شزا اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ اس کو دیکھ کر اس نے منہ پھیر لیا۔ شزا کی ناپسندیدگی کا بھی اظہار ہوتا تھا۔ وہ تو پہلے دن سے اس کو سخت ناپسند کرتی

تھی اور ہمیشہ سے دیکھ کر ایسا منہ بناتی تھی جیسے کوئی گندی سی سزا اندوہ چیز کو دیکھ کر منہ بناتا ہے۔ سحر کو ہمیشہ اس کا رویہ برا لگتا تھا مگر وہ کچھ کہتی نہیں تھی۔

وہ کچن میں گئی اور واپس آ کر اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"تم آفاق پر ذرا کنٹرول رکھو۔ آج کل وہ بہت اوور ہورہا ہے۔" شزا منہ دوسری طرف کر کے روکھے انداز میں بولی۔

وہ اس کی بات سنی اُن سنی کرتے ہوئے چائے پینے میں مصروف رہی۔

"میں تم سے کہہ رہی ہوں۔۔۔۔۔" وہ قدرے بھنجلا کر بولی۔

"اس گھر میں کیا کوئی کسی کو کنٹرول کر سکتا ہے؟" اس کے اسچلے پر شہزاد نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم پوچھو گی نہیں کہ وہ آج کل کیا کرتا پھر رہا ہے؟"

"یہ اس گھر کی روایت ہی نہیں کہ کوئی دوسرے سے کچھ پوچھے....."

"تم ہر بات کا اٹلا جواب کیوں دیتی ہو؟" شہزاد سے غصے سے گھورتے ہوئے بولی۔

"آپ بے سستی اور فضول باتیں جو کر رہی ہیں....."

"شٹ اپ..... میں بے معنی باتیں یعنی کہ کو اس کر رہی ہوں اور تم ہمارے غلط فہمی بنی ہو؟"

"کیوں ہمارے بچوں کے دماغ نہیں ہوتے یا پھر ان کے دل و دماغ بھی آپ جیسے شوخیوں میں ڈال دیے جاتے ہیں....." اس نے بھی

برابر کی چوٹ کی۔

"تم بہت بد تمیز ہو..... مان بٹھس..... بات سمجھ نہیں رہی..... اور اٹلا بکواس کیے جا رہی ہو۔" شہزاد غصے میں آپ سے باہر ہو رہی تھی۔

"میں سب جانتی ہوں آفاق کیا کر رہا ہے۔ کس کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن میں کیا کروں؟ کیا آپ اپنے شوہر کو آج تک بن کاموں سے

منع کر سکی ہیں، جو میں کروں؟ آفاق بھی وہی کرے گا جو ملک منصور کرتا آیا ہے..... نہ آپ کچھ کر سکیں اور نہ میں اسے روک سکوں گی۔ ہم دونوں ایک

سی ہیں..... نہ آپ کا حسن اور خوبصورتی انھیں کسی کام سے روک سکا اور نہ میری محبت..... اس لیے یہ منگتو ہی فضول ہے۔" وہ کہتی ہوئی اٹھ کر اپنے

کمرے میں چلی گئی اور شہزاد اپنی جگہ پر تھلائے لگی اس نے اپنے آپ کو اس کے برابر مٹوایا تھا اور دونوں اب ایک ہی جگہ کھڑی تھیں۔ اس کا حسن نکتا

اور ان تھا، ملک منصور اس سے کٹر لڑکیوں کے ساتھ گھومتا پھرتا تھا۔ ان کے لیے اس کو نظر انداز کرتا تھا۔ واقعی اس کی بات میں سچائی تھی۔ وہ غصے میں

ٹپٹپ ٹپٹ چبا رہی تھی اس کے اندر جیسے آتش فشاں کھول رہا تھا۔ وہ پاؤں پٹختی گاڑی کی چابی لے کر باہر نکل گئی۔

مخزنوں پر مسز عبید سے کس شہلا حیدر کا فون نمبر لے رہی تھی، جب آفاق کی آنکھ کھل گئی۔

"تم آہستہ بکواس نہیں کر سکتیں..... دیکھ نہیں رہیں، میں سو رہا ہوں۔" اس نے چلاتے ہوئے نگلیہ اس کی طرف پھینکا۔ اس نے نگلیہ پکڑ کر

پاس رکھ لیا اور کس شہلا حیدر کا نمبر لکھنے لگی۔ فون بند کرنے کے بعد اس نے نگلیہ زور سے اس کی طرف پھینکا۔

"یہ سونے کا وقت نہیں..... جو سونے کا وقت ہوتا ہے تم آؤ اور لڑکیوں کے ساتھ رات بھر گھومنے پھرنے میں صرف کرتے ہو۔" وہ غصے

سے چلائی۔

"تم سے مطلب..... جب تم کسی قابل نہیں رہیں تو پھر میں جو چاہے کروں....."

"کیا..... کیا..... کیا کہا تم نے..... میں کسی قابل نہیں رہی۔ یوں کہہ تم نے مجھے کسی قابل نہیں چھوڑا....." وہ آفاق کا گریبان مچھوڑتے

ہوئے بولی۔

"تمہاری یہ جرات؟" اس نے گریبان چھڑاتے ہوئے دو تین چھینڑا سے لگائے۔

”تمہارے ان تھپڑوں کا مجھ پر اب کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس لیے بھڑکے کہ زبان سے بات کرو۔“ اس نے اسے دھکا دیتے ہوئے پیڑ پر گرا دیا اور خود بھی صوفے پر بیٹھ گئی۔

”تم دفع ہو جاؤ کمرے سے۔۔۔۔۔ آفاق فحش سے بولا۔

”وہ تو میں ہوں جاؤں گی۔۔۔۔۔ مگر وہ کون ہے جس کے ساتھ تم بہت خوش تھے۔ تمہارے قہقہے اور تمہاری خوشی ابھی تک مجھے یاد ہے۔“

”تم سے مطلب۔۔۔۔۔ اوہ جو کوئی بھی ہے۔“

”مجھے نہیں۔۔۔۔۔ تمہاری ماں شزا کو ہے۔۔۔۔۔ وہ آج مجھ سے شکایت کر رہی تھی۔“

”ان کو کیا تکلیف ہے؟“

”انہی سے پوچھو۔“

”مجھے کوئی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ اور نہ ہی میں کسی کو جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ اگر مرد رخ ان کی سیکرٹری کی بہن ہے تو میں کیا کروں؟

اس میں ان کا کیا جاتا ہے۔ روکتا ہے تو ماہ رخ کو روکیں۔۔۔۔۔ انہوں نے تو اسے پاپا کی نگرانی کے لیے رکھوایا تھا۔ اب لیکٹری میں، میں چلا گیا تو ماہ رخ سمیت ان سب کو خطرہ پڑ گیا ہے۔ ٹھیک ہے، میں کل ہی ماہ رخ کو نکال دیتا ہوں۔“

”مجھے نہیں پتا۔۔۔۔۔ تم لوگوں کے گندے گمز کا۔۔۔۔۔ ہر وقت ایک دوسرے کو کٹر ثابت کرتے رہتے ہو۔“

”تم اپنے کام سے کام رکھا کرو۔۔۔۔۔ نہ کسی کی بات میں دخل دو اور نہ ہی کسی کو یوں جھگ کرنے کی ضرورت ہے۔“ وہ ٹھکی سے بولا۔

”کیا تمہیں بھی۔۔۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ مجھے بھی۔۔۔۔۔“

”آفاق، تمہیں معلوم ہے تاکہ تم میرے لیے۔۔۔۔۔“ وہ ایک دم محبت بھرے لہجے میں بولی۔

”سب بکواس ہے۔۔۔۔۔ یہاں کسی کو کسی سے کوئی محبت و محبت نہیں۔۔۔۔۔ سب باہم پاس کرنے کا ذریعہ۔۔۔۔۔ سب کا کوئی نہ کوئی مفاد ہے۔ خود

فرض ہیں سب۔۔۔۔۔ مطلب پرست۔۔۔۔۔ ہوس کے مارے ہوئے لالچی انسان۔“ وہ فحش میں بے قابو ہو رہا تھا۔

”لیکن آفاق، مجھے تو تم سے بہت محبت ہے۔“

”ہونہ۔۔۔۔۔ محبت۔۔۔۔۔ چھوڑو اس فضول بکواس کو اور جاؤ، میرے لیے چائے لے کر آؤ۔“ ایک دم اس کا موڈ بدل چکا تھا۔

”اچھا۔۔۔۔۔“ وہ اچھا چہرہ اور ہال درست کرتی ہوئی ابرا آگئی اور چائے خانا اس سے خواہ اس کے لیے لے کر آئی۔ وہ بستر پر بیٹھا سا

پڑ رہا تھا۔

”آفاق۔۔۔۔۔ ایک بات کہوں؟“

”ہاں۔۔۔۔۔“

”تم نے مجھے بہت دکھ دیے ہیں مگر..... مگر ایک بات نہ کرنا۔“ وہ پیار سے بولی۔
”کیا.....؟“

”دوسری..... شادی نہ کرنا..... بے شک تم لڑکیوں کے ساتھ محو مہر و مگر مگر میں کسی کو نہ لانا۔“
”جھپٹیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے.....؟“

”پڑتا ہے..... یہی تو فرق پڑتا ہے..... بس تم وعدہ کرو.....“

”کیوں..... کیوں، میں وعدہ کروں اور اگر تم ہی دوسری شادی کر لیتی ہو.....“

”وہاں ہاں سب..... ایسا بھی نہیں ہوگا۔“ اس نے غصے سے جواب دیا۔

”تم عورتیں بہت ناقابل اعتبار ہوتی ہو۔“

”تم مرد بھی کسی سے کم نہیں ہوتے۔“

”مرد تو ایک کو بنا کر بنا ہے تم تو خاندانوں اور نسلوں کو برباد کرتی ہو۔“

”اس ایک کے بھی بہت سے رشتے ہوتے ہیں اور ہر عورت کو پہکانے والے بھی تو تم مرد ہی ہوتے ہو۔“

”تم بہت بحث کرنے لگی ہو۔“

”سب کچھ میں نے یہاں آ کر سیکھا ہے..... چالاکیاں..... حکاریاں اور عیاریاں.....“

”اور جہاں سے تم آئی ہو وہاں تو تم بڑی پاک صاف تھیں نا! میں سب جانتا ہوں، ایک ایک کے چار چار چہرے.....“ وہ طنز پر مسکرا ہٹ

کے ساتھ بولا۔

”بکواس نہیں چلے گی آفاق! تم جانتے ہو، میں یہ سب نہیں سن سکتی۔“

”اور میں بھی نہیں سن سکتا۔“ اس نے گرم گرم چائے کا کپ اس کی طرف پھینکا۔ کپ اس کے ہاتھ سے گر کر گھٹنے سے گرا تا ہوا پاؤں پر

گرا۔ گرم چائے سے اس کا پاؤں اور گھٹنا بھی جل گیا۔

”تم بہت ظالم ہو.....“ وہ غصے میں بولی۔

”وہ تو ہم ہیں.....“ ڈریسنگ روم سے برش اٹھا کر اس نے ہالوں کو لٹیک کیا اور پر لٹیم لگاتے ہوئے باہر نکل گیا۔ اب مارکٹائی کے بعد وہ

آرام سے باہر نکل جایا کرتا تھا۔ اس سے قبل وہ ہمیشہ اس کی مرہم پٹی کیا کرتا تھا۔ اس کو مار کر خود ہی خوف زدہ ہو جایا کرتا تھا مگر اب وہ ان تمام باتوں

اور احساسات سے عاری ہو رہا تھا۔ جیسے جیسے وہ بے پروا ہوتا جا رہا تھا، اس کے اندر کی سفاکی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ بڑی سے بڑی بات کی پروا کیے

بغیر وہ آرام سے باہر نکل جاتا تھا۔

شفق اس کی بھرتی۔ رات گہری ہو رہی تھی مگر وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کے لیے سوپ اور پھل وغیرہ لے کر آئی۔
”سحر! جی رہے.....؟“

”ہاں..... بس آفاق سے جھگڑا ہو گیا تھا۔“

”تم لوگ اتنا جھگڑتے کیوں ہو؟“

”مجھے کیا معلوم..... اس کے اندر نہ جانے کون سا درد ہے۔ کیا دہرے کہ بس وہ ہر وقت عادی کو لے رکھتا ہے۔ شفق اویسے تم لوگ بہت

محبت لوگ ہو..... میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ اسے میری اس کمزوری کا علم ہے، اس لیے وہ ہر وقت..... اچھا چھوڑ دیتا..... یہ سوپ پی لو۔“

”اسے چھوڑ دیتا..... یہ بتاؤ تم نمبر لائی ہو؟“

”ہاں، یہ لوہات کرو۔“ اس نے موبائل پر نمبر ملاتے ہوئے کہا۔

”بیلو..... جی حیدر صاحب سے بات کرتی ہے۔“ اس نے لرزتے ہاتھوں سے موبائل کو پکڑتے ہوئے کہا۔

”میں شفق بولی رہی ہوں..... بہت ضروری کام ہے۔“ حقیق پو..... اس نے موبائل فون بند کر دیا۔

”کیوں..... کیا ہوا؟“ سحر نے حیرت سے پوچھا۔

”شہلا حیدر جی..... بہت طے میں بولی رہی تھی پھر کہنے لگی کہ وہ اس وقت میٹنگ میں ہیں، ایک گھنٹا ظہر کر ان کے موبائل پر کر لیں۔ ان

کا موبائل نمبر اس نے دے دیا ہے۔ لیکن سحر تم تو اس کی بہت تعریفیں کر رہی تھیں۔“

”ہاں..... شفق، معلوم نہیں وہ کیوں ایسے بولی ہے ورنہ وہ تو بہت ہنس مٹھور ہے میں خود اس سے ملی ہوں۔ ہو سکتا ہے اس وقت وہ بھی

بڑی ہو.....“

”ہاں، ہو سکتا ہے.....“ وہ آہستہ سے بولی، اسے امید تو جی نظر آئی۔ اگر حیدر اکل بھی اس کی طرح بولے تو وہ پھر کہاں جائے گی۔ ہر

طرف اعدیرا نظر آ رہا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

”سحر..... آفاق نے میرے بارے میں پوچھا؟“ شفق نے ہر امیدنگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”جہیں..... کیا اس گھر میں کوئی دوسرے کے بارے میں پوچھتا ہے؟ سب اپنی اپنی زندگیوں میں کھوئے رہتے ہیں اور شاید اپنے آپ

سے بھی محبت نہیں کرتے۔ شفق مجھے تو کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ سب بہت کھوکھلے لوگ ہیں۔ بس کبھی کبھی کھوکھلی بول کی طرح کھٹکتے ہیں پھر چپ ہو

جاتے ہیں۔ میں تو تنگ آ گئی ہوں۔ ہم سب لوگ کیسی زندگی جی رہے ہیں۔ نہ کسی کو کسی کے دکھ درد کی پروا ہے اور نہ کسی کی خوشی کی۔ اپنی اپنی زندگی

ہے جیسے چا ہو جیو اور مر جاؤ۔ مجھے تو یوں لگتا ہے اگر اس گھر میں کوئی مرا جائے تو یہاں رونے والا ابھی کوئی نہیں ہوگا۔“ وہ بے صدا فسرو کی سے بولی۔

”تم ٹھیک کہتی ہو..... گھر تو ماں باپ سے بنتے ہیں۔ جب دونوں ہی دولا دولا کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑیں تو ان پر نہ قدرت دم کرتی

ہے نہ دوسرے انسان مہربانی۔ یوں جیسے کسی درخت کے آوارہ پتے ادھر ادھر بھاگتے رہتے ہیں اور پھر کہاں گم ہو جاتے ہیں، کون جانتا ہے.....“

”شفق اسی سے بولی۔

”شفق، تم لوگوں کی ماں نے بچوں کو کیوں چھوڑا؟“

”مطمئن نہیں۔“ وہ عمر کی بات کا جواب نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس لیے چو کلنے کے ساتھ ساتھ خاموش بھی ہو گئی۔

”آفاق کسی نہ کسی طرح اپنی ماں کا ذکر کر رہی لیتا ہے۔ مجھے لگتا ہے اس سے بہت محبت تھی۔ شاید یہ سارا اور، یہ زہرا اس کے اندر انہی

کی جہ سے ہے۔“

”کیا اس نے تم سے کبھی کچھ کہا.....؟“

”اگر بچے وقائی، بچہ اتھاری عورت سے منسوب کرتا ہے اور ایسی باتیں کرتا ہوا کہیں کھوسا جاتا ہے۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں جو

بے چینی اور بے بسی ہوتی ہے، وہ میں محسوس نہیں کر سکتی۔“ وہ آؤ بھر کر بولی۔

”ہاں..... ہماری ماں بہت اچھی تھی اور ہم سے بہت محبت بھی کرتی تھی پھر نہ جانے کیا ہوا..... اس نے ہمیں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور ہم

بکھر گئے۔ جب سے ہم منتشر ہو گئے..... ہم پہلے بڑھ کر جوان ہو گئے مگر اندر سے ہم خالی ہو گئے، پھر انسان ہیں۔“

”ملک منصور جیسے شخص کو چھوڑا ہی جا سکتا ہے.....“ وہ آہستہ سے بولی۔

”جین شزا آئی بھی تو ہیں نا..... وہ بھی تو سب کچھ برداشت کر رہی ہیں؟“ ماما بھی کر سکتی تھیں۔“ اس کے لہجے میں بلا کا تاسف تھا۔

”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ یہ تو دعویٰ جانتی ہوں گی مگر ہم عورتیں کیسے بہن حوروں کے ہاتھوں ذلیل ہو رہی ہیں۔ چلو دفع کرو، اس کو اس

کو۔ ہاں تم بات کرو، اس شخص سے۔“ اس نے موہا ل پر غبر ملا کر اسے تھما دیا۔

”چلو، حیدر صاحب سے بات کرنی ہے.....“ شفق قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

”جی ہاں رہا ہوں.....“ وہ بھاری رعب دار آواز میں بولے۔

”اٹکل، میں شفق بات کر رہی ہوں۔“

”کون شفق.....؟“

”ملک منصور کی بیٹی.....؟“

”اوہ..... تم.....“ جیسے وہ بری طرح چٹک سے گئے ہو۔

”اٹکل، مجھے آپ سے بہت ضروری کام ہے۔ میں اسپتال سے بات کر رہی ہوں۔ آپ کل اسپتال آ سکتے ہیں۔“ اس نے بڑا امید لہجے

میں پوچھا۔

”ٹھیک ہے..... میں کل کسی وقت چکر لگاؤں گا۔“ وہ قدرے سوچتے ہوئے بولے۔

”جھک بھانگل!“ اس نے اسپتال کا ایڈریس وغیرہ بتا کر خوشی خوشی فون بند کر دیا۔

”کیا کب رہے تھے؟“ سحر نے بچپنی سے پوچھا۔

”وہ کل آئیں گے۔۔۔۔۔ سحر، وہ بہت اچھے انسان ہیں۔ وہ ضرور ہماری مدد کریں گے۔“

”غدا کرے۔۔۔۔۔ دروازہ ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں میں تمہیں چھپا سکوں؟“ سحر نگر بندی سے بولی۔
 شفق مطمئن تھی اور بڑی امید بھی۔

اگلے دن سہ پہر کو حیدر آیا، شفق اس وقت سو رہی تھی۔ اور سحر واک مین لگائے کچھ من رہی تھی۔ اس نے کمرے کا دروازہ ناک کیا اور شفق کے بارے میں پوچھا۔

”آپ آج نہیں۔۔۔۔۔ آپ کا انتظار کرتے کرتے دو سوئی ہے۔ آپ تشریف رکھیں۔“ اس نے حیدر کو کرسی دیتے ہوئے کہا۔ حیدر نے قدرے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا اور پھر بیڑ پر سوئی شفق کو وہ ہو، یہاں مجھی لگ رہی تھی۔

وہ کافی حد تک شہلا سے مشابہہ تھی۔ سحر نے اسے سمجھوڑ کر اٹھایا۔

”شفق اٹھو اور کچھ کون آیا ہے؟“

”کون۔۔۔۔۔؟“ اس نے حیدر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”حیدر۔۔۔۔۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”اوہ آئی ایم سوری انکل! میری آنکھ لگ گئی تھی۔“

”کیسی ہیں آپ۔۔۔۔۔؟ اور یہ سب کیا ہے؟“ حیدر نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”انکل، میں نے بہت مجبوری میں زحمت دی ہے اس وقت پوری دنیا میں صرف آپ ہی میرے لیے امید کی کرن ہیں۔۔۔۔۔ مجھے آپ

کی مدد کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔؟“

”کیسی مدد۔۔۔۔۔؟“ حیدر نے چمک کر پوچھا۔

”انکل، مجھے سر چھپانے کے لیے لھکانا چاہیے۔ میرے پاس اس وقت کوئی ایسی جگہ نہیں جس کے سائے تلے میں چند دنوں کے لیے

پناہ لے سکوں۔“

”کیوں۔۔۔۔۔ آپ کا گھر اور آپ کے والد تو۔۔۔۔۔؟“

”انکل پلیز۔۔۔۔۔ ان کے کان میں تو اس کی بجائے بھی نہیں پڑنی چاہیے۔“

”کیوں؟“ حیدر نے حیرت سے پوچھا۔ شفق نے ساری بات اسے بتادی۔ وہ خاموشی سے سن رہا تھا۔

”تمہیک ہے۔۔۔۔۔ آپ ہماری گاؤں والی حویلی میں قیام رکھتی ہیں۔ میں کل ڈرامہ بھیج دوں گا اور تمہانے میں بھی بات کر لوں گا، آپ بے فکر

رہیں۔“

"انکل، بہت شکریہ..... اس وقت میں ہانکل بے آسرا ہوں۔ آپ کا خیال آیا تو امید ہی بندھی۔ سوچتی تھی نہ جانے آپ بھی....." اس کی آنکھیں بھرا آئیں۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ اللہ مسئلے اور اس کے حل کے ساتھ اب بھی پیدا کر دیتا ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔" حیدر نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور خاموشی سے نکل گیا۔

"وہاں آ کر بس نل میں....." سحرا کا ادا سے بولی۔

"ہاں، حیدر انکل بہت ہنس رہے ہیں۔"

"ہاں، اور تمہارے گھر کے مردوں سے بہت مختلف بھی..... پہلی دفعہ کوئی بندے کا ہر لگا ہے۔" سحرا نے مخصوص پرانے اسٹائل میں بولی۔

"شفق نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور آنکھیں جھپکا لیں۔ اسے قطعی سمجھ نہ آیا کہ وہ کس بات کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

"میں تم سے ملنے وہاں آیا کروں گی..... اور تمہارے ان انکل سے بھی۔"

"کیا مطلب.....؟"

"بھئی اچھے لگے ہیں....." وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"پلیز، کسی کو کچھ مت بتانا....."

"ٹھیک ہے، نہیں بتاؤں گی، مجھ پر بھروسہ رکھو۔ البتہ تمہارے باپ کی سی آئی ڈی بہت اہم ہے۔ ان کی ڈیوڑھی میں نہیں لیتی۔" وہ

تنبہ لگا کر بولی۔

"شکریہ کوئی لکھا نا تو ملے۔" شفق نے سکھ کا سانس لیا۔

"خوش قسمت ہو کہ کوئی آسرا تو بنا۔ میری طرف دیکھو، کہیں جانا بھی چاہوں تو نہ کوئی منزل ہے، نہ راستہ۔ میرے تو راستوں کے آثار ہی

مٹ گئے ہیں۔"

"تم کل میرے کچھ کپڑے اور ضروری سامان بیک میں ڈال کر لے آنا..... اور سنو، بہت بہت شکریہ تم نے میری بہت مدد کی۔" شفق

نے اس کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگا کر کہا۔

"شکریہ، کسی کے کام تو آئی..... ورنہ..... خیر، چھوڑو..... میں تم سے ملنے آتی رہوں گی اور کل میں تمہارا سامان لے آؤں گی۔"

"ٹھیک ہے....." وہ مطمئن ہو کر لیٹ گئی۔

پوری رات آفاق بھر گھر نہیں آیا..... اسے معلوم تھا، وہ کہاں ہوگا؟ اس لیے وہ خاموشی سے لیٹ گئی۔ جو شخص خود اپنی کارستانیوں کا اقرار

کر لے تو اس سے مزید کچھ اگلا نا حماقت ہے۔ اور ایسے منہ زور گھوڑے کو روکنا مزید حماقت جب کہ دوسرے بھاگ رہا ہو۔ دوا بھی طرح جانتی تھی

کہ اس کی طبیعت میں شہر آشوب نہیں۔ چند دنوں کے بعد وہ خود لوٹ آئے گا۔ نہ سزا گھر پر تھی نہ ملک منصور۔ خانا ماں اپنے کوارٹر میں جا چکا تھا اور

چہ کیدار باہر پہرہ دے رہا تھا۔ کئی دنوں سے وہ کلب بھی نہیں جا سکی تھی۔ اس نے مسز زہرا کا نمبر ملا یا۔ مسز زہرا لگائی بجائی کرنے میں شاطر کلاڑی بھی جاتی تھی۔ برائے نام کی بات کی خبر سب سے پہلے انہیں ہوتی تھی۔ مگر یہ سیاست سے لے کر لگی سیاست تک تمام جوڑ توڑ کے علاوہ سب مہروں کی چالیں ان کی نظر میں ہوتی تھیں۔ یہاں ہزار کے ڈوبنے کا دکھ تو اپنی جگہ پر تھا۔ مگر مسز زہرا سے باڈو نا گویا سوسائٹی میں اپنے آپ کو ذلیل کرنے کے مترادف تھا۔ اس وقت اس کی فون کال کا مقصد کچھ اور تھا۔

”مسز زہرا سنا ہے، کلب ہمارے بغیر کیسا جا رہا ہے؟“ وہ اک ادا سے بولی۔

”بھئی کلب کی رو لیں تو آپ جیسے لوگوں سے ہیں۔ یار تم نے آنا کیا بند کیا ہے، ہر طرف اداسی ہی چھا گئی ہے۔ آپ جیسے روح رواں ہوں تو محفلوں کو چار چاند لگتے ہیں اور یہ چاند اسے دنوں سے کلب میں جلوہ افروز نہیں ہوا اس لیے تاریکی ہی تاریکی ہے۔“ مسز زہرا اپنے مخصوص چالیں اسٹائل میں بولیں۔

”جج، میں تو خود آپ کے کنکشن اور قبیلوں کو ترس گئی ہوں۔ بس جلد ہی حاضر ہوں گی۔ بس مصروفیت ہی ایسی تھی۔ ہاں، یہ تو بتا ہے شہلا حیدر آج کل کلب آ رہی ہے کہ نہیں..... مجھے اس سے کچھ کام تھا۔“

”نہیں، کافی دنوں سے نہیں آ رہی..... شاید کچھ مشرب ہے؟“

”ڈنر مشرب..... کس لیے..... اور کیہ کرے؟“ وہ اپنی جگہ پر اچھل پڑی۔

”کیوں..... تم کیوں چنکیں؟“

”بھئی، ایسی اسٹراٹجی پر سٹائی کے بارے میں سن کر..... ویسے آپ کو کیا خبر ملی؟“

”جیسا بات تو معلوم نہیں ہو سکی مگر لگتا ہے آج کل اس کی باپ سے کچھ ٹھنی ہے ورنہ پہلے تو ہر جگہ اکٹھے جاتے تھے۔ جاتے تو خیر اب بھی ہیں مگر کچھ ٹاؤ سا ہے۔“

”باپ کے ساتھ..... شوہر کے ساتھ ہوتا تو کوئی بات بھی تھی۔“ وہ قہر لگا کر بولی۔

”بھئی اس کی باپ کے ساتھ زبردست الٹچ منٹ ہے۔“

”کیوں، اس کے باپ میں کیا خاص بات ہے؟“ وہ اپنے اصل موضوع کی طرف آ رہی تھی۔

”اس کے باپ میں ہی تو بات ہے.....“ مسز زہرا نے زبردست بے ہودہ سا قہقہہ لگایا اور اس قہقہے کے انداز میں ہی ساری بات سمجھی ہوئی تھی۔

”خیر عت تو ہے مسز زہرا..... مجھے تو آپ بڑی امپریشن لگ رہی ہیں؟“

”ہائے ہائے، ہم تو بس ان کے حاشیوں میں سے ہی رہ گئے ہیں۔ کوشش تو بہت کی مگر وہ کسی کو گھاس نہیں ڈالتے..... تم نے ان کو دیکھا ہے جانو، کیا ڈشنگ پر سٹائی ہے..... اور اوپر سے مٹروں بھی۔ کلب کی بہت خواتین لے ٹرائی ماری ہے مگر سب ناکام ہی ہوئیں۔ مس شہلا حیدر ہی

بات پر تو اُکڑتی ہے۔ ویسے ابھی تک باپ سے ناراضگی کی سمجھ نہیں آ رہی۔ خیر ہم بھی آرام سے کہاں بیٹھنے والے ہیں۔ بس اندر کی خبر پہنچی سمجھو۔۔۔۔۔
بڑے لوگ چھوڑے ہوئے ہیں ان کے پیچھے یقین مانو، سیاست دانوں کی صف میں کمزادہ منفرد شخص ہر ایک کو بس ترہا ہوا ہے۔۔۔۔۔“ مسز حیدر کی جیسے دال کھ رہی تھی۔

”بس بس مسز حیدر ازبیر صاحب نے سن لیا تو آپ کی شامت آ جائے گی۔“
”ارے، وہ اس قابل تو ہوں پہلے۔۔۔۔۔“ مسز حیدر نے ہمارے قہر لگایا۔
”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“

”اے اب اتنا بھی مت بڑو۔۔۔۔۔ بے وقوف۔۔۔۔۔ اور چند قسم کے شوہر بس بیوی بچوں کو پال لیں، ایسی بڑا کام ہے۔ رو مانس تو کہیں اور چلتا ہے۔ یہ جس حیدر سے کہیں لڑاؤں کی بھڑکنا۔۔۔۔۔ اب میں چلتی ہوں۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔ میرا بیٹا بلا رہا ہے۔۔۔۔۔ لو کے بائے، کلب میں ملیں گے۔“
اس نے بھی مسکراتے ہوئے فون رکھ دیا اس کا دل نہ جانے کیوں حیدر سے ملنے کو چاہ رہا تھا۔ اس اپنی اس اہمیت پر بھی آ رہی تھی مگر وہ اس سے اتنی متاثر ہوئی تھی کہ سوچ خود بخود اس کی طرف چلی جاتی۔ اس کا ضمیر اٹھ رہا تھا، باتوں میں سنجیدگی اور شائستگی۔۔۔۔۔ نظروں میں حیا اور شرافت۔ وہ کسی اعلیٰ خاندان سے معلوم ہوتا تھا۔

رات کے چھلے پہر آفاق گھر لوٹا، وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ آتے ہی جوئے اتارے بغیر بستر پر لیٹ گیا۔ وہ بھی آنکھیں بند کیے لیٹی رہی۔
اس کے تصور میں کبھی حیدر تھا، کبھی ملک منصور اور کبھی آفاق۔ وہ ان تینوں کا موازنہ کر رہی تھی۔ یہ دونوں اسے بہت حقیر اور سلی مرد محسوس ہو رہے تھے۔ ملک منصور سے وہ شدید نفرت کرتی تھی اور آفاق سے شدید محبت مگر شاید حیدر کی وہ عزت کرنے لگی تھی۔ خود بخود اس کے لیے دل سے اچھے اور محترم جذبات نکل رہے تھے۔ واقعی، وہ شخص اس قابل ہے کہ اس کی بہت تعریف اور دل سے عزت کی جائے۔ میں ضرور اس سے کبھی ملوں گی۔ شوق خوش قسمت ہے کہ وہ ایسے شخص کے زیر سایہ رہنے جا رہی ہے۔

صبح وہ شوق کا سامان بیک کر کے کمرے میں لوٹی تو آفاق ادھ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
”کہاں جا رہی ہو؟“

”کیوں۔۔۔۔۔ تم ہوش میں آ گئے؟“

”اچھا کچھ نہیں کر دیکھ مج۔۔۔۔۔ شوق کہاں ہے، بہت دنوں سے نظر نہیں آئی؟“

”واہ۔۔۔۔۔ کیا کہنے، بہن کی یاد آئی گئی۔ تھ ہے تم جیسے بھائی پر اور تمہارے باپ پر بھی۔ تمہاری بہن اتنے دنوں سے گھر نہیں آئی اور تم ایسے پوچھ رہے ہو جیسے تمہاری بیٹی کئی دنوں سے نظر نہیں آ رہی۔ حد ہے تم لوگوں کی بے حسی کی۔۔۔۔۔“ وہ بے حد زبان دراز اور منہ پھٹ ہو گئی تھی۔

”افو۔۔۔۔۔ کیا کچھ اس شروع کر دی تم نے۔۔۔۔۔ جاؤ دفع ہو جاؤ کمرے سے۔“ اس نے سائنڈ ٹیبل پر رکھا پلاسٹک کا گلدان اس کی طرف پھینکا۔ جسے اس نے فوراً کچھ کر لیا اور جواہر سے اس کی طرف پھینکا جو اس کے بازو پر لگا۔ وہ کراہا تھا۔ اس سے نکل کر وہ بستر سے اٹھ کر اس کو تھپتھپ

رسید کرتا وہ باہر جا چکی تھی۔ ”جابل۔۔۔۔۔ بھکاری۔۔۔۔۔“ وہ بڑا تار ہوا۔

شفق اور وہ دونوں سامان پیک کے خطر تھیں شام کو حیدر کا ڈرائیور اسے لے آ گیا۔ ”حیدر صاحب نے مجھے بھیجا ہے۔۔۔۔۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔“ ڈرائیور فطری جھکائے بہت احرام سے بولا۔

”ہاں، میں بھی انتظار کر رہی تھی۔۔۔۔۔ چلو۔۔۔۔۔“ وہ دو پٹا گلے میں ڈالتے ہوئے بولی۔

”بلی، اس طرح۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ گاؤں میں بغیر چادر کے باہرے کے نہیں جاسکتیں۔ شہلا بلی بھی گاؤں جانے کے لیے چادر اوڑھتی ہیں۔ یہ اس علاقے کی روایت ہے۔“ شفق اور عمر جبرانی سے اس کی باتیں سن رہی تھیں۔

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ سہریک میں سے مجھے کوئی بڑا اوڈھ پٹا کال کر دو۔“

سمر نے ایک کاشن کے سوٹ کے ساتھ بڑا سا بلیک کلر کا اوڈھ پٹا کال کر دیا جسے اس نے اچھی طرح اوڑھا اور سمر سے مل کر چل دی۔

”یہ میرا سوا بیل تم رکھو۔“ سمر نے اس کے چمک میں اپنا سوا بیل رکھ دیا۔

”جھینک پور سمر۔۔۔۔۔ میں تم سے رابطہ رکھوں گی۔“

”میں تمہیں خود فون کیا کروں گی۔۔۔۔۔ اپنا خیال رکھنا۔“ وہ اس کے گلے ملے ہوئے بولی۔



آر مس پروست

آر مس پروست، ام ہے عمران میرے کے سنے مائل کا جسے آپ کے لیے مقبرہ عظیم جیسے کہ نہ شفق مصنف نے خوب کیا ہے۔ اس بار ہر ادھک مصر کی ٹیکرے سروں کے سر ہوانے پاکیجا ٹیکرے سروں سے درخشا مت کی کہ وہ اُن کے ملک سے چوری ہو جانے والے قیمتی تاریخی اور اہم کمالیاب نمائے کے لیے اُن کی مدد کرے لیکن ایکس فو نے ٹیکرے سروں کے لیے یہ کیسی لینے سے انکار کر دیا۔ کیوں؟ مصر کے عوام باہر سے چوری ہونے والی قدیم تختیاں جن کے حصول کے لیے عمران اور انجیر کما چکے تھے بڑے جگمگاتی پڑی۔ وہ تختیاں ایسا کون سا مال ہے؟ اندر چھپائے ہوئے تھیں کہ مجرم ایجنٹ اُن کے لیے عمران کے خون کے پیاسے ہو گئے؟ آر مس پروست، ایک شیطان صفت پروست جس کے مقبرے کی کھوج لگانے کے لیے لوگ صدیوں سے سرگرم تھے لیکن وہ مقبرہ دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رہا۔ اور جب عمران کو آر مس پروست کے مقبرے کو تلاش کرنے کا مسک ملا تو کیسے کیسے حالات پیش آئے عمران اور انجیر کما چکے کی کاروں پر راکت کا ڈنڈہ اُڑا دیا۔ عمران اور انجیر کس طرح اس راکت جھنے سے بچ پائے؟ آخر کیوں جو زف کو اپنی کلائی کاٹ کر اپنا خون عمران کے صحن میں پھینکا پڑا؟ کیا عمران اور انجیر کوئی زندگی مل سکی؟ کیا عمران آر مس پروست کا مقبرہ تلاش کر سکا۔ یہ سب جاننے کے لئے پڑھنا چاہیے۔ ”آر مس پروست“

”آر مس پروست“ کتاب گہرے دستاویز ہے جسے جاسوسی مائل کشیش میں پڑھا جاسکتا ہے۔

مسز پیٹر (شہلا) بے حد پریشان تھی۔ جب سے حیدر نے اسے موبائل بھیجا تھا۔ ایک کال کے بعد اس نے اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ بار بار اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتی مگر جواب نہ ملتا یا تو فون بند ملتا یا پھر بڑی۔ وہ عجیب محسوس کرتی تھی۔ حیدر نے اس دن بہت مایوسی میں اس سے بات کی تھی۔ وہ بیٹی کے بارے میں بھی پریشان تھا۔ دوسری جانب دلیم بھی لاہور آ کر بہت ڈسٹرب تھا۔ وہ بہت خاموش خاموش رہنے لگا تھا۔ لاہور آنے کے بعد وہ اکثر اس سے ملنے آتا یا وہ ہٹل جاتی مگر دلیم پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ اس کا مخصوص لمب و لمبا، ہر بات میں بحث و مباحثہ، لمبی لمبی تمہیدیں..... ہر بات پر ایک نیا جوک، وہ قہقہے، وہ ہنسی، وہ شرارتیں سب نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ سنجیدہ اور پیچور ہو گیا تھا۔ شہلا کو یوں لگتا جیسے وہ ہر بات قابل طرے سے کر رہا ہو۔ اس سے محبت اور شدت پسندی نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کر رہی تھی۔ دلیم شام کو اس سے ملنے آیا تھا۔ دونوں کافی دیر بیٹھے رہے۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ وہ اس کی اسٹڈیز کا پوچھتی رہی اور وہ اس کے کالج کا۔ پھر ایگزجر ہر باتیں ہوتی رہیں۔ مختلف موضوعات زیر بحث رہے مگر کوئی بھی ایسی بات نہ ہوئی جو دل کو ٹوٹتی جذبات کو چھوٹی اور احساسات کو تنہو کرتی۔ ان کا رشتہ سرسری کی نہ رہا اور آہستہ آہستہ اپنی گرفت کھو رہا تھا۔ دونوں اس بات کو محسوس کر رہے تھے اور دونوں ہی اس بات کو خوش آمدید بھی نہیں سمجھ رہے تھے۔ دلیم جا چکا تھا اور وہ بیٹھی سوچ رہی تھی۔

اس نے موبائل پر حیدر کا نمبر لایا۔ وہ آج حیدر سے دلیم کے بارے میں بات کرنا چاہ رہی تھی۔ اسے سب کچھ بتانا چاہ رہی تھی۔ اس سے درخواست کرنا چاہ رہی تھی کہ وہ اسے روکے، اسے مزید بھگنے سے بچائے۔ وہ جسے صراطِ مستقیم سمجھ رہا ہے، وہ تو کچھ اور ہے..... اور اگر کچھ ہو گیا تو اس کی ذمہ دار وہ خود ہوگی۔

شہلا حیدر نے فون اٹھایا تھا۔

”مجھے حیدر صاحب سے بات کرنی ہے۔“

”آپ کون بول رہی ہیں؟“ وہ اس کی گھبرائی ہوئی آواز سن کر مٹھک ہو گئی۔

”میں..... میں.....“ وہ خاموش ہو گئی۔

”میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں..... میں آپ سے کہاں مل سکتی ہوں؟“

”جہاں آپ کہیں؟“ وہ آہستہ سے بولی۔

”نہیں، میں آپ سے خود آ کر ملنا چاہتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے کل ہاسٹل آ جائیے۔“

”کیا..... آپ ورکنگ دین ہاسٹل میں ہیں.....؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”جی..... جی ہاں.....“

”آپ کا نام.....؟“ اس کے لہجے میں بلا کا تجسس تھا۔

”سز پڑ.....!“

”آپ وہی..... اس اسٹ میں.....“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”جی ہاں۔“

”مائی گاڈ..... اہو کے..... ٹھیک ہے، میں کل شام کو آپ کی طرف آؤں گی۔“ اس نے ایک دم اپنا لہجہ تبدیل کرتے ہوئے کہا۔

اسے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اس سے کیوں ملنا چاہتی ہے مگر اس کے لہجے میں تجسس اور رکھنا پن کسی اچھی بات کی طرف اشارہ نہیں کر رہا تھا۔ وہ بہت مضطرب رہی مگر دوبارہ فون نہ کیا کیونکہ شاید حیدر کا موبائل اس کے پاس تھا۔ وہ کالج سے جلد واپس آ چکی تھی اور اس وقت سے ہی اس کی آمد کی منتظر تھی۔ شام کو ایک دم ہاسٹل میں افراتفری سی پھیل گئی۔ وارڈن اور نوکرانیوں کی دوڑیں ادھر سے ادھر لگ رہی تھیں۔ اس کے کانوں میں بھی بھٹک پڑی تھی، وہ جانتی تھی کہ اس کے پیچھے کیا بات تھی۔ چانک مس حیدر اس کے کمرے میں آ گئیں۔

”آپ لوگ سب جائیں جھان سے تنہائی میں کچھ بات کرنی ہے۔“ مس حیدر نے وارڈن اور دوسری دور کر تو کہا۔

”آپ کوئی شخص اور غیرہ..... میرا مطلب ہے ادھر ہی بھجوا دوں۔“ مس افغان نے کہا۔

”نہیں، کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بس آپ لوگ جائیے.....“ اس کا لہجہ حکمانہ تھا اور مزاج اکھڑا ہوا۔

”آپ بیٹھیں پلیز.....“

”میں، آپ کے صرف چند منٹ لوں گی مگر یہ روزانہ اچھی طرح بند کر دیں تاکہ ہماری گفتگو کو کوئی تیسرا بندہ نہ سن سکے۔“ وہ بولٹا نماز میں بولی۔

”جی فرمائیے۔“ اس نے وردازہ بند کرنے کے بعد کہا۔

”میں آپ کے اور پاپا کے بارے میں سب کچھ جان چکی ہوں۔ میں آپ سے صرف یہی کہنا چاہوں گی کہ اگر آپ کی خواہشات پوری نہیں ہو سکیں تو اس کا بدلہ آپ کس کس سے لیں گی..... کتنے لوگوں کے سکون اور ان کی زندگیاں ڈھیر کر دیں گی۔“ وہ غصے سے بولی۔

”کیا مطلب.....؟“ وہ چمکی اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے ڈھیروں پانی اس کے اوپر گرا دیا ہو۔

”آپ نے میری ماں کو بے سکون زندگی دی اور اب مجھے..... میرے پاس بہت محبت کرنے والا آئیڈیل باپ تھا اور میرا آئیڈیل آپ نے مجھ سے چھین لیا ہے۔ میرے خیال کو کرچی کرچی کر رہا ہے۔ میری سوجھیں منتشر ہو گئی ہیں۔ جس باپ کے بغیر میں سانس بھی نہیں لیتی تھی، اب اس کی موجودگی میں مجھے گھبراہٹ محسوس ہوتی ہے کیونکہ آپ انہیں ان کی حیثیت سے گرا رہی ہیں۔“ وہ انتہائی کاٹ دار لہجے میں بولی۔

”میں..... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں..... آپ..... اگر آپ کو خوشیاں نہیں ملیں تو دوسروں کو کیوں تباہ کرنے پر تلتی ہیں۔ آپ نے تو مجھ سے میرا سارا کچھ جینے کی کوشش کی ہے۔ آپ کیا سمجھتی ہیں، میں خاموشی سے یہ ”محبت ڈرانا“ دیکھتی رہوں گی۔ میں اتنی کمزور نہیں۔ میں آپ کو وارننگ دے رہی ہوں کہ اتنا بندہ نہ تو پاپا کو فون کریں اور نہ ہی ان سے ملنے کی کوشش کریں..... ورنہ..... اس کا انجام.....؟ وردازہ کھول کر باہر نکل گئی اور وہ ہمیشہ کی طرح حیرت سے

ساکت کڑی رہ گئی۔ اسے کوئی توجہ پیش نہ کر سکی۔ اس کی غلط باتوں کو رد نہ کر سکی۔ وہ اس سے بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر ایک کی بھی تردید نہ کر سکی۔ وہ جہاں کڑی تھی۔ وہیں ہنسنے لگی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے شدت سے رواں ہوئے۔ مس حیدر کیسے اس کی تذلیل کر کے لگی تھی۔ چند منٹوں میں اسے اتنا بے عزت کیا تھا کہ اپنا آپ اسے نہ ہر گھٹنے لگا۔

کب تک۔۔۔ یا خدا کب تک یہ تذلیل میرا مقدر ہے گی۔۔۔ اب تو بچے بھی اٹھ کر مجھے ذلیل کرنا شروع ہو گئے ہیں۔ شاید کچھ لوگ دنیا میں صرف اس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ دوسرے انہیں قدم قدم پر ٹھوکریں لگائیں، انہیں ذلیل کریں، انہیں رسوا اور بے عزت کریں۔۔۔ اور وہ خاموشی سے سب کچھ سہتے رہیں۔ وہ تو اپنے دفاع میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔ بس ہمیشہ کی طرح سختی رہی، سوچتی رہی اور روتی رہی۔ کاش زندگی میں کوئی ایک لمحہ تو ایسا آئے جب وہ اپنا موقف کھل کر بیان کر سکے۔ کسی کے دعوے کو جھٹلا سکے۔ دوسروں کی مجبوری باتوں اور الزامات کو رد کر سکے مگر قدرت کبھی بھی اسے ایسا موقع نہیں دیتی۔ ساری رات وہ روتی رہی اس کی آنکھیں رو رو کر سوچ مچی تھیں۔

اس نے اگلے دن کالج سے چھٹی بھی کر لی تھی۔ مس افضل اور دوسرے لوگ بھی پریشان تھے کہ مس حیدر اسے کیا کہہ کر گئی تھیں کہ اس کے بعد تو وہ کمرے سے باہر نہیں نکلتی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے آنسو بہا اٹھا ڈھوٹی مالا کے سوتیلوں کی طرح گرتے رہے۔ بچنے کے اندر سے ہوک سی اٹھتی، آہیں اور سسکیاں ہر سانس کا لازم و ملزوم حصہ بن گئیں۔ آنکھیں لمحوں میں غم ہو جاتیں۔ وہ بہت بھلانے کی کوشش کرتی مگر مس حیدر کے الفاظ گویا اس کے دماغ کے خلیوں کے ساتھ چپک گئے تھے۔ منٹے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ مس افضل خود اس کے کمرے میں آئیں۔ وہ بھی اس کی حالت دیکھ کر افسردہ ہو گئیں۔

”مسز پنیر، یہ آپ نے کیا حالت بنا رکھی ہے۔ آپ جیسی خاتون، یوں کسی بات پر حوصلہ کھو دے گی، میں تو سوچ بھی نہیں سکتی۔ میں نہیں جانتی مس حیدر نے آپ سے کیا کہا ہے اور نہ میں یہ جاننے میں کوشاں ہوں لیکن آپ کو یہ حالت ہم سے دیکھی نہیں جاتی۔ پلیز، اپنے آپ کو نارمل سمجھئے، ہاسٹل میں بہت چڑھ چکی ہیں اور ہی ہیں۔ سب لوگ یہ جاننے کے لیے تجسس ہو رہے ہیں کہ آخر مس حیدر آپ سے کیا کہہ کر گئی ہیں اور آپ کیوں پریشان ہیں۔ آپ کی ظلمتیں ساتھی ہونے کے ناطے آپ کو مشورہ دیتی ہوں کہ پلیز، اپنے آپ کو سنبھالیے۔ حالات کبھی ایک سے نہیں رہتے۔ چند دنوں بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ مس افضل نے اسے بہت دلاسا دینے کی کوشش کی۔

”جی نہیں مس افضل۔۔۔ میرے حالات کبھی نہیں بدلیں گے۔۔۔ میں نے بڑے بولڈ اسٹیلس لے کر بھی دیکھے مگر۔۔۔ میں کیا کروں، بعض لوگوں کے ہر اٹھنے قدم اٹھنے ہی کیوں پڑتے ہیں۔ کتنے نصیب والے لوگ ہوتے ہیں جن پر پروردگار اتنا مہربان ہوتا ہے کہ ان کے اٹنے کاموں کو بھی وہ اپنے کرم سے سدا کار کرتا ہے۔ میں تو مختصر ہی رہی۔ ساری زندگی اسی تک۔ وہ وہیں گزر گئی شاید میری زندگی میں بھی کوئی ایسا لمحہ آئے جب میری بھی سنی جائے مگر کچھ لوگ صرف ترنا ہی کر سکتے ہیں۔ اپنی ناقص آرزوؤں کے ساتھ ہی دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ میں اب دعا کرتی ہوں کہ خدا مجھے جلد اٹھالے۔ میرے ارد گرد کہیں بھی امید کی کرن نہیں۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہے۔ سائے بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں اور میں خزاں رسیدہ بچے کی طرح اب ہنر ہزار ہی ہوں۔ جب انسان خود ہی اپنی نظر میں گر جائے تو پھر اسے لوگوں کی کیا پروا۔ ہاسٹل کے لوگ جو مرضی کہیں، حالات میرے بس ہیں تو نہیں۔ رسوائیاں اگر میرا مقدر ہیں تو میں انہیں روک تو نہیں سکتی۔“

”خدا کے لیے یوں مایوسی کی باتیں مت کریں۔ آپ کیوں اس قدر ہدل ہو رہی ہیں۔ اگر آپ کہیں تو میں خود کس حیدر سے بات کروں کہ وہ آپ سے کیوں ناراض ہیں۔“

”خدا کے لیے یہ غضب نہ کیجئے۔۔۔۔۔ جو بات بھی ہوئی ہے، میرے اور ان کے درمیان ہوئی ہے، اسے غم سمجھیں۔۔۔۔۔ اس بات کو ڈھرائے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں، میں اب حیدر کچھ برداشت نہیں کر سکتی۔“

”پھر آپ یوں مایوس ہونا بھی چھوڑ دیں اور۔۔۔۔۔ اور دلہ بھی تو ہے، اس کی خوشیاں بھی تو آپ کو دیکھنی ہیں۔“

”نہیں مس افضال۔۔۔۔۔ پہلے مجھے اس کی امید تھی، اب وہ بھی نہیں رہی۔“

”کیوں۔۔۔۔۔؟ خدا نہ کرے، آپ کسی باتیں کر رہی ہیں؟“

”میں نے کہا تھا بعض لوگ صرف دکھنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ پھر یا تو جا رہو کر بستر کے ساتھ لگ جاتے ہیں یا پھر مر جاتے ہیں۔ میں بھی ایسے لوگوں میں سے ایک ہوں۔ میں تو خدا سے کہتی ہوں کہ میں نہ تو سرکش تھی نہ باغی۔۔۔۔۔ میں نے تو کبھی تجھ سے شکوہ بھی نہ کیا پھر کیوں تو نے مجھے اس قدر آزمایا ہے کہ میں اب تک مگی ہوں۔“

”مسز پٹیل۔۔۔۔۔ آپ یہ کیوں بھول رہی ہیں کہ اللہ اپنے پیاروں کو ہی آزماتا ہے۔“

جس کو دنیا میں انسانوں سے پیار نہ مل سکا، اس کو خدا پیار کرے گا۔ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں مس افضال۔۔۔۔۔ یہ محض ڈھکوسلے ہیں۔ خوش فہمیاں ہیں، اپنے آپ کو جموٹی تسلیاں ہیں اور کچھ نہیں۔۔۔۔۔ اس کے لہجے میں بلا کی شگفتگی تھی۔

”اس وقت میں آپ نے کوئی بحث نہیں کروں گی۔۔۔۔۔ اس وقت آپ بہت مایوسی کا شکار ہیں۔ ان دنوں آپ میرے روم میں کیوں شغف نہیں ہو جاتیں۔۔۔۔۔ کم از کم ہم دونوں باتیں تو کر سکیں گے۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ میں ادھر ہی ٹھیک ہوں۔ جب خجائی اور رسوائی مقدر ہو چکی ہو تو پھر فرار کیا۔۔۔۔۔؟“

”آپ دل مت چھوڑیں، پلیز۔۔۔۔۔ خدا سے اچھی امید رکھیں۔“

”مس افضال! آپ بھی تو کب سے بڑا امید ہیں۔۔۔۔۔ کیا ہوا؟“

مس افضال کی آنکھوں میں ایک دم آنسو نمودار ہوئے اور پھر ان کے لیے روکنا محال ہو گیا۔ وہ خاموشی سے چلی گئیں۔ اس نے بھی آنکھوں کو جھپکایا سے رگڑا اور ہاتھوں کی لکیروں میں کہیں گم ہو گئی۔



کالج میں اینزل ڈے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ہر طرف لڑکے لڑکیوں کی ٹولیاں پیٹھی پروگرامز ترتیب دے رہی تھیں۔ دبیر کا آغا ہو چکا تھا اور سرور ہواؤں کی شدت میں بھی اضافہ قابل برداشت ہو رہا تھا۔ لان میں، کیفے ٹیریا میں، غرض ہر جگہ اسٹوڈنٹس معروف نظر آ رہے تھے۔ کلاسز نہ لینے کا اچھا بہانہ بھی انہیں ملا ہوا تھا۔ ڈسکشنر، قیقمے اور ایکٹنگ۔ سب کچھ عروج پر تھا مگر وہ اپنے کمرے میں بیس کے سامنے بیٹھا رہتا۔ اسے قاری کی

میل موصول ہوئی تھی کہ فارن ڈیپلی میٹیشنس ورکشاپس کے لیے آرہے ہیں اور اس کی شرکت ان میں بہت ضروری ہے۔ فارن نے اس کا نام بھی لکھوا دیا تھا۔ اینول ڈے کے بعد اس کے ایگزاحر بھی تھے مگر فارن کو اس کی اصطلاح کی نسبت اس کی مذہبی سرگرمیوں میں زیادہ دلچسپی تھی۔ اگر کوئی کلاس ہوتی تو وہ اینول کرتا اور وہاں آ جاتا۔ ان کی کلاس کمرس کے حوالے سے ایک اسٹ تیار کر رہی تھی۔ اس میں ایک پادری کے رول کے لیے سب نے ولیم کا نام تجویز کیا مگر ولیم کو اس بات پر آمادہ کون کرے، وہ تو کسی سے قاصد بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اسے تو بس اپنی سرگرمیاں اور اصطلاح مزین تھی۔ سب لوگ بھی پروگرام بتا رہے تھے کہ کون اس کو آمادہ کرے، اسی لمحے فرسٹ ایئر کی آئے نور آتی ہوئی دکھائی دی۔ جب سے آئے نور نے کالج میں داخلہ لیا تھا، ہر کوئی اس کی ذہانت اور خوبصورتی کا زبردست مداح ہو گیا تھا۔ اس کا سنس آل بیور بھی سب بہت انجوائے کرتے۔ لڑکوں کو چلانا اور بدلتیزوں کو بھاننا اس کو خوب آتا تھا۔

”کیوں نہ آئے نور کی خدمات لی جائیں.....“ رملہ نے کہا۔

”مگر وہ ہماری کلاس فیلو نہیں.....“ اولیس بولا۔

”تو کیا ہوا.....؟ ولیم کو کون سی خبر ہوتی ہے کہ کون کلاس میں آیا ہے اور کون نہیں..... اپنے مطلب کے لیے سب جائز ہے.....“ انٹھین نے رائے دی۔

”چلو..... کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے؟“ ڈاکر نے بھی اپنی رائے دینا ضروری سمجھی۔

”انٹھین جاؤ ذرا اس کو بلا کر لاؤ۔“ رملہ نے اسے کہا۔

”ٹھیک ہے..... تم لوگ بھی تو آؤ؟“ اس نے اولیس اور ڈاکر کو کہا۔

آئے نور اگلے ہی لمحے ان کے درمیان بیٹھی ان کی باتیں سن رہی تھی اور قہقہے لگا رہی تھی۔ ”یار! کیوں مجھ سے کوئی گناہ کروانے پر تھے ہو..... اگر وہ اپنی عبادت میں بڑی ہے تو ہمیں کیا تکلیف ہے؟“

”مگر وہ اس کالج کا اسٹوڈنٹ بھی تو ہے؟..... اس پر یہ فرض ہے کہ وہ ہماری یعنی کراچی کلاس فیلو کی مدد بھی کرے، کیا اس کی کوئی ڈے داری نہیں.....؟“ رملہ نے منہ بٹ کر کہا۔

”ہاں، یہ تو ہے..... چلو تم مجھے اس کے کمرے تک پہنچا دو..... میں کوشش کرتی ہوں..... باقی تمہاری قسمت۔ نتائج کی ڈے دار میں نہیں ہوں گی۔“ وہ جھپٹے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے؟“ انٹھین نے کہا۔ سب لوگ اسے اس کا کمرہ دکھا کر باہر کونے میں اس کا انتظار کرنے لگے۔

”ایکسکیووزی!..... بے آئی کم ان.....“ ولیم کے دروازہ کھولنے پر اس نے فوراً کہا۔

”نہیں..... بٹ آئی.....“

”اوکے..... اوکے آئی ایم یور نو کلاس فیلو..... آئے نور۔ آپ نے مجھے بھجانا نہیں، بہت بری بات ہے۔“ وہ جلدی جلدی بولی۔

”عمر آپ یہاں کیسے.....؟“ ولیم اس غیر طراری لڑکی کی اچانک آمد پر حیران ہوا تھا۔

”آپ کا کمر اجبت ہو گا رہا ہے۔ آئی میں۔۔۔ کوئی بیرو، بیرون نظر نہیں آ رہی۔۔۔ بروں لی، جیمز ہاٹل اور جیمسن کے بغیر تو کسی لڑکے کا

کرا ہوتا ہوں، اللہ ہے آپ.....؟“

”آپ مطلب کی بات سمجھتے اور آپ کو کسی بھی بات پر تنقید کا کوئی حق نہیں۔“

”اود۔۔۔ آئی ایم سوری۔۔۔“ وہ جھل سی ہو کر بولی۔

”آپ کیا ایسا پسند کریں گی..... کافی یا..... بھر؟“ وہ اسے شرمندہ دیکھ کر بولا۔

”نو، بھٹک..... اکیچہ ٹیلی..... کالج میں اینزل ڈے ہو رہا ہے۔ ایک رول ہے جو آپ کو ہی سوٹ کرے گا۔ ہم سب کی خواہش ہے کہ وہ

”رول آپ کریں۔۔۔“

”سوری..... میں بہت بڑی ہوں اور ان کاموں میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔“

”بائی دادوے..... آپ کو کن کاموں میں دلچسپی ہے.....؟“

”کاؤ کے.....“ وہ اس کی طرف بخود دیکھتے ہوئے تجھیر گئی ہے ہوا۔

”گند..... ویری گند..... لیکن گاؤں تو بہت سوشل ہے“ وہ ابرو اچکاتے ہوئے بولی۔

”وہاٹ ڈویژن.....؟“

”اٹس کیئر..... وہ صرف عبادت میں تمہاری اور خاموشی چاہتا ہے۔ عملی طور پر وہ بہت سوشل ہے۔ اس لیے تو اس نے کئی بار آ کی لینڈ اور

سوسائٹو مانی ہیں مگر سوسائٹی میں رہنے کے طریقے اور اصول بھی تو اسی نے بنائے ہیں۔ وہ لوگوں کا لوگوں سے ملنا پسند کرتا ہے اسی لیے تو کہتا ہے کہ

جب ایک دوسرے سے ملو تو محبت سے لہو ایک دوسرے کو تھپے دو..... ایک دوسرے سے اچھی اچھی باتیں کرو۔ ایک دوسرے کی مدد کرو۔“

"آپ.....؟" اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

”ہاں، ہیں..... کہیے، آپ رک کیوں گئے۔ کیا خدا ایسا نہیں کہتا؟“

”مگر ہمارے دلچسپ“

”کہا ہے آپ کے ریلجن میں..... کہ دنیا سے علیحدہ ہو جاؤ..... ٹھیک ہے، آپ کے لئے موبل کوڈز ہیں..... مگر ہمارے کوڈز میں تو یہی

ہے کیا آپ اس کالج کے اسٹوڈنٹ ہیں اور آپ کو طاری ہمدردی ہے۔“

”سوری..... میں بہت مصروف ہوں۔“

”دی ڈونٹ کیئر..... آپ کو ہر صورت میں روولی کرنا ہے۔“

”میں نے کہا...“ وہ بھٹکا کر بولا۔

"اور میں نے بھی کہا نا۔۔۔۔۔ کہ میں اس کمرے سے جب جاؤں گی جب آپ رول کرنے کی ہائی بھریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ آپ بیٹھیے، میں جا رہا ہوں۔" اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

"ایک منٹ۔۔۔۔۔ ایک منٹ سنا ہے آپ لوگ بہت مہمان نواز ہوتے ہیں یہ کسی مہمان نوازی ہے۔۔۔۔۔ مہمان نامہ ہے اور میں جا رہا ہے۔"

"جب مہمان اور دور دور ہو۔۔۔۔۔" وہ درشتی سے بولا۔

"تو اسے برداشت کرنا چاہیے۔۔۔۔۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

"افوہ۔۔۔۔۔ آپ کیوں مجھے ڈسٹرب کر رہی ہیں۔۔۔۔۔؟"

"اس لیے کہ ہم آپ کی وجہ سے ڈسٹرب ہیں۔"

"میں نے ایسا کیا کیا ہے؟"

"یہی تو مسئلہ ہے کہ آپ کچھ کر نہیں رہے۔"

"بھئی، میں اس مسئلہ نہیں۔۔۔۔۔"

"چین ہم کیا کریں۔۔۔۔۔ ہم تو آپ ہی میں اس مسئلہ ہیں۔" وہ اک ادا سے آنکھیں ملکا کر شرارت سے بولی تو اس نے نظریں جھکا لیں۔

اس کی سفید رنگت سرخ پڑنے لگی۔ اس کے کانوں کی لونیں سرخ ہونے لگیں۔

"آپ پلیز۔۔۔۔۔؟"

"آپ بھی پلیز۔۔۔۔۔"

"اوکے۔۔۔۔۔ میں سوچوں گا۔" وہ اس سے جان چھڑانا چاہ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے کل تک سوچ لیجئے گا ورنہ میں کل پھر آؤں گی۔۔۔۔۔"

"آپ۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے میں خود آ جاؤں گا۔"

"وہیں گڈ۔۔۔۔۔" وہ مسکراتی ہوئی باہر نکلی تو اس نے شکر ادا کیا۔

"لگتا ہے۔۔۔۔۔ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی ہو۔"

"جی ہاں۔۔۔۔۔ اس نے سوچنے کی ہائی تو بھری ہے۔ دیے سمجھو کہ کام ہو گیا ہے۔ قسم سے مجھے تو اس غریب پر ترس آ رہا تھا۔ ایسا کیوٹ سا لڑکا ہے اور تم لوگ اس کو تنگ کرنے پر تلے ہو۔ کیوں تعصبات رہے ہولے۔۔۔۔۔" آئے نوروز را غلگی سے بولی۔

"یار اتم بھی کمال کرتی ہو، ہماری عزت کا مسئلہ ہے۔ ہمارا اسکاٹ اس کے بغیر ادھر رہا ہے اور ہم نے اس کو شریف سا رول ہی دیتا ہے۔

دیے آپ ان کی بہت طرف داری کر رہی ہیں، خیر تو ہے نا۔۔۔۔۔؟" رملہ نے ہنسنے سے کہا۔

"ہاں، میں نے اس کو بہت تنگ کیا۔۔۔۔۔ وہ پریشان ہو گیا تھا۔ اب میں چلتی ہوں۔ کل ملوں گی۔" وہ کتابیں اٹھا کر چلی گئی اور سب لوگ

پھر پانچ کرنے لگے۔

وہ اس اچانک افتاد پر ایک دم گھبرا گیا تھا۔ اس نے تو اپنی زندگی صرف کرے تک محدود کر رکھی تھی ورنہ اس سے گل وہ مری میں ہر فنکشن میں بہت دلچسپی سے شرکت کرتا تھا کوئی بھی فنکشن اس کے بغیر ادھورا سمجھا جاتا مگر جب سے قادر نے اس کو گاڑ سے انٹروڈیوس کر دیا تھا، وہ بہت سویر ہو گیا تھا۔ وہ گناہ اور ثواب کی ڈوری سے بندھ گیا تھا ہر قدم ڈرڈر کر اٹھاتا۔ اب نور کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ ”گاڈ اڈوسٹل۔“

”ہاڈا لٹ پاسٹل۔۔۔۔۔۔“ وہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے قادر سے کانٹیکٹ کیا۔ وہ آن لائن تھے۔ اس نے ان سے یہ سوال پوچھا۔

”قادر اٹلی۔۔۔۔۔۔ گاڈ اڈوسٹل؟“ اس نے لکھا۔

”وہاٹ نان پیس۔۔۔۔۔۔ گاڈ، اس طرح کی باتیں پسند نہیں کرتا۔“ قادر نے اسے جھڑکا۔

”قادر۔۔۔۔۔۔ آپ مجھے بتائیں۔۔۔۔۔۔ کیا یہ سچ ہے؟“ وہ بھی مصر تھا۔

”گاڈ انسان نہیں۔۔۔۔۔۔ جو وہ سوشل ہو۔“

”تو پھر وہ کیا ہے۔۔۔۔۔۔ کیا وہ واقعی سوشل نہیں۔۔۔۔۔۔؟“

”تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔۔۔۔۔۔ آج تم کس سے ملے ہو؟“

”قادر! آپ مجھے میرے سوال کا جواب دیں۔۔۔۔۔۔ اگر خدا سوشل نہیں تو پھر وہ کیوں ایک دوسرے کو ملنے کو کہتا ہے۔ ایک دوسرے کی مدد

اور ایک دوسرے سے محبت کرنے کو کہتا ہے؟ اگر وہ ان سوشل ہو تو وہ علیحدہ رہنے کا کہے گا، کیا قادر یہ سچ نہیں۔۔۔۔۔۔“

”نہیں۔۔۔۔۔۔ سوشل۔۔۔۔۔۔ سنو، تم مجھے کل ہی ملو۔“ غصے میں قادر آف لائن ہو گئے۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ یہ کیا تضاد پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ بہت سے تضادات موجود ہیں۔ وہ لڑکی تو بہت نان سیریس ہی لگی تھی

اور اس کی نان سیریس بات میں کسی سچائی تھی کہ قادر بھی بلا غرضیت مان گئے تھے۔ اس کا ہنسنا، مسکراتا چہرہ ہار ہار اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہا

تھا۔ اس کا ہاتھ کرنے کا کاغذ ڈنٹ اور ہلکا سا نکل، اس کی ٹیسی۔۔۔۔۔۔ اور اس کا ترکی بہ ترکی جواب دینا اور اس کی آنکھوں میں شرارت۔ وہ سو نہیں پا

رہا تھا۔ اس نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کی بات پر سوچے گا مگر وہ تو۔۔۔۔۔۔ بات کے بجائے اس کے ہارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ ایک لمحے کے

لیپے بھی ذہن سے نہیں ہٹ رہی تھی۔۔۔۔۔۔ وہ آنکھیں بند کرنا تو وہ کھٹ سے اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتی اور وہ آنکھیں کھول دیتا۔

گاڈ۔۔۔۔۔۔ مائی ڈیئر کرائسٹ۔۔۔۔۔۔ سیدی۔۔۔۔۔۔“ وہ مزید کوئی دعا نہ کر پاتا۔۔۔۔۔۔ اس کا مسکراتا سرخ و سفید۔۔۔۔۔۔ گول سا چہرہ۔۔۔۔۔۔ بڑی بڑی سیاہ

شرارت سے بھرپور مسکراتی آنکھیں۔۔۔۔۔۔ گہرے سیاہ ابرو۔۔۔۔۔۔ وہ کوئی ایپل اسپرٹ تو نہیں بلکہ جنت کی حرر مطہوم ہوتی تھی۔ اچانک وہ کہاں سے آہنگی

تھی اس نے تو اسے کلاس میں نہیں دیکھا تھا مگر وہ خود بھی تو کلاس فیلو کے ہارے میں بہت کم جانتا تھا۔

”نور۔۔۔۔۔۔ شنوار وہو لیم ابھی تک نہیں پہنچا۔۔۔۔۔۔“ رملہ نے اسے دیکھ کر کہا۔

”یار ابھی تو ہی بچے ہیں۔۔۔۔۔ پر نہیں لوگ اتنی صبح کہاں اٹھتے ہیں انہیں تو اٹھانا پڑتا ہے اور پر نہیں ہے مادہ ادھر ہی جا رہی ہے۔۔۔۔۔ اس نے دھڑو تو کیا تھا۔۔۔۔۔ کیا خیال ہے نہیں انتظار کر لیتا جاوے۔۔۔۔۔“

”نہیں نہیں۔۔۔۔۔ تم جاؤ اسے بلا کر لاؤ۔۔۔۔۔ اور اگر دو آ گیا تو میری طرف سے ٹریٹ کی۔۔۔۔۔“ انہیں نے اسے لالچ دیا۔

”یہ تباہ ٹریٹ کہاں دوگی۔۔۔۔۔؟“

”انہائی ہار ہے نا۔۔۔۔۔“ انہیں ہنس کر بولی۔

”نہیں جناب۔۔۔۔۔ میکڈونلڈ کی بات کرو۔۔۔۔۔ کے ایف سی کی بات کرو۔۔۔۔۔ یا پھر۔۔۔۔۔“

”بس بس۔۔۔۔۔ بس ہم اسٹوڈنٹ ہیں ہمیں رعایت دی جائے۔۔۔۔۔“

”یہ رعایت صرف حکومت دیتی ہے۔ اسٹوڈنٹس، اسٹوڈنٹس کوئٹس دیتے اور سنو پر بس بھی ہمارے ساتھ چلے گا۔۔۔۔۔“ تو رات بھیس بھسا کر بولی۔

”واقعی۔۔۔۔۔“ سب نے حیرت سے کہا۔

سب لوگ خطر پر مگر وہ نہ آیا۔ بہت انتظار کے بعد نور کو اس کے کمرے میں بھیجا گیا مگر اسے سخت مایوسی ہوئی جب اس کا کمرہ لاکڈ دیکھا۔ اس نے اور گرد اسٹوڈنٹس سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ تو صبح سویرے ہی کہیں چلا گیا تھا۔ نور کو سخت غصہ کا سامنا تھا اسے پکا یقین تھا کہ وہ اگلے دن ضرور ان کے درمیان ہوگا مگر وہ تو بغیر بتائے ہی کہیں چلا گیا تھا۔۔۔۔۔ اس کا مطلب ہے اس نے اس کی اسٹڈی کی تھی۔ اس کی بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ آج تک کسی نے بھی اس کی بات کو نہیں جھٹلایا تھا اور۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ سب لوگ آئے نور کا مذاق اڑا رہے تھے مگر ظاہری طور پر شرمندہ ہونا گویا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

”یار ہو سکتا ہے وہ بیمار پڑ گیا ہو۔۔۔۔۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ آخرو وہ بھی تو انسان ہے۔ اس کو گھر سے بھی کال آ سکتی ہے۔ ہزار مسائل ہوتے ہیں۔ تم لوگ تو بس یونیورسٹی دل چھوڑ دیتے ہو۔۔۔۔۔ کل وہ آ جائے گا۔ ٹرک کیوں کرتے ہو۔“ اس نے سب کو تسلی دی۔

”تو اس نے تمہیں بتایا ہے۔۔۔۔۔ اور ویسے بھی اس نے آنے کا وعدہ تو نہیں کیا تھا۔ اس نے سوچنے کا وعدہ کیا تھا۔ ہو سکتا ہے اس کا ذہن ضائع ہو۔“ رملہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

”بھئی دھکی آ جائے گا۔۔۔۔۔ کہا نا۔۔۔۔۔“ وہ کھلے عام اسے ساتھ بولی۔

”ٹھیک ہے کل تک انتظار کر لیتے ہیں۔ مگر کل تک نہ آ یا تو ہم اپنا اسٹڈی چھینچ کر لیں گے۔۔۔۔۔“ انہیں نے مشورہ دیا۔

”ویسے تم لوگوں کو کس نے مشورہ دیا تھا کہ ایسا اسٹڈی بھر بیرونی سے ہی رکھو۔۔۔۔۔ تم لوگ بھی حد کرتے ہو۔۔۔۔۔“ نور ذرا منہ بنا کر بولی۔

”یار تمہیں کیا معلوم ہائی لوگ ایسے ذہن دست اسٹڈی کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ اور ہماری کلاس میں کوئی اس قابل تو ہے ہی نہیں کہ کچھ بھی

ڈھنگ کا کر سکے۔ شوخیاں مستیاں ان سے کروالو۔ کوئی کڑی کام ان سے نہیں ہو سکتا۔ یہ تو بیرونی انکھل نے اسٹڈی لکھ دیا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا یہ رولی کوئی کر سکے گا۔ میں نے جلدی سے ولیم کا نام لے دیا۔ انہوں نے اسٹڈی تو لکھ دیا مگر ولیم اب مان نہیں رہا۔ اتنی جلدی نیا اسٹڈی لکھوانا

بھی تو مشکل کام ہے۔" رملہ نے پوری تھکھیلیات متائیں۔

"اچھا کل تک انتظار کرلو۔۔۔۔۔ میں اس سے بات کروں گی۔۔۔۔۔ آئی ہو پھر کل وہ آ جائے گا۔" نور نے پھر انہیں امید دلائی۔ مگر سب لوگ بددلی کا شکار ہو چکے تھے۔

ولیم تذبذب کا شکار ہو چکا تھا۔ اس نے قادر سے دے دے بے الفاظ میں رد کرنے کی اجازت مانگی تو وہ غصے میں آ گئے۔

"ولیم تم اپنے فرائض بھول رہے ہو۔۔۔۔۔ مجھے قطعی امید نہیں تھی کہ تم اس قدر اچھے ہو۔ میں تمہیں اپنے ارادوں میں مضبوط دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے جب تمہیں کہا ہے کہ تم نے ورکشاپ میں شرکت کرنی ہے تو اس کے علاوہ اور کوئی سوچ تمہارے ذہن میں نہیں ہونی چاہیے۔"

"..... مگر قادر وہ میرے کلاس فیلو ہیں اور....."

"ولیم..... کلاس میں بہت سے لڑکے لڑکیاں ہوتے ہیں یہ رد ان میں سے کوئی بھی کر لے گا مگر تمہاری جگہ ورکشاپ میں شرکت کوئی اور نہیں کر سکتا۔ غمراہی نہ....." قادر ڈرامائی سے بولے۔

اسے قادر کا رویہ بالکل اچھا نہیں لگا۔ قادر نے آہستہ آہستہ اس کی سوشل لائف ختم کر دی تھی۔ ہر وقت مذہبی سوچوں نے اس کے ذہن کو جس راہ پر گامزن کرنا شروع کیا تھا وہ وہاں پہنچنے پہنچنے تک سما گیا تھا..... اتنے سوالات ذہن میں اٹھتے..... اتنی نئی سوچیں ابھرتیں کہ وہ کبھی کبھی خود ہی جھنجھلا جاتا۔ آہستہ آہستہ سب اس کے لیے ایک ایسی آزمائشی میزمری بننا جا رہا تھا جس کے ہر نہ چنے پر قدم رکھتے ہوئے وہ کئی بار کچھ سوچتے پر مجبور ہو جاتا۔ وہ پکا ارادہ کر کے آیا تھا کہ اس نے کوئی رد نہیں کرنا اور ان لوگوں کو صاف نہ کہنی ہے۔ شام ہو رہی تھی جب وہ لوہ..... قادر نے خصوصی طور پر اس کے لیے کالج انتظامیہ سے کچھ خاص مراعات لے رکھی تھیں۔ وہ جب چاہے آئے جائے..... اسے کسی قسم کی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا اور ویسے بھی وہ اچھے ڈیزائن اور بے ضرر طلباء میں شمار ہوتا تھا۔ اساتذہ بھی اس سے بہت خوش تھے۔ وہ ہر ایک کی گڈ بک میں تھا۔ آئے نور کو دیکھ کر وہ ایک دم چٹکا..... وہ بائبل کے باہر بے چینی سے چکر لگا رہی تھی۔ اس وقت وہاں اس کی موجودگی اسے قطعی غیر متوقع لگی۔ وہ اسے نظر انداز کرتا ہوا اندر داخل ہونے لگا..... تو وہ اس کے پیچھے آ گئی۔

"کیا آپ جانتے ہیں کہ میں کب سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں؟"

"آپ کو کس نے انتظار کرنے کو کہا ہے..... آپ نے کیوں تکلیف کی.....؟"

"جس شخص کو اس کا وعدہ یا واعدہ ہے اسے یاد دلانے کے لیے کبھی کبھی انتظار بھی کرنا پڑتا ہے۔"

"میں نے آپ سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا..... کیا میں نے ایسا کچھ کہا تھا.....؟"

"آپ نے کہنے کا نہیں غائب سوچنے کے بارے میں کہا تھا اور سوچنے کے بعد ہمیشہ کچھ کہا جاتا ہے۔ آپ نے تو کچھ بھی کہنا مناسب نہیں

سمجھا اور صبح سے غائب ہیں..... مجھے آپ سے یہ توقع نہیں تھی۔"

"دیکھیں مس....."

”آئے نور.....“

”جی.....جی..... میں بہت معزوف ہوں۔ میں ابھی بھی قادر کے پاس سے آ رہا ہوں مجھے بہت ضروری درکشالیں میں شرکت کرنی ہے میں ان فضول کاموں میں شرکت نہیں کر سکتا۔ آپ میرے پراہم کو کیوں نہیں سمجھتیں.....“ دو اکٹا کر بولا۔

”کیا آپ میرے پراہم کو سمجھتے ہیں.....؟“

”میں سمجھنا بھی نہیں چاہتا۔ مجھے آپ سے کوئی مطلب نہیں..... میری اپنی حدود ہیں اور آپ کی اپنی..... آئی ایم سوری.....“ اس نے جان چھڑانے کے لیے قدم آگے بڑھائے۔

”آپ کیا سمجھتے ہیں اتنے بہت سے لوگوں کو ہرٹ کر کے آپ گاڈ خوش کر لیں گے۔ گاڈ آپ سے کبھی بھی خوش نہیں ہوگا..... جو لوگ اپنے جیسے لوگوں سے وعدے پورے نہیں کر سکتے وہ خدا سے کیا وعدہ پورا کریں گے۔“ وہ قدرے خشکی سے بولی۔

”آپ میرے پیچھے کیوں پڑی ہیں جبکہ..... میں.....“ بایوسی کے سامنے اس کے چہرے پر لہرانے لگے وہ جھجھکاؤ ڈالتے ہوئے بے بسی سے بولا۔

نور ایک لمحے کو خشکی اس نے اس کے چہرے پر یا سیت اور آنکھوں میں بے بسی کی لہر دیکھی تھی۔

”میں آپ کے کمرے میں کچھ دیر کے لیے آنا چاہتی ہوں۔ آپ سے بیٹھ کر بات کرنا چاہتی ہوں.....“ اس نے اپنا لہجہ نرم کرتے ہوئے کہا۔ وہ خاموشی سے ہٹا کچھ کہے اس کے آگے چلنے لگا..... وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور اسے اندر جانے کے لیے راستہ دیا۔ وہ کمرے میں رکھی ایک لکڑی کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے نیکل سے گلاس اٹھا یا سنرل واٹر سے اسے بھرا اور اس کے آگے کر دیا۔

”تھینک یو.....“ اس نے خاموشی سے گلاس لے لیا۔ دونوں کافی دیر خاموش رہے۔

”یہ رول کوئی اور بھی تو کر سکتا ہے..... سب لوگ میرے لیے حق کیوں کو شمس ہیں۔“ بلڈا خراس نے خود ہی سکوت توڑا۔

”آپ مجھے بہت بے ضرر شخص اور سچے انسان لگتے ہیں۔ میں حقیقت بتائے دیتی ہوں۔ میں آپ کی کلاس فیلو نہیں ہوں مگر کالج فیلو ضرور ہوں۔ آپ کی کلاس نے مجھے خصوصی طور پر آپ کے پاس بھیجا ہے اور یہ رول آپ کے لیے ہی لکھوایا گیا ہے۔ کلاس میں کوئی بھی اس رول کو ٹھیک طرح سے پرفارم نہیں کر پائے گا۔ میں نے اسٹوڈنٹس پڑھا کر اس کی ڈیمانڈ ہی آپ ہیں۔ میری ان کے ساتھ شرط بھی لگی ہے کہ آپ یہ رول ضرور کریں گے..... اگر آپ نے یہ رول نہ کیا تو میری بہت انسلٹ ہوگی..... اور پھر ہو سکتا ہے..... میں دوبارہ کالج نہ آؤں.....“ وہ جذباتی لہجے میں بولی۔

”رینلی..... بھارت سوہٹی.....“

”جی۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”اور..... آئی سی.....“ وہ قدرے مسکرایا۔ ”ٹھیک ہے کل میں آ جاؤں گا.....“ وہ کچھ سوچے ہوئے بولا۔

”تھینک یو..... آئی ایم رینلی کرےٹ فل ٹویو.....“ اس کی آواز میں خوشی کی کھٹک تھی۔

”اُس مائی پلیز۔۔۔“ وہ بھی مسکرا کر بولا۔

انہی صبح وہ ہاسٹل سے باہر نکل رہا تھا۔ جب وہ اس کی طرف مسکراتی ہوئی آئی۔ ”آپ کے کلاس فیلوز آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔۔۔“

”کہاں ہیں سب۔۔۔؟“

”سب لوگ لائبریری میں بیٹھے ہیں۔“

”ٹھیک ہے تو ادھر ہی چلتے ہیں۔۔۔“ وہ پرسکون لہجے میں اعتماد سے بولا۔ جیسے ہی سب نے دونوں کو آتے دیکھا تو حیرت سے ایک

دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر نوکرہ سٹائنٹس لگا ہوں سے داد دی۔

”لو بھئی۔۔۔ میرا وعدہ تو پورا ہو گیا۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔۔۔“ نور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”ہم سب لوگ بھی ہال میں ہی چلتے ہیں۔۔۔ یہاں پر قیامت بھی نہیں ہو سکتی۔“ رملہ ٹٹتے ہوئے بولی اور اس کے ساتھ سب لوگ ہی اٹھ گئے۔

”تم بھی ہماری رہبر سل دیکھنے آنا۔۔۔“ افسین نے کہا۔

”سوچوں گی۔۔۔“ وہ ڈراما سٹائل سے منہ بنا کر بولی تو ایک دم اس کی نظر ولیم کی طرف اٹھی۔ وہ ہر شوق لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھ کر

مسکرا دیا وہ چونک سی گئی اور جلدی سے افسین کی طرف دیکھنے لگی۔

”تھیں اپنی ٹریٹ یاد ہے نا۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ٹی بارش۔۔۔“

”نہیں۔۔۔ کہیں اور۔۔۔“

”ٹھیک ہے اینول ڈے کے بعد۔۔۔ اور تھیں بھی۔۔۔“

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ مجھے بھی یاد ہے۔۔۔“ وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔

ولیم اپنا رول پڑھنے لگا۔ اس کا رول ایک سلیجے ہوئے، حساس پرنس کا تھا جو محبت میں ناکام ہو کر پادری بن جاتا ہے اور لڑکی غربت کے

باتوں تک آکر نرن بن جاتی ہے۔۔۔ دونوں اپنی زندگی کا مشن نولے ہوئے دلوں کو جھڑنا چاہتے ہیں۔ اسٹ میں زیادہ زور، جذبات، کیفیات اور

ڈائیکلو پر تھا۔

”ٹھیک ہے مجھے سمجھا گئی ہے مگر نرن کا رول کون کرے گا؟“ ولیم نے اسکرپٹ پڑھتے ہوئے کہا۔

”خود یہ ہماری کلاس فیلو ہے۔۔۔ وہ نرن کا رول کرے گی۔۔۔ وہ ابھی آنے والی ہے۔“ رملہ نے اسے بتایا۔

”نور کیوں نہیں۔۔۔“ ولیم کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”بھئی وہ ہماری کلاس فیلو نہیں۔۔۔“ افسین نے جلدی سے جواب دیا۔

”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔ دیکھو ابھی اس کے لیے کلاس فیلو بننا کون سا مشکل کام ہے۔۔۔“ ولیم مسکرا کر بولا۔

”ہاں..... مگر.....؟“ رملہ بھی سوچ میں پڑ گئی۔

”میرے خیال میں یہ رول ان سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا کیونکہ اس میں زورہ کیفیات اور جذبات پر ہے اور میں نے یہ مشاہدہ کیا ہے وہ اس میں کافی تجزیہ ہیں.....“ وہ قدرے سنجیدگی سے بولا۔

”ٹھیک ہے اسے بھی دیکھ لیں گے مگر پہلے حد یہ کہ.....“ رملہ نے جواب دیا۔ تھوڑی دیر بعد حد یہ آئی خوبصورت سی نازک سی دہلی پتلی سفید یو نیفارم میں۔ چاسر کی پرائز لیس کی طرح حسین و نازک نازنین..... دو ذن کے رول کے لیے ہر لحاظ سے فٹ لگتی تھی۔ اس کا ایکسٹری بہت اچھا تھا۔ مگر ڈائلاگ ڈلیوری اچھی نہیں تھی۔ جذبات الفاظ کے ساتھ کچھ نہیں کر رہے تھے وہ ڈائلاگز یوں بول رہی تھی جیسے لے رہے تھے..... اور اس بات کو سب لوگ بہت محسوس کر رہے تھے۔ ولیم اور رملہ نے اس کے ساتھ بہت کوشش کی۔ ہر ڈائلاگ دونوں نے ادا کر کے بتایا مگر اس کی پک شارپ نہیں تھی۔

”میرا خیال ہے فور کو دیکھتے ہیں۔“ رملہ خود ہی بولی اور اسے بہت منت سماجت کر کے آمادہ کیا۔ واقعی اس کی ڈائلاگ ڈلیوری بہت اچھی تھی۔ ریہرسل شروع ہو چکی تھی اور سب لوگ بہت ڈوب کر کرفار ادا کر رہے تھے۔ رملہ اور ڈاکر..... افسین اور ادیس..... دو کھلو کے کردار ادا کر رہے تھے اس کے علاوہ کچھ چھوٹے موٹے کردار تھے جو کلاس کے دوسرے لوگ کر رہے تھے۔

ریہرسل کرنے ہوئے سب لوگ بہت انجمائے کرتے۔ معمولی معمولی باتوں پر تہنوں کا دور چل پڑتا..... تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد آرام کرنے بیٹھ جاتے..... پھر کینے ٹیڑھا چل دیتے۔ بہت دنوں کے بعد ولیم اپنے آپ کو فریش محسوس کر رہا تھا۔ اس کا رول پرنس سے پادری کا تھا۔ سب لوگ اسے پرنس کہہ کر بلاتے..... اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بہت دنوں بعد وہ کھلی فضا میں..... سانس لے رہا ہو..... اسے دنوں نیٹ کے آگے بیٹھ بیٹھ کر ادور بائبل کے مختلف دور پڑھ پڑھ کر اس کا ذہن تھک سا گیا تھا۔

”فور..... میں یہ رول صرف تمہارے لیے کر رہا ہوں.....“ کینے ٹیڑھا میں ہواپ اڑاتی چائے کا سپ لیتے ہوئے اس نے اسے آہستہ سے کہا۔

”کیوں.....؟“ اس نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”تمہاری پرنس کے لیے..... اور گاڈ کو خوش کرنے کے لیے..... ورنش میں فادر کے ساتھ کھڑا تھا اور وہ مجھ سے ناراض بھی ہیں۔ وہ کل سے نیٹ پر مجھ سے بات بھی نہیں کر رہے..... لیکن میں انہیں مانوں گا۔ درکشاپس تو اگلے مہینے ہیں۔ معلوم نہیں فادر مجھے کیوں یہ رول نہیں کرنے دے رہے تھے..... لیکن جب میں نے تمہاری آنکھوں میں مایوسی دیکھی تو مجھے دکھ سا ہوا اور مجھے لگا کہ واقعی گاڈ مجھ سے ناراض ہو جائے گا..... اگر..... اگر تم ناراض ہو گئیں تو.....“ وہ مسکرا کر بولا۔

”تم اپنے فیصلوں میں بہت جلد ہاز لگتے ہو.....؟“

”ہاں..... شاید..... میں ایسا ہی ہوں..... اور اکثر میں اچانک کوئی اہم فیصلہ کرتا ہوں تو اس میں کامیاب بھی ہوتا ہوں.....“

”جیسا کہ رول کرنے کا.....؟“

”ہاں..... ممکن ہے..... اس میں بھی.....“

”پرنس تم میں اتنی انٹنس کیوں ہے..... تم حقیقت میں بھی تو پادری نہیں بننا چاہتے.....؟“ نور کے سوال نے اسے چونکا دیا۔

”ہاں..... تم نے ٹھیک اندازہ لگا لیا ہے..... قادیانی چاہتے ہیں.....“

”اور تم.....؟“ نور حیرت سے اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

”شاید..... میں بھی.....“

”اس میں ”شاید“ کیوں ہے..... اس میں تمہارا اپنا ارادہ اور عزیمت نظر نہیں۔“

”پلیز اس ہر بات مت کرو.....“ وہ جھنجھلا کر بولا۔

”جو مسئلے ڈسٹرب کریں ان کو پہلے ڈسکس کرنا چاہیے.....“

”اور جو زیادہ ڈسٹرب کریں ان کو حالات پر چھوڑ دینا چاہیے.....“

”ٹھیک ہے..... میں اس ہر آئندہ بات نہیں کروں گی..... مگر میں اتنا جان گئی ہوں کہ یہ تمہارے دل کی آواز نہیں..... اور جب دل کچھ

کہے اور دماغ کچھ تو پھر زبردست تضاد جنم لیتا ہے..... تم حشر بوجاؤ گے اور کھر جاؤ گے..... اس لیے سوچ کچھ کر فیصلہ کرنا.....“ آئے نور نے اسے ہمدردی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہو.....“ وہ آہستہ سے بولا۔

وہ کالج سے ہاسٹل واپس آیا تھا کہ قادری آگئے..... انہیں یوں اچانک دیکھ کر دو دو گدگد گیا..... وہ کچھ غما غما سے لگ رہے تھے۔

”قاہر آپ.....؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ولیم تم نے میرے سمجھانے کے باوجود اسٹٹ میں حصہ لیا..... تمہیں ورکشاپ کے لیے ہوم ورک کرنا ہے۔ اور تم ان فضول، لٹوکا مولوں

میں مصروف ہو گئے ہو اس آل رنٹل.....“ وہ سخت غصے میں بولے۔

”قاہر ورکشاپ اگلے مہینے ہے اور یہ تو صرف کچھ دنوں کی بات ہے۔ میں دونوں کام آسانی سے کر سکتا ہوں۔ اسی لیے میں نے یہ رول

کرنا قبول کیا ہے.....؟“

”مائی سن..... تم پادری بن رہے ہو۔“ وہ سخت لہجے میں بولے۔

”آئی ایم سوری قادری.....“

”اوکے..... مگر آئندہ خیال رکھنا۔“

”رائٹ قادری.....“ وہ آہستہ سے بولا۔

قادر ہا کچھ کہے چلے گئے۔ قادر کا رویہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ جب قادر پہلے تلے تھے تو بہت محبت اور شفقت سے چٹیں آتے تھے اس کے کندھے چھپتے تھے۔ اسے گلے لگاتے تھے اور اب قادر جب سے اس سے ناراض ہوئے تھے سیدھی طرح بات بھی نہیں کرتے تھے۔ ان کے لہجے میں بھی تلخی ہوتی تھی اور آنکھوں میں غصہ۔ لنگھوں میں ترشی تھی اور حرکات و سکنات میں بھی وہ دھمکی سی محسوس کرتا وہ قادر سے یہ توقع نہیں کر رہا تھا۔ اس کا دل ٹوٹنے لگا تھا۔ وہ ضرورت سے زیادہ حساس واقع ہوا تھا۔ وہ لہجوں سے اندرونی احساسات و جذبات محسوس کرنے کا عادی تھا۔ ماما اور اس کے درمیان بہت کم شدید غصے کا اظہار ہوتا۔ وہ ہمیشہ ماما سے بہت سوئٹ ٹون میں بات کرتا۔ وہ سوچ میں اپنی عمر سے زیادہ پختہ اور پیچور تھا۔ وہ تو صاحب کے احساسات کو سمجھ کر بات کرنے کا عادی تھا۔ صرف قادر کی وجہ سے اس میں اور ماما میں سرو جنگ جھڑپیں تھیں۔ مگر شدید تلخی کا تھلہ کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ قادر کی طرف بھی ان کی محبت اور شفقت کی وجہ سے کھینچتا چلا گیا تھا۔

قادر کی پرستاشی کا یہ رخ اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ یہی سوال اس کے ذہن میں بار بار ابھرتا کہ قادر اسے کیوں اتنا محدود رکھنا چاہتے ہیں کیوں اسے ہر کام سے روکنا چاہتے ہیں۔ وہ پائلٹ بننے کا خواب لے کر جوان ہوا تھا اور اس نے اپنے ذہن سے بہت مشکل سے اپنا یہ آئیڈیل کھرچا تھا۔ وہ جب تک مری میں رہا اس کے پاس ہر شکل اور سائز کے جہاز اور ان کے پھرنے ہوتے تھے کبھی وہ فائٹر پائلٹ بننے کے خواب دیکھتا تو کبھی کمرشل۔۔۔۔۔۔ کبھی اپنے آپ کو آرمی پائلٹ میں دیکھتا تو کبھی پی آئی اے۔۔۔۔۔۔ اتنے سارے خواب۔۔۔۔۔۔ جو بچپن سے لے کر اب تک اس کے ساتھ لگے ہوئے تھے اور ان سارے خوابوں کے ساتھ اس کے جذبات بھی اسی طرح پران چڑھے تھے وہ سب قادر کے کہنے پر اسے اپنے دماغ کے ایک ایک غلیے سے خود کو چھیننے پڑے تھے اور یہ کس قدر مشکل تھا یہ صرف وہی جانتا تھا۔ اس نے اپنے دل و دماغ کو بہت منایا تھا۔ بار بار سمجھایا تھا۔ اپنی زندگی سے خواہشات کے دائرے اور خوشیوں کو محدود کر دیا تھا مگر قادر اس کے احساسات کو سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ اسٹ میں رول کرنے سے کسی کا بھی کوئی نقصان نہیں تھا۔ اس نے ہر زاویے سے اس بات پر سوچا تھا مگر قادر کی ناراضی سمجھ سے باہر تھی۔

جیسے جیسے دن قریب آرہے تھے۔ تیاریاں شروع کر گئیں۔ پورے کالج کو ڈیکوریٹ کیا جا رہا تھا۔ بہت سی کلاسز کے طلبائے مختلف اسٹیکس اور پروگرامز ترتیب دیے تھے۔ کچھ حراہیہ کچھ پیچیدہ۔۔۔۔۔۔ ساتھ ہی ان کی بھرپور نمائی کر رہے تھے۔ طبیعات بنائے جا رہے تھے۔ اک ہنگامہ سائبر پا تھا۔ پروگرام کی کامیابی کی ٹیلیشن بھی تھی اور تفریح کا زبردست موقع بھی تھا۔ اس اسٹ کی وجہ سے سب لوگ ایک دوسرے کے ساتھ قریب آ گئے تھے کہ ایک دوسرے کے احساسات کو بھی سمجھنا شروع ہو گئے تھے۔ دلیم کو کہ سمجھدار اور موقع شناس تھا مگر چانک فیصلے کرنے کا عادی تھا۔ شاید یہ عادت اس نے اپنی ماما سے دہرائی تھی۔ نور ہر بات کو بہت سوچ سوچ کر فیصلہ کرنے کی عادت تھی لیکن کسی حد تک وہ غندی بھی واقع ہوئی تھی۔ رملہ تھوڑی سی خود پسند تھی اور افسانہ نویس تو سیدھی سادی ہر بات ماننے والی لڑکی تھی۔ اولیس اور ڈاکٹر میں بہت دوستی تھی۔ ڈاکٹر کی اپنی کوئی رائے نہ تھی جو اولیس کہتا وہی ڈاکٹر پر کرنا لازم ہوتا۔ اولیس کی ہر بات میں ہاں میں ہاں ملاؤ ڈاکٹر پر فرض تھا۔ سب لوگ ڈاکٹر کو چھیڑتے تو وہ مسکرا کر اولیس کی طرف دیکھتا۔۔۔۔۔۔ اس کا اولیس کی طرف مسکرا کر دیکھنے کا اسٹائل سب لوگ بہت انجھائے کرتے۔

فلکشن والے دن سب لوگوں نے اپنے اپنے گھر سے کسی نہ کسی کو انوائٹ کیا تھا ویسے بھی ایڈولڈے تھا۔ پڑتیس کا آنا تو لازمی سمجھا جاتا

ہے مگر وہ کم کے گھر سے کوئی نہیں آیا۔ اس نے ماما کو انوائسٹ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ کچھلی دھند جب وہ ماما سے مل کر آیا تھا تو ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اور اب مصروفیت کی وجہ سے نہ تو انھیں ملے جاسکا اور نہ ہی خون کر سکا اس کا پروگرام تھا کہ فکشن کما گلے دن وہ ماما سے ملے جائے گا۔ شہر کی انتظامیہ کے بڑے بڑے لوگ مدعو تھے۔ حیدر اور شہلا بھی مدعو تھے مگر شہلا نہ جاسکی اور صرف حیدر کو ہی جانا پڑا۔ ملک منصور بھی مدعو تھا۔ وہ شہزاد کے ساتھ گیا چونکہ ایکشن قریب تھے اس لیے عوامی رابطہ مہم کے سلسلے میں ایسے پروگرامز میں شرکت سیاستدانوں کے لیے ہمیشہ فائدہ مند رہتی ہے۔ اسی بات کے پیش نظر وہ اسٹوڈنٹس کے اس فکشن میں گیا اور نہ اس سے قبل اس کی جگہ شہزادی شرکت کرتی تھی۔ حیدر اور منصور نے ایک دوسرے کو کچھ کرمٹ پھیر لیا۔

ولیم اور آئے نور کی ایکٹنگ اور ان کے اسٹک Broken Hearts کو سب لوگوں نے بے حد پسند کیا خصوصی طور پر ولیم کی ایکٹنگ اور اس کے ایکسپنس کو بہت سراہا گیا۔ ہر ایک کی زبان پر پرنس ولیم کا نام تھا۔ پڑھائی کے علاوہ ایکٹنگ میں بھی اسے سرٹیفکیٹس اور میڈلز دیے گئے۔ سب لوگ بہت خوش تھے اور فکشن کے بعد سب لوگ افشین کے گرد سے پارٹی کا وعدہ یاد دلانے کے لیے جمع ہو گئے۔

”بھئی چینیوں کے بعد پروگرام رکھ لو.....“ افشین نے جان چھڑانا چاہی۔

”نہیں..... پارٹی آج ہی چاہیے اور وہ بھی کمالیہ ہی میں.....“

”تھوڑی سی رعایت دے دو.....“ افشین منمنائی۔

”ہم کچھ نہیں سنا چاہتے.....“ آئے نور بولی۔

”یقین ولیم اور آئے نور پر بھی تو پارٹی بنتی ہے..... ان لوگوں کو تو خصوصی انعامات ملے ہیں۔“ رمل نے ناٹک لگایا۔

”ہاں..... ہاں..... یہ تو ہم بھول ہی گئے۔“ اولیس بولا تو ڈاکر نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

”ہماری کوئی کمنٹ نہیں تھی..... ویسے بھی میرے راتے آج کے بعد آپ لوگوں سے جدا ہیں..... میں تو بس کرسی میں آ گیا اور رول کر دیا ورنہ..... میں تو..... خیر..... پھر سہی“ اس نے آئے نور کی طرف مسکراتے ہوئے ذومعنی الفاظ میں کہا۔

”اوہو..... یہ کوئی روالس تو نہیں شروع ہو گیا.....؟“ افشین نے سادگی سے کہا تو دونوں گڑبڑا گئے۔

”واٹ نان پلیس..... اب میں تمہاری کلاس میں کبھی نہیں آؤں گی پہلے ہی میرے کلاس فیلوز مجھ سے ناراض ہیں۔ میں بھی کرسی میں آ گئی..... ورنہ.....“ آئے نور مصنوعی غلغلے سے بولی۔

”ہائی راوے..... دونوں ایک دوسرے کی کرسی میں آئے ہیں تو پھر فریٹ کیسی.....؟“ اولیس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیوں..... کیوں..... اتنا کام کیا ہے۔ میں نے تمہارے لیے۔“ فریٹ کا وعدہ ہوا تھا کہ نہیں یاد رکھو آئندہ بھی تم لوگوں کو مجھ سے کام پڑ سکتا ہے۔“ آئے نور نے گویا دھمکی دی۔

”اوکے بھئی..... جیکب یو دیری کج..... میرے پاس جتنے پیسے ہیں ان میں جو کچھ نبھائے کر سکتے ہو کر لو.....“

”چلو سب لوگ لٹالو..... سوائے میرے.....“ آئے نور نے ہنسنے ہوئے کہا۔

"اور میرے علاوہ بھی..... کیونکہ میرے پاس تھوڑے سے پیسے ہیں اور یہ اس ماہ کا خرچ ہے میں ماما کو خریدتی ہوں کے لیے تنگ نہیں کر سکتا..... اور ایسے بھی یہ وعدہ میری موجودگی میں نہیں ہوا تھا۔ میں تو تم لوگوں کا گیسٹ ہوں....." ولیم نے صاف گوئی سے کہا۔

"ٹھیک ہے بھی..... کل کا پروگرام دکھ لو آج تو بہت تھک گئے ہیں۔ کل چلیں گے....." رملہ نے رائے دی۔

"اوکے..... کل سب تیار رہنا اور چھٹی کوئی نہ کرے....." آئے لور نے گویا وارننگ دی سب مسکراتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

ولیم ہاسٹل لوٹا تو اس کے لیے فون کال تھی.....

"ولیم..... آپ کے لیے کئی دفعہ فون آچکا ہے مگر آپ فکشن میں بڑی تھے۔ اس لیے کوئی کال نہیں ہو سکا۔" آپرین نے اسے بتایا۔

"کس کا فون ہے.....؟" ولیم نے قدرے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

"ڈورنگ ویکن ہاسٹ سے مس انفال بات کر رہی ہیں....."

"اوکے....." اس نے فون پکڑتے ہوئے کہا۔

"ہیلاؤ انٹی خیریت تو ہے نا؟"

"ہیٹا آپ کی ماما بہت بیمار ہیں اور اسپتال میں ہیں....." وہ اسے ایڈریس بتانے لگیں۔

"میں ابھی آتا ہوں....." اس نے فون رکھتے ہوئے کہا اور وارڈن کو بتا کر چلا گیا۔

اسپتال میں مس انفال کے علاوہ ایک دو اور خواتین تھیں۔ "آئی ماما کو کیا ہوا ہے؟" اس نے پریٹانی میں مس انفال سے پوچھا۔

"ہیٹا بہت دنوں سے وہ شدید ڈیپریژن کا شکار ہیں اور پھر بخار ہونا شروع ہو گیا اور آج تو حد ہی ہو گئی۔ چلے چلے اچانک گر پڑیں۔ بی بی اس قدر بالی ہو گیا کہ ناک سے خون بہنا شروع ہو گیا۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ شاید برین ہیمریج....."

"اوہ فو....." وہ مایوسی سے بولا اور دو تا شروع ہو گیا۔

"حوصلہ رکھو ہیٹا....." مس انفال نے اسے پیار سے سمجھایا۔

"مجھے لگتا ہے کہ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے..... بھولی دفعہ میں آیا تھا تو ماما مجھ سے ناراض تھیں شاید یہ ڈیپریژن اسی وجہ سے ہے....." وہ بہت گھٹی محسوس کر رہا تھا۔

"نہیں ہیٹا..... تم یونیورسٹی میں مل مت کرو..... اسکی کوئی بات نہیں....." مس انفال حقیقت جانتی تھیں اس لیے اسے سمجھا رہی تھیں۔

"آئی لو آئی....." یہ میری وجہ سے ہی ہوا ہے..... آئی لوما..... اینڈ شی لوزی مورڈین ی..... وہ یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکیں..... اسی لیے یہ سب ہوا ہے..... آپ نہیں جانتی نا....." اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"ہیٹا..... آپ اتنا محسوس نہ کرو..... سب ٹھیک ہو جائے گا....." وہ مزید کہہ نہ سکیں۔ وہ اسے حقیقت بتانا چاہتی تھیں مگر کچھ نہ بتا سکیں۔ کہاں سے شروع کرتی اور کیا بتاتی..... انہیں تو خود بھی صحیح طرح معلوم نہ تھا کہ مس شہلا حیدر نے کیونکر ان کی انسلٹی کی تھی۔

”جیسا آپ کے پاس کچھ پیسے ہیں۔۔۔“ مس افضل نے رازداری سے پوچھا۔

”کس۔۔۔ کس لیے۔۔۔ آئی۔۔۔؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ڈاکٹر کچھ آپریشن کی بات کر رہے تھے ابھی بلیئر نوٹس۔۔۔ مگر ممکن ہے۔۔۔“

”میرے پاس تو صرف پاکٹ منی ہوتی ہے۔۔۔ ماما کے پاس ہی۔۔۔ معلوم نہیں ان کے پاس بھی کچھ ہے کہ نہیں۔۔۔“ ولیم افسردگی سے بولا۔

”اچھا تم پریشان نہ ہو۔۔۔ میں کچھ کرتی ہوں۔۔۔“ انھوں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

دوسری رات ماں کے پاس بیٹھا رہا۔ ان کی حالت اب قدرے بہتر تھی۔ لیکن ڈاکٹر مطمئن نہیں تھے اور انھوں نے کچھ ٹیسٹ کروانے کو کہا تھا۔ وہ بھی لگ رہا تھا۔ وہ اب ہاسپٹل شفٹ ہو چکی تھی۔ مس افضل ان کی بہت دیکھ بھال کر رہی تھیں۔ وہ بھی ہاسپٹل پہنچا تو سب لوگ اسے ناراض ملے مگر جب اس کی ماما کا سبب خاموش ہو گئے۔ پھر کسی نے بھی ٹریٹ کی بات نہ کی وہ اندر ہی اندر بہت پریشان تھا اور بہت چپ چاپ بھی۔ آئے نور اس کو دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

”ولیم تم اس قدر پریشان کیوں ہو۔۔۔ کیا تم اپنی پریشانی مجھ سے شیئر نہیں کرو گے۔۔۔“ آئے نور نے اس سے ہاسپٹل جا کر پوچھا۔

”نہیں۔۔۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

”کیوں۔۔۔؟“

”اس کا کوئی فائدہ نہیں۔۔۔“

”ولیم ہم بہت سے کام بغیر فائدے کے بھی تو کرتے ہیں۔۔۔“

”مثلاً۔۔۔“

”مثلاً۔۔۔ مثلاً۔۔۔ میں جانتی ہوں تمہارے اور میرے راتے جدا جدا ہیں۔ مجھے سب کچھ اچھی طرح معلوم ہے مگر میں بے بس ہوں۔

میرے دل میں تمہارے لیے ایسا جذبہ بیدار ہو چکا ہے جو میرے لیے بہت قیمتی اور شاید تمہارے لیے بہت ارزاں ہو۔۔۔ میں جانتی ہوں یہ سب بے فائدہ ہے مگر میں ان خوبصورت یادوں کو۔۔۔ ان لمحوں کو اپنا خوبصورت ماضی بنانا چاہتی ہوں ایسا ماضی کہ جب مستقبل میں کسی تھک جاؤں تو اس کی کھڑکی کھول کر تازہ ہوا کے جھونکوں سے تازہ دم ہو سکوں۔۔۔“ آئے نور کی آنکھوں میں دکھ بھی تھا، غصہ بھی اور ایک چمک بھی۔

”آئے نور۔۔۔ تم بھی۔۔۔ کیا تم بھی ایسا محسوس کرنے لگی ہو۔۔۔ میں تو سمجھا تھا کہ یہ سب میرا وہم ہے۔ کیا ہم دونوں۔۔۔ اوہ گاڑ۔۔۔“

ولیم کے لہجے میں ہلاکی حیرت تھی۔

”ولیم میں اپنے آپ کو بہت سمجھاتی ہوں کہ تم اور میں۔۔۔ لیکن میں کیا کروں کہ میری حالت اس مچھلی کی سی ہے جو جانتی ہے کہ خشکی پر

موت اس کا مقدر ہے مگر خشکی پر جانے کی اس کی خواہش شدید تر ہوتی جا رہی ہے ولیم وہ خشکی کا جزیرہ تم ہو۔۔۔ میں جانتی ہوں تمہارا اس میں کوئی قصور نہیں۔ تمہاری منزل سے تو میں پہلے دن سے آگاہ ہوں۔ لیکن میں بہت بے بس ہوں۔۔۔ معلوم نہیں تمہارا اور میرا تعلق کیا ہے اور کیا ہوگا۔۔۔

جا ہے ہمارا انجام کچھ بھی ہو مگر میرا قدم تمہارے ساتھ اٹھے گا۔۔۔ تم اپنے ہر دکہ سکھ میں مجھے اپنا شریک پاؤ گے۔۔۔ کیا اب بھی نہیں بتاؤ گے کہ قصص کیا پریشانی ہے؟“ آئے نور کی آنکھوں میں نمی ہی حیر نے لگی جس سے اس کے اندر کا خلوص جھانک رہا تھا۔

”نور تم نے مجھے اور پریشان کر دیا ہے۔۔۔“ وہ ایک بیچ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”میں تمہاری ہر پریشانی شیش کرنا چاہتی ہوں۔۔۔ آزما کر تو دیکھو۔۔۔“

”مما بہت پیار ہیں اور ڈاکٹروں نے ان کے کچھ ٹیسٹ کروانے کو کہا ہے۔۔۔ مگر۔۔۔“ ولیم رک سا گیا۔

”مگر کیا۔۔۔؟“

”نور میں یہ صرف قصص بتا رہا ہوں۔۔۔ لیذا اسے راز میں رکھنا۔۔۔“

”ولیم۔۔۔ مجھے آئندہ یہ افلاطون مت کہنا۔۔۔ یہ میری تو بین ہوگی۔“

”اوکے۔۔۔ ہمارے پاس اتنے۔۔۔ آئی مین اتنے ریورسز نہیں کہ۔۔۔“

”اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔۔۔ میرے ایک ملے والے انکل ادھری جاب کرتے ہیں۔ تم بس لکھتے کرو۔۔۔ مجھے بتا دینا۔ میں خود آئی کو لے کر چلوں گی اور وہ کچھ میرے سامنے کبھی ہمت نہ ہارنا۔۔۔ مجھے پونڈ اور ڈالر کے اچھے لگتے ہیں۔۔۔ زندگی میں کچھ بھی مشکل نہیں سوائے ان راستوں کے جہاں ہمیں محسوس ہو کہ خدا ہمارے ساتھ نہیں۔۔۔ تم مجھے بس انعام کرو دینا میں قصص بھی چک کر لوں گی اور آئی کو بھی۔۔۔“ وہ اسے حوصلہ دیتے ہوئے بولی۔

”تھینک یو۔۔۔“ وہ زٹی مسکراہٹ سے بولا اس لیے اس کا دل کرچی کرچی ہل رہا تھا۔ اس نے مارا بچپن محرومیوں میں گزارا تھا ماما سے کبھی بے جا ضد نہیں کی تھی وہ جانتا تھا کہ ماما کے پاس کبھی بھی اتنے پیسے نہیں ہوتے تھے کہ وہ اپنی ضد منوا سکتا۔ اس نے تو ضد ہی کرنا چھوڑ دی تھی اور اب ماما کے علاج کے لیے بھی وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ابھی وہ اس قافلے میں نہیں ہوا تھا۔ ایک لمحے کو قافلوں کے ذہن میں آئے مگر دل نہیں مانتا تھا۔ قافلوں کے دیے نے اسے قدرے بختر کر دیا تھا۔

ورکشاپ میں صرف ایک دن باقی تھا اور قافلوں سے صبح سویرے ملے ہاٹل آئے۔ وہ سخت غصے میں تھے۔

”ولیم تم اس قدر کیئر لیس ہو گئے ہو۔۔۔ قصص ذرا بھی خیال نہیں کہ قصص ورکشاپ میں شرکت کرنی ہے اور تم نے مجھ سے کوئی کوئی ٹیکٹ

نہیں کیا۔“

”آئی ایم سوری قافلو۔۔۔ میری ممابہت پیار قصص اور مجھان کے کچھ خاص ٹیسٹ کروانے ہیں۔“

”وہاٹ ڈویو مین۔۔۔ تم ورکشاپ میں شرکت نہیں کرو گے۔۔۔“

”لیس قافلو۔۔۔ اس نے اچانک اپنا فیصلہ نہیں سٹایا۔

”وہاٹ نان ٹکس۔۔۔ تم جانتے ہو تمہارا فلو چر کیا ہے۔۔۔؟“

"نور! میں صرف یہ جانتا ہوں کہ میری ماں بہت بیمار ہے اور انھیں اس وقت میری ضرورت ہے۔"

"ڈونٹ بی کل۔۔۔ کیا تم جانتے ہو تمہارا کتنا بڑا نقصان ہوگا۔۔۔؟"

"نور!۔۔۔ لیکن اگر ماما کو کچھ ہو گیا تو اس سے بڑا نقصان اور میرے لیے کیا ہوگا۔۔۔؟"

وہی تم اس قدر بدل گئے ہو۔۔۔ کیا اس لیے میں تمہیں لاہور لایا تھا؟"

"مطمئن نہیں میں بدلا ہوں کہ نہیں مگر آپ کہہ رہے ہیں تو ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں گے۔ نور! اگر آپ میری جگہ ہوتے تو کیا

کرتے۔۔۔؟" اس نے استغماہیہ لٹا ہوں سے ان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"میں۔۔۔ میں درکشاپ میں شرکت کرتا۔۔۔" وہ قدرے گھبراہٹ میں جھنجھلا کر بولے۔

"سو ری نور! مجھے میں نہ تو اتنا استغماہیہ اور شائقِ سوجو بوجو۔"

"ولیم۔۔۔ پو۔۔۔" نور کو اس کی بات پر سخت غصہ آیا اور وہ غصے سے منگھٹیاں پھینچنے چلے گئے۔

وہ مطمئن تھا اس نے جو بھی فیصلہ کیا تھا ٹھیک کیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد نور آگئی اور اس نے اسے ساری بات بتائی۔

"تم نے ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔۔۔ ظاہر ہے آئی کو اس وقت صرف اور صرف تمہاری ضرورت ہے یہ بتاؤ شیت کب کروانے ہیں۔ میں نے

بات کر لی ہے بالکل نے بہت تسلی دی ہے فکر کی کوئی بات نہیں، میں کب آؤں۔۔۔؟"

"کل! طیس گے۔۔۔ مگر ابھی تم کہاں جا رہی ہو۔۔۔؟"

"کہیں نہیں۔۔۔ یونی۔۔۔ مارکیٹ جا رہی تھی تو تمہاری طرف آگئی۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو، کیا کہیں جانا ہے۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔ میں اس وقت شدید اسٹریس میں ہوں۔ تھوڑی دیر کے لیے باہر جانا چاہتا ہوں۔۔۔ تمہارے ساتھ۔۔۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ چلو۔۔۔"

وہ آہستہ آہستہ رانچو کرتی ہوئی منبر کے پاس سے گزر رہی تھی۔ شدید ٹھنڈ اور دھند نے ارد گرد کو اور بھی خوبصورت بنا رکھا تھا منبر کے رخ پانی

سے بھاپ سی اڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔۔۔ دونوں خاموش تھے۔

"ولیم کیا تم فادہ کی وجہ سے پریشان ہو۔۔۔؟" ہلا خراس نے پوچھا۔ وہ شیت کے ساتھ سرٹکائے مسلسل باہر دیکھ رہا تھا اور کچھ سوچ رہا تھا۔

"ولیم میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔۔۔؟"

"کیا۔۔۔؟" اس نے چہ نکلتے ہوئے پوچھا۔

"تم اس قدر پریشان کیوں ہو۔۔۔؟"

"نور! میں نے ساری زندگی پریشانیوں کی تو دیکھی ہیں مگر کبھی ان کو اپنے اوپر طاری نہیں کیا مگر اب مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے میں

جکڑا جا رہا ہوں۔۔۔ میرا دل دوماغ اور روح سخت آویٹ میں ہیں۔۔۔ کچھ نہیں آ رہا مجھ سے کہاں کہاں غلطیاں ہوئی ہیں۔"

”تم کیوں ایسا محسوس کر رہے ہو.....؟“

”معلوم نہیں..... مگر دل پر ایک بوجھ سا ہے۔ قصصیں معلوم ہے ماما میری وجہ سے بیمار ہوئی ہیں، قادر بھی مجھ سے ناراض ہیں اور تم.....“

”تم.....“

”دلیم میں تو تم سے ناراض نہیں.....“ اس نے گاڑی کو ایک دم بریک لگاتے ہوئے کہا۔

”میں جانتا ہوں..... مگر میں تمہارے بارے میں بھی سوچ سوچ کر پریشان ہوتا ہوں۔“

”تم کیوں میرے بارے میں سوچتے ہو..... جبکہ میں جانتی ہوں کہ تمہارے اور میرے راسخے کبھی بھی مل نہیں پائیں گے مگر اس سڑک

اور نہری طرح ہم دونوں ساتھ ساتھ چلیں گے..... میری جانب سے اپنا ڈھن بہ سکون کر لو..... مجھے تو تم سے کوئی شکوہ نہیں۔ مجھے تو صرف اور صرف تم سے بے غرض محبت ہے..... اور ضروری نہیں کہ ہر محبت اپنا حق بھی وصول کرے.....“ وہ بہ سکون لہجے میں بولی۔

”مگر میں تو لمحہ بہ لمحہ شہر ڈھونڈ رہا ہوں۔ تم نے تو اپنے آپ کو سمجھا لیا ہے مگر میں..... کس طرح.....؟“

”دلیم..... میری ایک بات یاد رکھنا مجھے وضاحتیں دینے والے لوگ سخت نا پسند ہیں۔ اپنے آپ کو مضبوط بناؤ۔ تم جو بات کہو محسوس لہجے

میں کہو تمہارے لہجے میں مایوسی مجھے خسر دلاتی ہے۔ میں نے زندگی سے ہارنا نہیں سیکھا مگر میں نے حقیقت سے بھی آنکھیں نہیں چرائیں۔ میں جانتی ہوں میرا اور تمہارا تعلق چاند اور چکر جیسا ہے، جو کبھی نہیں مل سکتے مگر کیا چکر چاند کی محبت میں اس کی طرف پرواز کرنا چھوڑ دیتا ہے..... جبکہ وہ جانتا

ہے کہ وہ کبھی بھی اس کو نہیں پاسکے گا..... وہ ہار نہیں مانتا مگر موت قبول کر لیتا ہے..... میں تمہاری طرف بڑھی ہوں..... جانتی ہوں کہ تم میرا مقدر نہیں۔

مگر..... مگر ایک امید میرے اُمد ہے اور وہ مجھے ہارنے نہیں دیتی..... میرے سامنے اپنے بکھرے کی باتیں کبھی بھی نہ کرنا ورنہ میں ناراض ہو جاؤں

گی.....“ اس نے گاڑی کو ایک دم ریس دی۔

”دلیم اس کی باتوں سے گڑبڑا گیا۔ اسے امید نہیں تھی کہ نور یوں بکڑ جائے گی۔“ آئی ایم سوری.....“

”تو سوری..... ایسے الفاظ تمہارے پاس بہت زیادہ ہیں ان کو یوں میرے سامنے کثرت سے استعمال مت کیا کرو..... مجھے ڈھیٹ قسم

کے سخت جان لوگ پسند ہیں۔“

وہ مسکرا کر بولی۔

”مجھے سسٹ ہاکر بتاؤ کہ قصصیں کس کس قسم کے لوگ پسند ہیں میں ویسا ہی بننے کی کوشش کروں گا.....“ وہ بھی مسکرا کر بولا۔

”گڈ..... زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا کرو..... اگر پریشانی ہے تو اس کو بولڈ لی فیس کرو..... یوں منہ لٹکائے بھٹوں بننے

سے فائدہ..... ہاں شکوے ہاتھ میں ہو تو خیرات مل سکتی ہے ورنہ دل ہی کڑھتا رہے گا اور اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔“ وہ ہلکھلا کر ہنس دی۔ ”اب

بولو..... کچھ کھاؤ گے.....“

”ہاں..... کافی پیوں گا..... مگر آج صبح میں کروں گا۔“

"اوکے..... ارب پڑوش..... میرے پاس کون سے ڈالرز ہیں..... خوشی سے کیجئے....." اس نے ایک اوسط درجے کے ریسٹوران کے سامنے گاڑی پارک کی اور دونوں کافی پیئے اندر چلے گئے۔

تم کتنی بڑی نعمت ہو..... وہ کافی کے سپ لیتے ہوئے سوچ رہا تھا ورنہ چند لمحوں پہلے وہ کتنا ڈسٹرب تھا اور اب بہت حد تک اپنے آپ کو نارل محسوس کر رہا تھا۔

"ولیم جس دن تم چرچ جوائن کرو گے نا..... وہ ہماری ملاقات کا آخری دن ہوگا..... میں نے یہ سوچ لیا ہے مسٹر..... خیر چھوڑو....."

"ہاں ہوری کرو....." وہ ایک دم خشکا۔

"اس بات سے تمہارا کوئی کنسرن نہیں..... جس کا تم سے کنسرن تھا وہ میں نے مکمل کر دی ہے۔"

"نور تم بہت مختلف لڑکی ہو اور بہت مختلف باتیں کرتی ہو۔ تم مجھے اکثر چوکا دیتی ہو....."

"اس لیے کہ مجھے چوکنا اور چوکنا اچھا لگتا ہے....."

"تم ایسی کیوں ہو.....؟"

"کیسی.....؟" اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

"اب سوچت....."

"ٹھیک ہے..... تو تم بناؤ مت....."

"نور....." وہ غصے میں جھنجھلائے لگا۔

"ہاں..... پرنس....." دونوں مسکرا دیے۔

"اب بولو..... کہاں چلو گے.....؟"

"مجھے ماما کے پاس ڈراپ کر دو۔"

"راحت مر....." وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

اسے درنگ دینا بائیل ڈراپ کرنے کے بعد وہ کل دو بارہ آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی اور وہ اس کے بارے میں سوچتا رہ گیا مگر اب اس سوچ میں مایوسی نہیں تھی۔ سمت تھی اور حوصلہ تھا۔



شہلا کا باپ کے ساتھ تھوڑا ابھی تک برقرار تھا۔ وہ ہمہ انداز میں باپ کے رویے، اس کی حرکات و سکنات، ان کی فون پر باتوں کو منگھوک انداز میں دیکھنے کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔ شک کا بیج آہستہ آہستہ نشوونما پاتا جا رہا تھا گوکہ حیدر نے مسز پیٹر کے ساتھ ہر طرح کا رابطہ منقطع کر دیا تھا مگر وہ شہلا کو مطمئن نہیں کر پایا تھا۔ دونوں کے درمیان ایک خلیج تھی جو بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ حیدر بھی بس ضرورت کے تحت اس سے بات چیت کرتا

اور وہ بھی اسے زیادہ سے زیادہ نھرا انداز کرنے کی کوشش کرتی۔ انہی دلوں شہلا کے خیال سے اس کی خالہ کے بیٹے اسماعیل شاہ کا رشتہ آگیا۔ اسماعیل نے اسے زیادہ سے زیادہ نھرا انداز کرنے کی کوشش کرتی۔ انہی دلوں شہلا کے خیال سے اس کی خالہ کے بیٹے اسماعیل شاہ کا رشتہ آگیا۔ اسماعیل نے اسے زیادہ سے زیادہ نھرا انداز کرنے کی کوشش کرتی۔ انہی دلوں شہلا کے خیال سے اس کی خالہ کے بیٹے اسماعیل شاہ کا رشتہ آگیا۔

”پاپا! آپ کو کچھ میری شادی کا خیال کیسے آگیا.....؟“ وہ حیدر سے اسماعیل شاہ کے بارے میں سن کر حیکمے انداز میں بولی۔

”اس لیے کہ رشتہ انھوں نے اب مانگا ہے..... اگر وہ پہلے مانگتے تو میں پہلے ہاں کر دیتا۔“

”اس کا مطلب ہے آپ اپنے طوطے پر فیصلہ کر چکے ہیں اور اگر میں انکار کروں تو.....؟“ اس کی نظروں میں معنی خیز استغہام تھا۔

”تمہیں انکار کرنے کا ہر حق ہے.....“ وہ مطمئن لہجے میں بولا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ دلوں کا ڈوں پہنچے تو لوگ ان کے استقبال کے لیے

کھڑے تھے۔ بوڑھے اور جوان آگے بڑھ کر حیدر سے ہاتھ ملارہے تھے اور انھیں چوم رہے تھے۔ بوڑھی عورتیں شہلا کے سر پر پیار بھیر رہیں

تھیں۔ حویلی میں ایک دم شور مچا ہوا۔ شفق اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ جب سے وہ حویلی آئی تھی وہ بہت مطمئن اور خوش تھی۔ یہاں ہر طرح کا

آرام اور قہقہہ تھا۔ وہ بہت بے سکون تھی۔ اس کا ہر طرح سے خیال رکھا جاتا وہ کمرے سے باہر نکل تو نوکروں کی ادھر ادھر دوڑی گئی تھی۔ اس نے حیرانی

سے ایک نوکرانی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ حیدر شاہ اور شہلا بی بی آئے ہیں۔ وہ ان سے اسی وقت ملنا چاہتی تھی مگر بشری آپا نے اسے منع کر دیا جو

پوری حویلی کی مہمان اور حویلی کے سب سے پرانے خادم رحیم بابا کی بیٹی تھی۔ بشری آپا اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ حویلی کے ساتھ منسلک ایک

چھوٹے سے گھر میں رہتی مگر سارا دن وہ حویلی کے کاموں میں گزارتی تھی ہر روز کوئی نہ کوئی شہر سے حویلی آیا ہی رہتا۔ اسے نوکر چاکر اناج اور

جانوروں کی دیکھ بھال کے علاوہ ہر نئے مسئلے سے حیدر کو آگاہی بشری آپا کی ہی ذمہ داری تھی۔ وہ ادھر عمر کی نرم دل خاتون تھی شفق کے ساتھ بھی وہ

بہت محبت سے پیش آتیں۔ سب لوگ انھیں آپا ہی کہہ کر بلاتے تھے۔ بشری آپا کے کہنے پر وہ رک گئی۔

”مگر آپا میں ان سے ملنے کب جاؤں گی.....؟“ وہ قدرے بے مبری سے بولی۔

”وہ آرام کر لیں۔ کھانا دانا کھا لیں اس کے بعد.....“

”ٹھیک ہے..... پھر آپ مجھے ان سے ضرور ملوائیے گا.....“

”اچھا بابا..... تم اس کیوں سو رہی ہو..... وہ ادھر ہی ہیں۔ تم سے مل کر ہی جائیں گے۔“

”آپا ان کے آنے پر ہر روز یونیورسٹی اور گہما گہما جاتی ہے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں..... اور نکلتی تو کیا۔ وہ گاؤں کی بڑی سرکار ہیں۔ ان کے آنے سے تو گاؤں میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے.....“

”اور شہلا بی بی..... وہ کیسی ہیں.....؟“ اس نے تجسس سے پوچھا۔

”بہت سوتی..... بہت اچھی..... جیسا بابا آپ ویسی بیٹی..... اللہ ان دونوں کو ایسی حیاتی دے دونوں ہی بہت اچھے ہیں۔ قرعہ غربا کے تو مائی

”بابا ہیں۔“

”یہ لوگ یونہی اچانک گاؤں آتے ہیں۔۔۔۔۔ اس نے پھر سوال کیا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ اور نہیں تو کیا، ان کا اپنا گھر ہے جب دل چاہتا ہے آ جاتے ہیں۔ ان کو بھلا کسی سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اچھا اب میں باورچی خانے میں جا کر انتظام وغیرہ دیکھوں۔“ وہ چادر سر پر اوڑھتے ہوئے یوٹیس۔

رات گئے تھیں وہ شہر رہی مگر کوئی بھی اسے بلائے نہ آیا اور نہ شہلا اس طرف آئی۔ اگلے دن صبح سویرے وہ پھر بشریٰ آپا کے پاس بچن میں چلی گئی۔

”آپا آپ نے تو کہا تھا کہ میں رات کو ان سے مل سکتی ہوں مگر آپ نے مجھے بلا یا نہیں۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ کہا تو تھا مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ لوگ کس ارادے سے آئے ہیں۔۔۔۔۔؟“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔ کس ارادے سے؟“

”ارے بھئی۔۔۔۔۔ شہلا بی بی کے رشتے کے سلسلے میں۔ ان کے نصیال سے آج لوگ ادھر اکٹھے ہو رہے ہیں اور آج بھی سب بہت مصروف ہیں۔“

”کیا شہلا بی بی کی شادی ہو رہی ہے۔۔۔۔۔؟“

”معلوم نہیں۔۔۔۔۔ ابھی تو رشتے کے لیے آرہے ہیں۔ آگے کیا ہوتا ہے خدا ہی بہتر جانتا ہے۔“

”کیا شہلا بی بی خوش ہیں۔۔۔۔۔؟“

”جانتی نہیں۔۔۔۔۔ کچھ اکڑی اکڑی سی لگ رہی ہیں۔ اس سے پہلے تو کبھی بھی وہ ایسی نہیں لگیں۔ معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔“

”رشتہ پسند نہیں ہوگا۔۔۔۔۔“

”اؤںہوں۔۔۔۔۔ ایسی بات بھول کر بھی نہ کرنا۔ اس خاندان میں ایسی باتیں نہیں ہوتیں۔ ایسی آواز باتیں وہ شہر میں ہی چھوڑ آتے ہیں۔ اگر پسند نہ ہوتا تو وہ گاؤں نہ آتے۔ بات کچھ اور ہے۔ مجھے تو وہ کچھ حیدر سائیں سے ناراض لگی ہے۔ اللہ بہتر کرے۔۔۔۔۔“ وہ بچن میں ادھر سے ادھر مسلسل پکر لگاری تھیں اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہی تھیں۔

”تم جا کر آرام کرو۔۔۔۔۔ جیسے ہی وہ مجھے فارغ نظر آئے میں تمہیں بلاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے آپا۔۔۔۔۔“ وہ بے دلی سے اٹھ کر چلی گئی۔

دو پہر تک اور مہمان آگئے۔ شہلا کی خالہ، خالو اور ان کے عزیز واقارب سب اکٹھے ہو کر حیدر سے شہلا کا ہاتھ مانگنے آئے تھے۔ حیدر نے پھر شہلا سے پوچھا۔

”ٹھیک ہے پاپا جیسے آپ مناسب سمجھیں اور ویسے ہی اب ہمارے حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ میرا شادی کر لینا ہی بہتر ہے۔“

”یہ محض تمہارا وہم اور اپنی سوچ ہے مگر نہ ایسی کوئی بات نہیں اور نہ ہی میں کسی بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں اگر تمہیں یہ رشتہ منظور

ہے تو میں ہاں کر دیتا ہوں۔ میں زبردستی کا قائل نہیں۔ سوچ لو..... پھر مجھے جواب دے دینا۔“ حیدر کرے سے نکلے ہوئے ہوا۔
 ”شادی..... شفیق بی بی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔“ اسی لمحے بشری آپا کرے میں داخل ہوتے ہوئے بولیں تو شہلا نے چونک کر باپ کی طرف دیکھا۔

”ہاں بلا لواتے اور اسے یہاں کوئی مسئلہ تو نہیں.....؟“ حیدر نے بچہ چھوٹا شہلا کی آنکھیں حیرت سے پھیلے گئیں۔
 ”نہیں..... شادی..... آپ اس سے خود پوچھ لیں۔“ بشری آپا کبھی ہوئی باہر نکل گئیں۔ شہلا استغما مہرنگاہوں سے باپ کی طرف دیکھنے لگی مگر کچھ نہ بولی اور ذہنی انہوں نے کچھ بتانا مناسب سمجھا۔ تھوڑی دیر بعد شفیق کرے میں داخل ہوئی۔ خواہصورت، دراز قد، نازک سی لڑکی، شہلا نے چونک کر اسے دیکھا۔
 ”السلام علیکم، نکل.....“

”وعلیکم السلام بیٹا کیسی ہیں آپ..... سب ٹھیک تو ہے نا..... کوئی تکلیف تو نہیں آپ کو یہاں؟“ حیدر نے جلدی جلدی سارے سوال ایک دم پوچھ ڈالے۔

”نہیں نکل..... میں بہت آرام سے ہوں بس آپ سے کچھ کہنا تھا.....“

”ہاں کہو..... کیا کوئی خاص بات ہے.....؟“

”نکل..... وہ..... میں.....“ وہ شہلا کی موجودگی میں ہچکچا رہی تھی۔

”اچھا..... اس وقت میں جلدی میں ہوں آپ مجھے موبائل پر رنگ کر کے بتا دینا آپ کے پاس اپنا موبائل تو ہے نا.....“

”جی نکل.....“

”ٹھیک ہے بیٹا..... اللہ حافظ۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ شہلا کے ساتھ خدا حافظ کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔
 شہلا کا مؤرخہ آف تھا۔ رشتے کی نوعیت تو کچھ کچھ مجھ میں آگئی تھی مگر پاپا نے کبھی بھی چھوٹے سے چھوٹا کام اس سے دیکس کیے بغیر نہیں کیا تھا۔ ایک لڑکی نہ جانے کب سے حویلی میں رہ رہی تھی اور اسے خبر تک نہ تھی۔ اس کا مطلب ہے پاپا اب آہستہ آہستہ خود ہی اسے اپنے سے دور کر رہے تھے۔ ان کے دل میں اب اس کے لیے کوئی جگہ نہیں..... اس نے شوہروں کو بھائیوں کو اور بیٹوں کو بدلتے تو سنا تھا مگر باپ کو بدلتے خود دیکھ لیا تھا۔ یہ سب کچھ اس کے ساتھ صرف اس عورت کی وجہ سے ہوا تھا۔ وہ سارا راستہ گاڑی میں خاموش بیٹھی رہی۔ نہ حیدر نے اس سے کوئی بات کی اور نہ ہی اس نے..... مگر پہنچے ہی اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا کہ وہ شادی کے لیے راضی ہے اور جلد از جلد شادی کرنا چاہتی ہے۔
 حیدر کے لیے یہ اچھے کی بات نہ تھی وہ جانتا تھا کہ وہ غصے میں یہ سب کر رہی ہے مگر وہ اسد علی شاہ کی طرف سے مطمئن تھا اس لیے غصے کی کوئی پروا نہ تھی اور اس کی خالہ زیدہ کو فون کر کے مبارکباد دے دی۔

اسد علی شاہ ایک بڑے تک پاکستان پہنچ رہا تھا اور اس کے آنے کے دو دن بعد شادی کی تاریخ رکھی گئی۔ شادی گاؤں میں ہی ہونا طے پائی۔

حیدر نے قسم اور قاطعہ آپا کو بھی فون کر کے اطلاع دے دی اور انھیں جلد آنے کو کہہ دیا تاکہ شادی کی تیاری میں وہ شہلا کی مدد کر سکیں کیونکہ اس کی ماں تو موجود نہیں تھی اور سارے کام حیدر کے ذمے ہی تھے۔ شہلا بھی جیسی جیسی اور بہت اداس تھی۔ اس نے اپنی ساری سرگرمیاں ختم کر دیں جس میں صرف ضروری کام کے سلسلے میں باہر نکلتی۔ حیدر نے اسے شاپنگ کے لیے کہا مگر وہ پھر بھی نہ مانی۔ بہت دنوں کے بعد اس کا موٹر گاڑی ایک ٹھیک ہوا تھا اور دونوں زیورات کی خریداری کے سلسلے میں باہر گئے۔ حیدر نے اسے فری چنڈ دے رکھا تھا کہ جو جو اسے پسند ہو وہ خرید لے اور اس نے اپنی پسند کے بہت سے زیورات پیک کروائے۔ حیدر صحت کرنے لگا تو موہاںل نکال دیا..... اس نے فیرو دیکھا اور ایکسکوپ ڈکرتا ہوا باہر نکل گیا۔ شہلا نے حیرت سے منکھوک انداز میں باپ کی طرف دیکھا۔ اس کا موٹر پھر آف ہو گیا۔

”ہاں یوں تو سچ چنا کیا بات ہے۔“

”اٹکل..... میں نے آپ سے سکیل کے بارے میں ڈسکس کرنا ہے۔ پاپا نے خواہ مخواہ اسے پھنسا دیا ہے اور وہ اپنی ماں اور بہنوں کا اکلوتا سہارا ہے۔ اٹکل وہ بے قصور ہے۔ پاپا نے اپنی پوزیشن بچانے کے لیے اسے میرے کے طور پر استعمال کیا ہے اور مجھے یقین ہے اس کے گھر والوں کی بھی خبر نہیں لی ہوگی۔ اٹکل پلیز آپ سکیل کے لیے کچھ کریں..... اور اس کے گھر والوں کے لیے بھی.....“

”ٹھیک ہے تم مجھے ان کا ایڈریس بتا دو اور سکیل سے میں خود جیل میں لے جاؤں گا۔“

”شکریہ اٹکل..... آپ بہت اچھے ہیں۔“

”او کے چنا خدا حافظ.....“ وہ موہاںل آف کر کے اندر آیا تو شہلا نے سارے زیورات واپس رکھوا دیے تھے اور سخت غصے میں بیٹھی تھی۔

”پاپا پلیس..... مجھے یہ زیورات پسند نہیں۔“

”کیوں کیا ہوا..... تم نے سارے زیورات خود پسند کیے تھے اور میں ابھی صحت ہی کرنے والا ہوں ابھی آپ نے ہماری بیٹی کو کیوں ناراض کر دیا۔“ وہ سٹرک مین سے مخاطب ہو کر بولا۔

”میرا تم تو خود حیران ہیں۔ میڈیم پیکنگ کے بعد انھیں واپس کر رہی ہیں۔ ہم نہیں جانتے وہ کیوں ناراض ہوئی ہیں۔“

”آپ انھیں دوبارہ پیک کر دے گاڑی میں رکھوا دیں اور مل مجھے دے دیں۔“

”مجھے کچھ نہیں چاہیے۔“ وہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی باہر نکل گئی۔ حیدر نے خاموشی سے صحت کی اور باہر آ گیا۔

”شہلا یہ کیا حرکت ہے..... تم کیوں ایسا کر رہی ہو.....؟“ حیدر خنگی سے بولا۔

”میں نہیں جانتی پاپا..... لیکن جب بھی اس عورت کا فون آتا ہے میرا دل جلتے لگتا ہے اور خون کھولنے لگتا ہے۔“ وہ صاف کوئی سے بولی۔

”کس عورت کا.....؟“ حیدر نے حیرت سے پوچھا۔

”وہی مسز پٹیرا۔“

”کیا مطلب..... کیا تم اس سے ملی ہو؟“ حیدر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور حیران رہ گیا۔

”ہاں..... میں اس سے ملی تھی۔“

”تم نے اس سے کوئی.....“ جواہر خاموش رہی۔

”شہلا مجھے تم سے ایسی باتوں کی قسم امید نہیں تھی۔ تم عورتیں کسی مخلوق ہونے بغیر حقیقت جانے ایک دوسرے سے حسد کرنے لگتی ہو اور بعض اوقات اس رعبیت میں ایک دوسرے کا کتا بڑا نقصان کر دیتی ہو، میں سچے آپ پر فخر کرتا رہا کہ میں نے اپنی بیٹی کی ایسی تربیت کی ہے کہ وہ جہاں بھی جائے گی میرا سر فخر سے بلند کرتی جائے گی اور شہلا تم اس قدر..... مائی گاؤ مجھے یقین نہیں ہو رہا..... اور..... اور..... تم جانتی ہو اس وقت کس کا فون تھا۔ شفیق کا گاؤں سے فون تھا۔ دوپٹا پاری اپنا ایک مسئلہ سکس کر رہی تھی۔ لودیکھو..... دیکھو یہ نمبر.....“ اس نے شفیق کا نمبر اسے دکھاتے ہوئے سوہاگل اس کی گود میں پھینکا اور گاڑی ڈرائیو کرنے لگا..... اسے سخت دکھ ہو رہا تھا۔ ایسا دکھ زندگی میں کبھی بھی اس نے محسوس نہیں کیا تھا جو وہ اب کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں ایک دو دفعہ اس نے بری طرح اور ٹپک کرنے کی کوشش کی۔ شہلا پشیمان اور شرمندہ سی اپنی جگہ ٹٹٹی تھی۔

”آئی ایم سوری پاپا.....“ اس نے گاڑی سے نکلے ہوئے کہا۔ حیدر جواہر خاموش رہا اور اس کے بعد اس نے شہلا سے کوئی بات نہ کی۔ اسے شہلا کی اس حرکت پر سخت افسوس تھا کہ وہ غرت اور حسد میں اس حد تک دور نکل گئی تھی کہ اس نے باپ کے احساسات کی بھی پروا نہیں کی اور اس نے قدم قدم پر بیٹی کے احساسات کی پروا کی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی برسوں کی محنت اکارت گئی ہو۔ شہلا حیدر اس کی سوچ سے کتنی مختلف نکلی تھی۔ وہ ایسی نہ تھی جیسا اس نے بنانا چاہا تھا۔ انسان کے اندر کیا کچھ ہوتا ہے اور کیا کیا پکڑا رہتا ہے دوسرا انسان کتنا عظیم رہتا ہے وہ تو اس کی بیٹی تھی اور اس کی بظاہر تربیت کر کے وہ سمجھا تھا کہ وہ اس کو اپنی سوچ کے قالب میں ڈھال چکا ہے مگر وہ تو بہت مختلف نکلی تھی۔

شہلا اپنے کمرے میں بند تھی اور حیدر اپنی سوچ میں گم تھا۔ دونوں کے درمیان گہری خاموشی اور سرد مہری کی وسیع طلیح مائل تھی۔ قاطعاً پا اور جسم آ پا دونوں آج بھی جھیں اور شادی کی تیاریوں میں گرم جوشی سے حصہ لے رہی تھیں۔ زیورات اور طبعیات کے علاوہ بقیہ چیز کی ساری تیاری ان کے کمرے تھی۔ دونوں صبح سے شام تک بازار کے چکر لگاتی رہتیں۔

حیدر کو شہلا کی حرکت پر افسوس کے ساتھ ساتھ کچھ دکھ بھی تھا۔ اس نے تو سزا کر شہلا کی خبر بھی لی تھی۔ اس سے کوئی کوشش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے شہلا کی غلطی کے پیش نظر اور مغیث بھائی کے سمجھانے پر دوبارہ اس سے سارے رابطے منقطع کر دیے تھے اور اب شہلا کی رہائی اس سے ملاقات کی خبر ہوئی تو وہ جانا چاہتا تھا کہ شہلا نے اس سے کوئی بد تمیزی تو نہیں کی تھی نہ جانے کیوں اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ شہلا نے ضرور کوئی نہ کوئی بات اس سے کہی ہوگی کیونکہ شہلا کے تہ اور اس کے بات کرنے کے انداز سے ہی اس نے اندازہ لگا لیا تھا اور اب وہ اس سے جلد از جلد رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اسے سوہاگل پر فون کیا مگر فون آف تھا۔ اس نے ہاسٹل فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ باہر مگی ہے شام کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ اس کی طبیعت خراب ہے وہ فون نہیں سن سکتی۔ اسے یہ سن کر قدرے تشویش ہوئی۔ وہ اس سے ملنا چاہتا تھا مگر ہاسٹل میں نہیں..... کہیں باہر..... اور اس سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ جیسے جیسے اس سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا اس کی بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اگلے دن صبح سویرے ہاسٹل پہنچ گیا۔ انچارج ابھی نہیں آئی تھی۔ مس افصال سے ہی ملاقات ہو گئی۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں پوچھتا رہا۔ مس افصال جانتی تھیں کہ وہ سر پرائزڈنٹ کا عادی تھا

شاید اسی لیے صبح سویرے بچ گئے۔

”مسز انفال..... میں آپ سے ایک ذاتی سوال پوچھنا چاہتا ہوں؟“

”جی فرمائیے.....“

”کچھ روز پہلے شہلا حیدر ہاسٹل وزٹ کے لیے آئی تھیں تو انھوں نے کس چیز پر زیادہ زور دیا۔ آئی مین کس چیز کی ڈیو پلمنٹ کے بارے میں..... کیونکہ میرے ساتھ ان کی تھیلیا ہات نہیں ہو سکی اور دیکھتے ہی ایک ہفتے بعد ان کی شادی ہے اور شادی کی مصروفیت میں ایسے معاملات تو ذرا بحث نہیں لائے جاتے میں ادھر سے گزر رہا تھا تو سوچا کہ آپ لوگوں کی خبریت بھی دریافت کر لوں۔ مجھے ان کے وزٹ کا تو علم تھا مگر تفصیلات ڈسکس نہیں ہو سکیں۔“ وہ قدرے رک رک کر بولا۔

”مس شہلا اچانک ہی مسز پیر سے ملنے آئی تھی اور بس ان سے ملنے کے بعد چلی گئیں۔“ مسز انفال نے نارمل لہجہ میں بتایا۔

”مسز پیر سے..... مگر کیوں..... کیا کوئی خاص بات تھی؟“

”معلوم نہیں..... ان کے کمرے میں ہی ان سے کچھ بات ہوئی اور..... اس کے بعد.....“

”اس کے بعد کیا ہوا؟“ وہ پوچھتی سے بولا۔

”اس کے بعد مسز پیر بہت پریشان تھیں اور پھر بیمار پڑ گئیں۔ ان کو برین ہمرج ہو گیا.....“

”کیا.....؟“ حیدر کو سخت غصہ آ رہا تھا مگر اس نے ظاہر نہ ہونے دیا۔

”اور اب تو بھاری..... ڈاکٹر ان کے کمرے میں پریشان ہیں۔ برین ہمرج کا بہانہ بنا ہے۔“

”اب کیا ہوا ہے.....؟“

”ڈاکٹر نے ٹیسٹ کروانے کو کہا..... اور ان کی رپورٹس بھی اچھی نہیں آئیں۔“

”کیا مطلب.....؟“

”ان کو برین ٹیور ہے..... اور ستم غریبی دیکھیے بھاری کے پاس اتنے ریورسز بھی نہیں کہ وہ علاج کروائیں۔ بیٹا تو ابھی خود تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ ہم لوگ اپنے طور پر کوشش تو کر رہے ہیں مگر آپ کو تو معلوم ہے کہ اس علاج میں بہت پیسہ چاہیے..... اچھا ہوا آپ آگئے اور میری آپ سے بات ہو گئی۔ سر اگر ممکن ہو سکے تو انسانیت کے نامے ہی ان کی مدد کر دیجئے.....“ مسز انفال نے امدادی سے کہا تو حیدر کے لیے مزید وہاں رکنا محال ہو گیا۔

”ٹھیک ہے میں پھر آؤں گا.....“ وہ دروازے کی طرف منہ کر کے جلدی سے باہر نکل آیا۔ گاڑی میں آ کر اس نے رومال اپنی آنکھوں پر رکھا۔ جیسے ہی رومال نے آنکھوں کو چھوا نہ جانے کہاں سے آنسو بغیر کسی رکاوٹ کے رومال میں جذب ہوتے رہے۔ مسز انفال کے الفاظ مسلسل اس کے کانوں میں گونج رہے تھے..... ”انسانیت کے نامے ان کی مدد کر دیجئے۔“ اسے اس پر، اس کی قسمت پر شدید دکھ ہو رہا تھا۔ اس نے تو مس

افصال سے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ اس وقت وہ کہاں تھی وہ اس کے بارے میں اس قدر پوچھی ہو چکا تھا کہ اس کا سامنا کرنے سے بھی گھبرار ہا تھا۔ وہ کافی دیر یونہی بے مقصد سڑکوں پر گھومتا رہا۔ وہ کسی سے سب کچھ و سکس کرنا چاہتا تھا۔ شہلا کو ڈانٹنا چاہتا تھا مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ شہلا پہلے ہی ناراض تھی اور..... اس کا سامنا کرنے کی اس میں ابھی ہمت نہ تھی وہ اپنے حوصلے کو یکجا کرنا چاہتا تھا۔ بچھلے کئی دنوں سے وہ اندر ہی اندر شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ مگر پہنچا تو اطلاع ملی کہ اسد علی شاہ پاکستان پہنچ گیا ہے اور اسی شام ان لوگوں نے حیدر اور اس کی دونوں بہنوں کو کھانے پر انواہیٹ کیا تھا۔ ایک دفعہ پھر اس سے ملنے کا موقع ضائع ہو گیا۔

”حیدر تم مجھے کچھ پریشان لگ رہے ہو۔“ تبسم آپا نے راستے میں اس سے پوچھا۔

”نہیں..... ٹھیک ہوں آپا..... ایسی کوئی بات نہیں۔“

”بیٹی سے جدائی کا دکھ ہوگا۔“ قاطمہ آپا مسکرا کر بولیں۔

”شہلا بھی مجھے ناراض ناراض لگ رہی ہے، حیدر بھائی کیا ابھی تک وہ.....؟“

”معلوم نہیں..... شاید.....“ حیدر آہستہ سے بولا۔

”اس کا کیا حال ہے.....؟“ تبسم آپا نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”معلوم نہیں.....“

”کیوں تم اس سے ملے نہیں.....؟“

”نہیں.....“

”کون..... اور آپ لوگ کس کی باتیں کر رہے ہیں؟“ قاطمہ آپا بے مبری سے بولیں۔ دونوں جھابھا خاموش رہے۔ تبسم آپا نے حیدر کی

طرف دیکھا اور حیدر نے آپا کی طرف..... مگر کوئی بھی کچھ نہ بولا۔

”آپ شہلا کی بات تو نہیں کر رہے.....“ قاطمہ آپا جلد ہی بھانپ گئیں۔

”ہاں“ حیدر نے جواب دیا۔

”کیا وہ پاکستان میں ہے.....؟“

”ہاں.....“

”کیسی ہے وہ..... کچھ مجھے بہت یاد آتی ہے بہت اچھا وقت اس کے ساتھ گزارا ہے۔ بڑی پیاری سی بہن تھی ہماری..... آپا کسکی روز اس

سے ملنے نہ ملیں۔“ قاطمہ آپا کی طبیعت میں ابھی تک جلد بازی اور بے پروائی سی تھی۔ دونوں پھر خاموش رہے۔

”وہیے حیدر تم بھی ابھی تک اسے نہیں بھلا پائے.....“ قاطمہ آپا نے مسکراتے ہوئے مذاکات کیا تو دونوں نے قدرے خستے سے ان کی

طرف دیکھا۔

”فاطمہ..... تم کس قدر غیر متعینہ ہاتھیں کر رہی ہو۔ تم ابھی تک نہیں بدلیں۔ وہ بیٹی کی شادی کر رہا ہے اور تم کیا قصے لے کر بیٹھ گئی ہو۔“ تبسم
آپا نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”آپا تو اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ یہ تو بیومن منجر ہے۔ انسان کے اندر کے احساسات اور جذبات تو نہیں بدلتے نا۔۔۔۔۔
جا رہے کچھ بھی ہو جائے۔“

”لیکن بعض اوقات وقت اجازت نہیں دیتا کہ ایسی باتوں کو دیکھیں کیا جائے۔ اس لیے بھر ہے کہ اس بات کا ذکر نہ ہی کیا جائے اور سنو
شہلا کے سامنے بالکل ہی ذکر نہ کرنا۔“ تبسم آپا نے انھیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

حیدر خاموشی سے منتظر رہا اور نہ اس کا دل جا رہا تھا کہ تبسم آپا سے سب کچھ دیکھیں کرے۔ تبسم آپا کے ساتھ شروع سے اس کی بہت اذیت
اسٹینڈنگ تھی۔ وہ اسے تائی اماں کی طرح ہی ٹریٹ کرتی فاطمہ آپا اور تبسم آپا میں دس سال کا فرق تھا اور حیدر ان دونوں سے چھوٹا تھا جب اس کے
والدین حادثے کا شکار ہو گئے۔ حیدر صرف چھ ماہ کا تھا جب تائی اماں نے اس کی دوسری سنبھالی۔ تائی اماں اس وقت کافی بوڑھی ہو چکی تھیں اور تبسم
آپا کا کالج جاتی تھیں۔ تب سے حیدر ان کے ساتھ بہت اٹچھڑتا تھا۔ شہلا اور حیدر کو تبسم آپا نے بہت محبت سے پالا تھا۔ دونوں کی عمروں میں صرف چند ماہ
کا فرق تھا۔ آپا ایک طرف حیدر کے منہ میں فیڈر دیتیں ایک طرف شہلا کے..... اور ان دونوں کے درمیان بچپن دیکھ دیتیں مگر دونوں تھوڑی دیر بعد ایک
دوسرے سے متنفر گھٹا ہوئے ہوتے۔ ایک دوسرے کے فیڈر دھینچتے۔ آپا ہر رات دونوں کو اپنے پاس لٹا کر کہانیاں سناتیں۔ ان کے جھگڑے
نمٹاتیں۔ فاطمہ آپا ان دونوں سے بڑی تھیں اس لیے اکثر انھیں ڈانٹتی رہتیں، وہ بھی بہت پیار کرتیں مگر ان کے پیار کا انداز مختلف تھا وہ پہلے باتیں،
ڈانٹیں پھر مٹاتیں اور پیار کرتیں۔ تبسم آپا کی محبت میں صرف ٹھنڈک اور سکون تھا جبکہ فاطمہ آپا کی محبت میں مذاق اور مار کٹائی زیادہ تھی۔ جیسے جیسے وہ
بڑے ہوتے گئے دونوں میں لڑائی جھگڑا کم ہوتا گیا اور شدید محبت پیدا ہو گئی۔ حیدر نے جب کالج سے آنا ہوتا تو تبسم آپا کی جگہ دہ جاتی رہتی۔ اس کے
کھانے پینے اور ہر ضرورت کا خیال رکھتی۔ ان کی اس محبت کو فاطمہ آپا بھرپور اعزاز میں انجوائے کرتیں۔ کبھی شہلا کو لٹلی کہہ کر پکارتیں اور اسے
بجھتیں..... وہ حیدر سے بھی مہر عام مذاق کرنے سے باز نہ آتیں اور وہ مسکرا کر ہار لکھ جاتا۔ تبسم آپا، فاطمہ آپا کو اکثر ان باتوں پر لڑا کرتیں مگر وہ بھرپور
قیسم کھاتی ہوئی ہار لکھ جاتیں یہ تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کا ملاپ نہیں ہوگا۔

ہر کوئی ذاتی طور پر تیار تھا کہ حیدر کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد شہلا ہمیشہ کے لیے اس کی ہو جائے گی مگر سید صاحب کے اچانک فیصلے نے
سب کو دنگ کر دیا۔ ہر کوئی سوچ میں پڑ گیا کہ دونوں کیسے ایک دوسرے کے بغیر جی پائیں گے۔ اس واقعے کے بعد حیدر نے جو تنہائی کا لہوہ اوڑھا
اور اپنی زندگی سے خوشیوں اور مسرتوں کو خیر باد کہا تو پھر کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ اس کے سامنے کسی بھی بات کا ذکر کیا جاتا۔ فاطمہ آپا سا بیواں بڑا ہی
گلیں۔ کبھی کبھار گاؤں آتا ہوتا اور اکثر دونوں بہنوں کی ملاقات ہی نہ ہونے پاتی۔ یہ موقع ایسا تھا کہ حیدر نے دونوں کو بلا لیا اور حیدر کی محبت میں
دونوں گھبراہٹ چھوڑ کر آ گئی تھیں۔ تبسم آپا حیدر سے اپنی اولاد جیسی محبت کرتی تھیں۔ اس کے احساسات کو سمجھتی تھیں اور ہر قدم پر اس کے احساسات اور
جذبات کا خیال رکھتی تھیں۔ اندر سے تبسم آپا بھی شدید جتنی تھیں کہ شہلا سے ملاقات ہو۔ وہ اسے دیکھتا اور پیار کرنا چاہتی تھیں مگر حیدر کے سامنے کوئی

ابھی ایسی بات کر کے وہ اس کے جذبات کو ٹھیک نہیں سمجھتا تھا۔ حیدر بھی ان سے اس کی باتیں کرنا چاہتا تھا اور انہیں اس سے ملنا چاہتا تھا مگر منیٹ بھائی کے سمجھانے پر اب وہ ان کے سامنے بھی کوئی بات نہیں ڈیرنا چاہتا تھا اور پٹا اور میں گھر سے رخصت کرتے وقت آپا نے بھی تو یہی کہا تھا کہ ماضی جب کہیں دفن ہو چکا ہے اسے دفن ہی رہنے دو۔ اسے کرید کر حال کو قبرستان مت بناؤ۔ اس نے جب ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس سے رابطہ نہیں کرے گا اور اسی لیے واپس آنے کے بعد اس نے شہلا کو بھی فون نہیں کیا تھا اور نہ ہی کسی قسم کا رابطہ کیا تھا۔ وہ آپا کی کبھی ہوئی باتوں کا بہت احترام کرتا تھا۔ ماں جیسی بہن کا وہ دل سے متفق تھا۔ ان کا کہنا نہ بھی ٹالا تھا اور نہ ہی رد کرنے کی کوشش کی تھی۔

اسد علی شاہ سب کو بہت پسند آیا۔ وہ شہلا کے لیے بہترین بچہ تھا۔ شادی کی تاریخ تو پہلے ہی طے ہو چکی تھی۔ بس دوسری اہم باتیں دیکھ کر باقی تھیں۔ شادی کی تیاریاں بھی تقریباً مکمل تھیں۔ حیدر کی مصروفیات میں پہلے سے کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا مگر وہ اس کے ذہن میں تھی۔ بار بار فون ملا تا مگر جواب عمار و شادی سے فارغ ہو کر وہ جلد از جلد اس کے پاس جانا چاہتا تھا مگر اس دوران ہی اس نے مس انفصال کو دو لاکھ کا چیک بھجوایا اور ساتھ ہی تاکید کی کہ وہ کسی سے اس کا ذکر نہ کریں۔



آفاق کئی روز سے مگر نہیں آیا تھا۔ ملک منصور انکیشن کے سلسلے میں دن رات مصروف تھا۔ کئی بار شرا کو بھی جلسے انیٹڈ کرنا پڑتے۔ محرر مگر میں بیٹھے بیٹھے سخت ہر ہو گئی تھی۔ شام ہو رہی تھی اس نے کلب جانے کا سوچا۔ آج وہاں اچھی خاصی گید رنگ تھی۔ وہ حیران تھی کہ آج ایسی کیا خاص بات ہے کہ سب خواتین یہاں جمع تھیں۔ مسز زہر نے اسے دیکھ کر بیہودہ سا نعرہ لگایا تو سب نے ان کا ساتھ دیا اور ایک گونج دار تہقہ فضا میں بلند ہوا۔ ”بہت دنوں بعد یہ چاندھر نکلا ہے۔۔۔۔۔ کوئی خیر خبری نہ دی کہ آج کل چاند کی اس چاندنی سے کون لطف اندوز ہو رہا ہے۔“ مسز زہر نے اسے اپنے قریب جگہ دیتے ہوئے کہا۔

”مسز زہر چھوڑیے یہی۔۔۔۔۔ یہ تو بتائیے آج اتنی روٹیں کس سلسلے میں ہے۔ کیا کوئی اہم بات ہے یا پھر ملک میں کوئی آفت آگئی ہے کیونکہ ایسی گید رنگ یا تو ملک و قوم کے ساتھ خالی خالی ہمدردی کے لیے ہوتی ہے یا پھر کسی اور اہم بات کے لیے۔۔۔۔۔“ اس نے آنکھ دبا کر کہا اور مسز زہر کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

”یہ تم بھی کمال کرتی ہو۔۔۔۔۔ میں تمہیں فون کرنے کا سوچ ہی رہی تھی تم نے بھی رابطہ نہیں کیا۔ بڑی ذمہ دہت خبریں ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ مس حیدر کی شادی ہو رہی ہے۔۔۔۔۔“ مسز زہر نے کہا۔

”واقی۔۔۔۔۔ ذمہ دہت۔۔۔۔۔ لیکن یہ سب کب اور کیسے ہو رہا ہے۔۔۔۔۔؟“

”کیوں بھی یہ ناممکنات میں سے تو نہیں جو تم یہاں چوکی ہو۔۔۔۔۔“ مسز اکمل اپنی لے میں بولیں۔ وہ ہر ایک کو کھج کر جواب دینے کی عادی تھیں اس لیے کوئی بھی ان سے زیادہ غری ہونا پسند نہیں کرتا تھا۔

”وراصل۔۔۔۔۔ اچانک اچھی خبر سن کر انسان چونک ہی جاتا ہے۔۔۔۔۔“ مسز سعید نے اسے لیٹھ کرنا چاہا۔

”اچھا تو کہاں ہو رہی ہے۔۔۔“

”اپنے ہی کسی کزن سے۔۔۔ سید لوگ ہیں غیر ذات میں تو جانے نہیں ورنہ شہلا حیدر کے لیے رشتوں کی کمی تو نہیں تھی۔۔۔“ مسز عید نے

جواب دیا۔

”ہاں تو اورز ہمدست خبر کیا ہے۔۔۔؟“ اس نے سرگوشی کے انداز میں مسز ہیر سے پوچھا۔

”ابھی بتاؤں گی بڑی مسالے دار خبر ہے۔ بس ان لیڈرز کو ادھر ادھر ہو لینے دو۔۔۔“ مسز ہیر نے بھی سرگوشی کی۔

”واقعی کوئی ایسی خبر ہے۔۔۔“

”ہاں بھئی۔۔۔ تم بھی انجوائے کر دو گی۔“

”کہیں سچے بدلے کی کہانی تو نہیں۔۔۔“ اس نے طریقہ انداز میں کھیل بات نہ ہرائی۔

”ارے نہیں بھئی۔۔۔ اس سے بھی گرم گرم۔۔۔ ہیں تو مسز اکمل آپ کیا کہہ رہی تھیں۔۔۔ واقعی اس وقت تو ملکی سیاست کا اللہ ہی حافظ

ہے۔۔۔ کون جیتے گا کون ہارے گا کچھ بھی کہنا نقل از وقت ہے۔“ مسز اکمل کو انھوں نے طریقہ انداز میں کہا کیونکہ مسز اکمل کے شوہر دو دفعہ الیکشن

ہارنے کے بعد پھر ہارے جوش و خروش سے سیاست کے میدان میں اترے تھے اور اب اپنی جیت کے بارے میں بہت بڑا اعتماد تھے۔ مسز ہیر ادھر

ادھر کی باتیں لیڈرز کے ساتھ کر رہی تھیں اور وہ بار بار پہلو بدل رہی تھی کہ کب اسے وہ بات سنا لیں جس کے لیے وہ اتنا انتظار کر رہی تھی۔

”مسز ہیر اب سنا بھی لیں۔“ اس نے موقع غنیمت جان کر کہا۔

”اچھا آؤ ڈاک کریں۔۔۔“ اور وہ لان کے ایک کونے میں اسے لے گئیں۔ ”یار بڑے حرے کی خبر ملی ہے۔۔۔“

”کیا۔۔۔؟“ بتا بھی وہ اب۔۔۔

”حیدر شاہ کی محبوبہ دریافت ہو چکی ہے۔۔۔“

”کیا مطلب۔۔۔؟“ اسے جیسے کرکٹ لگا۔

”ہاں بھئی۔۔۔ کوئی مسز ہیر ہے اور درکنگ ویمن ہاسٹل میں رہتی ہے۔۔۔ حیدر شاہ اس کا بڑا اچھا عاشق نکلا۔۔۔ سچ مجھے تو رشک آتا ہے اس

عورت پر۔۔۔ بند دیکھی کیسا زبردست پھانسا۔۔۔ مجھے تو اس عورت سے ملنے کا کرپڑ ہو رہا ہے۔۔۔“ وہ حسرت بھرے لہجے میں بولیں۔

”مسز ہیر میں بھی اس سے ملنا چاہوں گی مگر آپ کو یہ ساری خبر کس نے دی۔۔۔؟“

”کو۔۔۔ میری خبریں کبھی جھوٹی نہیں ہوتیں اور شہلا کی باپ کے ساتھ ناراضی کی وجہ بھی وہی عورت ہے۔۔۔“

”واقعی۔۔۔؟“

”اور نہیں تو کیا۔۔۔ چلو کسی دن یہاں سے درکنگ ویمن ہاسٹل چلتے ہیں۔ اس عورت سے ملنے۔۔۔ میں بس حیدر شاہ کی چوائس دیکھنا

چاہتی ہوں۔ کلب کی کئی خواتین نے بڑی کوشش کر دی تھی مگر وہ تو کس کی بات سننا گوارا نہیں کرتا۔۔۔ اور سناؤ تمھارے سانس سرسرا کیا حال ہے۔۔۔“

..... آج کل تمہاری ساس اینکشن کمپن میں بہت آگے آگے ہیں۔ لگتا ہے تمہارے سر کے ساتھ ان کی خوب بندوبست ہے۔۔۔۔۔ دو قبہ لگا کر پولی۔۔۔۔۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ظاہر ہے۔۔۔۔۔ ان کی ذات سے ان کو ظاہر ہے ہی قائم ہے ہیں۔“

”اور ہاں تمہارا شو ہر آج کل کن چکروں میں ہے۔۔۔۔؟“ مسز دہر کی کوششیں والی نہیں تھیں۔ ہر ایک کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیتی تھیں۔

”ووہ۔۔۔۔۔ وہ بھی ٹھیک ہے۔۔۔۔۔“ وہ گھبرا کر پوچھی۔

”تمہیں اسے قلعے میں جکڑنا نہیں آتا۔ بڑے پر پڑے نکال رہا ہے۔ سنا ہے کسی مدبر کے ساتھ اس کا چکر ہے..... ہاں..... مدبر

بھی تو اسی ہاٹل میں رہتی ہے۔۔۔ تم اپنی رقیب سے مل لیتا میں اپنی سے۔۔۔ اس نے پھر قہقہہ لگایا۔

”مسز زہیر کیا مطلب..... میں کبھی نہیں۔“

”پار..... تم میں بھی حمل کی بڑی کمی ہے..... سٹارٹین حیدر میں ہم بھی تو شامل ہیں۔ بس نہ جانے کیسے..... کب..... کہاں اس شخص سے

خیر..... تم بھی اپنے شوہر کو قاضیوں میں رکھو..... کسی دن مددگار ملے گا..... تو میں تمہاری بھینسی..... اور تم

”وہاں بھی نہیں جاسکو گی جہاں سے آئی ہو.....“

مسز زہر نے ایسا تیرا اٹھا کہ وہ چلنے لگی۔ مسز زہر انتہائی کینہ پرور عورت تھی جو ہر وقت قیمتی زیورات، ملبہ سات اور خوشبوؤں سے

لیبریز ہوتی مگر اس کاغذ رانا سیاہ اور گندہ تھا کہ وہ کسی پر بھی کچھ اچھا لٹنے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ اسی لیے وہ ہر ایک کی کزوری جاننے کی تاک

میں رہتی۔ کسی نہ کسی کی کوئی نہ کوئی بات ایسے فتنوں کے لیے ضرور اپنے پاس محفوظ رکھتی۔ سحر کے لیے وہیں رکنا محال ہو گیا تھا۔ دو دو چار باتیں کرنے

کے بعد خدا حافظ کہتے ہوئے باہر نکل آئی۔

مسز زہرا اکثر اسے بچی بچہ کیا کرتی تھیں کسی نہ کسی بات کی طرف اشارہ کر کے گھڑا ج تو حد ہی کر دی تھی ہر بات صاف صاف اس کے

منہ پر دے ماری تھی اور خاص طور پر آفاق کے حوالے سے اور اس کے اپنے حوالے سے اسے شدید صدمہ ہوا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سبز

زیر نے بھری محفل میں اس کے نکلے جسم پر چابک مارے ہوں۔ آسوا ایک دم اس کی آنکھوں میں حیرنے لگے۔۔۔۔۔ انسان کہیں بھی چلا جائے ماضی

سے فرار ممکن نہیں اور حال ہمیشہ ماضی کی طرف دھکیلتا ہے اور مستقبل دونوں سے جواب طلب کرتا ہے۔۔۔ انسان کچھ بھی ہو جائے کہیں بھی چلا

جائے..... اس کا اصل ہیرو منہ کھولے اس کی طرف دیکھتا رہتا ہے.....

دو بار بار آفاق کا نمبر ملتا رہی تھی مگر کوئی اٹھا نہیں رہا تھا۔ آفاق کو تین دن ہو گئے تھے وہ مگر نہیں آیا تھا اور یقیناً کوئی ایسی ویسی بات ہوئی

ہوگی جو سزا دہر کو خبریں پہنچے تھیں۔ اس کے ذہن میں سزا دہر کی باتیں گونج رہی تھیں۔ اس کا ذہن ایک نام پر ایٹک گیا تھا۔ ”مردخ.....“ آفاق اور

“مصدقہ“

گھبرا نکل ہنسان ہو رہا تھا۔ ہیران میں کہیں کہیں روشنی تھی۔ چوکیدار گیٹ پر تھا۔ اتنے بڑے گھر سے اسے وحشت ہو رہی تھی۔ رات کی

تارکین میں جیسے جیسے احناف ہو رہا تھا۔ اسے ہر شے سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کہیں بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اس نے ایسی تنہائی، ایسا خوف کبھی بھی

دعگی میں محسوس نہیں کیا تھا۔ دوسو سوچ کر تھک گئی تھی۔ وہ کسی سے بات کرنا چاہتی تھی مگر کوئی بھی تو ایسا نہ تھا۔۔۔۔۔ یہ کیا مگر تھا جہاں ایک دوسرے سے بات کرنے کو ترے۔۔۔۔۔ کوئی بھی کسی کے ساتھ وقار نہ تھا ہر کوئی مفاو کا بندہ تھا۔ کسی کو کسی سے کوئی فرض نہ تھی۔ نہ محبت نہ الفت شاید نفرت بھی نہیں۔۔۔۔۔ وہ دعگی میں پہلی دفعہ اس گھر میں کھل کر روئی۔۔۔۔۔ وحال میں مار مار کر۔۔۔۔۔ اپنی بے بسی پر۔۔۔۔۔ اپنی تنہائی پر اور شاید اپنی بے عزتی پر۔۔۔۔۔ اس نے جس سے بھرے دو تین سگرے پیے۔۔۔۔۔ وہ آج اپنے آپ کو ختم کرنا چاہتی تھی۔ وہ بے سندھ پڑی تھی۔ نہ جانے کس وقت آفاق آیا۔۔۔۔۔ اسے کوئی ہوش نہ تھا، آفاق خود بھی تو نے کی کیفیت میں تھا اسے کسی کی کیا پروا۔۔۔۔۔ صبح دیر سے اس کی آنکھ کھلی تو آفاق اس کے پہلو میں سو رہا تھا۔

”آفاق تم کب آئے۔۔۔۔۔؟“ اس نے اسے بھونچتے ہوئے پوچھا۔

”پتا نہیں۔۔۔۔۔“ وہ دھوٹی کے عالم میں بولا۔

”کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم کتنے دنوں بعد مگر آئے ہو۔۔۔۔۔؟“

”مجھے نہیں معلوم۔۔۔۔۔“

”تو تمہیں کیا معلوم ہے۔۔۔۔۔؟“

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔“ وہ بھر سوجیا۔

”اس کے پاس جب ہوتے ہو تو تمہیں سب کچھ معلوم ہوتا ہے۔“ وہ طعنے میں بولی۔

”تھک مت کرو۔۔۔۔۔ چپ کر جاؤ اور مجھے سونے دو۔“

”نہیں سونے دوں گی۔۔۔۔۔ تم نے میری بندہ میں حرام کر دی ہیں اور میں تمہیں آرام سے سونے دوں۔“

”منطقی دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔۔۔۔۔“ آفاق نے سوئے سوئے اٹھاڑ میں کہا۔

”کیا بکواس کی تم نے۔۔۔۔۔“ اس نے آفاق کو تنہوڑ کر اٹھایا اور اس کا بازو مروڑا۔۔۔۔۔ غصے سے اس کا خون کھول رہا تھا۔۔۔۔۔ اس کا اصل۔۔۔۔۔

اس کا منہ ہی بار بار سامنے آ رہا تھا۔۔۔۔۔

”تم۔۔۔۔۔ تمہاری یہ جرات۔۔۔۔۔“ آفاق نے اٹھ کر گھولوں سے اس کی تواضع شروع کی تو رکسنے میں نہ آ رہا تھا۔

”تم آج مجھے ختم ہی کر دو۔۔۔۔۔ تاکہ یہ قصہ ہی پاک ہو۔“ اس نے چاقو آفاق کی طرف پھیٹا۔

”تم کیا سمجھتی ہو۔۔۔۔۔ تمہیں مار کر میں اپنے آپ کو عذاب میں ڈالوں اور سنو تمہیں بھی میں یوں آسانی سے مرنے نہیں دوں گا۔۔۔۔۔ تمہاری

بونیاں کتوں کے آگے لال دوں گا مگر تمہیں بھر بھی مرنے نہیں دوں گا۔“

”تم میرا قصور تو بتاؤ۔۔۔۔۔ آخر تم کیوں اتنے سفاک ہو گئے ہو؟“ وہ روئے ہوئے بولی۔

”میں تم سے۔۔۔۔۔ اور تمہارے جیسی سب عورتوں سے نفرت کرتا ہوں۔ تم عورتیں صرف تپاؤ پر باد کرتی ہو۔۔۔۔۔“

”اور مدد نہ۔۔۔۔۔ مدد نہ۔۔۔۔۔“

”ہاں..... ہیں۔ اس سے بھی غرت کرتا ہوں۔“ وہ خیمے سے چلا یا۔ اور اسے جیسے ایک دم سکون مل گیا ہو جیسے اس کے چلتے پھرتے ہونے کی خبر مل گئی ہو۔ وہ مسکراتی ہوئی اٹھی۔

”آفاق..... تم میرے ساتھ جو مرضی کر لو۔۔۔۔۔ میری بیویاں بھی کتوں کے آگے ڈال دو مگر مددِ غ سے شادی نہ کرنا۔۔۔۔۔ اس کو کبھی میرے سامنے نہ لانا۔۔۔۔۔ بس مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔“ وہ محبت سے اس کے گلے لگ کر بولی۔

”بیچھے ہو۔۔۔۔۔ میں تم سب سے تنگ آ گیا ہوں۔۔۔۔۔ نہ جانے کیوں میں نے تم سے شادی کی۔۔۔۔۔“

”اور آفاق میں نے بھی۔۔۔۔۔ میں بھی کیسی سزا بھگت رہی ہوں کاش تم جان سکو۔۔۔۔۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”تم..... تم تو یہاں بیش سے رہ رہی ہو۔۔۔۔۔ کس چیز کی کمی ہے یہاں۔“

”یہاں کمی ہی کی تو ہے۔ انسانوں کی..... محبوں کی..... اور سچے جذبیوں کی۔ تمہارے اس گھر میں چیزیں تو بہت ہیں مگر انسان نہیں

ہوتے۔ یہاں کچھ بھی نہیں۔“ وہ خالی نظروں سے کمرے کا جائزہ لے کر بولی۔ وہ بے دم سا ہو کر بستر پر لیٹ گیا اور وہ خاموشی سے اس کے لیے ناشتہ لینے چلی گئی۔

مما کی رپورٹس آنچلی تھیں اور ولیم بے حد پریشان تھا۔ ٹیوٹر اچھا خاصا پھیل چکا تھا۔ آپریشن بہت ضروری تھا مگر اس کے لیے پیسے بالکل

نہیں تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ممما کی زندگی خطرے میں تھی۔ اس کا پورا جسم بری طرح کانپ رہا تھا اور آنکھوں میں آنسو بار بار آرہے تھے۔ آئے نور اس کی ٹیبلٹ کو سمجھ رہی تھی اسے بھی یہ جان کر بہت دکھ ہوا تھا۔

”ولیم تم کیسے بی چوک رہے ہو۔۔۔۔۔ اس وقت تمہاری ممما کو تمہارے حوصلے کی ضرورت ہے تمہارے آنسوؤں کی نہیں۔۔۔۔۔ اور پلیز میرے

سامنے اپنے آپ کو اتنا کمزور اور بے بس نہ دکھایا کرو۔۔۔۔۔“ آئے نور زرا سخت لہجے میں بولی۔

”نور..... اتنی بڑی بات ہو جائے اور انسان کو صدمہ بھی نہ ہو۔۔۔۔۔ تم کیسی ہلکی ہو۔۔۔۔۔؟“

”ہاں میں ایسی ہی ہوں۔ میں نے تمہیں کہا تھا کہ میں زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی عادی ہوں۔ مجھے روتے، منہ

بھرتے لوگ سخت ناپسند ہیں۔“

”تو پھر میں کیا کروں۔۔۔۔۔؟“ وہ بے بسی سے بولا۔

”بہادر اور حوصلہ مند انسان ایسے لمحوں میں کیا کرتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ تمہیں خود سوچنا ہے۔۔۔۔۔ کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔۔۔۔۔ تم کب تک یوں

دوسروں کے سہارے چلتے رہو گے۔ تم تو روٹنگ اسٹون ہو۔ کبھی ممانے لگ لگاؤ کی کبھی قادر نہ۔۔۔۔۔ تو کبھی نور نہ۔۔۔۔۔“ وہ خفگی سے بولی۔

”میں تم سے آئندہ بات بھی نہیں کروں گی۔۔۔۔۔“ وہ یک اٹھا کر چل دی۔

”پلیز نور..... ایسا مت کرنا۔۔۔۔۔ ورنہ میں..... میں.....“

”میں کیا بولو۔۔۔۔۔؟“ وہ خیمے میں اس کی طرف مڑی۔

”کچھ نہیں۔“

”بات مکمل کرنے کا بھی تم میں حوصلہ نہیں۔ تم کیا کرو گے۔۔۔۔۔ مجھے تم بہت مایوس کر رہے ہو۔۔۔۔۔ میں تو تمہیں بہت سمجھا رہی تھی مگر تمہارا

رویہ بالکل ہی گناہ ہے۔“

”نور۔۔۔۔۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔۔۔۔۔ میرے پاس صرف یہی اس ہے۔“

”اور کیا تم جانتے ہو کہ میرے پاس کوئی بھی نہیں۔۔۔۔۔ اس کے اس انکشاف پر وہ چونک گیا۔

”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“

”میں ناکچھ کلاس میں تھی جب میری ماں نے میرے ہاتھوں میں دم توڑا۔۔۔۔۔ اور جانتے ہو۔۔۔۔۔ اس کے چھ ماہ بعد ڈیڑی کی ڈیڑہا ڈی

امریکا سے آئی ان کا وہاں ایکسٹنٹ ہوا تھا ان کی ڈیڑہا ڈی کے ساتھ خود میں قبرستان گئی تھی۔ کیا بھی تم نے کچھ میرے منہ سے سنا۔۔۔۔۔ میرے منہ

سے مایوسی اور بدولی کی باتیں۔۔۔۔۔ میں اتنی ہی عمر میں کیسے بے آسرا ہوئی اور کون کون میرا سہارا بنا۔۔۔۔۔ مجھے کیسے کیسے تجربات ہوئے۔۔۔۔۔ اور میں کیسے

اتنی بچھوڑ ہو گئی۔ تم کیا جانو۔۔۔۔۔ تمہیں تو رونے دھونے سے ہی فرصت نہیں۔۔۔۔۔ مجھے اپنی چوڑاں پر بھی آنسوؤں سے کہ میں نے محبت بھی ایسے شخص سے کی

جو میرے لیے کبھی ڈھال نہیں بن سکے گا۔ میرے آنسو نہیں پونچھ سکے گا بلکہ مجھے خود ہی سارے کام کرنے پڑیں گے۔۔۔۔۔ دیکھو ناکسی بیلہ لگ

ہے۔۔۔۔۔“ وہ ہونٹ سکوڑتے ہوئے بھیدگی سے بولی۔

”آئی ایم رٹل سوری۔۔۔۔۔“

”اٹس آل رائٹ۔۔۔۔۔ مجھے تمہاری اس سوچی اور لفظی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔ میں اب بہت پرکٹیکل ہو چکی ہوں۔ میں نے خالی

لفظوں پر یقین کرنا چھوڑ دیا ہے۔۔۔۔۔ میں حقیقت کی تلاش میں رہتی ہوں۔“

”تم نے مجھے کبھی بھی اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔۔۔۔۔“ وہ شکایتی لہجے میں بولا۔

”مجھے ہمدردیاں سہینا سخت ناپسند ہے اور اپنے بارے میں کسی کو کچھ بتا کر میں ہمدردیاں نہیں سہینا چاہتی۔۔۔۔۔ اس کبھی اتفاق بھی ایسا نہیں

ہوا۔ بہر حال آج تو تم جان گئے ہوتا۔۔۔۔۔“

”اور تمہارے بہن بھائی۔۔۔۔۔ وہ سب کہاں ہیں؟“

”کوئی بھی نہیں۔۔۔۔۔ میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی اور ان کی شادی کے چند روز سال بعد پیدا ہوئی۔ میری پیدائش امریکا میں ہوئی

اور زیادہ تر وقت میں امریکا میں گزارتی رہی ہوں۔ ڈیڑی کی ڈیڑہ کے بعد میں کہیں نہیں گئی۔ اب چند دن بڑے چچا کے پاس رہتی ہوں۔ چند دن

چھوٹے چچا کے پاس چند دن چھوٹے چچا کے پاس۔ میرا تو کوئی مستقل ٹھکانا نہیں۔ ڈیڑی نے کافی پیار اور امریکا میں پر اپنی میرے لیے چھوڑی ہے۔

جیب خرچ گاڑی کا خرچہ اور دوسری ضروریات کے لیے خرچہ بڑے چچا سے ملتا ہے۔ بس اور کچھ نہیں۔“

”کیا تم اپنی زندگی سے مطمئن ہو۔۔۔۔۔“

”ہاں..... اگر نہ بھی ہوں تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ اس لیے مطمئن ہونا ہی پڑتا ہے۔ بے چینی اور اضطراب صرف ڈپریشن اور پریشانیاں ہی دیتا ہے اور کچھ نہیں..... اس لیے میں کرائس میں بھی مطمئن رہتی ہوں۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ وہ قدرے حیرت سے بولا۔

”میں قسمیں بھی ایسا ہی دیکھتا چاہتی ہوں۔ ولیم میں می، ڈیڑی کی موت کے بعد بہت ڈپریشن میں تھی یوں لگتا تھا جیسے میں سانیکو کیس سختی جاری تھی کہ ایک دن میں نے تنہائی میں سوچا کہ انسان تو اپنے خوابوں کے سہارے جیتا ہے اور گزر جائے وہ تو ماضی بن جاتا ہے اور ماضی تو کبھی مڑ کر واپس نہیں آتا۔ ہمیں اس شے کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے جو ہمارے ہاتھ آ سکے۔ مجھے میرے خواب بہت عزیز تھے اور خوابوں کا قتل مستقبل سے ہوتا ہے..... اب میں اپنے مستقبل کے لیے جدوجہد کر رہی ہوں۔ میں بے معنی کھوکھلی اور دوسروں کے سہارے زندگی نہیں گزارنا چاہتی۔“

”نور..... تمہارے خواب کیا ہیں.....؟“

”میرے خواب بہت سے ہیں لیکن میری خواہش ہے کہ جب میں مروں تو میرے لیے زمین بھی روئے اور آسمان بھی..... میں انسانیت کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔“

ولیم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور مزید کچھ نہ پوچھ سکا۔

”ولیم اب تم ہمارے میری زندگی سخت گزری ہے یا تمہاری.....“

”جو جس پر گزرتی ہے وہ اسے ہی لگ جاتا ہے لیکن تمہاری بھی یقیناً بہت لمبا لائف گزری ہے۔“

”گزری نہیں..... اب بھی گزر رہی ہے مگر..... خیر تم اپنی سوچ کہ اب تم نے آئی کو کس طرح ذیل کرتا ہے..... کیا انھیں سب علم ہے۔“

”جہنمیں..... صرف میں اور آئی افسانہ جانتے ہیں۔ لیکن نماز یاد تر کرے میں رہتی ہیں۔ میرے خیال میں ان کا آپریشن جلد از جلد ہو

جانا چاہیے۔ ٹیسٹ تو ہو گئے مگر.....“

”ہاں ابھی سب کچھ ہو جائے گا۔ میری ماما کی جیڈری میرے پاس ہی ہے۔“

”جہنمیں..... میں یہ نہیں اوں گا۔“

”تم مجھے لوٹا دو گے جب کسی قابل ہو جاؤ گے ورنہ میں یہی سمجھوں گی کہ میں نے اپنی ماں کی بیماری کے لیے انھیں سچ دیا لیکن سنا اگر تم کسی

قابل ہوئے اور مجھے نہ لوٹا پائے تو میں سمجھوں گی تم نے امانت میں خیانت کی ہے۔“ وہ اس کی بات پر حیران رہ گیا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”یوں کیا دیکھ رہے ہو.....؟“ نور نے منہ دوسری طرف کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھ رہا ہوں کہ گاؤں نے کیسے کیسے عجیب لوگ بنائے ہیں.....“

”ہاں ابھی مجھے کسے سمجھے نہیں آتے..... اور مجھے کس عجوبے میں شمار کرتے ہو؟ ٹھوکیں میں یا ٹوئیں میں.....“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”پہلے اور آخری میں.....“

”وہ کیوں....؟“

”بھئی باقی سارے تو اپنی جگہ فکسڈ ہیں جیسے ہیں نظر آ رہے ہیں اور تم بہت ان پڑکٹ پہل ہو۔ کس لمحے کیسے ری ایکٹ کرو.... کوئی

نہیں جانتا....“

”شکر ہے تم نے اپنی رائے تو دی.... ولیم ویسے ایک بات میں جمیدگی سے سوچ رہی ہوں۔ آنٹی کی بیماری میں قصصیں برداشت ان کے پاس ہونا چاہیے اور ہاسٹل میں تم رہ نہیں سکتے۔ ہمارا گھر بند پڑا ہے میں بڑے چچا سے بات کر کے وہ کھلاتی ہوں۔ اگر وہ مان گئے تو تم لوگ ادھر شفٹ ہو جانا.... اب میں چلتی ہوں اور آنٹی کو میری طرف سے پوچھتا....“ وہ کاکڑ لگاتے ہوئے جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئی اور وہ حیرت سے اسے جاتا دیکھتا رہا۔ وہ جمیدگی سے اس کی باتوں پر سوچ رہا تھا کہ کس طرح ماما کو بتائے۔ اس کے لیے کتنے حوصلے کی ضرورت تھی۔ وہ تو ہمیشہ سے ماما سے ایسی باتیں سننے کا عادی تھا۔ اب ان کو کیسے، کس طرح سب بتائے.... وہ الفاظ سوچتا رہا، ہمت نکجا کرتا رہا، پھولیشن پر غور کرتا رہا.... کبھی اٹنا میں آنٹی افضال کا فون آ گیا۔ اس کی ماما کو دورہ پڑا تھا ان کی حالت بہت خراب تھی اور انہیں اسپتال لے کر جانا تھا۔

”آنٹی.... میں آ رہا ہوں بس کچھ....“

”سنو ولیم.... بیسوں کی فکرنہ کرو.... میرے پاس کچھ پیسے ہیں بس تم آ جاؤ۔“

”ٹھیک ہے آنٹی....“ اس نے فوراً فون کر کے بتایا۔

”ولیم میں آ رہی ہوں اور سنو تم نے آنٹی کو کچھ بتایا تو نہیں۔“

”نہیں، ابھی تو میں ان سے ملنے ہی نہیں گیا ابھی آنٹی افضال کا فون آیا ہے اور میں ہاسٹل جا رہا ہوں۔“

”میں بھی پہنچ رہی ہوں....“ اس نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔

”تو رہی کس کا فون تھا....“ اس کے بڑے چچا نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”اٹکل.... میرے کلاس فیلو کا.... اس کی ماما بہت بیمار ہیں۔ انہیں کینسر ہے اور اٹکل میں نے آپ سے اجازت لینی تھی کہ میں اپنا گھر

کچھ دنوں کے لیے انہیں دینا چاہتی ہوں۔ اس کی ماما ہاسٹل میں رہتی ہیں اور وہ خود بھی۔ اس وقت ان کے پاس کوئی آسرا نہیں۔“

”کیا نام ہے اس کا....؟“

”ولیم....“

”ولیم....“ اٹکل نے ذرا مت چڑھایا۔ ”تم کب سے اسے جانتی ہو....؟“

”اٹکل.... یہ کام میں انسانیت کے نامے کرنے جا رہی ہوں۔ اس لیے ایسے سوالات بے معنی ہیں۔“ وہ دھڑک لہجے میں بولی۔

”مگر میں ان کے بارے میں مطمئن تو ہونا چاہیے....“

”میں ان کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ لوگ کرپشن ہیں۔ ماما اس کی درنگ و دھن ہاسٹل میں چارہ سولہ سالوں سے رہ رہی ہیں۔ اب

کنسر کی پوسٹ ہیں اور وہ خود ایلول کا اسٹوڈنٹ ہے۔“

”کل کو وہ لوگ کوئی مسئلہ نہ پیدا کریں۔۔۔۔۔“

”مجبوراً وہ بے بس لوگ خود بہت بڑے مسئلے ہوتے ہیں دوسروں کے لیے کیا مسائل پیدا کریں گے۔ آپ بے فکر رہیے۔“

”نور۔۔۔۔۔ تم ابھی اتنی سمجھا رہی ہیں۔۔۔۔۔“

”انگل تجربہ بات انسان کو سب سمجھا دیتے ہیں۔ مجھے بھی کر لینے دیجئے۔۔۔۔۔“

”ٹھیک ہے جو تمہاری مرضی۔۔۔۔۔“ اس کے چچا اٹھیا اور ڈالتے ہوئے بولے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ اپنی بات منوانے کی ہمیشہ سے عادی ہے

اور جو کام وہ کرنا چاہے تو پھر کوئی اسے نہیں روک سکتا۔ سارے خاندان میں وہ خود سراسر ضدی مشہور تھی۔ بہت سے لوگوں کی اس کے بارے میں مختلف آراء تھیں جن کی وہ قطعی پروا نہیں کرتی تھی۔

”جینک برا انگل۔۔۔۔۔“ اس نے فارملائی کے طور پر کہا اگر نہ وہ جانتی تھی کہ انگل کی اس میں کوئی غلط نہ تھی۔ وہ اسے کسی طرح بھی نہیں روک

سکتے تھے اس نے تو محض انھیں اطلاع دی تھی۔

ڈاکٹروں نے انھیں غوری آپریشن کے لیے ایڈمٹ کر لیا تھا۔ آپریشن کر کے ٹیور نکال دیا تھا اور انھوں نے ابھی طرح سے اسے ریہود

بھی کر دیا تھا۔ وہ مسلسل ان کے ساتھ اسپتال میں رہی۔

”ولیم اب تم لوگ میرے گھر شفٹ ہو جانا۔ میں نے بڑے بچے سے بات کر لی ہے انھوں نے اجازت دے دی ہے اور اب تمہیں آنٹی کا

بہت خیال رکھنا ہے۔ میرا گھر ہر طرح سے آرام دہ ہے تمہیں اور آنٹی کو وہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں بھی زیادہ تر وقت ادھر ہی رہنے کی کوشش

کروں گی اور سرورق کو از سر میں ہمارا پرانا نوکر بن کر اور اس کی فیملی رہتی ہے تم لوگوں کو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔“

”جینک پلور۔۔۔۔۔“ مارے تفکر کے اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے وہ جہاں خاموش رہی اور اس کی طرف گہری نگاہ سے دیکھنے لگی۔

”ولیم آپریشن کی پوسٹ کیسے کی ہے۔۔۔۔۔“

”وہ۔۔۔۔۔ آنٹی افعال نے۔“

”میں نے تم سے کچھ کہا تھا۔۔۔۔۔“

”مگر میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی انھوں نے سب کچھ کر دیا تھا۔“

”ٹھیک ہے مگر ضرورت پڑی تو مجھے بتا دینا۔“ وہ ہنس مکھ لہجے میں بولی۔

”نور۔۔۔۔۔ ایک بات پوچھوں۔۔۔۔۔؟“

”ہاں پوچھو۔۔۔۔۔“

”نور۔۔۔۔۔ تم اتنے بڑے بڑے اسٹپس لیتی ہو تمہارے کارڈ میں کچھ نہیں کہتے۔“

”نہیں.....“ وہ آہ بھر کر بولی۔ ”کیونکہ جب وہ کچھ کہنے کی پوزیشن میں تھے تو انہوں نے اس کا فلاح استعمال کیا اور ان کے فلاح رویوں نے

مجھے اپنے فیصلوں میں آزاد بنا دیا۔“

”میں سمجھا نہیں.....“

”ضروری نہیں کہ ہر بات کی سمجھا جائے..... بہت سی باتیں سمجھ میں نہ آئیں تو بہتر ہے انسان کو کچھ ڈسکورد کرنے کی جتن تو رہتی ہے نا؟“

”اگر تمہارے می ڈیلی ز منہ ہوتے تو کیا تب بھی تم یہی کرتیں.....؟“

”نہیں..... تب میں بہت مختلف ہوتی۔ جب آپ کو اعمازہ ہو کہ کوئی آپ کی فکر کرنے والا موجود ہے۔ آپ کو ڈی گریڈ نہیں کرے گا اور

آپ کی فیلنگ کو سمجھے گا تو ظاہر ہے رویہ بھی مختلف ہوگا۔ رویہ ماحول کے مطابق پروان چڑھتے ہیں۔ میں جب چاروں ایک چچا کی طرف آٹھ دن

ایک کی طرف۔ دس دن پھوپھو کی طرف رہنے لگی تو کسی بھی گھر میں میری کوئی حیثیت نہ رہی۔ میں ایک لڑھکتا پتھر بنی رہی۔ ہر کوئی اپنی مرضی مجھ پر

چلاتا۔ میں گھر کے ایک ایک فرد کی مرضی کے مطابق چلتے لگی۔ ولیم میں تھک گئی تھی۔ میرا اعتماد اتنا ذلیل ہو چکا تھا کہ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے

لگی میری عزت نفس ختم ہونے لگی ان دو تین سالوں میں، میں نے اتنا کچھ سہا، سمجھا اور بھرا اپنے آپ کو مضبوط کیا کہ مجھے کیا کرنا ہے اب نہیں میری

مرضی کے مطابق چلنا ہے۔ میرے ماں باپ میرے لیے بہت کچھ چھوڑ کر مرے ہیں۔ میری اپنی ایک حیثیت ہونی چاہیے۔ میری اپنی شخصیت اور

پچان ہونی چاہیے اور پھر میں نے یکدم اپنے آپ کو بدلا۔

اداسیاں، محرومیاں، دکھ، سب کچھ اپنے اندر کہیں دفن کر دیے اب میں ایک منفرد شخصیت کی مالک ہوں۔ اب سب میری رائے کو اہمیت

دیتے ہیں۔ ولیم جب آپ کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہو مگر کہنے کا حوصلہ نہ ہو تو اس کا مطلب ہے آپ ایک ناکام انسان ہیں۔ آپ کی حیثیت سوسائٹی

میں زبرد ہے اور آپ اپنی ذات کے ساتھ بہت نا انصافی کر رہے ہیں۔ بہت بڑا نقصان..... اور تباہی شخصیت کا یہ پہلو مجھے بہت برا لگتا ہے۔ تم

ایک اچھے انسان ہو مگر ایک دم انک جا تے ہو۔ پھر کوئی تمہیں چلاتا ہے یا تم اچانک کوئی فیصلہ کر لیتے ہو جیسے میں نے بھی ایک فیصلہ کر لیا ہے۔ میں اس

میں بھی بہت پر غم ہوں.....“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”کونسا.....؟“ وہ چمکا۔

”کیا تم واقعی نہیں جانتے..... اور اب میں یہ نہیں مننا چاہتی کہ تم کچھ نہیں جانتے۔“ وہ روٹھے لہجے میں بولی۔

”نہیں، میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“ وہ آہستہ سے مطمئن لہجے میں بولا۔

”بس میں یہی مننا چاہتی تھی.....“

”کیا تم اس سے اپنے اندر کی تسکین چاہتی ہو؟“

”نہیں..... میری محبت تمہارے سپورٹس کی محتاج نہیں اور میں نے پہلے بھی یہ تمہیں بتا دیا تھا۔“

”تو پھر.....؟“

”میں تمہارا اقرار چاہتی تھی۔“

”میں بہت پہلے اس کا اقرار کر چکا ہوں۔“

”انسان اپنی رائے بدلنا بھی تو رہتا ہے اور میں تم سے کچھ بھی توقع کر سکتی ہوں۔“

”نہیں نور۔۔۔۔۔ تم مجھے جو چاہے سمجھو۔ اچھا، برا۔۔۔۔۔ کمزور، بزدل، بے وقوف۔۔۔۔۔ کچھ بھی مگر یہ یقین رکھنا کہ اب میرے دل میں صرف اور

صرف دو لوگ رہتے ہیں۔ ایک میری ماں اور دوسری تم نے اپنی محبت کے لیے تو چاند اور چکوری مثال دے دی تھی۔ میرے پاس ایسی کوئی مثال

نہیں صرف یہی کہوں گا جیسے کرائسٹ گاڈ اور مدد میری سے محبت کرتے تھے۔ ان کے لیے بھی تو صرف وہ ہستیاں تھیں میری طرح۔“

”کیا تم کرائسٹ سے بہت محبت کرتے ہو؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ بہت۔“

”اور اگر تمہیں اپنا راستہ اچانک بدلنا پڑے تو۔۔۔۔۔؟“

”ناممکن۔“ وہ ہلکی سی بولا۔

”ایسے سوالوں کے جوابات جذبات سے نہیں منسلک سے دیتے ہیں۔۔۔۔۔ اگر تم ایک لمحے کے لیے اس پر کچھ سوچتے تو شاید مجھے تم پر حیرانی نہ

ہوتی۔۔۔۔۔ جیسی اب ہوئی ہے۔۔۔۔۔“ نور نے ہنس مکھ لہجے میں کہا۔ ولیم اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔

وہ دونوں اسپتال کے لان میں کافی دیر سے چکر لگا رہے تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے۔ سبز پیڑ اب ہوش میں تھیں ہاسٹل سے بہت سی

خواندین ان کی خیریت پوچھنے آتی تھیں اور اس لیے وہ دونوں باہر آ گئے بلکہ آ نئی افضال نے ہی دونوں کو باہر بھیج دیا تھا۔

”ولیم۔۔۔۔۔ میں نے تم میں ایک مثبت تبدیلی دیکھی ہے۔۔۔۔۔“ وہ اس کی طرف بخود دیکھتے ہوئے بولی۔

”کیا۔۔۔۔۔؟“

”تم آ نئی کے سامنے بہت محکم رہتے ہو اور دونی شکل بھی نہیں بناتے۔۔۔۔۔ مجھے یہ سب اچھا لگتا ہے۔“

”شکر ہے تمہیں مجھ میں کچھ تو اچھا لگا۔۔۔۔۔“ وہ مدد سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”کوشش کرتے جاؤ اتفاقاً ہوتا جائے گا۔۔۔۔۔“ وہ ہنس کر بولی۔

”جینک یوس۔“

چند روز بعد وہ اسپتال سے نور کے گھر شفٹ ہو گئی۔ ولیم بھی ان کے ساتھ تھا۔ اتنی بڑی کوشش میں ہر وقت سناٹا سا اچھا رہتا۔ ولیم ہر وقت

مما کی دیکھ بھال میں مصروف رہتا۔ وہ بھی دن بھر وہیں ہوتی اور شام کو گھر جاتی۔ دو تین دن تو بڑے چچا نے برداشت کیا پھر خود ان لوگوں سے ملنے

چلے گئے۔ نور سبز پیڑ کو دائیں دے رہی تھی اور ولیم کہیں باہر گیا ہوا تھا۔

بچا کو یوں اچانک دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔

”اگل آپ.....؟“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

”ہاں..... اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ آپ کی مہمان ہیں۔ ان کی خیریت پوچھنا ہم پر بھی فرض ہے۔ اسی لیے

چلا آیا۔

”جھٹک یو بھائی صاحب.....“ مسز پٹیل نے جواب دیا۔ اسی لمحے کمرے میں داخل ہوا اور انہیں دیکھ کر چلا۔ چچا بھی حیرت سے اسے دیکھتے رہ گئے۔ گورا چٹا، لمبا تڑکا خوبصورت نیلی آنکھوں اور چمکے نقوش والا لڑکا انہیں ایک دم بہت مختلف سا لگا۔ ایسا مختلف چہرہ کہ بعض لوگ جنہیں دیکھ کر کہیں گم ہو جاتے ہیں۔ وہ تو تصویر میں کچھ اور سوچ کر آئے تھے۔ وہ ان کی سوچ سے بہت مختلف نکلتا تھا۔

”گڈ ایئرنگ اگل.....“ ولیم نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”گڈ ایئرنگ.....“ اگل نے قدرے محبت سے جواب دیا۔

”مر جھٹک یو.....“ آپ اور نور ہمارے لیے بہت کچھ کر رہے ہیں۔ ماما اور میں آپ کے بہت شکر گزار ہیں۔ میں خود آپ سے ملنا چاہ رہا

تھا مگر ماما کی خرابی طبیعت کی وجہ سے میں حاضر نہیں ہو سکا.....“ وہ بہت شائستگی سے بولا۔

”کوئی بات نہیں..... بانی دادے آپ لوگ کہاں سے تعلق رکھتے ہیں۔“ نہ جانے کیوں چچا کے ذہن میں کچھ اٹک سا گیا تھا۔

”میں..... میرا مطلب ہے لاہور سے.....“ ولیم نے جلدی سے جواب دیا۔

”مگر آپ..... آپ کچھ مختلف لگے ہیں.....“ وہ کچھ تجسس ہو کر بولے۔

”ہاں میرے پاپا انگلینڈ سے تھے.....“

”تھے..... کیا مطلب.....؟“

”ان کی ذمہ دہ ہو چکی ہے۔ اس لیے ماما لاہور آ گئیں۔“ ولیم تعصبات بتا رہا تھا اور مسز پٹیل کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا رہا تھا۔

انہوں نے جو کچھ ولیم کو بتا رکھا تھا وہ سب کچھ بتا رہا تھا۔

”اینی دے ٹکس ٹو میٹ یو..... میں بھی تسلی کرنا چاہ رہا تھا۔“

”کیا اگل.....؟“ نور نے حیرت سے پوچھا۔

”ٹکس آل رائٹ ناؤ..... اب میں چلتا ہوں۔“ وہ مطمئن سے چلے گئے۔

”نور مجھے تمہارے اگل کچھ پڑا سراسر سے لگے ہیں۔“ دونوں انہیں گیٹ تک چھوڑنے آئے اور وہیں باتیں کرنے لگے۔

”تکتے ہیں مگر ایسے ہی نہیں۔ ان کو میں ابھی طرح جانتی ہوں۔ خواہ مخواہ جھوٹا بننے کی کوشش کرتے ہیں۔“ وہ فہم کر بولی۔

”تم جانتے ہو وہ کیا کرتے ہیں.....؟ سرائی رساں ہیں اور نام نہاد بڑے پس منہ بھی۔“ اس نے قہقہہ لگایا۔

”واقعی.....“ ولیم نے حیرت سے پوچھا۔

"اور نہیں تو کیا ہر بات میں میں بیچ نکالیں گے۔ ہر بات کو نیڑھا کر کے دیکھیں گے مگر رزلٹ ہمیشہ الٹا ہی نکلتا ہے۔ دیکھا کیسے پڑ کر رہے تھے جیسے کچھ سوچتے سوچتے یہاں پہنچے ہوں۔ اسی لیے تو میں انہیں اچانک دیکھ کر حیران رہ گئی تھی بلکہ ذرا بھی گئی تھی کہ کچھ الٹا سیدھا مسئلہ ہی نہ کھڑا کر دیں۔ چچی تو ان سے سخت تنگ ہیں۔"

"اور تم....؟"

"مجھے ان کی نفسیات اچھی طرح معلوم ہو چکی ہے اس لیے آسانی سے وینڈل کر لیتی ہوں۔ ایک دم ایسے پڑ کریں گے جیسے اچانک قیامت آگئی ہو اور اگلے ہی لمحے نازل ہو جائیں گے۔ ویسے وہ پچھرا انسان نہیں۔ ان کو دھوکا دینا دنیا کا سب سے آسان کام ہے۔ اسی لیے تو سسلی چچی ہر وقت ان کو ڈانٹتی رہتی ہیں۔"

"اچھا....." وہ حیرت زدہ سا تھا۔ "لیکن خطرناک بھی بہت ہیں..... لوگوں کو روکتے ہاتھوں پکڑنے کا بہت شوق ہے اس لیے اچانک چھاپے مارتے ہیں۔ اگر ہم دونوں کو اچھے موڈ میں دیکھ لیتے تو اب تک قیامت آچکی ہوتی۔ شکر ہے تم باہر گئے ہوئے تھے مگر پھر بھی ہوشیار رہنا....." وہ مذاقاً تیار ہی تھی کہ اچانک چچا کی گاڑی پورچ میں داخل ہوئی۔ گیٹ کھلا تھا اس لیے دونوں گیٹ کی ایک ایک سائیڈ کی طرف ہو گئے۔ نور نے مسکراتے ہوئے ولیم کی طرف دیکھا۔

"بیٹا ذرا میری بات سننا....." انھوں نے گاڑی سے نکلے ہوئے کہا۔

"نہیں انکل....."

"تمہارے قادر کی ڈیوٹی کب ہوئی اور تم لوگ کب لاہور آئے.....؟"

"آئی ایم سوری انکل..... مجھے صبح سے نہیں معلوم۔ مگر شاہ میری پیدائش سے پہلے میں ممبے چھوڑ کر تباؤں کا مگر خیریت تو ہے.....؟"

"ہاں..... تمہارا چہرہ مجھے کچھ جانا پہچانا سا لگا ہے۔"

"میرا چہرہ..... مگر کس سے.....؟"

"ہے کسی سے..... تم چھوڑ واس کو مگر مجھے اس کے بارے میں انفارمیشن چاہیے....."

"جی ضرور....." اس نے کہا۔

"اوکے..... میں پھر آؤں گا....." دو گاڑی ریورس کرتے ہوئے بولے۔

"مائی گاڈ..... یہ کیا مصیبت ہے..... نور تم نے ہمیں کہاں پھنسا دیا ہے۔"

"فکر نہیں کرو..... اب یہ تمہیں بہت معروف رکھیں گے..... کچھ دنوں کے بعد کہیں گے کہ تم ان کے ساتھ ان کے کام میں شامل ہو جاؤ۔"

تمہیں معقول معاوضہ بھی ملے گا....." وہ چپتے ہوئے بولی۔

"تمہارے چچا کو میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

”بالکل نہیں۔۔۔ ایسا سوچنا بھی مت۔۔۔ اب جلدی سے گیٹ بند کر دیں بھرتا آ جائیں۔ میں تمہیں ایک راز بتاؤں گی تو تم ان کے شر سے محفوظ رہو گے۔“

”تو ابھی بتا دو نا۔۔۔“ وہ بے صبری سے بولا۔

”انودا بتا دوں گی۔۔۔“

”ویسے ہائی راوے۔۔۔ یہ گھر میں کیا کرتے ہیں۔۔۔؟“

”گھر میں دیکھے بیٹھے رہتے ہیں۔ بچی کے سامنے ان کی ایک ٹیبل گھر میں ہوں تو لگتا ہے کوئی ہے ہی نہیں۔۔۔ اسی لیے تو بیچارے باہر ہی اپنا ٹیبلو ٹیبلو کر رہے ہیں۔“

”کیا یہ تمہارے گارڈین ہیں۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔ ان کی کوئی اولاد نہیں۔ اس لیے ڈیڈی نے بھی ڈیڈی سے پہلے دل میں انہیں میرا کارڈین بتا دیا۔ ان جیسا بندہ پورے خاندان میں نہیں۔ مجھ پر ہر طرف سے نگاہ رکھتے ہیں اور نگاہ بھی ایسی۔۔۔ کہ پوچھو مت صاحب سے زیادہ تیز نکالیں ہیں لیکن نگاہیں جتنی جتنی ہیں عقل اتنی ہی کم۔ تمہیں بھی اندازہ ہو جائے گا۔“

نور نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور دونوں گیٹ اچھی طرح بند کر کے اندر آ گئے۔ سبز پتھر چٹا کی غیر متوقع آمد اور سوالات سے پریشان ہو گئی تھیں۔

”آئی آپ پریشان نہ ہوں۔ انگل کی ہاتھیں میری تسلی نہ لیں ورنہ وہ مبالغہ رساں ہیں اس لیے ہر ایک سے سوالات پوچھتے رہتے ہیں۔“ نور نے ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

”ویسے ماما۔۔۔ پاپا میری جگہ سے کتنے ماہ پہلے فوت ہوئے تھے۔۔۔؟“ ولیم نے اچانک سوال کیا تو وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”ولیم۔۔۔ پاپا مل ہو گئے ہو کیا۔۔۔ آئی کی حالت تو دیکھو اور تم کیسے سوالات کر رہے ہو۔ آئی آپ آرام کریں ہم ابھی آتے ہیں۔“ وہ دروازہ بند کر کے اسے ساتھ لے کر باہر آ گئی۔

”تم بھی کمال کرتے ہو اسے مجھے آپریشن کے بعد تو انسان کی یادداشت بھی ٹھیک نہیں رہتی اور تم انہیں ایک برا واقعہ یاد دلانے کی کوشش کر رہے ہو۔“

”اوہ میں تو بھول ہی گیا۔۔۔“ ولیم تاسف سے بولا۔

”اب میں چلتی ہوں اور اب آئی کو آرام کرنے دینا اپنی فضول باتوں سے ڈسٹرب نہ کرنا۔۔۔“ وہ ہیک اٹھاتے ہوئے بولی۔

”تم نے وہ راز نہیں بتایا۔۔۔“ ولیم نے اس بات کی طرف اشارہ کیا۔

”اوہ۔۔۔ ہاں۔۔۔ ایسا کر دین گیٹ پر باہر سے ٹالا لگا دو اور پیچھے ایک سائیز گیٹ ہے چھوٹا سا، اسے بھی ٹالا لگا دو پھر دوبارہ پھلانگ کر

اندر چلے جانا۔“

”کمال کرتی ہو وہ ڈیپٹیکٹو ہیں اگر دیوار بھلا گ کر آ گئے اور ہمیں گھر کے اندر پایا تو.....“

”میں انہیں تادوں گی کہ تم جب بھی گھر سے باہر جاتے ہو تالا لگا کر جاتے ہو اور باقی ملازم گھر کے اندر ہی ہوتے ہیں اور آئی بھی اور ظاہر ہے وہ تم سے سوالات کرنے آئیں گے۔ آئی سے ملازمین سے نہیں کیونکہ ان کا ٹارگٹ تم ہو۔ ان سے بچ سکتے ہو تو بچو ورنہ تمہارا اللہ حافظ ہے۔“ وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی وہ بھی مسکرانے لگا۔



شہلا کی شادی پر دور و نزدیک سے مہمان آئے تھے۔ خوب گہما گہمی اور رونق تھی۔ حویلی کی جدید آرائش کے لیے شہر سے خصوصی طور پر ٹینڈ سروں والے لوگ آئے تھے۔ حویلی سے ملحقہ وسیع رقبے پر محیط باغ میں برسات کا ٹکشن اریج کیا گیا تھا۔ تبسم اور فاطمہ آپاس کے سارے چاؤ ہارے کر رہی تھیں۔ اس کے ہر طرح سے ناز و خیرے اٹھائے جا رہے تھے۔ حویلی کے نوکر، نوکرانیاں اور ان کے خاندان بھر پر راغناز میں شرکت کر رہے تھے۔ ایسی زبردست شادی شوق نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھی تھی۔ انواع و اقسام کے کھانے تیار ہو رہے تھے۔ جس دن سے شہلا گاؤں آئی تھی شوق اندر ہی اندر شدید ڈپریشن کا شکار تھی۔ شدید احساس غمردی نے اس کے دل و دماغ کو بہت متاثر کیا تھا۔ حیدر انکل نے ہر ایک سے اسے اپنے ایک دیرینہ دوست کی بیٹی کے نام سے حصارف کرایا تھا۔ تبسم آپاسے دیکھ کر ایک لمحے کو چونکی تھیں۔ اس کے خدو خال غم، غصہ، سب کافی حد تک شہلا سے ملتا تھا اور نام بھی جانا بچھانا۔ آپانے حیدر کی طرف متنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور پھر خاموشی سے شوق کی طرف دیکھنے لگیں۔

”حیدر یہ تمہارے کس دوست کی بیٹی ہے؟“ آپانے اچانک پوچھا تو وہ بھی چونک گیا۔

”وہ آج کل امریکا میں ہے..... یہ اس کی اکلوتی اولاد ہے اس لیے میرے پاس چھوڑ گیا۔“ حیدر انہیں تفصیلات بتا کر نئی مصیبت کھڑی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آپا مطمئن ہو گئیں کیونکہ وہ منصور اور حیدر کے تعلقات سے بہت اچھی طرح واقف تھیں اور منصور اپنی بیٹی حیدر کے پاس چھوڑے گا۔ اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کی شہلا سے اس حد تک مشابہت اتفاقیہ بھی ہو سکتی ہے۔ اس لیے انھوں نے اس کو حیرت نہ کر دیا۔ شہلا حیدر تو ہر ایک سے بچی بچی تھی۔ اس سے کیا فری ہوتی۔ دونوں ہمیشہ انتظامات دیکھنے میں مصروف تھیں وہ بری طرح نظر انداز ہو رہی تھی۔ بایوں کی رات بھی وہ اپنے کمرے میں بند ہی کسی نے اس کو بلانا ضروری نہ سمجھا۔ ہر کوئی مصروف تھا اور وہ کسی کے لیے بھی ضروری نہ تھی۔ اس نے ماں کی غیر موجودگی اور باپ کی موجودگی میں جس طرح کی بے آسرا زندگی گزاری تھی اس نے اس کو تنہائی، یاسیت اور دکھ کے علاوہ کچھ بھی تو نہیں دیا تھا اور عابد والے واقعے نے تو اس کی روح تک کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ اس کا انسانیت پر سے ہی اعتبار اٹھ گیا۔ اگر ماما انہیں یوں تنہا چھوڑ کر نہ جاتیں تو شاید وہ آج کی شوق سے بہت مختلف ہوتی۔

اس کے پاس تو کوئی ایسا رشتہ نہ تھا جس کی طرف وہ اعتماد سے دیکھتی۔ شہلا حیدر اسے بہت خوش قسمت معلوم ہو رہی تھی جس کے سامنے لاڈ اٹھائے جا رہے تھے اور جس کا اتنی محبت کرنے والا باپ موجود تھا۔ یہ دن اس پر بہت بھاری تھا۔ وہ ہر لمحہ اندر ہی اندر نہ جانے کتنے آنسو بچی رہی۔ مگر جتنی اپنے آپ کو تسلیم دینے کی کوشش کرتی اتنی بکھرتی جا رہی تھی۔ اس کے حافضے میں کوئی ایک شخص بھی تو ایسا نہ تھا جس نے کبھی بھی زندگی میں اس

کے لیے پریشانی اٹھائی سوائے سہیل کے اور وہ بھی نہ جانے کس حالت میں ہوگا۔ اسے بھی پاپا نے جنرل کی تاریک کوٹھڑی میں بند کر دیا تھا اور اب وہ تنہا تھی۔ باہر ساری رات اُصول پیٹتے رہے۔ عورتیں گیت گاتی رہیں مگر وہ السردہ ہی اپنے کمرے میں گیلی ککڑیوں کی طرح سلتی رہی۔ رات شمع کی مانند آہستہ آہستہ اپنے اختتام کو پہنچنے والی تھی جب بشری آ پا کر ایک دم افسوس سا ہوا۔ وہ شاید کھانا کھائے بغیر سو رہی تھی اور مایوں کی رسم میں بھی موجود نہیں تھی حیدر شاہ کو معلوم ہوگا تو وہ کتنے ناراض ہوں گے اور وہ یہ بات اب کسی سے نہیں کرنا چاہتی تھیں مگر انہیں یوں اس کالا داروٹوں کی طرح بیٹھے رہنا بہت قابلِ رحم لگا۔

اگلی صبح انھوں نے جنھنڈ کر اسے خود ناشتہ کروایا مگر کوئی بات نہ کی۔ ”تم آج ہمارے میں کیا پہنو گی۔؟“ بشری آ پاپا نے اس کی توجہ دوسری طرف کرانا چاہی۔

”میں..... معلوم نہیں۔“ وہ آہستہ سے بلائی۔

”اچھا سا سوٹ پہنا..... کیا تمہارے پاس اتنے کپڑے ہیں میرا مطلب ہے کوئی چمک والے؟“

”نہیں.....“

”تو تم نے مجھے بتایا ہی نہیں.....“

”کیا بتاتی.....؟“

”اچھا میں دیکھتی ہوں۔ شہلا بی بی کا کوئی سوٹ لادوں۔“ بشری آ پاپا بی بی لے میں بولیں تو اس نے چونک کر انہیں دیکھا مگر خاموش رہی۔ اسے شدید تپیل محسوس ہوئی کہ اب وہ دوسروں کی اترن پہنے گی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ کبھی کبھی زندگی کیسے سوز پر لا کھڑا کرتی ہے کہ انسان خود ہی چونک جاتا ہے۔ وہ خود لاکھوں کروڑوں کی مالک اب کتنی بے وقعت ہو گئی تھی۔ اس کی وارڈ روب قینچی سے قینچی لمبوسات سے بھری رہتی تھی۔ مگر نہ اسے کپڑوں کی پردا ہوتی تھی نہ زیورات کی اور نہ ہی زندگی کی..... اس کے لیے سب کچھ بے معنی تھا اور اب بے معنی چیزیں بھی اپنی حیثیت دکھانے لگی تھیں۔ شام کو برات سے پہلے بشری آ پاپا شہلا حیدر کا ایک کاغذ جامنی اور شاکنگ چمک سوٹ لے کر آئیں۔

”شفیق یہ تم پر بہت اچھا لگے گا.....“

وہ خاموش رہی اور سوٹ کو دیکھتی رہی۔

”کیا تمہیں پسند نہیں آیا.....؟“

وہ بھر بھی خاموش رہی۔

”بتاؤ نا کیا بات ہے..... کوئی دوسرا لے آؤں۔“

”نہیں آ پاپا..... میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ میں شادی میں نہیں جاؤں گی۔“

”ہیں..... ہیں..... کیا کہا تم نے..... تم شہلا بی بی کی شادی میں نہیں جاؤ گی تو حیدر سائیں کیا کہیں گے۔“

”انہیں کوئی غصہ ہے۔۔۔“

”یہ مت کہو، وہ تو بایوں کی رسم میں ادھر نہیں آئے ورنہ اب تک۔۔۔ اور یہ بھی تو دیکھو کہ وہ تمہارا کتنا خیال رکھتے ہیں اور تم ان کی بیٹی کی شادی میں نہیں جاؤ گی تو وہ کیا سمجھیں گے۔“

”کچھ نہیں سمجھیں گے۔۔۔ کسی کو کسی کے نہ جانے سے نہ فرق پڑتا ہے اور نہ آنے سے میں کسی کے لیے بھی اہم نہیں۔ آ پائیں آپ جائیں میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“

”خیر شفیق بیٹی یوں مت کہو۔۔۔ اچھا نہیں لگتا۔ تم میری خاطر چلو۔۔۔ یوں سمجھو اپنی ماں کی خاطر۔۔۔“ بشری آ پائے محبت اور اپنا نیت سے کہا تو وہ خاموش ہو گئی۔

شہلا حیدر سرخ اور نیوی بلیو کا مڈر غرارے میں زچہ رات سے لہی ہوئی بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ ایسی حسین پری جس پر نظر نہیں ٹھہر رہی تھی۔ جسم آ پ اور قلمی آ پاس کی بلانیں لینے نہیں تھک رہی تھیں۔ اس کا سارا انخیال جمع تھا مگر وہ خود بہت افسردہ تھی۔ وہ رخصتی سے پہلے حیدر شاہ سے ملنا چاہتی تھی۔ جسم آ چادر شاہ کو بلا کر ایک کمرے میں لے گئیں شہلا پہلے سے ہی وہاں بیٹھی تھی۔ حیدر نے ایک تک اسے دیکھا جیسے اس کی بلانیں لے رہا ہو اور پھر استہمامی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے لگا۔

”تم نے مجھے یہاں کیوں بلایا ہے، خیریت تو ہے نا۔۔۔؟“

”پاپا آپ مجھ سے ناراض ہیں۔ یہ میں جانتی ہوں اور یہ بھی اچھی طرح جانتی ہوں کہ جتنے آپ وسیع القلب ہیں شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ اسی لیے میں آپ سے سب باتوں کی معافی چاہتی ہوں۔“ وہ حیدر کے قدموں میں گر گئی۔

”اٹھو یہاں سے۔۔۔ میں نے ہمیشہ تمہیں اپنے دل میں جگہ دی ہے۔ کبھی بھی رو اپنی باپ بننے کی کوشش نہیں کی۔ شہلا مجھے اپنی زندگی میں کوئی ایسا لمحہ یاد نہیں آتا جب میں نے تم سے کوئی زیادتی کی ہو۔ میں خود بہت مغرور باپ بننے چلا تھا اور تمہیں مغرور بیٹی بنانے مگر شاید ہم سب انسان اندر سے ایک ہی ہوتے ہیں کبھی احساسات، جذبات اور انسان کی سوچ بھی ہدلی ہے۔ مگر تم نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔۔۔“ حیدر نے آہ بھر کر کہا۔ ”تم نے اپنے باپ کو شک کی نگاہ سے دیکھا۔۔۔“ حیدر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”مگر خدا نے شاید ہر باپ کو اتنا وسیع القلب بنایا ہے کہ جب بھی اپنی اولاد کی طرف ہدلے کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو اس کی نگاہ خود بخود جھک جاتی ہے وہ اولاد کے لیے بددعا تو کر ہی نہیں پاتا۔ وہ بڑی ہی بد نصیب اولاد ہوگی جس کے لیے کوئی باپ بددعا کرے گا۔ میرے دل میں اب بھی تمہارے لیے برے جذبات نہیں۔۔۔ تم جہاں رہو خوش رہو۔“ حیدر نرم آنکھوں سے مڑنے لگا۔

”نہیں پاپا، میں ایسے نہیں جاؤں گی جب تک آپ میرے گناہوں کا کفارہ نہ بتاویں۔۔۔“ وہ رونے لگی اور اس کا مسکارا بہہ کر اس کے چہرے پر میک اپ کی تہوں پر لکیریں چھوڑنے لگا۔

”کیا تم سمجھتی ہو کہ تم نے واقعی کوئی گناہ کیا ہے۔۔۔؟“ حیدر کی نظروں میں مگر استہمام تھا۔

”ہاں..... شاید میرا ضمیر مجھے ہر وقت ملامت کرتا رہتا ہے۔“

”کس بات پر.....“

”اس پر کہ جو میں نے آپ سے کہا.....“

”اور اس پر نہیں جو تم نے اس عورت سے کہا.....“

”نہیں.....“

”کیا تم جانتی ہو کہ تمہارے جانے کے بعد وہ کس قدر چار پڑ گئی اور اسے برین ٹیکسٹ ہو گیا.....“

”اورد..... لو.....“ وہ چلائی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ ”آئی ایم سوری..... آئی ایم رینگی سوری.....“ وہ اپنا زور لوچے لگی..... ”پاپا

کاش آج مجھے یہ سب نہ ملتا۔ میرے لیے تو اس احساس کے ساتھ جانا ہی مشکل ہو رہا تھا کہ میرا باپ مجھ سے غرض ہے اور آپ نے مجھے یہ خبر بھی سنا دی۔“

”خاموش ہو جاؤ شہلا اب رونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں بھی تمہیں نہیں بتاؤ چاہتا تھا مگر تمہاری بہت دھڑکی دہرے سے بتانا پڑا۔“

شہلا جب ہم کسی دوسرے پر چلاتے ہیں یا زیادتی کرتے ہیں تو ایک لمحے کو یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ سننے والا بھی ہماری طرح کا انسان ہے۔ اس کی بھی مجھدیاں ہو سکتی ہیں۔ اس کے بھی دکھ ہو سکتے ہیں اور اس کے بھی احساسات آپ کی طرح ہی نازک ہو سکتے ہیں۔ ہم ساری اچھائیاں اپنے لیے اور ساری عماشیں اور برائیاں دوسروں کے لیے ہی کیوں سوچتے ہیں۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ تم خوشی خوشی اپنے سسرال جاؤ۔“

”نہیں، اب نہیں..... میں آج ہی شادی سے انکار کر دوں گی۔“

”یہ کیا پاگل پن ہے۔ دکھ تو تم نے مجھے دیا ہی ہے اور اب ایسا صدمہ بھی دینا چاہتی ہو کہ ضرر حیدر جان سے بھی جائے۔ تمہارے اور میرے درمیان جو کچھ ہے اسے صرف میں، تم اور تبسم آچا جانتے ہیں اور اس طرح کی حرکت کر کے تم لوگوں پر کیا واضح کرنا چاہتی ہو کتنی زبانوں اور کتنی نگاہوں کو میرے اور اپنے لیے ایک امتحان بنانا چاہتی ہو۔ میں تبسم آچا کو بھیج رہا ہوں۔ جو کچھ خاموشی سے چل رہا ہے اسے چلنے دو۔“

”پھر آپ کو مجھے معاف کرنا پڑے گا۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

”جاؤ شہلا..... اگر تمہیں اس سے تسکین ملتی ہے تو یہ بھی کیا..... تم خوش رہو.....“ اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور ہاتھ لگالیا۔

اسد علی شاد بہت خوبصورت لگ رہا تھا دونوں کی جوڑی چاند اور سورج سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ شہلا کے تنہیالی بار بار دونوں کو چوم رہے تھے مبارکبادیں دے رہے تھے مگر شہلا کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ نہ تھی۔ وہ خاموش بیٹھتی تھی مگر اسد علی شاد بہت چمک رہا تھا۔ شوق کی نظریں ان دونوں پر تھیں۔ وہ ایک کونے میں خاموش بیٹھتی تھی اور نہ جانے کیا کچھ سوچ رہی تھی۔ اس کے اندر شدید احساس محرومی تھی۔ برجیز کی کمی وہ اپنے اندر محسوس کر رہی تھی۔ خوشی کی، اعتماد کی، سکون کی، جھٹکی کی، عزت کی اور رشکوں کی محبت والفت کی..... اس کے ماں باپ زعمہ تھے مگر وہ اپنے آپ کو شروع سے ہی بے آسرا اور لاوارث محسوس کرتی آ رہی تھی۔ کیا یہ زندگی یونہی یا سیت اور تنہائی کی غم رہا ہو جائے گی۔ میری زندگی میں خوشی کی کوئی رتی

کوئی کرن، کوئی خوشبو، کوئی جھوٹا کبھی نہیں آئے گا۔ ذمہ انسانوں کے لیے یہ چیزیں آکسیجن کا کام کرتی ہیں اور میری آکسیجن تو رفتہ رفتہ ختم ہوتی جا رہی ہے۔ کاش میں بھی اس آکسیجن کی طرح جلد ختم ہو جاؤں اور پھر کچھ نہ رہے۔ نہ شفق نہ اس کی تنہائی، نہ اس کا خوف اور نہ اس کے دکھ کاش میں خاک میں خاک ہو جاؤں۔ میں نے اور آفاق نے زندگی سے کیا پایا ہے۔ ہم دونوں نے کس طرح کی زندگیاں گزاری ہیں۔ جس عمر میں چہروں پر مسکرائشیں اور جھنجھکے رہنا پڑا تھا پیدائش سے ہی ہم نے تنہائیاں، خوف اور سکوت چہروں پر سما لیا اور نتیجہ کیا نکلا وہ دگر رفتہ بن گیا اور میں سانپ بن گیا۔ وہ خود بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کا رویہ باورل انسانوں جیسا نہیں رہا تھا۔ اسے شدید ڈپریشن ہونے لگا وہ اٹھ کر اندر آ گئی۔ کسی نے نہ اس کے آنے کا نوٹس لیا نہ جانے کا۔ نہ کسی نے بیٹھے کو کہا اور نہ اب جانے کو۔

بعض لوگ حشرات الارض کی طرح ہوتے ہیں جن کے ہونے نہ ہونے سے اہل زمین کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ اپنے کمرے میں آ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔ ماں کا چھوڑ کر جانا۔ پاپا کا شزا کے ساتھ مسکرائشیں بکھیرنا چہرہ اور اس رات ملک کی موت پر ہلک کر رہنا۔ اس کا اکرم کے ساتھ سونا عاید اور ذویا کا ذاب دینا۔ یہ سب اسے شدید تہذیب بالا کرنے لگا اس نے ایک زوردار جی ماری وہ فرش پر گر کر تڑپنے لگی۔ وہ نہ جانے کیا کیا کہتی رہی۔ کتنا جھنجھکی رہی۔ کس کس کو مدد کے لیے بلائی رہی اسے کہاں کہاں درد ہوتا رہا۔ کسی کو بھی خبر نہ ہوئی وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کا سر پھٹ چکا تھا اور اس سے خون بہہ رہا تھا۔ باہر شادی کا بنگامہ عروج پر تھا۔ مول زور زور سے پیٹے جا رہے تھے رسومات جاری تھیں۔ رخصتی کا وقت قریب آ رہا تھا۔ شہلا کو بہت محبت اور پیار سے دیکھتے کیا گیا۔ حیدر نے خواہے گاڑی میں بٹھایا وہ باپ کے گلے لگ کر بہت روئی۔ حیدر کی بھی آنکھیں نم تھیں مگر رسی نہیں۔

"پاپا آپ نے مجھے....." اس نے آہستہ سے سرگوشی کی۔

"ہاں..... ہاں..... بس اور کچھ نہیں۔" اس نے اس کی پیشانی کو چوما۔ اسد علی شاہ کو گلے لگایا اور محبت سے دونوں کو رخصت کر دیا۔ لوگ آہستہ آہستہ منتشر ہونے لگے۔

رات کافی گہری ہو رہی تھی رفتہ رفتہ رات کی خاموشی اور سکوت نے ہر ایک شے پر اپنا قبضہ عطا شروع کر دیا۔ تبسم آپا اور فاطمہ آپا کچھ دیر اس کے پاس بیٹھی رہیں اور پھر تھکاوٹ کی وجہ سے وہ بھی سونے کے لیے چلی گئیں۔ سب لوگ جا چکے تھے مگر اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی شہلا حیدر کھٹ سے اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتی۔ بائیس تیس سال سے دونوں کا ساتھ تھا۔ بہت دکھ سکھ اکٹھے شہر کیے تھے۔ زندگی کے ہر پہلو کو دیکھ سکیا تھا۔

انسانی رویوں پر بخشش کی تھیں۔ اس نے اسے اپنی پشت پر بٹھا کر حویلی کی سیر کرائی تھی۔ اس کے لیے سائیکل اور موٹر سائیکل چلائی تھی۔ ایک دفعہ اس کے لیے رکشہ بھی کرائے پر لے کر چلا یا تھا۔ اس کے لیے ہر وہ کام کیا تھا جس کی وہ تمنا کرتی اور جب وہ کھلکھلا کر فٹیم لگاتی تو اس کا دل باغ باغ ہو جاتا۔ اس کی آج تک اس نے کوئی خواہش رو نہیں کی تھی۔ اس کی ایک محبت کے جواب میں وہ محبتیں لوٹاتی تھیں۔ اس کو زندگی میں کبھی بھی تنہا نہیں ہونے دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو اس نے اپنے لبوں سے چما لیا تھا۔ اتنی محبتیں، اتنی چاہتیں، اتنی

احساسات کو سمجھنا تو اس نے اسے دے دیا تھا اپنے پاس تو کچھ بھی نہیں رکھا تھا مگر شہلا حیدر کی ایک محبت کا حق بھی ادا نہ کر سکی اور باپ کے احساسات اور جذبات کو سمجھنے کی وجہ یہاں تک لے گیا کہ وہ اپنے دماغ سے اور اقرار سے بھر گئی کہ وہ بھی اسے اپنی جان سے زیادہ چاہتی ہے۔ اس کے شدید رد عمل نے حیدر کو بہت تکلیف دی تھی۔ جب غم کے رشتے یوں بدل جائیں تو دوسروں پر کیا اعتبار کیا جاسکتا ہے۔ ہر رشتہ اسے ناپائیدار اور مفاد پرست لگنے لگا۔ مگر اس کی اپنی ایک مخصوص سوچ تھی کہ ہم سب انسان خطاؤں کے پتے ہوتے ہیں اور مختلف حالات میں انسان کا غیر متوقع رد عمل اس کی ساری زندگی کی کہانی کا آئینہ دار نہیں ہو سکتا۔ ایسی مثبت سوچ اس کو انسانیت پر سے اعتبار رکھنے نہیں دیتی تھی۔ شہلا حیدر فراراک پہننے کی عمر سے لے کر عمری جوڑے تک لمحہ بہ لمحہ اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔

کاش وہ انہی اچھے جذبات کے ساتھ رخصت ہوتی تو حیدر کا دل یوں کربھی کر پتی نہ ہوتا مگر حالات کا انسان کے بس میں ہونا اور انسان کے رد عمل کا ان کے مطابق ہونا بھی شاید انسان کے اپنے بس میں نہیں۔ وہ شہلا حیدر کو قصور وار سمجھتے ہوئے بھی اور اس کے پوزیٹو رویے کو سامنے رکھتے ہوئے بھی اسے قصور وار نہیں سمجھتا تھا۔ باپ اور اولاد کے درمیان رویوں کا یوں مائل ہونا قابلِ مذمت تو تھا مگر ان نچرل نہیں تھا۔ حویلی کے اس کمرے میں یادوں کا خزانہ تھا۔ جس شے کی طرف دیکھتا یادوں کے در پہنچے وہاں ہوتے جاتے۔ شہلا کے ساتھ گھنٹوں آتش دان کے پاس بیٹھ کر کالج اور یونیورسٹی کی باتیں کرتا۔ محبت اور وارثی کی باتیں کہہ سن کر مسرور ہوتا۔ ایک دوسرے کو تنگ کر کے خوش ہوتا۔ اور پھر طاہرہ کی سنگت میں اس کمرے اور اس کی چیزوں کو شیئر کرتا۔

بچہ کے ساتھ جھوٹی ایزی چیئر پر بیٹھے بیٹھے اس کا ادھکنا اور طاہرہ کے شکوے سننا کمرے کے ایک کونے میں رکھے گھڑی کے جھولنے میں شہلا حیدر کو جھولا جھلاتا۔ کونے میں رکھی ٹیبل اور اس پر رکھے لیپ کی روشنی میں حیدر کا شہلا کو پڑھانا۔ سب کچھ اپنی جگہ پر تھا اور ان سے منسلک یادیں بھی جلیں کی توں ذہن میں موجود تھیں مگر وہ انسان نہیں رہے تھے۔ ان چیزوں کو چھونے والے۔ اپنی یادیں ان پر نقش کرنے والے اور یادوں کو زندگی بخشنے والے۔ کوئی بھی تو نہیں رہا تھا، سب اپنی اپنی منزل کی طرف کا مزن تھے۔ اور وہ خود بھی۔ کسی دن ایک یاد بن جائے گا۔ جیسے شہلا یادیں لگی تھی۔ طاہرہ اور شہلا حیدر بھی۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ تین بج چکے تھے۔ بارش کے مینے میں خشکی کا کافی حد تک کم ہو چکا تھا۔ بہار کی آمد نے دھندوں پر جی خشکی کی تہوں کو کافی حد تک کرید ڈالا تھا اور اب وہ نرم، گرم، خشکے خوشگوار جھونکوں سے انھیں موسم کے حسین تغیر سے مسح کر رہے تھے۔ اس نے کھڑکیاں کھولیں اور شہلا کے جھولنے کے پاس آ کر رک گیا۔ اسے اپنے ہاتھوں سے جھلانے لگا جیسے وہ بچپن میں اسے جھلانے کا عادی تھا۔

یادیں ہی یادیں تھیں۔ اچھی اور تلخ۔ خوبصورت اور کرب۔ اس کے لیے وہاں رکنا محال ہو رہا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ اور برآمدے میں آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ چودھویں کا چاند پورے مہن کو اپنی غنڈی ڈھلی روشنی سے منور کر رہا تھا۔ وہ نادانستہ آہستہ لے لے کر برآمدے کا پھر لگا رہا تھا۔ برآمدے میں موجود قطار قطار کمروں کے دروازے بند تھے مگر چلتے چلتے دورک گیا۔ شفق کے کمرے کے سامنے۔ اس کا دروازہ آدھا کھلا تھا اور آدھا بند تھا۔ لائٹ آن تھی۔ اسے حیرت ہوئی۔ کیونکہ اس نے بشری آپا سے کہہ رکھا تھا کہ سوتے وقت ہر ایک کا

درد اور انہی طرح بند ہونا چاہیے۔ مگر شاید شادی کی وجہ سے کسی کو بند کرنا یا نہیں رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو دمگ رہ گیا۔ شفق زمین پر گر چکی تھی اور خون اس کے ماتھے سے بہہ کر اب جم چکا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر پریشان ہو گیا اور جلدی سے اسے اٹھا کر بستر پر لٹایا۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ جب سے اس نے سید صاحب کی جگہ جانشینی اختیار کی تھی اس نے ڈاکٹری کو خیر باد کہہ دیا تھا اور پولیکس میں آنے کے بعد اسے پریکٹس کی فرصت تو بالکل ہی نہیں ملتی تھی۔ وہ جلدی سے اپنے کمرے سے فرسٹ ایڈ باکس لایا۔ اس کا خون صاف کر کے بیڈج کی اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور حیدر کو یوں اپنے پاس بیٹھے دیکھ کر وہ چونک گئی۔

”انگل..... آپ..... کب..... یہاں آئے.....؟“

”مجھے چھوڑو..... مگر یہ بتاؤ کہ آپ کو کیا ہوا تھا اور کب سے ایسا ہو رہا ہے؟“

”معلوم نہیں انگل..... ایک دم بہت شدید چکر آیا اور مجھے نگاہیں میں وہیں گر جاؤں گی۔ اس لیے میں کمرے میں آگئی اور پھر کب میں گر گئی مجھے یاد نہیں.....“

”بیٹا مجھے لگ رہا ہے آپ کچھ پریشان ہیں۔“ حیدر نے پیار سے پوچھا تو اس کی آنکھوں سے جیسے چشمے ابل پڑے..... اتنے آنسو کہ چہینے میں نہیں آ رہے تھے۔

”آپ روکیں رہی ہیں کچھ تو بتائیں..... ہر مسئلے کا حل ہے.....“

”نہیں انگل..... ہمارے مسئلوں کا کوئی حل نہیں۔“

”مگر پھر بھی..... کچھ تو بتاؤ نا.....“ اس نے اسے دلاسا دیا اور جیب میں سے رد مال نکال کر اس کی آنکھوں کو صاف کیا تو وہ اور شدت سے رونا شروع ہو گئی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

”دیکھو..... اگر آپ کچھ نہیں بتاؤ گی تو میں کیسے جان پاؤں گا کہ آپ کس بات سے پریشان ہو..... کچھ تو بتاؤ آخر ہوا کیا ہے..... رونے سے مسئلے حل تو نہیں ہوتے.....“ وہ اسے سمجھا رہا تھا اور وہ خاموشی سے سن رہی تھی۔

”انگل..... کیا میری ماما بہت بری تھیں.....؟“ اس کے اس سوال پر حیدر چمک گیا اور حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”آپ کیوں ایسا پوچھ رہی ہو بیٹا.....؟“ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”انہوں نے ہمارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے..... انہوں نے ہمیں یوں چھوڑ دیا جیسے جانور اپنے بچوں کو ادھر ادھر پھینک کر چلے جاتے ہیں..... انگل آئی ریلیکس ہر.....“

”ہاں میں جانتا ہوں لیکن تمہارے باپا نے بھی تو ان کے ساتھ بہت زیادتیوں کی تھیں۔“

”مگر اس میں ہمارا کیا قصور تھا..... ہم نے کیا گناہ کیا تھا ان دونوں نے ہم سے ہمارا بچپن، ہماری شراعتیں، مسکراہٹیں اور سب کچھ ہی تو

چھین لیا۔۔۔ شہلا باگی تو بہت خوش قسمت ہیں کہ انھیں آپ جیسا باپ ملا اور ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں نہ ممانہ پاپا۔۔۔ نہ بہن اور بھائی بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہم روتے تھے تو کوئی آنسو پونچھنے والا نہ ہوتا تھا اور دکھی ہوتے تھے تو کوئی دکھ سن کر تسلی دینے والا نہ ہوتا تھا۔ میں اور آفاق پوری زندگی کل کر نہیں لے۔۔۔ اکل جو لوگ دوسروں کی خوشیوں کو چھین لیں کیا انھیں معاف کیا جاسکتا ہے۔۔۔ خدا کرے وہ بھی اسی طرح مشکلات سے گزریں۔۔۔ انھیں بھی اندازہ ہو کہ رکھا اور غم جب خون میں گردش کرتا ہے تو کیا محسوس ہوتا ہے۔۔۔ ”وہ بے مکان بولتی جا رہی تھی۔

”ہیں کرو شفیق بیٹا۔۔۔ اتنی بددعا نہیں مت دو۔۔۔ مظلوم کون کتنے کرب سے پہلے ہی گزر رہا ہے۔۔۔“ حیدر آہستہ سے بولا تو وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”اکل۔۔۔ آپ ماما کو بھی طرح جانتے تھے نا؟“

”ہاں۔۔۔“

”تو پھر انھوں نے ایسا کیوں کیا۔۔۔؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں بیٹا۔۔۔؟“

”کیوں اکل، آپ تو ان سے محبت کرتے تھے نا؟“ شفیق کے منہ سے نادانستہ نکلا تو حیدر نے اس کی طرف حیران کن نگاہوں سے

استغناء میا اعادہ میں دیکھا۔

”آئی ایم سوری۔۔۔ لیکن پاپا جب بھی ماما کو کہتے تھے تو آپ کو بھی ضرور اٹوا لیا کرتے تھے۔۔۔“ وہ نظریں جھکاتے ہوئے بولی اور حیدر بنا

کچھ کہے کرے سے ہار بھگ گیا۔

”سوری اکل۔۔۔ آپ ناراض تو نہیں ہیں۔۔۔ نہ جانے کیسا چانک میرے من سے نکل گیا۔۔۔“ شفیق اس کے پیچھے بھاگتی ہوئی آئی۔

”ہم بہت سی باتوں میں دوسروں کو الزام دینے کے عادی ہوتے ہیں اور۔۔۔ اور تمہارا باپ بھی ان میں سے ایک تھا۔ جو کچھ بھی تھا وہ اس

کی شادی سے پہلے تھا جب ہم کزنز تھے مگر شادی کے بعد وہ منصور اور تم لوگوں سے بہت قطع تھی اس نے تو مڑ کر بھی حویلی کی طرف نہیں دیکھا۔ منصور

نے اس پر اتنا تشدد کیا اور اتنی ذہنی الزامیں دیں کہ وہ خود ہی سب کچھ چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کی طرف سے اپنا ذہن صاف کر لو۔۔۔ اور یہ بھی ذہن میں

رکھو کہ کوئی بھی ماں اپنے بچوں کو چھوڑ کر مطمئن زندگی نہیں گزارتی۔“ حیدر نے شہلا کا دفاع کرنے کی پوری کوشش کی۔

”لیکن۔۔۔؟“

”لیکن کچھ نہیں۔۔۔ اب جاؤ اور آرام کرو۔۔۔“ حیدر کہہ کر خاموشی سے آگے بڑھ گیا اور وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔



ملک منصور کی الیکشن کمپن بہت کامیاب جا رہی تھی اور شزا اس کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔ اسے اپنی کامیابی یعنی نظراً رہی تھی۔ دونوں ایک جلسے سے تھکے ہارے رات کے تین بجے لوٹے تھے۔۔۔۔۔ الیکشن نے اچانک دونوں کا پھر سے ملاپ کر دیا تھا اور نہ ملک منصور تو کئی کئی دن گھر نہ آتا تھا، کہاں ہوتا تھا۔۔۔۔۔ کس کے ساتھ ہوتا تھا اس نے سوالات کرنے کے سارے حقوق شزا سے چھین لیے تھے۔ اگر شزا ابھی رعب سے ہات کرنے کی کوشش کرتی تو اگلے ہی لمحے اسے اپنی حیثیت کا اچھی طرح اندازہ ہو جاتا۔ اس نے ہر طرح سے صرف ٹائل اور سیر کے لیے اس سے کپڑا مانگ کر لے لیا تھا کیونکہ وہ آفاق اور شفیق کو کچھ کر دینا چاہتی اور ملک منصور کو اس کے حالات پر ہنسنے دیتی۔

”منصور اس الیکشن میں آپ کے پیچھے کے کتنے پرستار چالیں ہیں۔۔۔۔۔؟“

”جیسے کیا لگتا ہے۔۔۔۔۔؟“ وہ قاتمانہ مسکراہٹ سے بولا۔

”حالات تو ایسے ہی لگ رہے ہیں۔۔۔۔۔“

”اور یہ سمجھو کہ تم اپنے ساتھ ہی میں ہے۔۔۔۔۔ اس دفعہ میں نے سارے مہرے بڑی ہوشمندی سے استعمال کیے ہیں۔۔۔۔۔ تم دو دیکھنا انشا اللہ

جیت جاؤ گی ہوگی۔۔۔۔۔ چیف منسٹر کے عہدے تک پہنچنے کے لیے میں نے اس دفعہ اپنا سب کچھ ڈال دیا ہے۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔ میں سمجھتی نہیں۔۔۔۔۔“

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔ میں یونہی کہہ رہا تھا۔۔۔۔۔“ وہ بات کو پلٹنے میں ماہر تھا اور شزا سمیت وہ کسی بھی صورت پر مکمل اعتبار نہیں کرتا تھا۔ وہ احتیاط ضرور

دیتا تھا مگر خود اعتبار نہیں کرتا تھا۔ وہ سیاست کا شاطر اور ٹھکانا ہوا کھلاڑی سمجھا جاتا تھا۔ خوبصورتی سے لے کر ذہانت اور مکارانہ چالوں تک وہ ہر چیز پر مکمل

مبور رکھتا تھا۔ وہ از قند، خوبصورت نقوش، سفید رنگت، سڈول توانا جسم، سفید اور کہیں کہیں سے جھانکتے ہوئے کالے بال، تھری پوسٹرسٹ میں پائپ

پیتے ہوئے وہ بہت سلیبی ہوئی گروڈ پر سنائی لگتا اور اس کا ٹھہر ٹھہر الب ولوبا اور سوچ کہ بات کرنے کا انداز اسے پیدائشی سیاستدان ظاہر کرتا۔

سب جانتے تھے کہ اس چندار پر سنائی کے پیچھے کتنا بھیاںک ذہن اور مکار سوچ ہے۔ وہ اپنی ہر خوبی کو پیش کرانے کا عادی تھا اور کس

طرح کس کو کیسے انکسپلائٹ کرتا ہے اس فن سے بھی بخوبی آشنا تھا۔ اسی لیے آج تک اس نے جتنے الکھٹو میں حصہ لیا تھا کبھی نہیں ہارا تھا۔ وہ ہمیشہ

اپنے گاؤں کی سیٹ سے جیتا تھا اس نے گاؤں والوں کو اپنی فنی میں لے رکھا تھا کہ اس کے مقابلے میں آنے والا پہلے ہی اس کے حق میں ہینڈ جاتا ہر

الیکشن کے بعد اسے وزارت میں حصہ ملنا ضروری سمجھا جاتا تھا اور اب ایک عی حسرت میں وہ چیف منسٹر کا عہدہ لے کر اپنا دیرینہ خواب پورا کرنا چاہ رہا

تھا اور اپنے ان خوابوں میں اس نے شزا کو بھی شریک کر رکھا تھا کیونکہ این جی او چلانے کی وجہ سے شزا کی سماجی حیثیت بھی کافی مستحکم تھی اور وہ اس کی

حیثیت سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی جب کہ وہ شزا کی۔۔۔۔۔ مگر دونوں اندر ہی اندر ایک دوسرے کے ساتھ جس حد تک قلعہ تھے دونوں خوب جانتے

تھے۔ شزا اس کا جواب بن کر خاموش ہو گئی۔ وہ ابھی طرح جانتی تھی کہ اپنے رازوں میں کسی دوسرے کو شریک کرنا اس کے مزاج کے خلاف تھا۔

”منصور۔۔۔۔۔ آپ سے ایک بات پوچھنا تھی۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ کیا بات ہے۔۔۔۔۔؟“ اس نے لینڈ کرڈز رٹرن کرتے ہوئے پوچھا۔

”منصور..... شفق بہت دنوں سے نظر نہیں آ رہی۔ کہیں باہر چلی گئی ہے؟“ شزا شاید زندگی میں پہلی بار قدرے تشویش سے بولی۔ منصور نے مڑ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا مایہ دار کہیں وہ سب کچھ جانتے ہوئے اسے ڈانچ تو نہیں دے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سچ کی لہر دیکھ کر وہ قدرے مطمئن ہو گیا۔

”ہاں..... وہ کچھ روز کے لیے اٹھینڈ گئی ہے۔“

”اچھا..... خیر عت تو ہے..... لہجہ بتائے.....“

”کیا وہ پہلے بتا کر جاتی تھی اور ویسے بھی وہ اپنے فیصلوں میں آزاد ہے۔“

”لیکن منصور گھر میں ایک فرد رہتا ہو تو اس کے آنے اور جانے کا دوسرا کوئی اندازہ ہو ہی جاتا ہے..... اسے گئے ہوئے کافی دن ہو گئے ہیں۔“

”آجائے گی..... تم کیوں اتنا اعتراض کر رہی ہو..... وہ لوگ تو قصص دیکھنا بھی نہیں چاہتے.....“ منصور کا ہمیشہ سے یہی مہرہ کامیاب رہا تھا۔ وہ شزا کو ہمیشہ بچوں کے خلاف باتیں بتاتا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جب تک شفق، آفاق اور شزا ایک دوسرے سے متفرق ہیں گے۔ گھر میں اس کے خلاف کوئی محاذ نہیں کھل سکے گا۔ اس نے بچوں کے ساتھ شزا اور شہلا کے ساتھ جتنی زیادتیوں کی قصص وہ ان سب سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ کسی بھی صورت میں ان کا اتحاد اس کے لیے مسائل پیدا کر سکتا تھا اس لیے شروع دن سے اس نے شزا کو ان سے متفرق رکھنے کی کوشش کی تھی اور اس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی رہا تھا بچپن سے ہی شفق اور آفاق کو سوتیلی ماں سے بچنے کے مشورے دیتا تھا۔ اس شخص نے گھر اور باہر ایسی مکارانہ چالوں کی بساط بچا رکھی تھی کہ وہ آکٹوپس کی طرح اپنی طرف اٹھنے والی ہر شے کو اپنے فتنے میں جکڑ لیتی..... وہ ان سب کی طرف سے بہت مطمئن تھا..... اسے گھر کا سکون نہیں چاہیے تھا۔ اس کا سکون تو ہمیشہ گھر سے باہر ہوتا اور ملک کا سکون بھی اس کے لیے نقصان دہ تھا اس لیے وہ سیاسی جوت توڑ اور سازشوں میں برابر کا شریک رہتا..... منصور کا جواب سن کر وہ خاموش ہو گئی اور پھر مزید کچھ پوچھنے کی اس میں ہمت نہ رہی۔

”شزا..... سیر اور شائل سے بہت دنوں سے بات نہیں ہوئی..... کیا کر رہے ہیں آج کل؟“ اس نے شزا کا موڈ آف دیکھ کر اس سے پوچھا۔

”منصور شائل آپ کو بہت مس کرتی ہے۔ اب وہ لاہور آنا چاہ رہی ہے۔ مری میں اس کا دل نہیں لگتا ہے۔“

”جہنم..... نہیں..... یہاں کیا رکھا ہے..... اگر اس کا دل ادھر نہیں لگتا تو میں اس کو انگلیڈ، امریکا جہاں بھی وہ جانا چاہتی ہے ادھر بھیج دیتا ہوں۔“

”جہنم منصور، وہ آپ کو مس کرتی ہے۔ مجھے مس کرتی ہے۔ وہ گھر میں رہنا چاہتی ہے وہ ہم دونوں سے ختم ہو رہی ہے۔ آپ بھی تو سوچیں کب اس سے ملنے گئے تھے اور اکثر وہاں جا کر بھی آپ اس سے مل کر نہیں آتے۔“ شزا نے لمبا واسطہ اس پر چوٹ کی۔ منصور نے پہلو بدلا اور گلا کھٹکھٹاتے ہوئے بولا۔

”لیکن یہاں آ کر وہ اور اُشرب ہو جائے گی۔“

”کیوں.....؟“

”بھئی میں اپنے کاموں میں مصروف رہتا ہوں اور تم بھی تو بروقت مصروف رہتی ہو پھر وہی مسئلہ ہوگا۔ اسے سمجھاؤ کہ یہاں آنے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں۔“ وہ اسے کنوئیں کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

”منصور میں بچوں کو کیسے سمجھاؤں۔۔۔ کیا کوئی بھی ماں باپ بچوں کو گھر آنے سے روک سکتے ہیں۔“ شزا بھنپتا کر بولی۔ ملک منصور اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔ ”منصور وہ بڑی موروثی ہے اور سمجھدار بھی بہت ہے۔ یہ نہ ہو کہ وہ ہم دونوں کو ناپسند کرنے لگے اور پھر خود ہی بکھر جائے جیسے شفیق اور آفاق۔“

”اگر وہ ہمیں ناپسند کرنے لگے گی تو ہم اسے روک تو نہیں سکتے اور آفاق کو کیا ہوا ہے، ٹھیک ٹھاک تو ہیں۔“

”منصور کیا وہ ٹھیک ہیں۔۔۔؟“ شزا نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں تو کیا ہوا ہے انہیں سب کچھ تو نارل ہے۔۔۔۔“

منصور آپ کو سب معلوم ہے کہ آفاق کیا کچھ کرتا رہتا ہے اور شفیق کس قدر غمزدی اور خود مر ہے وہ بعض اوقات اس قدر جھوٹی ہو جاتی ہے کہ مجھے تو اس سے خوف آنے لگتا ہے۔

”کم آن شزا۔۔۔۔۔ یہ ہم سب امیروں کی اولادوں کے ساتھ مسئلہ ہے بلکہ اب تو انیشینس سبیل بن چکا ہے تھوڑی سی اینارٹسٹی، مختلف اور منفرد ہونے کا شوق۔۔۔۔۔ ان کے دکھاوے اور ان کے اسٹائلز، جب تک یہ سب کچھ نہ ہو وہ کیسے منفرد لگیں گے۔۔۔۔۔“ وہ لائٹ موڈ میں بولا۔

”یہیٰ منصور۔۔۔۔۔ میں اپنی مثال اور میر میں یہ سب کچھ ڈیولپ نہیں ہونے دوں گی۔“ وہ قطعیت سے بولی۔

”ویری گڈ۔۔۔۔۔ تم تو آج مجھے چمکا رہی ہو۔۔۔۔۔“ وہ جھٹے ہوئے بے پرواہی سے بولا۔

”کیوں۔۔۔۔۔؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”اپنی بورڈ اور سوچ سے۔۔۔۔۔ آج کل تو منسٹرز کی بیویاں خود ایسے شوق پاتی ہیں کہ تھوڑی سی اینارٹسٹی خود بخود ڈیولپ ہو جائے۔ پھر سائیکلو جسٹ کے پاس سیشنز کے لیے جائیں۔۔۔۔۔ اس پارٹ آف آؤٹ ڈارن سوسائٹی۔۔۔۔۔“ منصور جھٹے ہوئے بولا۔

وہ اس کی باتیں سن کر خاموش ہو گئی۔ اس شخص سے جیسا آسان نہیں تھا۔ وہ سوسائٹی کے ہر پہلو سے بخوبی واقف تھا۔ مردوں کی شائراںہ چالوں اور عورتوں کی چلتی باز یوں اور بناوٹی رویوں سے۔۔۔۔۔ وہ ہر چیز کو لاپٹی لینے کا عادی تھا۔ واقعی یہ شخص بہت نکلی ہے۔ وہ جتنا اس کو ناپسند کرتی تھی اتنی متصرف بھی ہوتی جاتی تھی۔

”یہ تم آنے والے دنوں کے بارے میں سوچو جب تم وائف آف چیف منسٹر ہوا کرو گی ہر فنکشن میں تم ہی تم ہو گی۔“ منصور کے لہجے میں آنے والے دنوں کی امید اور لہجوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ تب تک نہ جانے تم؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ یہ بھی خوب کبھی۔۔۔۔۔ میں جانتا ہوں تمہارا اگلا جملہ کیا ہوگا۔۔۔۔۔ بھی تمہاری خون جھارے سائیکسٹ اور تمہارے دیکھنے کے اعزاز

سے مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو اور تمہارا کیا مطلب ہے۔۔۔۔۔ آخر تمہارے ساتھ زندگی گزاری ہے۔ اس نے شزا کو خوش کرنے کے لیے اپنا بازو اس کے کندھے پر رکھا تو وہ مسکرا دی۔۔۔۔۔ ملک منصور اندر ہی اندر مسکرا رہا تھا اور اب وہ سرور کی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”منصور آپ نے سحر کو دیکھا ہے اس میں کتنا جینج آ گیا ہے۔“ وہ ایک دم بولی۔

”کون۔۔۔۔۔ وہ بھلا کون۔۔۔۔۔ ابھی تک نہیں ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔

”منصور آپ ایسے کہہ رہے ہیں۔ جیسے آپ کو معلوم ہی نہیں۔“

”قسم لے لو ڈار لنگ۔۔۔۔۔ میں نے کبھی اس فقیر کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ میرے پاس ایسے کیڑے کوڑوں کو دیکھنے کی فرصت نہیں

اور ویسے بھی میں فی الحال اسے پیچھے کر کوئی نیا ایڈیشن اٹھانا چاہتا۔ چیف منسٹر بن جاؤں تو سب سے پہلے اپنے گھر کو اس گندے صاف کروں گا اور تم خواؤخاویپ تک مت ہوا کرو۔۔۔۔۔“ منصور نے گاڑی گیٹ کے اندر لاتے ہوئے کہا۔

”میں تو اس کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی۔“

”گڈ۔۔۔۔۔“

”میں یونیورسٹی ڈسکس کر رہی تھی کہ اب تو وہ بہت بدل چکی ہے کلب میں اس کا بڑا نام ہے۔۔۔۔۔ گیمبلنگ میں تو بہت ایکسپٹ ہو چکی ہے۔“

”اوپر۔۔۔۔۔ کیا لڑی اور کیا لڑی کا شور ب۔“ وہ مسخرانہ قہر لگا کر بولا تو وہ بھی ہنس دی۔

گھر میں گہرا سکوت تھا یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی شہر غمناکوں میں داخل ہو گئے ہوں۔ تمام کروں کی لائٹس آف تھیں صرف پورچ اور لاؤنج

کی آن تھی گھر میں اتنا سا ہلکا سا شزا کا جی لہجے میں اس سے بولی۔ ”منصور اگر شکل اور میر گھر آ جائیں تو گھر میں رونق تو ہوتی جائے گی۔“

”شزا پھر وہی بات۔۔۔۔۔ ان کو گھر سے دور ہی رکھو تو بہتر ہے۔ میں جب چیف منسٹر بن جاؤں گا تو خود ہی بلا لوں گا۔“ اس نے اسے جھوٹی

تسلی دینے کی کوشش کی مگر وہ ملک منصور کے ارادوں اور نیتوں سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ شخص محض بہانے گھڑنے کا عادی تھا۔ وہ خاموشی سے

اپنے بیڈروم میں چلی گئی اور جاتے ہی موٹی مگر وہ نہ جانے کب تک فون پر انکیشن اور اس پر مبنی صورت حال اپنے پی اے سے ڈسکس کرتا رہا۔

سمبل خیل میں نہایت اذیت کی حالت میں تھا۔ سزا کے بعد ملک منصور نے مڑ کر بھی اس کی خبر نہیں لی تھی کہ وہ کن حالوں میں تھا۔ وہ اپنی

حالت سے ہی اعزاز نگار ہا تھا کہ اس نے یقیناً اس کے گھر والوں کی بھی خبر نہیں لی ہوگی اور اس کا کسی طرح ان سے رابطہ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اتنا

کمزور ہو چکا تھا کہ چند دنوں میں ہی اس کی ہڈیاں کل آئی تھیں اچانک ایک دن اس کی ماں ملنے آئی تو اس کی حالت دیکھ کر بلکنا شروع ہو گئی۔ اس

کے آنسو جیسے کانام نہیں لے رہے تھے۔ وہ اسے چپ کرانے کے لیے بہت تسلیاں دے رہا تھا مگر وہ روئے جا رہی تھی۔

”سمبل بیٹا۔۔۔۔۔ خدا کے لیے تم سچ کیوں نہیں کہتے۔ مجھے اس لڑکی نے سب کچھ سچ بتا دیا تھا مگر بھی تم نے انعام اپنے سر لے لیا اور دیکھو

وہ کیسے احسان فراموش لوگ ہیں۔ جس کے لیے تم نے یہ سب کیا اس نے ایک دفعہ بھی مڑ کر ہماری خبر نہیں لی۔“

”اماں کس نے۔۔۔۔۔ آپ شفق کی بات کر رہی ہیں۔ وہ تو شاید۔“

”نہیں..... تمہارے مالک نے..... وہ تو میں جانتی ہوں کہ اس کے باپ نے اسے گولیاں مار دی تھیں۔ ان بڑے لوگوں کو خدا ہی جانے۔ مگر بیٹا میرا تو سہارا تو ہے۔ ہماری حالت سے بھی تو اچھی طرح واقف ہے اب تو ثوبت کا قوں تک آگئی ہے۔ پرتو نگر نہ کر..... بس کسی طرح باہر آنے کی سوچ۔“

”ہاں اماں، اب کچھ تو سوچنا پڑے گا۔ وہ شخص واقعی اس قابل نہیں تھا کہ اس کے ساتھ تک حلالی کی جاتی۔ میں نے اپنی زندگی اس کی خاطر داؤ پر لگا دی ہے اور وہ کس قدر بے حس نکلا..... مگر آپ نگر نہ کریں۔ اس ایڈریس پر جا کر آصف نام کے لڑکے کو میرے بارے میں بتائیں اور کہیں کہ میں اسے جیل میں ملنا چاہتا ہوں۔“ اس نے ماں کو ایڈریس اچھی طرح یاد کرایا اور آصف کے اخبار کا دفتر وغیرہ اسے سمجھا دیا۔ آصف اس کے گاؤں کا ہی لڑکا تھا اور اس کا بہت اچھا دوست تھا وہ ایک اخبار میں صحافی کے طور پر نوکری کرتا تھا۔ ملک منصور کی پریس کانفرنسوں میں اکثر اس کی ملاقات سہیل سے ہوتی تھی اور سہیل کے ساتھ رفتہ رفتہ اس کی دوستی گہری ہوتی گئی۔ اس اندھیرے میں صرف آصف ہی اسے امید کی کرن نظر آتی۔ اماں نہ جانے کیسے اس تک پہنچی کہ اگلے دن آصف اس کے پاس تھا اسے اس حالت میں دیکھ کر اسے قدرے تشویش ہوئی۔

”یار مگر تم نے قتل کیوں کیا.....؟“

”بس..... پوچھو مت۔ مگر اس وقت میں نے جس کام کے لیے تمہیں بلوایا ہے وہ دوسرا ہے.....“

”کیا مطلب.....؟“

”ملک منصور کی انکیشن میں پوزیشن کیسی جا رہی ہے..... اور ان کے چیف منسٹر بننے کے کتنے پرسنٹ چانسز ہیں۔“

”بہت اسٹریٹجک پوزیشن ہے بلکہ تمام طاقتوں میں یہی کہا جا رہا ہے کہ چیف منسٹر کی سیٹ صرف ملک منصور کے لیے ریڑ رو ہے۔“

”آصف تم میری بات سنو.....“ اس نے آصف کے کان میں کچھ سرگوشی کی آصف کے چہرے پر غصہ رنگ آ جا رہا تھا۔

”یار دیکھو مردانہ دینا.....“

”دیکھو تمہاری جاب تو رسک ہی لینا ہے اور یہ کام جو تم کرنے جا رہے ہو۔ کم اہم تو نہیں.....“ سہیل نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا۔

”میں کل تم سے ملنے آؤں گا.....“

”ٹھیک ہے..... میں انتظار کروں گا.....“ سہیل نے اطمینان سے کہا۔

”لیکن اگر مجھے گاؤں جانا پڑ گیا تو پھر زیادہ وقت لگ جائے گا۔“

”ٹھیک ہے مگر پہلے ان لوگوں سے معاملہ طے کرنا پھر کوئی قدم اٹھانا۔“ سہیل نے اسے گائیڈ کیا۔

”ہاں..... ظاہر ہے ان کی سپورٹ کے بغیر تو ایسے رکی کام نہیں کیے جاسکتے ہوا کرتا.....“ آصف نے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔

ملک منصور باقاعدگی سے سارے قحانے والوں کو منتقلی سمجھاتا تھا۔ اسی لیے انکی زبانیں بند تھیں وہ نہ عشق کا معاملہ کب کا پریس میں جا چکا ہوتا۔

ایس ناچ اوانے سارا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ اسنے وہ عشق والے معاملے سے بے فکر تھا وہ بس پالیٹکس کا شہر تھا اور اسنے بعد وہ ہر گز سے آزاد ہوگا۔

جوں جوں انکیشن کے دن قریب آ رہے تھے اس کی راتوں کی نیندیں اڑ گئی تھیں وہ ہر جگہ میں ہونے والی تمام سرگرمیوں کی ہل کی خبر رکھتا۔ ہر طرف اس کے کارندے بکھیل چکے تھے اور اسے صورت حال سے آگاہ کرتے رہتے۔ اس کے بیویں موہا ٹکڑ ہر وقت مصروف رہتے۔ انکیشن میں دو دن باقی رہ گئے تھے وہ تمام اخباروں میں شائع ہونے والے سر دیے سے صبح سویرے لطف اندوز ہوتا تھا اخبار شائع کی گئی تھی اس کے سامنے تھا اور وہ پوری طاقت سے جی رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے پورے گھر میں زلزلہ آ گیا ہو۔۔۔۔۔ عمر اور شزا بھی اپنے کمرے میں سے بھاگتی ہوئی باہر آ گئیں۔ آفاق بھی دوڑتا ہوا باہر آ گیا۔۔۔۔۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ملک منصور پاگل ہو گیا ہو وہ موہا ٹکڑ اٹھا اٹھا کر زمین پر بیٹھ کر رہا تھا اور گالیاں ہٹکا جا رہا تھا۔

”منصور۔۔۔۔۔ ہوش کرو۔۔۔۔۔ آ کر کیا ہوا ہے؟“ شزانے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
 ”پانی لاؤ۔۔۔۔۔ جلدی سے پانی لاؤ۔۔۔۔۔“ شزا چلائی عمر بھاگ کر پانی کا گلاس لے آئی۔ شزانے اسے پانی پلانا چاہا تو اس نے گلاس اٹھا کر زمین پر دے مارا۔

”آخر بتاؤ تو کسی کیا ہوا ہے۔۔۔۔۔؟“ شزانے اسے صوفے پر بٹھایا اور اس کے کندھے دبائے گئی۔ ملک منصور نے چہرہ لکھوں کے لیے آنکھیں بند کیں اور پھر جیسے پر مسکون ہو گیا۔ شزانے اپنے کمرے میں سے کچھ گولیاں لا کر اسے زبردستی کھلا دیں۔۔۔۔۔ اور اسے وہیں صوفے پر لٹا دیا، آفاق اور مرد و کھڑے یہ تماشا دیکھتے رہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی آگے نہ بڑھا۔۔۔۔۔ چہرہ اخبار نمیل کے نیچے گر پڑا تھا۔ آفاق نے آگے بڑھ کر اخبار اٹھایا اور دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”آفاق اس میں کیا لکھا ہے۔۔۔۔۔؟“ عمر نے حیرت سے پوچھا۔
 ”کچھ نہیں، بس گیم ختم۔۔۔۔۔“ اس نے اخبار اس کے آگے پھینکا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔
 عمر نے بھی اخبار حیرت زدہ نظروں سے دیکھا اور وہیں رکھ کر آفاق کے پیچھے کمرے میں چلی گئی۔
 ملک منصور اب انگڑا رہا تھا شزانے بھی اخبار اٹھایا تو چونک گئی۔ سارا کچھ ختم ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ اور اسکی پھوٹیشن میں ملک منصور کا ہارٹ فلٹ نہ ہونا بہت بڑی بات تھی۔ شزا کو بھی سب کچھ ختم ہونا محسوس ہو رہا تھا۔ ملک منصور کے الفاظ اسے یاد آ رہے تھے اس دلہے میں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہے۔ اتنی بڑی کامیابی کے قریب پہنچنے پہنچنے وہ اچانک محسوس کے بل کر گیا تھا اور اب دوبارہ المنا بہت ہمت کی بات ہوگی۔
 ”آفاق اب کیا ہوگا۔۔۔۔۔؟“ عمر حیرانی سے پوچھ رہی تھی۔

”ہوگا کیا۔۔۔۔۔ انکو انری ہوگی اور شاید انکیشن سے ہی انھیں اس کو ایذا لگائی کر دیا جائے۔۔۔۔۔ ایف آئی آر کتنے کے بعد ہو سکتا ہے وہ کسی وقت بھی اریسٹ ہو جائیں۔“

”لیکن یہ سب اچانک کیسے ہوا۔۔۔۔۔؟“

”خائن کی سازش ہے۔۔۔۔۔ کسی نے بڑی گہری گیم کھیلی ہے۔۔۔۔۔؟“

”مگر کس نے.....؟“

”ظاہر ہے اپوزیشن نے..... وہ لوگ تو گھات میں لگے ہوئے تھے۔“

”لیکن دو سال بعد اس ایٹو کا اعلان..... اور وہ بھی عین اس وقت جب انکیشن سر پر ہیں۔ واقعی کسی کی سازش ہی لگتی ہے۔“ سحر بولی۔

”سیاست سے بڑھ کر مندی چھ کوئی نہیں، کون کس وقت کلیں بولند ہو جائے کے خبر ہے.....؟“ آفاق نے تشویش سے کہا۔

”آفاق تمہیں دکھ ہو رہا ہے.....“ سحر نے اس کا اصرار دہرہ دیکھ کر کہا۔

”نہیں..... جڑو دوسروں کے ساتھ کرتے آئے ہیں۔ ایسا تو ایک دن ان کے ساتھ بھی ہونا ہی تھا۔“

کچھ دیر بعد باہر گاڑی کی آواز آئی تو آفاق تقریباً ہمتا ہوا کمرے سے باہر نکلا وہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ شزا اور ملک منصور دونوں کہیں جا

رہے تھے۔

”کون ہے باہر.....؟“ سحر نے حیرت سے پوچھا۔

”پاپا اور شزا آ گئی..... کہیں جا رہے ہیں.....؟“

”واقعی.....؟“ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

”ہاں..... وہ واقعی بہت مضبوط اعصاب کے مالک ہیں اگر میں ان کی جگہ دیکھتا تو بے ہوش ہو چکا ہوتا.....“ آفاق قدرے حیرت سے بولا۔

”سیاست اعصاب کو مضبوط بنا دیتی ہے۔“ سحر بولی۔

”اور سیاست دانوں کو دھیت.....“ آفاق سر دلچھے میں بولا۔

ملک منصور کو اس کڑے وقت میں پارٹی نے انکیشن سے علیحدہ کر دیا تھا اور اب وہ روپوش تھا۔ اس کا اس وقت کہیں چلے جانا ہی بہتر تھا۔ شہر

میں اس کا رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

آصف بھی کہیں روپوش تھا اور سہیل اس کا شدت سے خطر تھا البتہ کچھ پولیس والوں کی رہائی اسے باہر کے حالات کا علم ہوا تھا اس لیے وہ

مطمئن تھا۔ آصف کا اس وقت روپوش ہونا ہی بہتر تھا۔ انکیشن کے بعد کی صورت حال کا کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا۔

شزا اخبار کو لے حیرت سے اسٹوری پڑھ رہی تھی۔ ملک منصور نے دو سال پہلے اپنی..... سیکرٹری کو قتل کیا تھا۔ اس کی ساری تصویریں اور

کہانی اخبارات میں شائع ہو چکی تھی۔ اس اسکیڈل کے منظر عام پر آتے ہی ملک منصور کی مقبولیت کا گراف جس چیز سے نیچے گر ا وہ سب کے لیے

حیران کن بات تھی۔

”ملک صاحب یہ تصویریں کس کے پاس تھیں.....“ شزا بار بار ملک منصور سے پوچھ رہی تھی..... جب اسے اس کے ایک دیرینہ دوست

کے پاس علاقہ خیر میں راتوں رات چھوڑنے جا رہی تھی۔

”مجھے اچھی طرح یاد نہیں لیکن وہ رپورٹر مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اسے تو میں نے خود دھکالنے لگا دیا تھا لیکن جس نے بھی میرے ساتھ یہ نیم

کھلی ہے میں اسے جنم رسید نہ کر دوں تو ملک منصور میرا نام نہیں۔“ اس کا خون بدلے کی آگ سے کھول رہا تھا۔ ”شزا تم اس صفائی کا نام جانے کی کوشش کرو۔۔۔“

”اس اسکینڈل کا اس وقت منظر عام پر آنا کوئی گہری سازش معلوم ہوتی ہے۔“

”جو کوئی بھی ہے ملک منصور اسے چھوڑنے والا نہیں۔ ایسے واقعات تو آئے دن ہوتے رہتے ہیں مگر اس وقت اس کا جو استعمال کیا گیا ہے یہ کسی شاطر ذہن کی کارستانی ہے۔ میرا خواب تو پورا ہونے سے رہا لیکن میں اس وقت تک جھن سے نہیں ہینوں گا جب تک اس شخص سے بدلہ نہ لے لوں۔۔۔۔۔ میری ساری محنت اگارت مٹی اور سب کچھ بھی۔۔۔۔۔ شزا تم بہت نہ ہارتا۔۔۔۔۔ ہمیں اپنے بچوں کے لیے اپنا کھوپا ہوا دکانا روٹا ہوا لیتا ہے۔“

”شزا حیرت سے گڑگڑ کی طرح رنگ بدلنے والے اس شخص کو دیکھ رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کی کن باتوں پر یقین کرے۔ اب دانی یا پہلے والی باتوں پر۔

انٹیشن میں ملک منصور کی پارٹی واضح اکثریت سے کامیاب ہوئی تھی اور چیف منسٹر شپ بھی انہی کے حصے آئی تھی۔ ملک منصور نے یہ خبر سنی تو دل مسوس کر دیا۔ ہاتھ آئی چیز جب اچانک حاصل کر دیا میں کر جائے تو سوائے ہاتھ ملنے کے باقی کیا رو جاتا ہے۔ یہی حال ملک منصور کا تھا۔ وہ مسلسل اب اپنی پارٹی سے رابطہ کیے ہوئے تھا اور حالات پر اس کی گہری نظر تھی۔

آصف پر دو دفعہ کا علاقہ حملہ ہو چکا تھا۔ اپوزیشن کے جن لوگوں نے اسے مہرے کے طور پر استعمال کیا تھا اور اسے ہر طرح کے تحفظ کی ضمانت دی تھی اب پیچھے ہٹ گئے تھے۔ ملک منصور کی پارٹی کے اقتدار میں آنے کے بعد انہیں شدید سکیورٹی رسک لاحق تھا۔ ان کے خلاف بھی مقدمے بن سکتے تھے۔ کئی فائلیں کھل سکتی تھیں۔ اس لیے انہوں نے آصف کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیا تھا اور اب وہ بھی پناہ کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ شیروں کی کچھار میں ہاتھ ڈال کر وہ بچتا رہا تھا۔ شزا بھی اس کوڑلیس آؤٹ کرنے کی کوشش میں تھی۔ سبیل بھی مزید پریشانی اور الجھنوں کا شکار ہو چکا تھا۔ پولیس اب اس پر پہلے سے زیادہ تشدد کرتی کیونکہ وہ ہر روز جیل میں کوئی نہ کوئی نیا مسئلہ کھڑا کر دیتا تھا۔ اس کے بال سر سے صاف کر دیے گئے تھے اور اس کی رنگت حل کر سیاہ ہو چکی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے مزید گہرے ہو چکے تھے۔۔۔۔۔ ہر لمحہ اسے ملک منصور کا خطرہ لاحق رہتا۔ اب اس شخص سے اسے کوئی بھی نہیں بچا سکتا تھا۔ ہر دن خطرے سے بڑھتا اور ہر آہٹ خوف سے۔



شکیل مری سے ڈرائیو کے ساتھ اکیلی آگئی تھی۔ ڈرائیو اسے کچھ ضروری سامان دینے گیا تھا مگر وہ خود ہی اس کے ساتھ آگئی تھی۔ شزا کی آنکھیں حیرت سے پٹی کی پٹی رہ گئیں۔۔۔۔۔ شکیل اتنی خود مر اور خود مختار ہو سکتی تھی اسے قطعی اندازہ نہ تھا۔ اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”تم۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ چانک یہاں کیسے آ گئیں اور اسکول والوں نے تمہیں کیسے آنے دیا۔۔۔۔۔؟“

”م۔۔۔۔۔ مہما۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔“

”میڈم۔۔۔۔۔ مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔“ تھے ڈرائیو شوکت نے سرگوشی کے انداز میں کہا تو وہ چونک گئی۔

”شائل تم کمرے میں جاؤ۔۔۔۔۔ میں ابھی آتی ہوں۔“ شائل پوجھل قدموں سے اٹھ کر چلی گئی۔

”ہاں کیا بات ہے۔۔۔۔۔؟“

”میڈم۔۔۔۔۔ شائل بی بی بہت پریشان ہیں اور۔۔۔۔۔ انہوں نے خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی مگر بچ گئیں اسکول والے میڈم اس دن سے آپ کو اور ملک صاحب کو فون کرنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر فون ملتا ہی نہیں۔ میں جب سامان دیتے گیا تو ان کی ماس نے مجھے میڈم صاحب سے ملوایا۔ شائل بی بی نے انہیں گمراہ کرنے کے لیے بہت تنگ کر رکھا تھا اور وہ گمراہوں کی اجازت کے بغیر آئے نہیں دیتے۔ میں آپ کو فون کرنے آ رہا تھا کہ مجھے سڑک پر آفاق صاحب مل گئے تو میں نے انہیں اسکول چلے کو کہا پہلے تو مائے نہیں مگر پھر مان گئے اور اسکول والوں نے ان کے کاغذ دیکھ کر شائل بی بی کو آنے دیا۔ میڈم صاحب بول رہی تھیں کہ وہ ٹھیک سے پڑھ بھی نہیں رہیں۔ ہر وقت پریشان رہتی ہیں۔ ان کا علاج کروائیں پھر اسکول بھیجیں۔“

”اور سیر۔۔۔۔۔؟“ شائل نے اس کے بارے میں پوچھا۔

”وہ ٹھیک ہیں۔۔۔۔۔ انہیں کوئی مسئلہ نہیں۔“

”اچھا تم جاؤ۔۔۔۔۔“ شائل آہستہ سے بولی۔ شائل اور خودکشی۔۔۔۔۔ اسے قطعی یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ لڑکی اس قدر شدید فرسٹریشن کا شکار ہو سکتی ہے اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ وہ اندر کمرے میں گئی تو وہ بستر پر لیٹی تھی اس کا چہرہ مردہ چہرہ اس کے امداد کی داستان سنا رہا تھا۔ اسے اس پر غصہ بھی آ رہا تھا مگر اس نے اپنے غصے کو کنٹرول کیا۔

”کیا بات ہے شائل۔۔۔۔۔ تم کس اپ پیٹ ہو۔۔۔۔۔؟“ وہ شائل کو اپنے ساتھ لگا کر بولی تو وہ رونا شروع ہو گئی۔

”بلوٹا ڈیر۔۔۔۔۔ کیا بات ہے۔۔۔۔۔؟“

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔“ وہ بس روئے جا رہی تھی۔

”کچھ تو متاؤ۔۔۔۔۔ اور تم نے خودکشی کی کوشش کس کی۔۔۔۔۔؟“ وہ دھیمے مگر شکایتی لہجے میں بولی۔

”میں زندگی سے بیزار ہو گئی ہوں۔۔۔۔۔“

”مگر کوئی وجہ بھی تو ہو۔۔۔۔۔“

”میں سردائے نہیں کرنا چاہتی۔۔۔۔۔“

”پھر دعی بات۔۔۔۔۔؟“

”ابھی تم آرام کرو۔۔۔۔۔ میں تمہارے لیے کھانا لگاتی ہوں۔“ وہ اسے بستر میں لٹا کر باہر چلی گئی۔

شائل شدید ڈپریشن کا شکار تھی اور شائل کو اس کی یہ حالت دیکھ کر سخت رنج و غم ہو رہا تھا۔ ملک منصور تمہاری زندگی کا حاصل کیا ہے۔۔۔۔۔؟ تمہاری ساری اولاد ہی ڈپریشن کی ماری ہے نہ جانے تمہارے جیہڑ میں کیا ہے کہ ہر کوئی ڈسٹرب ہے۔۔۔۔۔ اب سیر۔۔۔۔۔ یا خدا یا اس کو اپنی امان میں رکھنا۔۔۔۔۔ وہ

نہیں پر کھانا لگا رہی تھی اور ساتھ ساتھ سوچ رہی تھی۔ ملک منصور کو کیا فرق پڑتا ہے کہ اس کی اولاد کیا سوچ رہی ہے اور کیا کر رہی ہے اس کے نزدیک تو سب کچھ ماڈرن سوسائٹی کے لیشر ہیں۔ ان کا مخصوص اسٹائل ہے۔۔۔ اور سٹائل کا خود کشی کرنا۔۔۔ ہائی گاڈ۔۔۔ اس ٹوئج۔۔۔ اس کا مطلب ہے وہ ہائپر ہو چکی ہے اور اب مزید کچھ فلو ہوا تو وہ شاید۔۔۔ نہیں۔۔۔ مجھے اسے بچانا ہے ہر قیمت پر۔۔۔ میں اسے یوں نکھرتا نہیں دیکھ سکتی۔۔۔ میں اس کی ماں ہوں اور ایک ماں کیسے برداشت کر سکتی ہے کہ اس کی اولاد اس کے سامنے یوں نکھرتی چلی جائے۔ کھانا لگا کر وہ اسے بلانے گئی تو وہ ادھر رہی تھی۔

”جیٹا اٹھو کھانا کھا لو۔۔۔“

”میرا دل نہیں چاہ رہا۔۔۔“

”پلیز تھوڑا سا۔۔۔ آؤ میرے ساتھ۔“ وہ اسے زبردستی ہا ہر لے کر آئی اور خود اپنے ہاتھوں سے کھلاتی رہی۔ اسی لمحے سحر باہر سے آئی تو شزا اور سٹائل کو دیکھ کر چونک گئی۔ محبت کا یہ انداز اسے بہت الو کھانا لگا اور وہ بھی اس گھر میں۔ کیا یہاں بھی محبت کا وجود ہے۔۔۔ اس نے حیرت سے سٹائل کی طرف دیکھا۔۔۔ سٹائل بھی اس کی طرف دیکھتی رہی۔

”مما یہ کون ہے۔۔۔؟“

”آفاق کی بیوی۔۔۔“

”انہوں نے کب شادی کی اور وہ مری میں ان کے ساتھ۔۔۔“ سحر نے کمرے میں جاتے ہوئے اس کی بات سن کر معنی خیز مسکراہٹ سے شزا کی طرف دیکھا اور اندر چلی گئی۔ شزا اس کی اس مسکراہٹ کا مطلب سمجھ گئی تھی مگر خاموشی سے اسے کھانا کھلانے لگی۔

”سٹائل تم نے بتایا نہیں کہ تم آپ سیٹ کیوں ہو۔۔۔؟“

”معلوم نہیں۔۔۔“ وہ ہاتھوں سے بولی۔

”ہر فرسٹریشن کا کوئی ریزن بھی ہوتا ہے اور ضرور اس کا بھی ہوگا۔“

”مجھے خود سمجھ نہیں آ رہا۔ میں ہاسٹل لائف سے تنگ آ گئی ہوں۔ وہاں اتنی تنہائی اور اسی ہے کہ میرا دل گھبراتا ہے۔ مماس میں کس سے آپ لوگوں کی باتیں کروں۔ سیر میری باتیں سننا نہیں چاہتا اور میں آپ کو اور پاپا کو بہت مس کرتی ہوں مگر آپ لوگ ہمیں بالکل مس نہیں کرتے۔ پانچ ماہ جو مجھے ہیں پاپا ایک دفعہ بھی ملے نہیں آئے اور اب بھی وہ نظر نہیں آ رہے۔ مماس کیا آپ لوگ واقعی ہم سے پیار نہیں کرتے؟“ اس کی آنکھوں میں آنسو حیر رہے تھے۔

”یہ تم سے کس نے کہا اور یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم تم لوگوں سے پیار نہ کریں۔“

”مگر پاپا۔۔۔“

”وہ بہت مصروف ہیں۔۔۔ تم انہی طرح جانتی ہو۔۔۔“

”اور ان کی وہ تصویر اخبار میں۔۔۔“

”ادھا کی گاڑ.....“ شزا بڑبڑائی۔ ”دوسب جھوٹ ہے۔“

”مگر میں نہیں سمجھتی کہ دوسب جھوٹ ہے.....“ وہ پورے دھوک سے بولی۔

”کیوں..... جب میں کہہ رہی ہوں کہ تمہارے باپا ایسے نہیں اور یہ ظالمین کی سازش ہے..... پھر تم کیسے جانتے۔ یقین سے کہہ سکتی ہو.....“

”اس لیے کہ ایک دفعہ ہمارے اسکول ملے آئے تھے تو گاڑی میں، میں نے اس لڑکی کو دیکھا تھا.....“ وہ آہستہ سے بولی۔ اس کے لیے

میں ہلکا کا درد تھا۔

”ہاں..... تو وہ ان کی سیکرٹری تھی۔ اس لیے ان کے ساتھ ہر جگہ جاتی تھی۔“ شزا کا دل کرپتی کرپتی ہو رہا تھا مگر وہ کسی صورت میں ملک

منصور کا بیچ اس کی نظروں میں گرتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

”مما..... میں آپ جیسی باتیں نہیں کر سکتی لیکن مجھے یہ سب کچھ بہت ہرٹ کرتا ہے۔ دوسرے بچوں کے ماں باپ آتے ہیں تو اتنے اچھے

دن وہ انھیں مس کرتے رہتے ہیں۔ ان کی اچھی باتیں سناتے ہیں۔ ممّا آپ لوگ تو کبھی اکٹھے ہی نہیں آئے اور پھر آپ کی کوئی اچھی باتیں

ہمارے پاس ہیں ہی نہیں..... ممّا اب میں واپس نہیں جاؤں گی..... یہیں لاہور میں کسی کالج میں ایڈمیشن لے لوں گی۔“

”ٹھیک ہے ابھی تو تم ادھر ہی ہو..... مگر کچھ دنوں کے بعد تمیں ادھر ہی جانا ہے.....“

”نہیں ممّا..... اب میں کبھی واپس نہیں جاؤں گی۔“ وہ پاؤں پٹختی ہوئی اندر چلی گئی اور شزا وہیں ٹیبل پر سر پر ہاتھ رکھے سوچ میں گم ہو گئی

یہ سب کیا ہو رہا ہے..... باہر سے کتنا خوبصورت اور اندر سے کتنا بھیاں کتنے تپاؤں پر اتر رہے اور کتنی کھوکھلی زندگیاں..... کوئی ایک رشتہ بھی تو مضبوط

نہیں..... ہر رشتے کی بنیاد شکست اور عداوت میں درازیں ہیں..... تق ہے اس ماڈرن سوسائٹی پر..... ملک منصور..... تمہاری اس سوکا لڈ سوسائٹی کے

اسٹائلز پر..... اے فطرت ہی ہونے لگی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے بچوں کے ساتھ کہیں دو کردوں کالٹیٹ لے کر رہ لے.....

سب کچھ ختم کروے..... ساری سرگرمیاں اور کچھ بھی نہ رہے..... مگر یہ محض ایک سوچ تھی۔ وہ جس لائف اسٹائل کی غاوی ہو چکی تھی۔ اس میں اینڈ لجر

کے طور پر تو کچھ دن کھن گزرا رہے جاسکتے تھے مگر بیش نہیں..... جیسب سی آؤٹس سامنے کھڑی تھی۔ شائل کی صورت میں..... اور ابھی سیر ہاتی تھا.....

نہ جانے وہ کیا کرے گا؟ شزا کو ابھی شدید پڑ پڑیشن ہو رہا تھا۔ ملک منصور تم نے ہم سب کو یہ کیا مرض دے دیا ہے.....؟ وہ سوچ سوچ کر تھک گئی تھی۔

”کس کوفن کر رہی ہو.....؟“ شزا نے حیرت سے پوچھا۔

”دلیم کو.....“

”کون دلیم.....؟“

”میرا کلاس فیلو.....“

”مگر وہ مری میں ہے۔“

شزا کو کچھ کچھ سمجھانے لگا۔ وہ اس کی بہنابی دیکھ رہی تھی اور اس کے چھٹلانے سے اعزاز نگار رہی تھی۔ ”دو خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔“

”پتا نہیں کیا مصیبت ہے۔۔۔۔۔ نمبر ہی نہیں مل رہا۔۔۔۔۔ ماما میں ڈرائیور کے ساتھ اس کے کالج جا رہی ہوں۔“ وہ خون بند کرتے ہوئے بولی۔

”ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ تم ابھی ادھر ہی ہو اور نمبر مل ہی جائے گا۔“

”نہیں، میں اسے جلد ملنا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔“

”مگر کیوں۔۔۔۔۔؟“ شہزاد نے حیرت سے اس کی آنکھوں میں اتنی بے چینی دیکھ کر پوچھا۔

”بس۔۔۔۔۔ یونہی۔۔۔۔۔ آپ نہیں سمجھیں گی۔“ وہ بتا کچھ کہے باہر نکل گئی۔ ڈرائیور باہر کھڑا تھا اس نے اسے ایڈریس بتایا اور اس کے کالج

پہنچ گئی۔ مگر اسے سخت مایوسی ہوئی جب معلوم ہوا کہ وہ کئی روز سے کالج نہیں آیا اور ہاسٹل بھی نہیں آتا۔

”وہ کہاں جا سکتا ہے۔۔۔۔۔؟“ وہ شدید الجھن کا شکار ہو رہی تھی۔

”آپ اپنا نام اور فون نمبر لکھ کر دے دیں۔ جیسے ہی وہ آئے گا۔ میں بتا دوں گا وہ آپ کو کال کر لے گا۔“ ولیم کے روم میٹ ڈیٹان نے

اس کو پریشان دیکھ کر کہا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔“ اس نے ایک کاغذ پر اسے اپنا فون نمبر لکھ کر دے دیا۔

ولیم سے نہ ملنے کا اسے شدید غصہ تھا۔ جب سے ولیم نے کالج چھوڑا تھا اور لاہور شفٹ ہوا تھا وہ شدید افسردہ رہنے لگی تھی اسے وہاں رہتے

ہوئے اعجاز نہیں تھا کہ وہ اس حد تک اس میں اتنا دل ہو چکی تھی۔ صرف ایک دن تو تھا جس سے وہ اپنی اور مگر کی ساری باتیں کرتی تھی اور وہ اسے ہر

وقت کنسول کرتا رہتا تھا۔ مگر اس کے آنے کے بعد وہ شدید تنہائی کا شکار ہو گئی تھی۔ کوئی ایک بھی تو وہیں نہیں رہا تھا جس سے وہ اپنا دکھ سکھ کہتی۔۔۔۔۔ اپنی

باتیں شیئر کرتی۔۔۔۔۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے زندگی رک سی گئی ہو۔۔۔۔۔ کوئی بہت عزیز از جان ساتھی چھن گیا ہو۔۔۔۔۔ وہ اکثر میٹ پر اس سے

رابطے میں رہتی ولیم نے ہی اسے اپنے کالج کا ایڈریس اور فون نمبر سب کچھ میل کیا تھا مگر اب دو تین ماہ سے میٹ پر بھی رابطہ نہیں رہا تھا۔ ان سب

لیکچرز نے اس کے ذہن کو شدید مافوف کر دیا تھا۔ اس نے اپنی کتابیں اس کے نام اور کس یو سے بھردی تھیں۔ مگر خالق سے وہ کاپی کسی کلاس

فیو کے ہاتھ لگتی اور وہ اس کا خالق اڑاتی تو اس کا اچھا خاصا جھگڑا ہو جاتا۔

وہ روز بروز چڑچڑی اور بد مزاج ہوتی جا رہی تھی۔ ابھی وہ سترہ سال کی ہوئی تھی اور ذہن بھی اتنا پیچھے نہیں ہوا تھا کہ اپنے آپ کو

سمجھاتی۔۔۔۔۔ وہ اپنی سوچوں کے دھارے میں بہتی گئی۔ ہر وقت تخیل میں ڈوب رہا اور ولیم سے باتیں کرنا اسے اچھا لگنے لگا۔ ولیم اس کی ذات کا محو

ہو گیا۔ اس کا پنہاں سے دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ صبح آکھ کھلتے ہی پہلا خیال اور پہلی سوچ ولیم کے بارے میں ہوتی اور آنکھیں بند کرتی تو وہ خوابوں

میں ہوتا۔ ولیم کی سوچ نے اس کے دل و دماغ کو اپنے گھنے میں اس طرح جکڑ لیا تھا کہ اب ناراض ممکن نظر آتا تھا۔

جس دن اس نے پاپا کی تصویر لاہور بری میں اخبار میں دیکھی تو اسے شدید شاک لگا تھا۔ باپ کی پر سنائی کا یہ پہلا پہلا دفعت اس کے سامنے

کل کر آتا تھا وہ سخت اذیت میں تھی۔ سیر ابھی کلاس فور میں تھا۔ اسے ان باتوں کی سمجھ ہی نہیں تھی اور وہ اس کے ساتھ ایسی باتیں دیکھ کر کے اسے

پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ کسی کے ساتھ سب کچھ شیئر کرنا چاہتی تھی۔ اندر ہی اندر کوئی چیز اطمینان چاہ رہی تھی۔ کوئی ایک تو کہہ دے کہ نہیں اس کا

باپ ایسا نہیں۔ یہ سب کچھ محض کہانی ہے۔ ایسے میں اسے ولیم کی یاد ستانے لگی۔۔۔ مگر اس تک رسائی ممکن نہیں تھی۔ وہ ڈپریشن میں ہاسٹل آئی تو اس کی روم میٹس عزرا اور ندا اس کے باپا کے بارے میں ہی باتیں کر رہی تھی۔ وہ اب بھی تو نہیں تھی کہ ان ہاتوں اور ان کے لہجے کو نہ سمجھتی وہ ان کی باتیں سن کر ہنرک مٹی اور تینوں میں جھگڑا ہو گیا۔ وہ شدید فیسے میں تھی جب اس نے حیز چاقو سے اپنے بازو کی ٹس کاٹ دی۔ ہر طرف کہرام مچ گیا اسے جلدی سے اسپتال لے جایا گیا مشکل سے اس کی جان بچی تھی۔ وہ روز بروز چڑچڑی ہوئی جا رہی تھی۔ بات کو سمجھنا اور اعصاب پر کنٹرول رکھنا اس کے بس سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ جب اسے اپنی خواہشات پوری ہوتی نظر نہ آتیں تو وہ انتہائی قدم اٹھانے سے بھی دریغ نہ کرتی۔ اس کی کہسی پرسنالٹی ڈیولپ ہو رہی تھی۔ شزا کے لیے یہ لچر ملکر یہ تھا۔

وہ گھرا کر بھی انتہائی بے چین تھی۔ ہار ہار فون ملاتی۔ نمبر نہ ملتا تو بھینچا جاتی۔

”شمال یہ لڑکا کون ہے۔۔۔؟“ شزا نے اس کی بے چینی بھانچتے ہوئے پوچھا۔

”مری میں آپ کو طویا تو تھا۔۔۔“

”کون۔۔۔ وہ کون۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔؟“ وہ بے پروائی سے بولی۔

”تم اس میں اتنی انٹرسٹ کیوں ہو۔۔۔ تم جانتی ہو کہ ہم میں اور ان لوگوں میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔۔۔“

”میں کچھ نہیں جانتی۔۔۔ صرف یہ جانتی ہوں کہ وہ بہت اچھا ہے اور میں اسے بہت پسند کرتی ہوں اتنا کہ شاید آپ لوگوں کو بھی نہیں۔“

”شمال۔۔۔ تم کیوں اس قدر جذباتی ہو کر سوچتی ہو۔۔۔“

”مم۔۔۔ میرے بس میں کچھ نہیں۔ میں ایک کنزرو شخصیت ہوں۔۔۔“

”تم کیوں اس قدر کنزرو ہو۔۔۔ اور اپنے آپ کو کنزرو کیوں سمجھتی ہو۔۔۔؟“

”مجھے آپ لوگوں نے کنزرو بنا دیا ہے اور اب مجھے ہر وقت کسی ایسے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے جو مجھے ہر اسٹیپ پر گائیڈ کرے۔۔۔“

مجھ میں تو مچھ اور غلط کاسٹس بھی نہیں رہا۔۔۔“ وہ جھنجھلا کر بولی۔

”تو کیا وہ لڑکا تمہیں مضبوط بنا رہا ہے۔۔۔“ شزا نے قدرے طنز لہجے میں کہا۔

”نہیں۔۔۔ وہ میری ہر اچھی اور بری بات سنتا ہے۔۔۔“

”وہ تمہیں صرف دوست سمجھتا ہے اور تم دوسری سائڈ پر جا رہی ہو۔۔۔ کیا تم سمجھتی ہو یہ سب؟“

”ہاں۔۔۔ میں اسے سبک بنا چاہتی ہوں۔۔۔“

”کیا۔۔۔؟“ شزا کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں۔ وہ شمال کے منہ سے پہلے دفعہ ایسا بے ہاک باتیں سن کر حیران ہو رہی تھی اور مزید

جاننا چاہتی تھی کہ اس کے ارادے کیا ہیں۔

”میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”شٹ اپ! شٹ اپ!..... ایٹنی حد تک بھولو۔“

”میں کچھ نہیں جانتی، کچھ بھی نہیں۔“ وہ رو پڑی۔

”تمہارا باپ تم دونوں کو مار دے گا۔“

”آئی ڈونٹ کیئر..... اور اگر ایسا ہو بھی جائے تو ہم دونوں ساتھ مریں گے۔“

”تم خواہو یا نہ خواہو پاکستان ہو رہی ہو..... یہ گمر فیس یا گنل خانہ لگتا ہے.....“ وہ غصے سے بولی۔

”میں کچھ نہیں جانتی مجھے بس دلیم چاہیے۔“

”ہینکل کو اس نہیں کرو..... میں تمہیں آرام سے سمجھا رہی ہوں اور سنو میں تمہیں خود مری چھوڑنے جارہی ہوں۔“

”نہیں ماما..... آپ ایسا نہیں کریں گی اور اگرا ایسا کیا تو میری ڈیڈ یا ڈی آپ کے ساتھ جائے گی.....“ وہ کوکا دھمکی دیتے ہوئے بولی۔

”بھیک، اسٹاپ دس نان سینس.....“ وہ فہم سے چلائی۔

”جائیں مت.....“ وہ بھی غصے سے ہنسنے لگی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کا چہرہ لال۔ بھسوکا ہو رہا تھا اور آنکھیں غصے سے باہر اٹنے کو

تمہیں۔ سزا کا اس کے تہہ اچھے نہیں لگ رہے تھے وہ اس کی وجہ سے اس قدر پریشان ہوا ہی تھی کہ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ ایک نئی مصیبت ان کی بھر پوری تھی۔ نہ جانے وہ کیسے گرد و پیش میں جکڑے جا رہے تھے کہ ہر طرف سے پریشانیاں اور الجھنیں انہیں اپنی گرفت میں لے رہی تھیں۔

شام ہو رہی تھی۔ شیش ٹی وی کی حیران واذکر کے ایکلی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ اسے گھر آنے کا جتنا کریں تھا اب وہ کریں رنہ رنہ کم ہو رہا تھا۔ گھر میں تو بائٹل سے بھی زیادہ تنہائی اور وحشت تھی۔ اگرچہ شہزاد اپنی طرف سے اسے زیادہ سے زیادہ وقت دیتی مگر اس کے اپنے بے شمار کام اور مصروفیات تھیں اور پھر ملک منصور کو وہ اس مسئلے سے نکالنے کی سرتوڑ کوشش کر رہی تھی۔ ایک طرف صحافی کوڑلیں آؤٹ کرنا تھا۔ اخبارات کے دفاتر سے رابطے جاری تھے تو دوسری طرف پارٹی ورکرز اور ملک منصور کے قریبی لوگوں کو اس کی مدد کے لیے اکسائے تھا۔ کوشش کے باوجود کافی وقت باہر لگ جاتا۔ بحر اپنے کاموں میں مصروف رہتی اور جس دن سے وہ گھر آئی تھی۔ اتفاق گھر نہیں آیا تھا۔

شمال فون پاس رکھے بروقت منظر دکھائیں۔ اس کی طرف دیکھتی رہتی..... کسی وقت، کسی لمحے شاید اس کا فون آ جائے..... دل ہر وقت اس کی یاد میں کھوپا رہتا۔ وہ ابھی بھی اسے اتنا حس کر رہی تھی کہ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ خود اس کو سارے لاہور میں جا کر جگہ جگہ تلاش کرے مگر اسے نیتو مارا نہ تھک آتی تھی اور نہ ہی راستوں کا زیادہ علم تھا۔ اچانک فون کی بجلی زور زور سے بجنے لگی..... وہ چونک گئی اور جلدی سے ٹی وی کی آواز کم کی۔

”بیلو۔ شک سے بات کرنی ہے۔“

”کون۔؟ ولیم۔؟ تم۔؟“ وہ جیسے چمک پڑی۔

”ہاں..... محفل تم کب آئیں؟“

”ولیم..... میں تمہیں بے حد یاد کر رہی ہوں۔“

”تھیک ہے.....“ وہ مسکرا کر بولا۔

”میں تم سے ملنا چاہتی ہوں..... بس تم جلدی سے آ جاؤ۔“

”جیسے ہٹل، یہ ممکن نہیں۔ میں ماما کے پاس ہوں اور ان کی طبیعت بہت خراب ہے آج میں ہاسٹل اپنی کچھ کتابیں لینے گیا تو ڈیٹان نے

تمہارے بارے میں بتایا۔ اس لیے فون کر رہا ہوں۔ پھر کسی وقت آؤں گا۔“

”ولیم..... کیوں اپ سیٹ ہو؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ولیم آئی مس یہ سوچ۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر اس میں اپ سیٹ ہونے والی کیا بات ہے؟“

”ولیم..... پلیز تم سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”کیا.....؟“

”اچھا تم مجھے اپنا ایڈریس دو میں خود آتی ہوں.....“

”ٹھیک ہے..... لیکن اس وقت نہ آنا..... شام ہو رہی ہے کل آ جانا۔“

”جی ہاں، میں ابھی آؤں گی..... تم مجھے اپنا ایڈریس دو.....“ وہ ایڈریس لکھنے لگی۔ ایڈریس لکھ کر اس نے ڈرائیور کو سر وٹ کوادفر سے بلایا

اور خود اس کے ساتھ چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد شزا آئی تو اسے یہ جان کر سخت تشویش ہونے لگی۔

ولیم ماما کے پاس ہی تھا اور آئے نور مگر واپس جا چکی تھی۔ ولیم نے گیٹ کے باہر لگا ٹالا کھول دیا تھا۔ وہ اب اس کا منتظر تھا۔ اس کی گاڑی

گیٹ کے باہر مارن بج رہی تھی۔ ولیم باہر آیا..... اور گیٹ کھولا تا کہ اس کا ڈرائیور گاڑی اٹھالے آئے۔

”ہٹل کیسی ہو؟“ ولیم مسکرا کر بولا۔

”میں ٹھیک نہیں ہوں۔“

”کیوں.....؟“ وہ اس کا غیر متوقع جواب سن کر حیران رہ گیا اور اسے ڈرائیور کے درم میں لے آیا۔

”کیا یہ تمہارا گھر ہے.....؟“

”جی ہاں..... ایک دوست کا..... ماما چار ہیں اس لیے اس دوران ہم یہاں رہ رہے ہیں۔ ہاسٹل میں ماما کو اینڈ کرنا میرے لیے مشکل

تھا..... لیکن تم کب آئیں..... آج کل تو چھٹیاں نہیں ہیں۔“

”ہاں..... میں نے بتایا کہ میں بہت اپ سیٹ تھی.....“

”مگر کیوں.....؟“

"کیونکہ تم وہاں نہیں۔۔۔"

"کم آن ٹائل۔۔۔ ڈونٹ بی سلی۔ تم ایک بھدار لڑکی ہو۔"

"میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔"

"وہاں نان بنس۔۔۔" وہ غصے میں صوفے سے اٹھ کر کمرہ ہوا گیا۔

"اور اگر تم مجھے نہ ملے تو۔۔۔ تو میں اپنے آپ کو ختم کر لوں گی۔"

"شیکل۔۔۔ یہ تم کیا فضول باتیں کر رہی ہو۔ تم جانتی ہو کہ میں چرچ جوائن کرنے والا ہوں اور ہمارے اور تمہارے درمیان تو ویسے بھی بہت فرق ہے۔ اپنے آپ کو نارمل رکھو۔۔۔"

"میں کچھ نہیں جانتی۔۔۔ تم میری بات سمجھو۔"

"ادھر بیٹھو۔۔۔" اس نے اسے اپنے سامنے بٹھایا۔ "اب صحیح بات بتاؤ کہ کیا مسئلہ ہے۔۔۔؟"

"ولیم۔۔۔ میں بہت اکیلا محسوس کرتی ہوں۔ نہ میں وہاں کسی سے بات کر سکتی ہوں اور نہ یہاں۔۔۔ ماما پاپا کے بارے میں تم ابھی طرح جانتے ہو۔ ان کو ہماری کوئی پروا نہیں۔ میری لائف میں نہ کوئی امید رہی ہے اور نہ ہی کوئی اچھی بات۔۔۔ تم ہر وقت مجھے یاد آتے ہو۔ میں کیا کروں، دنیا میں صرف تم ہی ہو۔۔۔ جو مجھے اچھے لگتے ہو۔"

"لیکن شیکل جو اچھا لگے۔۔۔ ضروری تو نہیں کہ اس سے محبت بھی ہو جائے اور میں تو تمہیں ابھی سے بتا رہا ہوں کہ میں چرچ جوائن کرنے والا ہوں۔ میں تو صرف ماما کی جگہ سے رک گیا کیونکہ وہ بہت پیار ہیں۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟"

"اپنی اسٹڈیز کی طرف دھیان دو۔۔۔ اور اپنے لیے کوئی اچھی مصروفیت ڈھونڈو۔۔۔ اور ویسے بھی ہم لوگ ابھی اس ایجنے میں ہیں کہ ہمیں ایسی باتیں سوٹ نہیں کرتی۔ تم کچھ دن یہاں ریٹیکس کرو۔۔۔ اور پھر واپس چلی جاؤ۔ یہی بہتر ہے۔۔۔" ولیم اسے سمجھا رہا تھا اور وہ خاموشی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

"ٹھیک ہے میں واپس چلی جاؤں گی۔ تم بھی یہی کہتے ہو اور ماما بھی۔۔۔ کسی کو بھی میرا یہاں رہنا پسند نہیں۔۔۔" وہ افسروگی سے بولی۔

"نہیں شیکل، ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ تم ایسی باتوں میں اپنا وقت ضائع کرو۔ اپنی اسٹڈیز مکمل کرو۔ پھر تو تمہیں لاہور ہی آنا ہے۔۔۔" ولیم بہت نرم لہجے میں اسے سمجھا رہا تھا۔

"اب میں چلتی ہوں۔۔۔" وہ بے دلی سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"مما سے نہیں ملو گی۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ آج نہیں۔۔۔ پھر کسی۔۔۔" وہ اب مزید وہاں رکتا نہیں چاہ رہی تھی۔

دلیم کو اس کے خیالات اور حالات جان کر سخت پریشان ہوئی۔ وہ شروع سے ہی یہ محسوس کرتا چلا آ رہا تھا کہ شائل کے گھر والوں کو واقعی ان بچوں کی قلعی کوئی پروا نہیں۔ ان کے ماں باپ کا رویہ بچوں کے بارے میں بالکل نارمل نہیں تھا۔ جب تک وہ مری میں تھا ہر وقت شائل کو سمجھاتا رہتا تھا اور واقعی اب وہ منتشر ہو رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ نور سے اس کی باتیں ڈسکس کرے۔ وہ تو خود اپنی ہر بات نور سے ڈسکس کرنے کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ جس طرح وہ زندگی کا تصور نور کے بغیر نہیں کر سکتا تھا شاید اسی طرح شائل بھی اپنے لیے اسے اتنا ہی اہم سمجھ رہی تھی۔ یہ کیسی بھین تھی۔ وہ چونک سا گیا مگر شائل بہت جذباتی تھی۔ وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔



شہلا اسداچے گھر میں بہت خوش تھی۔ اسدا سے اسے جو محبت ملی تھی وہ کبھی اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ قدرت اس پر یوں فراخ دلی سے نظر کرم کرے گی۔ خالدا اور ان کے سب گھروالے بھی اسے بہت پیار کرتے۔ وہ لوگ شادی کے فوراً بعد ڈیفنس شفٹ ہو چکے تھے حیدر نے ایک کاشن مل شہلا کو جھجھ میں دی تھی اور اسدا اب اپنا بزنس اسٹیمپلش کرنے کے چکروں میں تھا۔ وہ لوگ خود بھی بہت امیر تھے۔ خاندانی جاگیر دار روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ وہ ہر طرح سے خوش تھی اور اپنا نیا گھر ڈیکورین کرنے میں مصروف تھی۔ لیکن جب قاریغ ٹیٹھی تو ایک دم حیدر نظروں کے سامنے آ جاتا اور اس سے ہو جاتی۔ حیدر خود اسے بہت کم فون کرتا۔ حیدر کی اس پرفنی سے وہ شرمندگی محسوس کرتی۔

شہلا کی شادی سے قاریغ ہونے کے بعد حیدر نے اس افضال کو خیریت پر چھنے کے لیے فون کیا تھا۔

”مرحبا کیمو! آپ نے جو پیسے جیسے تھے وہ مل گئے تھے بلکہ سبز پیٹر کا آپریشن بھی ہو چکا ہے۔ میں نے آپ سے ایک دو بار کھٹکٹ کرنے کی کوشش کی کہ شکر یہ انا کر دوں مگر رابطہ ہی نہیں ہو سکا۔“ اس افضال بہت مشکورانہ لہجے میں بول رہی تھیں۔

”شکر یہ کی بات نہیں۔۔۔۔۔ آپ اس بات کو چھوڑیں اور یہ بتائیں کہ اب ان کی طبیعت کیسی ہے۔۔۔۔۔؟“

”کیمو تمہاری کا ایک کورس ہو چکا ہے اور آپ تو جانتے ہیں یہ کیسی جان لیوا بیماری ہے۔ اس بیماری سے لڑنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔

یہ تو بھلاہ مریش ہی جانے۔ سبز پیٹر بھاری بہت مہینتیں اٹھا رہی ہیں۔“

”اس افضال میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔“

”سر آپ۔۔۔۔۔؟“ اس افضال نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ اس میں کیا حرج ہے۔ ایسا ہی ہوش و حیا۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ حرج تو کوئی نہیں مگر وہ یہاں نہیں رہتیں۔“

”تو پھر۔۔۔۔۔ وہ کہاں چلی گئیں۔۔۔۔۔؟“

”اپنے کسی عزیز کے پاس۔۔۔۔۔ اس افضال بتانا مناسب نہیں سمجھ رہی تھیں۔

”کس عزیز کے پاس۔۔۔۔۔؟“

”معلوم نہیں۔۔۔“

”مس افحال کیا واقعی آپ نہیں جانتیں یا پھر مجھے نہیں بتانا چاہتیں۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں سراسی کوئی بات نہیں۔ میں بھلا کیوں چھپانا چاہوں گی۔ دراصل میں اس سوچ میں پڑ گئی ہوں کہ واقعی آپ کا وہاں جانا

بہتر ہے یا نہیں کیونکہ میں نے انھیں آپ کی ہیلپ کا بالکل نہیں بتایا۔“

”اور بتائیے بھی مت۔۔۔ مجھے خود بھی یہ سب کچھ پسند نہیں۔ آپ پلیز مجھے ایڈریس بتادیجئے اور ان کے پاس کون ہوتا ہے۔۔۔؟“

”ان کا بیٹا دلیم۔۔۔ اور وہ دلیم کی کلاس فیلو کے گھر میں رہ رہی ہیں۔“

”اوہ آئی سی۔۔۔ آپ ایڈریس لکھوا دیجئے۔“ مس افحال انھیں ایڈریس لکھوانے لگیں۔ اسے بالکل علم نہیں تھا کہ اس کا آپریشن بھی ہو

چکا تھا۔ ورنہ وہ خود۔۔۔

وہ مس افحال کے بتائے ہوئے ایڈریس پر پہنچا مگر کوئی کے باہر تالا لگا ہوا تھا وہ سخت مایوس ہوا۔ ہو سکتا ہے وہ اسپتال گئی ہو۔ ادھر ادھر سے پوچھتا بھی مناسب نہ لگا۔ وہ اسی شام دوبارہ گیا پھر تالا لگا ہوا تھا۔ اسے سخت تشویش ہو رہی تھی۔ اس نے مس افحال کو فون کرنے کا سوچا مگر یہی سوچ کر کہ وہ اس کے بارے میں مشکوک ہو جائے گی اس نے ارادہ ترک کر دیا۔ وہ مسلسل دو تین دن جاتا رہا مگر ہر بار تالا دیکھ کر واپس آ جاتا۔ اسے سخت پریشانی ہو رہی تھی۔ غلغلو سے اور وہاں ہے اسے پریشان کر رہے تھے۔ خدا خواستہ اس کی طبیعت زیادہ ہی خراب نہ ہو وہ اسے ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا حال پوچھنا چاہتا تھا۔ اس مشکل وقت میں اس کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا مگر نہ جانے اس کی سوچ محض اک سوچ ہی کیوں رہ جاتی تھی۔ اس نے تنگ آ کر مس افحال سے رابطہ کیا مگر معلوم ہوا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے گاؤں اپنی بہن کے پاس گئی ہیں۔ ان کی بہن کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔ مس افحال ہی اس تک پہنچنے کا واحد ذریعہ تھی اور اب ان تک بھی رسائی ممکن نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ عجیب مصلوبلا ہٹ کا شہر تھا۔ وہ صبح شام ہی سڑک سے گزرتا۔ جیسے اس کے گھر جانے والا وہی راستہ ہو۔ کچھ پر گاڑی روک کر گیٹ کو دیکھتا اور چل دیتا۔

عجیب سی پکوشن ہو رہی تھی اور بعض اوقات اسے اپناری انکشن خود ہی عجیب سا لگتا۔ وہ ابھی بھی اس کے ساتھ کس قدر رانچہڑ تھا۔ وہ اپنے آپ سے ہر اس سوال کرتا کیا واقعی پہلی محبت کو بھلانا ممکن نہیں ہوتا۔۔۔؟ نہ جانے کیوں شہلا کو سوچ کر ہی اس کی آنکھوں میں نمی سی حیرنے لگتی۔ تا تمام حسرتوں اور آرزوؤں کے لیے دل میں ہوک سی اٹھی۔۔۔ شہلا کاش تم میری زندگی میں نہ آئی ہوتیں۔۔۔ کاش ہم تم نہ ہوتے۔۔۔ کاش تم مجھے دوبارہ نہ ملتیں۔

کاش اب تم مجھے ایک دھڑل جاؤ اور ہم دونوں صرف ایک دفعہ زندگی میں مل کر دو لیں۔۔۔ کاش اسی طرح دل کا یہ جھجکا ہو جائے۔ کاش ہم دونوں اپنا اپنا غم کہہ کر اپنی روجوں کو ایک دوسرے کی گرفت سے آزاد کرویں۔۔۔ کاش عمروں کے اس موڑ پر ہمیں کچھ طمانیت مل سکے۔۔۔ وہ درخت کے نیچے گاڑی میں بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا جب اچانک دلیم نے تالا کھولا۔۔۔ وہ اسے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔۔۔ یہ کیا سمجھا تھا۔ دلیم تالا کھولنے کے بعد گیٹ کھول کر باہر چلے کسی کا شہر تھا اور پھر ایک لڑکی گاڑی میں آئی دلیم دوبارہ گیٹ بند کرنے لگا تو اس نے بھی جلدی سے اپنی گاڑی اس

کے پیچھے لگا دی۔ بعض اوقات قدرت کیسے دلوں کی آوازیں لیتی ہے شاید وہی لوحِ تعویذ کا ہوتا ہے۔ ولیم حیرانی سے اسے اور اس کی بیوی ملی آئی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے بھی ایک بگ ولیم کو دیکھا اور اسے پہلی نظر میں پہچان لیا۔ اس کے چہرے اور پر سنالٹی میں دو ٹکوں اور دو تھنڈیوں کے نمایاں ٹچ نے ولیم کا خود بخود متعارف کرا دیا تھا۔

”آپ..... آپ کون ہیں اور.....؟“ ولیم سر اٹھنے کی طرف دیکھ کر بولا۔

”میں..... میں تمہاری ماما کا کزن ہوں۔ خراج حیدر.....“

”لیکن میری ماما..... کا تو کوئی نہیں۔“ ولیم کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ آئے نور بھی برآمدے میں رک کر دونوں کی گفتگوں رہی تھی اور اوجیز عمر کے اس سوہرے بندے کو دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔

”آپ اپنی ماما کو جا کر بتائیں کہ حیدر اکل آئے ہیں۔“ حیدر نے ہڑا ہوا ہو کر اسے کہا تو ولیم اندر چلا گیا۔ آئے نور مسلسل اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ولیم باہر آیا۔

”آپ اندر آ جائیں.....“ ولیم اور نور دونوں اسے ماما کے کمرے تک لے کر گئے۔ ولیم اور نور کچھ بھی نہیں بول رہے تھے۔ دونوں حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

شہلا بستر پر لیٹی ہڈیوں کا ڈھانچہ لگ رہی تھی۔ اس کے سر کے سارے بال اتر چکے تھے آنکھوں کی پلکیں اور ابرو تک جھڑپکی نہیں کالے سیاہ ہونٹ اور سیاہی مائل ہوئی رنگت اس کی اندر کی اذیتوں کی کہانی بیان کر رہی تھی۔ اس نے سر پر ٹھل کا سفید دوپٹا لے رکھا تھا۔ حیدر تو اسے پہچان ہی نہ سکا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”آ..... آپ یہاں کیسے.....؟“ شہلا نے حیدر کو یوں افسردہ دیکھ کر پوچھا۔

”مس افضل نے بتایا تھا ہر روز آتا تھا بکر گیٹ کے باہر تالا دیکھ کر چلا جاتا تھا۔“ حیدر نے وضاحت کی۔

”اوہ..... آئی ام سوری..... میں نے تالا کسی اور جگہ سے لگایا تھا۔ معلوم نہیں تھا کہ آپ.....؟“ ولیم محضت کرنے لگا اور نور کی طرف دیکھا۔

”پلیز اسے بتا دیں..... اسے دیکھ کر آنے والوں کو بہت کوفت ہوتی ہے۔“ حیدر نے اپنی جھنجھلاہٹ ظاہر کی۔

”ہاں..... میں آج ہی اسے اتار دیتا ہوں.....“ ولیم نے جواب دیا۔

”مما..... ہم لوگ اکل کے لیے کچھ لائیں؟“ ولیم نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کو کہا۔

”یہ ولیم ہے..... میرا بیٹا..... آپ اس سے مل تو چکے ہیں اور یہ آئے نور ہے۔ بہت اچھی بیٹی ہے۔ ولیم کی کلاس فیلو ہے۔ ہم اس کے گھر

میں رہ رہے ہیں یہ سب اسی کی مہربانی ہے۔ ورنہ آج ہم کہاں دور دور کی ٹھوکریں کھا رہے ہوتے۔“ وہ ناسف سے بولی۔

”آئی پلیز ایسی باتیں تو نہ کریں۔“ نور جلدی سے بولی۔

”اور یہ حیدر ہیں..... میرے کزن۔“ شہلا ولیم سے نظریں جراتے ہوئے بولی۔ ولیم کی نظروں میں ان محنت سوالات اور بے حد حیرانی

تھی۔ وہ تو اب تک یہی جانتا تھا کہ اس کی ماں کا کوئی نہیں یہاں تک رشتے دار کہاں سے پیدا ہو گیا اس کا مطلب ہے مرنے سے کچھ نہیں بتایا تھا اور اس کے لیے سب سے شاکل حیدر کا دوسری کیونٹی سے ہونا تھا۔ اس نے نور کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں بھی وہی کچھ تھا جو اس وقت وہ خود سوچ رہا تھا۔

”مما..... ہم آتے ہیں۔“ اس کے لیے وہاں رکنا مشکل ہو رہا تھا۔

”وہیم یہ سب کیا ہے..... مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا.....“ نور نے باہر نکلتے ہی حیرت سے پوچھا۔

”اور مجھے بھی.....“ وہ بھی حیرانی سے بولا۔

”سنو یہ کوئی عام شخص بھی معلوم نہیں ہوتے..... میں نے اس شخص کو کسی اخبار میں بھی دیکھا ہے اور ویسے بھی ان کا بات کرنے کا اسٹائل اور ہر سٹائی..... مجھے ہر ایشیئن ہے یہ کوئی عام شخص نہیں ہیں.....“ نور قدرے تشویش سے بولی۔

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ مرنے سے کیا کیا چھاپا ہے.....؟“

”افو..... ایک تو فوراً بدگمان ہو جایا کرو..... انسان کو پہلے اچھی طرح سارے پہلوؤں کے بارے میں یقین کرنا چاہیے پھر کوئی رائے قائم کرنی چاہیے.....“ نور نے اسے سمجھایا۔

”نور میں پہلے ہی کچھ کم ڈسٹرب ہوں..... اور اوپر سے یہ سب؟“

”کیوں..... تم کیوں ڈسٹرب ہو.....؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔ اس نے شاکل والی ساری بات اسے بتا دی۔

”تم تو مجھے اس وقت میں سوچ لگ رہے ہو.....“ وہ مسکرا کر بولی۔

”نفاق نہیں..... میں سیریس ہوں۔“

”اچھا بابا تم کیا چاہتے ہو.....“

”میں یہی چاہتا ہوں کہ وہ ڈسٹرب نہ رہے۔ وہ بہت پریشانی میں یہاں سے لگی ہے اور وہ کچھ اس کی سوچ کس قدر احمقانہ ہے۔ وہ کتنا غلط سوچ رہی ہے.....“

”اس میں غلط کیا ہے۔ سوچ تو سوچ ہوتی ہے۔ کیسی بھی ہو سکتی ہے۔ ہاں..... وہ احمق ہے اس لیے کہ اس نے ساری بات تمہیں بتا دی.....“ نور کے لیے میں شرارت تھی۔

”پلیز بی سیریس..... میں اس کے خیالات جان کر پریشان ہو گیا ہوں۔“

”اس میں پریشانی کی کیا بات ہے جب تم نے اسے کہہ دیا ہے کہ تم جج جو آئن کر رہے ہو وہ وہ خود ہی سمجھ جائے گی.....“

”لیکن وہ مجھے بہت زیادہ پریشان لگی ہے اور وہ کچھ حد تک جنونی ہو چکی ہے۔“

”وہ تو ہر انسان ہوتا ہے، کوئی تھوڑا کوئی زیادہ۔“

”تم سمجھ کیوں نہیں رہی ہو؟“ وہ جھجھلا کر بولا۔

”آخر تم کیا سمجھانا چاہتے ہو یہ کہ وہ تم سے محبت کرنے لگی اور اب تمہیں بھی کچھ ایسا سوچنا پڑے گا ٹھیک ہے اگر تم ایسا سوچتے ہو تو جو تم کرنا چاہتے ہو کر لو، مجھے کوئی اعتراض نہیں..... میں ہمیشہ سے تمام آرزوؤں کے ساتھ چپنے کی عادی ہوں۔ میں نے جہاں اتنا کچھ کھوایا ہے وہاں ہے یہ بھی سہہ لوں گی۔“

”کم آن فور.....“

”تو پھر کیا چاہتے ہو تم.....؟“ وہ فحشی سے بولی۔

”مجھے نہیں معلوم.....“ وہ اکتا کر بولا۔

”ولیم..... ابھی تک تمہارا زندگی کی طرف رویہ ناگہی کا شکار ہے۔ تم ہر بات، ہر سوچ کو واضح انداز میں کیوں نہیں سوچتے اور جو تم کہتے ہو اس کے بارے میں تمہارے اعتراف کیا کیوں ہے۔ تمہاری اب تک کسی بھی بات کے بارے میں ایک رائے ہو جانی چاہیے..... جب تم ایسی باتیں کرتے ہو تو مجھے لگتا ہے کہ میری اپنی محنت ضائع ہو گئی ہے۔ میں تمہیں بار بار کہتی ہوں کہ میں تمہیں اپنے ہر ارادے، ہر سوچ اور ہر بات میں پائیز اور اسٹرونگ دیکھنا چاہتی ہوں۔ تمہارا یوں جھنجھلانا، پریشان ہونا اور ہر بات پر وضاحتیں چاہتا مجھے کبھی بھی اچھا نہیں لگتا۔“ وہ گلاس میں کوک ڈالتے ہوئے بولی۔ ولیم اس کی باتیں دھیان سے سن رہا تھا۔ وہ ہر روز ایسی نصیحتیں سننے کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔

”غصہ و..... میں یا تم دوے کر آتی ہوں۔“ وہ گلاس ٹرے میں رکھ کر اندر چلی گئی..... اور دروازے پر دستک دی۔

”کم ان.....“ سز پٹیر نے کہا۔ اس نے گلاس ٹیبل پر حیدر کے سامنے رکھا اور ایک ٹک وڈوں کو دیکھا۔ سز پٹیر اپنی آنکھیں صاف کر رہی تھیں اور حیدر کی آنکھوں میں بھی نمی تیر رہی تھی۔ کسی نے کچھ بھی نہ کہا وہ گلاس رکھ کر باہر آ گئی اور گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ حیدر بیٹی کے رویے کی اس سے معافی مانگ رہا تھا اور وہ خاموشی سے سب کچھ سن رہی تھی۔

”شہلا تم سب کچھ کہہ کیوں نہیں دیتی.....“ حیدر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”کیا کہوں..... میرے پاس تو کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں..... نہ لفظ ہے میں اور نہ ہی اتنی یادداشت..... معلوم نہیں کس لمحے میں انکی

منزل کی طرف روانہ ہو جاؤں۔ ہو سکتا ہے یہی لمحہ آخری ہو.....“

”تم ایسی کی باتیں چھوڑ دو، تمہیں ٹھیک ہونا ہے..... ہر صورت میں اور ہر قیمت پر.....“ حیدر بڑا اصرار سے کہنے لگا۔

”نہیں، حیدر اب یہ ممکن نہیں.....“

”میں اسکی بات تم سے سننا نہیں چاہتا۔“

”مگر حقیقت تو تم بھی جانتے ہو.....“

”حقیقت کچھ بھی ہو..... میں خدا کی خدائی پر بھی یقین رکھتا ہوں۔“

”ہاں اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں رہ جاتا۔ ہم بس انسان نہیں کہیں گے تو اور کیا کہیں گے۔۔۔“ وہ پھر بے اعتمادی سے بولی۔
”تم جو کچھ کہنا چاہتی ہو۔۔۔۔۔ آج سب کہہ دو۔۔۔۔۔“

”کس کے بارے میں کیا کہوں۔۔۔۔۔ زندگی کے اتنے سال اپنے آپ سے سب کچھ تو کتنی اور سستی رہی ہوں۔“
”حصص شہلا سے جو شکوہ ہے وہی کہہ دو۔ اگر مجھ سے ناراض ہو تو کہہ دو کچھ تو کہو کہ تمہارے دل کا بوجھ کم ہو۔“

”حیدر مجھے کسی سے بھی کوئی شکوہ نہیں۔ شہلا تو میری بیٹی جیسی ہے اور تم سے کیا کہوں۔ پوری دنیا میں صرف ایک تم ہی تو ہو جس سے میں کبھی بھی ناراض نہیں ہوئی۔ حیدر زندگی بڑا ہی گورکھ دھنڈا ہے۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں۔ کاش میں پیدا ہی نہ ہوئی ہوتی۔ کاش تم میری زندگی میں نہ آئے ہوتے۔ کاش ہم تم ہی نہ ہوتے۔“ وہ اپنی ہی لے میں کہہ رہی تھی اور حیدر حیران کن لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جو کچھ وہ چھوٹے پہلے سوچ رہا تھا اب وہ سب کچھ کہہ رہی تھی۔ کوئی اتنا بھی دل کے قریب ہو سکتا ہے۔ جو دل کی باتوں کو بنا کہے سن لے۔ حیدر نے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ کاش ہم تم نہ ہوتے۔“ نادانستہ حیدر کے منہ سے نکلا اور اس کے اندر کا کرب اس کے چہرے پر پھیل گیا۔ ”کاش میں حصص کبھی اس حالت میں بھی نہ دیکھتا۔ تم سوچ نہیں سکتی کہ اس وقت میں کیا محسوس کر رہا ہوں۔“
”مگنا ہوں کی سزا کسی نہ کسی صورت میں تو ملتی ہوتی ہے۔“ شہلا آہستہ سے بولی۔
”کون سے گناہ؟“ حیدر چلا۔

”حیدر۔۔۔۔۔ میں نہیں جانتی کہ کس وقت مجھے موت آ جائے مگر اب سوچتی ہوں کہ شاید مجھ سے بہت زیادہ گناہ مرزو ہو گئے ہیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے کچھ ایسے فیصلے کیے جنہوں نے شاید کتنے ہی لوگوں کو براہ کردیا ہے۔“
”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“

”معلوم نہیں۔۔۔۔۔ میری شفیق، آفاق اور فلک کن حالات میں ہوں۔ حیدر حصص کچھ نہ کچھ خبر تو ہوگی۔ میرے بچے کیسے ہیں۔ معلوم نہیں منصور اور شہزادے ان کا خیال بھی رکھا کہ نہیں۔ منصور تو بچوں سے بہت محبت کرتا تھا۔ شہزادے کے بارے میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ حیدر مجھے تینوں بہت یاد آتے ہیں۔ نہ جانے مجھے کیوں یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ میرے بچوں کے ساتھ زیادتی ہو گئی ہے اور ولیم۔۔۔۔۔ ولیم چرچ جو ان کے نام سے ہی ہے۔ حیدر اس کو تو میں نے کوئی بھی مذہب ورٹے میں نہیں دیا۔ میں نے تو صرف ایک اچھا انسان بنانا چاہا اور وہ صرف اور صرف اپنے نام سے ہی سب کچھ اخذ کر رہا ہے اور میں نے کتنی کاش ٹھٹھی کی۔ پیڑ جو اس کا وجود نہیں چاہتا تھا۔ جس نے اسے ایک نظر بھی نہیں دیکھا۔ میں نے خود اس سے اصرار کر کے کہا کہ وہ اس کا نام رکھے۔

حیدر میں نے کتنی بڑی غلطیاں کی ہیں میں خود اندر سے کیا ہوں اور دنیا کی نظر میں کیا بن گئی ہوں۔ میں نے زندگی میں جن چیزوں کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ اب مجھ سے سوال کر رہی ہیں۔ حیدر میں نے جو قدم بھی اٹھایا، غلط اٹھایا۔ میں نے زندگی میں جس جس سے جو بھی کچھ کہنا چاہا کبھی نہ کہہ سکی۔ بس سوچتی ہی رہ گئی اور میں سب لوگوں سے پیچھے رہ گئی۔ میں اپنی شناخت ڈھونڈنے چلی تھی اور اپنا جو کچھ ٹھٹھی۔ کیا تم نے مجھے جیسے

لوگ بھی دیکھے ہوں گے۔ کتنے دراندہ بے خانماں، پستوں کے مسافر، دولتوں کے مارے ہوئے دھکارے ہوئے۔“
”خدا کے لیے اس طرح سوچنا چھوڑ دو۔“ حیدر تچی لہجے میں بولا۔

”حیدر تم ہی بناؤ کیا سوچوں موت مجھے سامنے نظر آ رہی ہے۔ مظلوم نہیں اگلا دن بھی دیکھنا نصیب ہوتا ہے کہ نہیں۔ میں ولیم کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ اس کے ساتھ بہت زیادتی ہو رہی ہے اور میں اسے ہلا کر کچھ کہہ بھی نہیں سکتی اور جب میں مردوں کی توہین کہاں دہن ہوں گی؟ میں نے تو کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا مگر حیدر..... تم..... تم گواہ رہنا کہ میں..... میں مسلمان ہی ہوں۔ میں تم لوگوں میں سے ہی ہوں۔“ اسی لیے نور کمرے میں داخل ہونے لگی تھی تو اس نے یہ الفاظ سن لیے وہ سکتے میں آ گئی۔ وہ جہاں کھڑی تھی وہیں سے لوٹ گئی۔ سبز پیر ہاتھ باندھے سسکیاں لے رہی تھیں۔ نور پھر لڑائی اور دروازہ کھوڑا سا کھول کر ان کی باتیں سننے لگی اس کے ذہن میں شدید کلکشن جاری تھی۔

”حیدر میں کبھی چرچ نہیں مگنی اور نہ کبھی میں نے مذہب بدلا۔ میں تو بس حالات کے دھارے پر بہنے والا وہ چتا ہوں جو لہروں کے سنگ بہتا ہی چلا گیا۔ غزاں رسیدہ مر جھایا ہوا چا۔ ہوا جس طرف لے لڑی، اڑتی گئی۔ پیر اور میں نے مذہب کی بنیاد پر نہیں ہلکے دوانسان ہونے کے ناتے شادی کی۔“

”شہلا تم نے یہ کیا کیا اتنی بڑی بڑی غلطیاں اور تم کیا جانو کہ کون کون کیسے کیسے شہلا زہ بھگت رہا ہے؟“ حیدر کے منہ سے ٹانستہ نکلا تو وہ چمک گئی۔

”کون..... میرے بچے.....؟“ اچانک اس کے منہ سے نکلا۔

”نہیں.....“ وہ بات کو بدلنا چاہتا تھا۔

”تو پھر کون؟“

”تم خود..... ولیم اور میں؟“ وہ بے رہ اعداد میں بولا۔

”میرے بچے تو ٹھیک ہیں نا؟“

”ہاں.....“ وہ آہ بھر کر بولا۔

”اب تو جہاں ہو چکے ہوں گے۔“

”ہاں۔“

”ٹھک کیسی ہے؟“ وہ امید لہجے میں بولی۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

”تمہارے لہجے میں کچھ ہے، حیدر کیا بات ہے؟“

”کچھ نہیں، میں تمہاری باتیں سن کر پریشان ہو گیا ہوں۔ اب میں چلتا ہوں، کل آؤں گا۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہے..... سنو.....“ حیدر کا..... ”حیدر میں جسمانی اذیت میں تو ہوں ہی مگر کوئی نگلش نے مجھے ڈبرے غذاب میں جٹا کر دیا ہے۔ پلیز کچھ سوچو۔ ولیم کو اس پتھریشن سے ٹھل دو۔ حیدر تم ہی میری آخری امید ہو۔“ اس کی آنکھوں میں بے انتہا بے بسی اور دکھ تھا۔ حیدر کے لیے حریف وہاں رکنا مشکل ہو گیا وہ وہاں لوٹ آیا۔

نور کے لیے یہ انکشافات بہت انوکھے تھے۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ظاہر اچھو نظر آنے والے انسان اندر سے کتنے مٹلف ہو سکتے ہیں۔ اس نے ولیم کو کچھ نہ بتایا۔ وہ کچن میں اس کا منتظر تھا۔ وہ تو انھیں چائے کا پوچھنے گئی تھی اور جب لوٹی تو گویا اپنے حواسوں میں ہی نہیں تھی۔

”ولیم..... میں گھر جا رہی ہوں۔“ وہ اچانک بولی۔

”ہیں..... یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ تم تو ان سے چائے کا پوچھنے گئی تھی اور ایک دم اپنا ارادہ بدل لیا۔ کھانے پینے کے معاملے میں بھی تم اتنا چٹکا سکتی ہو۔ میں نے سوچا نہیں تھا۔“

”وہ چلے گئے ہیں مگر میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“

”یہ طبیعت کو اچانک کیا ہوا؟ ابھی چند لمبے قتل تو تم مجھے نہ جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی اور اب..... نور میں تمہیں واقعی نہیں سمجھ سکتا۔“ وہ بول رہا تھا اور وہ سن رہی تھی۔

”میں جا رہی ہوں۔“ اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور باہر نکل گئی۔ حیدر جا چکا تھا اور اب وہ اپنی گاڑی ریورس کر رہی تھی۔ ولیم اس کے پاس کھڑا تھا مگر اس نے نظر اٹھا کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا اور قدرے تیز رفتاری سے گاڑی باہر نکالی ایک دم اسے زبردست جھٹکا لگا۔ وہ رکی اور پھر اتنی ہی تیزی سے گاڑی چلاتی ہوئی چلی گئی۔ ولیم اسے یوں دیکھ کر گھر مند ہو گیا۔

خدا اور محبت

خدا اور محبت بہت سی خوبصورت اور روحانی ناول ہے جو مصنف ہاشم عرمیم کی اپنی محبت کی گہنی داستان پر مبنی ہے۔ یہ مصنف ہاشم عرمیم کا پہلا ناول ہے اور اس کی کہانی کو سکا اور لندن شہر کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ یہ ناول ایک پرائیویٹ جینرل پر ڈرامائی شکل میں بھی پیش کیا جا رہا ہے۔ اس ناول کو نیشنل اور انٹرنیشنل دونوں سطح پر بہت سراہا گیا ہے اور بہت جلد علم و عرفان پبلیکیشنز والے اس ناول کا انگریزی ایڈیشن لندن سے شائع کرنے والے ہیں۔

یہ ناول کتاب گھر پر دستیاب ہے۔ جسے فاول سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

شرزاہنٹل میں اچانک رونما ہونے والی تبدیلی دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنا سامان پیک کرنے میں مصروف تھی۔ اس نے والہس مری جانے کا پروگرام شرزاہ کو بتایا تھا۔

”تم ولیم سے ملے گی تھی، کیا وہ ملا؟“ شرزاہ نے اس سے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

شرزاہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ مزید اس سے کیا پوچھے۔ لیکن اتنا اندازہ تو اسے ہو رہا تھا کہ یقیناً ولیم نے اسے کچھ ایسا کہا ہوگا اسی لیے وہ والہس جا رہی ہے ورنہ تو وہ والہس مری جانے کے نام سے ہی مشغول ہو جاتی تھی۔ شرزاہ خود اسے چھوڑنے جا رہی تھی۔ وہ سارا راستہ خاموش باہر دیکھتی رہی۔ دونوں نے راستے میں ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کی۔ شرزاہ کوئی سوال کرتی تو وہ ہوں، ہاں میں جواب دے دیتی۔ اسے اتنا گہرا سکوت مگر آنکھوں میں شدید اداسی، بے بسی اور دیرانی کسی آنے والے طولیوں کا پیش خیمہ لگ رہی تھی۔ شرزاہ اندر ہی اندر خوفزدہ تھی۔ وہ اسے بہت کچھ سمجھانا چاہتی تھی۔ اس کی طرف دیکھتی، لب کھولنے کی کوشش کرتی اور پھر خاموش ہو جاتی۔ اسے فضا مناسب نہیں لگ رہی تھی کہ وہ اس سے کچھ بھی کہتی۔ سارا سفر خاموشی میں گزرا۔ وہ سیر سے بھی ملی۔ سیر بہت خوشی خوشی ملا اور وہ اسے چھوڑ کر والہس آگلی۔ رخصت ہوتے وقت ہنٹل کو اس نے اپنے ساتھ لگایا مگر وہ اس سے کچھ نہ کہہ سکی۔ ہنٹل کا رویا بھی بھی بہت سرفرازا تھا۔ شہزادہ اسے دوبارہ آنے کا کہہ سکی اور نہ ہی ہنٹل نے گھر آنے کی خواہش ظاہر کی۔

والہس کا سفر بہت بے چینی میں گزرا۔ وہ ہنٹل کے احساسات کو محسوس کر سکتی تھی۔ اس کی بے تابیوں اور بے چینیوں کا اعجازہ کر سکتی تھی مگر وہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ایک عام غل کلاس طبع کی ماں کی طرح ہر وقت اس کی دلجوئی نہیں کر سکتی تھی۔ سائے کی طرح ہر جگہ اس کے ساتھ ساتھ نہیں پھر سکتی تھی۔ اس کی حرکات پر نظر نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس کو اپنے ساتھ لگا کر اس کے دکھ سکھ شہر نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اسے نئے نئے لوگوں سے ملنے سے روک بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے لیے وہ بہت کچھ نہیں کر سکتی تھی اور جو قہوڑا بہت کر سکتی تھی اس کے کرنے کے لیے اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو بہت بے بس اور مجبور ماں تصور کر رہی تھی۔

ملک منصور اتم ہر محنت کو کھل اتار بے بس کر دیتے ہو۔ شہلا، میں، فتنی اور لب ہنٹل۔ نہ تم چھٹی کو عزت اور مقام دے سکے نہ بیٹی کو محبت اور شفقت۔ اسے شہلا یاد آنے لگی۔ ملک منصور انھیں چھوڑا اسی جاسکا ہے۔ شہلا نے شاید ٹھیک فیصلہ کیا تھا لیکن اس کے بچے برباد ہو گئے اور میں نے بچوں کے خوف سے انھیں چھوڑا نہیں مگر میرے بچے پھر بھی بکھر گئے۔ حاصل کی تمنا میں حاصل تو کچھ بھی نہ ہوا ایک شخص نے اتنے لوگوں کو برباد کر دیا اور پھر بھی کس قدر بے فکر اور آزاں ہے۔ وہ جتنا اس کے بارے میں سوچتی تھی اتنی ہی شدید نفرت ہوتی جاتی تھی مگر وہ کچھ نہ کر سکتی تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ملک منصور کو چھوڑ کر سوسائٹی میں اس کی حیثیت ایک تنگ جیسی نہیں رہے گی اور تنگ کی طرح بے وقعت ہونا گویا اس کے لیے موت تھی۔ وہ اپنی ذات کے خوار میں جلتا تھی اور اس کے مفادات ملک منصور سے وابستہ تھے۔ اس نے اپنے کیرئیر کا آغاز ایک گلیسرس گرل سے کیا تھا اور ایک گلیسرس گرل کے لیے کمائی کی زندگی کسی موت سے کم نہ تھی۔ وہ اپنی حدود سوچ رہی تھی۔ وہ کس حد تک ملک منصور سے کپڑا مانگ کر سکتی تھی اور جس حد تک وہ کرتی آئی تھی اس کے علاوہ مزید کس حد تک جاسکتی تھی۔ اسے اپنی راہیں مسدود نظر آ رہی تھیں۔ سب کچھ بیکار تھا اس کا موہاں بچ رہا تھا۔

آصف ٹریس آؤٹ ہو گیا تھا۔ وہ فیصل آباد میں اپنے ایک دوست کے ہاں پناہ لیے ہوئے تھا۔ اخبار کے ایڈیٹر نے اسے حریدہ مطبوعات دے کر فون بند کر دیا۔ اب ہر سوچ ختم ہو چکی تھی۔ صرف ایک سوچ باقی تھی کہ آصف کو پکڑنا ہے۔ ملک منصور سے وقار داری اسی صورت میں بھائی جا سکتی تھی۔ اسے اس کی سادھ ہر صورت میں برقرار رکھنی تھی۔ اس کا کھوپا ہوا دھار والہ لانا تھا۔ یہی اس کی زندگی کا حاصل تھا اور یہی اس کی خواہش تھی۔ وہ آصف کو پکڑنے کے لیے پلاننگ کرنے لگی۔



حیدر آزاد امیدوار کی حیثیت سے گاؤں کی سیٹ جیت چکا تھا اور اب پھر کوئی نہ کوئی وزارت اس کے حصے میں آتی تھی۔ سوسائٹی میں اس کی نیک نامی اور اچھی شہرت کے تمام لوگ مداح تھے۔ مخالفین کو بھی اس کی ذات پر کچھ اچھالنے کا موقع کم ہی ملتا۔ وہ ہر حلقے میں عزت کی ٹاڈ سے دیکھا جاتا تھا اس لیے ہر حکومت میں اسے کوئی نہ کوئی عہدہ ضرور ملتا تھا۔ ملک منصور سے اس کے لاکھ اختلاف تھے مگر اس نے کبھی بھی اسے لیٹ ڈاؤن کرنے کی کوشش نہ کی جبکہ ملک منصور نے کئی دفعہ اس کی پوزیشن مگرانے کی کوشش کی مگر قسمت ہر بار اس کا ساتھ دیتی۔ وہ ایک دن کے لیے گاؤں گیا تھا۔ کہاس کی فھلوں کو ایک خاص قسم کا کیزاہت تیزی سے جہا کر رہا تھا۔ اس سلسلے میں وہ کچھ زرمی باہرین کو اپنے ساتھ لے کر گیا تھا۔ شوق کئی دنوں سے اس کی منتظر تھی۔ اس نے موبائل پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر اکثر جواب نہ ملتا۔ وہ سخت پریشان تھی۔ نہ جانے کیوں اس کا دل سہیل کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ وہ اس کے گھر کی کیمپری سے بھی اچھی طرح آگاہ تھی۔ وہ غریب لوگ تھے اور سہیل بنی ان کا واحد سہارا تھا اور اب وہ سہیل میں بند تھا تو وہ لوگ کس طرح گزر بسر کر رہے ہوں گے۔ شاید حیدر بھول چکا تھا اسی لیے تو سہیل کی کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ حیدر کی غیر متوقع اور اچانک آمد نے اسے خوش کر دیا۔ وہ جلدی سے بشری آپا کے پاس گئی اور حیدر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

"ٹھیک ہے، ابھی تو وہ مصروف ہیں، بعد میں مل لیں۔"

"اچھا تو میں ادھر ہی بیٹھ جاتی ہوں یہیں براہ میں۔" وہ اس کے کمرے کے باہر ہی بیٹھ گئی۔

"ایسا بھی کیا ضروری کام ہے کہ تم اتنی بے چین ہو رہی ہو، اپنے کمرے میں جاؤ۔"

"بس ہے نا؟" وہ مسکرا کر بولی۔

"ٹھیک ہے بابا! میں ان کو کہہ دیتی ہوں مگر وہ ان لوگوں کو تو فارغ کر دیں جو شہر سے ساتھ آئے ہیں۔ پہلے ان کی روٹی پانی کا بندوبست تو

کر لوں۔" بشری آپا حسب عادت اپنی مصروفیات کا ذکر کرتے ہوئے بولی۔

شام کو حیدر گھنٹے والا تھا جب بشری آپا اسے بلانے آئیں۔ وہ خوشی خوشی ملنے چلی گئی۔

"کیہ بیٹا کیسی ہو آپ؟" حیدر نے شفقت سے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں اٹکل!"

"خیریت تو ہے نا، آپ مجھ سے ملنا چاہتی تھیں۔"

”اودھاں! واقعی میں بھول گیا۔ مجھے اس کا ایڈریس بھی دے دو۔ میں جاتے ہی سکیل سے لموں گا۔ دیسے تم کیا چاہتی ہو۔“ حیدر نے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لے کر پوچھا۔

”انگل اود بے گناہ ہے۔ چاہانے اپنی پوزیشن بچانے کے لیے میرا گناہ اس کے سر قھوپ دیا اور اس کی وجہ سے اس کی فیملی مشکل میں ہے۔ میں چاہتی ہوں وہ رہا ہو جائے۔“

”یہ کیسے ممکن ہے، کورٹ اسے سزا دے چکی ہے۔“

”انگل ایسا سب کچھ ممکن ہے۔“ وہ بے پردائی سے بولی۔

”فرض کرو اگر قاتل خود بارہ کھلتی ہیں تو تم بھی اس میں انوالو کر لی جاؤ گی اور ہو سکتا ہے تمہیں سزا ہو جائے۔“

”انگل اچھے اس کی پروا نہیں لیکن اب ہر وقت گناہ کے احساس سے میں زمرہ نہیں رہنا چاہتی۔ میں نے گناہ کیا ہے تو سزا بھی مجھے ملنی چاہیے، کسی بے گناہ کو نہیں۔“

”اور اگر تمہارے چاہا۔۔۔۔۔“

”اب مجھے ان کی بھی کوئی پروا نہیں۔ وہ تو دیسے بھی آج کل مفرور ہیں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”سحر نے فون پر بتایا تھا اور میں نے اخبار میں بھی پڑھا تھا۔“

”او آئی سی! میں کل ہی اسے جا کر جیل میں ملتا ہوں۔“

”تھینک یو انگل!“ وہ خوش ہو کر بولی۔

”دیسا اب آپ ٹھیک ہوتا، کوئی مسئلہ تو نہیں؟“

”جی نہیں انگل! میں یہاں بہت خوش ہوں۔ یوں لگتا ہے پہلی دفعہ گھر کی گھاس میں سانس لے رہی ہوں۔ سب لوگ بہت اچھے ہیں اور میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں۔“

”اچھا اب میں چلتا ہوں۔“ اس نے اس کے سر پر پیار دیا اور باہر چلا گیا۔



ملک منصور علاقہ غیر میں اپنے ایک دیرینہ دوست گل اعجاز خان کے پاس بالکل محفوظ تھا۔ وہاں کسی قسم کا کوئی خطرہ نہ تھا بلکہ گل اعجاز خان کی میزبانی سے خوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ فون پر اپنی پارٹی سے مسلسل رابطہ رکھے ہوئے تھا۔ اس کی پارٹی برسرِ اقتدار آجکی تھی اور اس کے لیے اب راست بالکل صاف تھا۔ ایک ماہ کے اندر سارا سیاسی سین اپ تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کے خلاف سازشیں کرنے والے مخالفین بھی اب دبک کر بیٹھ گئے تھے اور پارٹی کے ارکان اس کی آمد کے منتظر تھے۔ ”اب کی بار وزیر اعلیٰ نہیں بن سکا تو کیا ہوا، اگلی دفعہ سی۔“ اس نے آنکھ کی پلانٹک

کمل کرنی تھی۔ اس پر دے عرصے میں اس نے انہی طرح حالات کا جائزہ لیا تھا اور ان تمام لوگوں کے بارے میں سوچا تھا جو اس کے خلاف سازش میں ملوث تھے۔ آصف کے بارے میں شزانے اسے بتا دیا تھا۔ آصف کو قصور میں پہنچانے والا کون تھا یہ بھی اب اسے یاد آ چکا تھا۔ اسے انہی طرح یاد آ گیا تھا کہ اس صحافی کو قتل کرنے کے بعد اس نے ریوالور اور قصور میں سیٹل کی طرف بھیجی تھیں۔ سیٹل نے ان کا کیا کیا اس نے دوبارہ پوچھنا گوارا نہ کیا۔ سیٹل کے بارے میں سوچ کر اسے ایک دم حیرانی بھی ہوتی تھی۔ سیٹل اس کا پاسپورٹ نامی تھا اور اس نے اپنی زندگی اس کے لیے داؤ پر لگا دی تھی تو پھر اس نے ایسا کیوں کیا۔ وہ دانیس جا کر جیل میں سب سے پہلے اسے ہی پوچھنے جائے گا۔ اس نے پکارا وہ کر لیا تھا۔

سیٹل پر روز بروز تشدد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ایک تو ملک منصور نے ایس ایچ او کو اس پر نظر رکھنے کو کہا تھا اور نظر رکھنے کا مطلب وہ انہی طرح جانتا تھا اور دوسرے وہ جیل کی زندگی سے سخت تنگ آ چکا تھا۔ ملک منصور کی طرف سے بھی اس کے دل میں ہر وقت کھٹکا رہتا۔ وہ ہر روز کسی نہ کسی کے ساتھ کوئی پھنسا کر تا اور پھر اس پر اتنا تشدد کیا جاتا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر جاتا۔ اس کا سارا جسم زخموں کے نشانات سے بھر چکا تھا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی زخم دس رہا ہوتا۔ وہ سخت اذیت میں تھا جب ایک پولیس والے نے اسے ایک ملاقاتی سے ملانے کے لیے اسے کھولا۔ وہ ملاقاتی یقیناً ملک منصور ہوگا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ملک منصور ہمیشہ سے تنہائی میں رہتا۔ وہ کوئی عام ملاقاتی تو نہیں ہوتا تھا۔ سیٹل، شفق کے انجام سے انہی طرح واقف تھا اور اب اسے اپنا انجام بھی سامنے نظر آ رہا تھا۔ وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا تو چونک گیا۔ ایسا ملاقاتی جس سے اس نے زندگی بھر ملاقات نہیں کی تھی اسے لئے جیل میں آیا تھا۔ سیٹل نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ سفید کاشن کے اچھے اچھے ماکڑے سوٹ میں سرخ وسیطہ رنگت، ہورا زرد، خوبصورت چہرہ، گرتے ہوئے ایک لمبے کوچک گیا۔

”آ..... آپ..... کون ہیں؟“ سیٹل نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا۔

”میں سید مزار حیدر ہوں۔ شفق کا اکل!“

”شفق..... کا تو کوئی اکل نہیں۔“

”ہے اس نے قسمیں تائیا نہیں ہوگا۔“

”میں اس کی ساری نیلی کو جانتا ہوں۔“

”کیا تم اس کے خیال کبھی مچے ہو؟“

”نہیں۔“

”تو پھر تم کیسے جان سکتے ہو۔ ہمارے ملک منصور کے ساتھ کچھ اختلافات ہیں اس لیے آپس میں میل جول نہیں اور اس وقت شفق نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔“ حیدر نے اسے واضح انداز میں بتایا۔

”کیا مطلب..... کیا وہ زندہ ہے؟“

”ہاں اور میرے پاس گاؤں میں ہے لیکن اس کا ذکر کسی سے بھی کرنے کی ضرورت نہیں۔ ملک منصور سے بھی نہیں؟“

”وہ بچ کیسے گئی اور ملک منصور کو خبر بھی نہیں۔“ سمیل بے حد حیران ہو رہا تھا۔

”ہاں یہ بھی ایک معجزہ ہے۔ خبر اس بات کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ تم اب کیا چاہتے ہو؟“

”کیا مطلب؟“ سمیل نے چونک کر پوچھا۔

”شوق تمہارے اور تمہارے گمراہوں کے بارے میں بے حد پریشان ہے۔ وہ تمہیں آزاد رکھنا چاہتی ہے۔“

”لیکن یہ تو اب ناممکن ہے جبکہ کورٹ مجھے سزا بھی دے چکی ہے۔“

”ہاں یہی تو میں اسے بتا رہا تھا۔“

”میں شوق سے ایک بار ملنا چاہتا ہوں۔“ سمیل آہستہ سے بولا۔ حیدر نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا اور پھر خاموش ہو گیا۔

”ٹھیک ہے، میں اسے تمہارے پاس لاؤں گا۔“ حیدر مٹختے ہوئے بولا۔

”سرا جلدی کیجیے گا۔ اس سے پہلے کہ ملک منصور مجھے جان سے مار ڈالے۔“

”کیوں؟“

”میں جانتا ہوں، پس آپ شوق کو مجھ سے جلدی ملواویں۔“

”اچھا۔“ وہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

شوق، حیدر کے فون کی ہر وقت منتظر رہتی۔ صبح سے شام تک وہ انتظار کی کیفیت میں بے قرار رہتی مگر کوئی فون نہ آتا وہ مایوس ہو جاتی۔ کوکہ حویلی میں ہر طرح سے آرام اور سکون تھا مگر اب وہ آہستہ آہستہ اس یکسانیت اور خاموشی سے ٹھک آ گئی تھی۔ وہ اس گاؤں سے باہر نہیں جاسکتی تھی۔ سحر کا بھی بہت خوف سے فون نہیں آیا تھا۔ کوئی ایک بھی تو ایسا نہ تھا جس سے وہ دل کی بات کرتی۔ اندر کا ڈپریشن اور باہر سکوت..... وہ بے حد مایوسی کا شکار ہو گئی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھی جب اچانک بشری آ پانے حیدر کے آنے کی اطلاع دی۔

”اس وقت.....؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں وہ جلدی میں ہیں اور تمہیں بار ہے ہیں۔“ بشری آ پانے کہا۔

”اچھا۔“ وہ دوپٹا ٹھیک کرتے ہوئے اس کے ساتھ ان کے کمرے میں گئی۔

”السلام علیکم، نکل!“

”وعلیکم السلام! کیسی ہیں آپ؟“

”ٹھیک ہوں۔“

”تو پھر آپ تیار ہو جائیے، میں آپ کو لینے آیا ہوں۔“

”کہاں اور کس لیے؟“

”سہیل آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“

”کیا آپ اس سے ملنے گئے تھے؟“ وہ ایک دم بڑے جوش ہو کر بولی۔

”ہاں۔“

”کیا وہ ٹھیک ہے؟“

”ہاں اور آپ سے ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔“

”اچھا تو کب تک ہم جائیں گے؟“

”بس مغرب کی نماز کے بعد۔“

”ٹھیک ہے میں فریش ہو جاؤں۔“ وہ سر در سی باہر نکل گئی۔ ڈرائیور باہر کھڑا تھا۔ دونوں رات گئے لاہور پہنچے۔ حیدر کا ڈینٹس میں انکڑوں پر عید شاعر اُگل نما گھر تھا۔ شفیق کا اپنا گھر بھی کسی محل سے کم نہیں تھا مگر اس گھر میں قدم رکھتے ہی ایک انوکھی طمانیت اور سکون کے گہرے احساس نے اسے گھیر لیا۔ اس گھر کے در و دیوار انتہائی آرٹسٹک اسٹائل میں ڈیکوریت کیے گئے تھے۔ جا بجا مینٹلز، سینڈ گلاس ڈورز، وڈ ورک، قیمتی ٹائپ لپے وڈ مارٹنگ، موم کی دیواروں پر میوئل آرٹ، برڈز اینڈ کرسٹل ڈیکوریشن، پوسٹر، اس کے تصورات سے بھی حسین گھر تھا۔

”اُگل! آپ کا گھر کس قدر خوبصورت ہے۔“ وہ ارد گرد دیکھتے ہوئے بولی۔

”ہاں میری بیٹی کے ہاتھوں نے اسے سنوارا ہے۔“

”اُگل! آپ شہلا باجی سے بہت پیار کرتے ہیں۔“ وہ حیرت سے بولی۔

”ہاں، دکھا رہی ہوں۔“

”اُگل! کاش میرے پاپا بھی آپ جیسے ہوتے یا پھر آپ ہی ہمارے پاپا ہوتے۔“ اس نے اپنی ایک ہاتھل آرزو کو بہت سادگی سے کہہ دیا تھا۔ حیدر اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔ اس بات کے جواب میں کوئی تسلی بھی تو نہیں دی جاسکتی تھی۔ شفیق کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

”بیٹا! کچھ چیزیں انسان کے بس میں نہیں ہوتیں۔ قدرت ان کے فیصلے کرتی ہے اور ہم تو بس ان فیصلوں کو ماننے ہیں۔“

”اُگل! قدرت ایسے فیصلے کیوں کرتی ہے جو بہت سے دلوں کو توڑ دیتے ہیں۔ بہت سے گھر اجڑ جاتے ہیں اور نہ کبھی زخم گھاسا جاہ ہو جاتی ہیں۔ قدرت کیوں ایسا کرتی ہے؟“ وہ بے بسی سے بولی۔

”اس لیے کہ قدرت انہیں آزما رہی ہے۔ کائنات میں ہر شے کی آزمائش ہوتی ہے اور جو چھنے زیادہ اختیارات کا مالک ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ آزما جاتا ہے اور انسان کو تو اللہ نے ساری مخلوقات پر فوقیت دی ہے اس لیے اسے وہ سب سے زیادہ آزما رہا ہے۔“ اس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”اُگل! ہماری آزمائش کب ختم ہوگی۔ لگتا ہے ہم ختم ہو جائیں گے مگر ہماری آزمائش ختم نہیں ہوگی۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

”گھبراؤ نہیں انشاء اللہ بہتر ہوگا۔ آؤ کھانا کھاتے ہیں۔“ حیدر نے خانساں کو کہہ کر کھانا لگوا دیا۔

”سرا شہلا بی بی کا فون آیا تھا۔“ کھانا رکھتے ہوئے خانساں نے بتایا۔

”اچھا کیا کہہ رہی تھی؟“

”وہ آنے کا کچھ کہہ رہی تھیں۔ کل پھر فون کریں گی۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ حیدر سر دھری سے بولا۔

شوق ایک لمحے کو چوکی۔ حیدر کا رویہ اسے کافی سرد لگا مگر وہ خاموش رہی۔ وہ کھانا سامنے رکھے نہ جانے کن سوچوں میں گن گئی۔

”بیٹا! آپ کھانا کیوں نہیں کھا رہے ہیں؟“

”بس دل نہیں چاہ رہا۔“

”کیوں بھئی؟“

”انگل! جب شہلا بی بی کا کھانا کھانے کو دل نہیں چاہتا تھا تو آپ کیا کرتے تھے؟“

”تو پھر میں اسے خود اپنے ہاتھوں سے کھلاتا تھا۔“ وہ ایک دم بولا اور پھر خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو خشے کی ڈانٹنگ

نکل رہے۔

”کیا ہوا بیٹا! آپ تو بے حد حساس ہو۔“

”انگل! ازمدگی میں ایک دفعہ بھی ہمیں کسی نے اپنے ہاتھ سے کھانا نہیں کھلایا۔ نہ ممانے اور نہ پاپانے۔“ شدید احساس بحروری نے اس کو

ایک دم معجزہ ڈالا تھا۔

”تو بیٹا! اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ لاؤ میں اپنی بی بی کو کھلا دیتا ہوں۔“ اس نے چادلوں کا چٹچ اس کی طرف بڑھایا۔ شوق نے اس کی

طرف دیکھا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ حیدر کی آنکھوں میں بھی نمی ہی تیرنے لگی۔

”انگل! جن بچوں کے ماں باپ نہیں ہوتے وہ کتنے محروم بچے ہوتے ہیں۔ وہ کیا کچھ کوہوتے ہیں۔ دنیا کی سب سے بڑی نعمت، سب

سے بڑا انعام۔“ وہ رو رہی تھی اور اس کے ہاتھ سے جھج پکڑ کر اس نے پلیٹ میں دایکس رکھ دیا تھا۔

”تم پریشان نہ ہو، انھواور سو جاؤ۔“ حیدر نے شیر شاہ کو بلایا جو گھر کے تمام امور کا انتہارج تھا اور ہر بات کا وہی جوابدہ ہوتا تھا۔ شیر شاہ

درمیانی عمر کا دراز قد، صحت مند پٹھان تھا اور حیدر اس کے ساتھ بہت ادب سے پیش آتا تھا۔

”شیر شاہ اب بی بی کے لیے گیسٹ روم کھلا دو۔“ حیدر نے اسے حکم دیا۔

”جی صاحب جی! میں ابھی آیا بی بی صیب۔“ وہ ابر کل گیا۔ شوق نے ایک نوالہ بھی نہیں کھایا تھا۔ وہ بہت تھک چکی تھی۔ حیدر بھی تھکا ہوا

لگ رہا تھا۔

"اگل اسہیل ٹھیک تو ہے نا، وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟" وہ ڈانگ بھل سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"ہاں وہ ٹھیک ہے۔ شاید کوئی ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔"

"اچھا۔" وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

"آ جاؤ بی بی صیب! کراٹھ کر دی ہے۔"

"ہاں شیر شاہ! بی بی کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ یہ بھی میری بیٹی ہے۔" حیدر نے مسکراتے ہوئے کہا تو شفیق نے ڈنکی مسکراہٹ سے اس کی طرف

دیکھا اور شیر شاہ کے ساتھ گیسٹ روم میں چلی گئی۔

لگے دن وہ بڑی ہی چاؤ داؤد کر سہیل سے ملنے گئی۔ سہیل کو اس طے میں دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی اور سہیل اسے زعمہ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔

"سہیل! تمہاری یہ حالت..... مائی گاڈ! میں اس سب کی ذمہ دار ہوں۔" شفیق کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ حیدر ایس انچ اوکے پاس

بیٹھا تھا اور وہ چیل میں اسے خود چھوڑ کر آیا تھا۔

"میری حالت کو چھوڑو، میں جانتا ہوں میری زندگی اب بہت تھوڑی ہے۔ بس میں چند دنوں کا سہماں ہوں۔"

"کیوں؟"

"ملک منہور نے آتے ہی مجھے شوٹ کر دیا ہے۔"

"مگر کیوں؟"

"اس لیے کہ ان کے خلاف ایکسپرٹل میں نے ڈس کلوز کر دیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ہم میں مشعل ہو گیا تھا اور آصف کو بھی انوا کر لیا۔"

"کون آصف؟" سہیل نے اسے ساری تھیلیات بتا دیں۔

"شفیق! کسی طرح آصف کو بچانے کی کوشش کرو۔ میں تو زندگی سے ہاتھ دھونے والا ہوں مگر آصف..... اس بے چارے کا کیا قصور۔ وہ

تو میری وجہ سے پھنس گیا۔ تم کسی طرح اسے بچانے کی کوشش کرو پلیز۔"

"لیکن تم....."

"میری فکر چھوڑو، بس گھر میں خیریت پوچھنے جاؤ۔ شاید وہاں تو قانون کی نوبت آگئی ہے۔ اماں آئی نہیں، بہت پریشان تھیں۔" سہیل

کی باتیں سن کر وہ بہت پریشان ہو گئی تھی۔

"تم اپنا خیال رکھنا، کیا میں کورٹ میں حاضر ہو جاؤں؟"

"نہیں، اس کی اب قطعی ضرورت نہیں۔ بس تم آصف کو بچانے کی کوشش کرو۔" سہیل کو اپنے سے زیادہ آصف کی فکر تھی۔

”میں پھر آؤں گی اور پریشان نہ ہوں۔“

”ہاں اب میرے دل کا بوجھ کتنی کم ہو گیا ہے۔“ حیدر اسے لینے آ گیا تھا۔ واپسی پر اس نے حیدر سے آصف کے بارے میں بات کی۔

”ٹھیک ہے، مجھے اس کے بارے میں تفصیلات بتا دینا۔ میں اسے بچانے کی پوری کوشش کروں گا۔“

”انکل امیں آپ سے کچھ اور بھی کہنا چاہتی ہوں۔“

”ہاں ہاں کہو، کیا بات ہے؟“

”انکل امیں سہیل کے گھر جانا چاہتی ہوں اور ان کی کچھ مدد کرنا چاہتی ہوں مگر میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔“ وہ صاف گوئی سے بولی۔

”ٹھیک ہے تم میرے سیکرٹری اولیس کے ساتھ چلی جاؤ اور جس طرح بھی ان کی مدد کرنا چاہو، اولیس کو بتا دینا۔“ حیدر نے شفقت سے کہا۔

”جینک یو انکل ایو آر ٹیلی گریٹ!“ جواہر حیدر مسکرا دیا۔

اگلے ہی دن وہ اولیس کے ساتھ سہیل کے گھر چلی گئی۔ ان لوگوں کی حالت دیکھ کر اسے سخت دکھ ہوا۔ اس کی ماں سوکھ کر تنکا ہو گئی تھی اور

اب حواسوں میں نہیں تھی اور دونوں بہنیں بھی شدید غم و غصے سے دوچار تھیں۔ گھر کا تقریباً سارا سامان بک چکا تھا۔ اسے ایک کپ چائے پلانے کے لیے بھی ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔

”آپ لوگ کیسے گزارہ کرتے ہیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”بس جی مانگ مانگ کر یا کوئی خودی خدا خونی کر کے یا پھر کوئی صدقے خیرات میں دے جائے۔“ عذرا نے کہا تو اس کی آنکھیں

آنسوؤں سے ڈبڈبائے گئیں۔

”اب آپ فکر نہ کریں۔ آپ کو ہر ماہیہ صاحب کچھ پیسے دے جایا کریں گے۔“ اس نے اولیس کی طرف اشارہ کیا۔

”نی الحال آپ یہ تو رکھیں۔“ اس نے دس ہزار روپے عذرا کو دیے۔ سب حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

”ڈاکٹر اماں جی کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟“ اس نے اماں کی حالت دیکھ کر پوچھا۔ اماں نے اسے ہانکل نہیں بچھانا تھا بلکہ وہ تو اس کی

آواز سن کر چارپائی سے بھی نہ اٹھی تھی۔

”جب سے بھائی کو سزا ہوئی ہے اور اب تو رو کر ان کی بیٹائی بھی بہت کم ہو گئی ہے۔ نہ جانے ہم کس کے گناہوں کی سزا بھگت رہے

ہیں۔ خدا اس کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ باقی ادیسے آپ کیسے بچ گئیں۔ اماں نے قہقہا لگایا۔“

”ہاں بس قدرت نے بچالیا۔“

”آپ اتنی اچھی ہیں اور اللہ اپنے اچھے بندوں کو ہمیشہ مصیبت سے بچاتی رہتا ہے۔“

”اچھا اب میں چلتی ہوں مگر اتنی رہوں گی۔“ وہ جیسے کہیں گم ہو گئی تھی بدلی سے اٹھتے ہوئے بولی۔

”شکریہ آپ بہت اچھی ہیں۔“ دونوں بہنیں اسے خدا حافظ کہنے دروازے تک آئیں۔ سارا راستہ وہ بے بہنیں رہی۔ عذرا کے الفاظ

اس کے دماغ میں مسلسل ہتھوڑے بجا رہے تھے۔ ”خدا اس کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔“ اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ اس کے اندر شدید جھنجھ اور پھانس تھی۔ نہ جانے اس نے کیا کہہ دیا تھا کہ ایک لمحے کے لیے بھی اسے جھنجھ نہیں مل رہا تھا۔ وہ گاڑی میں بار بار پہلو بدل رہی تھی۔ ڈرائیور اور ایس اس کے ساتھ تھے۔ ایس نے ابھی فریٹس بائیں پی اے کیا تھا۔ جاب کافی اچال مسئلہ تھا تو حیدر نے اسے پرسنل سیکرٹری رکھ لیا۔

”میڈم! ان لوگوں کی طرف ہر ماہ خدا تا پڑے گا پھر ان کے کاؤنٹ میں پیسے جمع کرادیے جائیں۔“ کوئس نے بغیر مڑے اس سے پوچھا۔ ”نہ جانے ہم کس کے گناہوں کی سزا بھگت رہے ہیں۔ خدا اسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔“ غدر کے الفاظ کسی تیز دھار چاقو کی طرح اس کے دماغ کی شریانوں کو کاٹ رہے تھے۔ وہ اندر ہی اندر لہلہا ہوا ہو رہی تھی۔

”میڈم!“ کوئس نے مڑ کر اسے دیکھا مگر وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ ”ایک سیکڑ ڈی میڈم!“ وہ پھر بھی باہر دیکھ رہی تھی۔ ایس نے قدرے شرمندگی سے ڈرائیور کی طرف دیکھا اور پھر خاموش ہو گیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ کہیں دور بھاگ جائے جہاں کوئی ایسا بازگشت نہ ہو۔ جہاں اس کا ماضی نہ ہو۔ یا غدا یا امیر امانی میرے لیے کس قدر بڑا عذاب بن گیا ہے۔ میرا ماضی کتنا داغدار ہے اور حال بھی اور شاید مستقبل بھی ایسا ہو۔ اس نے سیٹ کے ساتھ سر ٹکا دیا۔

نور شدید الجھن کا شکار تھی۔ وہ زندگی کی جھنجھوں کو جان کر ہر مسئلے کا حل ڈھونڈنے کی عادی ہو چکی تھی لیکن سز پٹری کی باتیں اس کی سمجھ سے ابھی بھی باہر تھیں۔ وہ ولیم سے ملنے آئی تو وہ بہت دنوں کے بعد قادر سے ملنے گیا ہوا تھا۔ سز پٹری دو انیس کھا کر سو رہی تھیں اور وہ ان کے سامنے ایڑی چیر کر بیٹھی ان کے چہرے پر نظریں مرکوز کیے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ انسان کو جان لینا مشکل کام ہے۔ شاید دنیا کا سب سے مشکل کام۔ جو چیزیں سامنے نظر آ رہی ہوں ان کی تفسیر مشکل نہیں۔ چوٹیاں سر کی جاسکتی ہیں مگر دلوں کو ان کے سارے رازوں اور اسراروں سمیت تفسیر کرنا شاید دنیا کا مشکل ترین اور انوکھا کام ہے۔ شاید اسی لیے آج تک کسی نے بھی دل کی چوٹی سر کرنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ سز پٹری کیا ہیں؟ اور ولیم! وہ بھی تو ان کی طرح نہیں۔ وہ تو شاید ان ساری باتوں سے ناواقف ہے اور اس کے لیے سب کچھ کس قدر غم انگیز ہوگا۔ وہ کیسے سب کچھ قبول کر پائے گا اور ان کے اور بچے بھی نہیں اور وہ ولیم کو اس صورت حال سے نکالنے کی بات کر رہی تھی۔ ولیم..... چرچ..... قادر اور اس کا ان سب سے شدید لگاؤ..... اس نے سب کچھ کہاں سے پایا تھا۔ وہ سوچوں میں گم تھی جب ولیم آ گیا۔

”تم کب آئی؟“ ولیم نے حیرت سے اس سے پوچھا۔

”کافی دیر سے۔“

”خبریت تو ہے تم آج کچھ پریشان سی لگ رہی ہو؟“

”ہاں، ہوں تو سہی۔“

”مجھے کچھ نہیں بتاؤ گی۔“

”نہیں کیونکہ تم بھی پریشان ہو جاؤ گے اور تمہارا پریشان ہونا مجھے پسند نہیں۔“

”اچھا، ایسی بھی کیا بات ہے۔“ وہ کتابیں شیف میں رکھتے ہوئے بولا جو وہ ہاسٹل سے لایا تھا۔

”کہاں سے آرہے ہو؟“

”ہاسٹل گیا تھا، کچھ کتابوں کی ضرورت تھی اور پھر قارہ کے پاس گیا تھا۔“

”کیوں؟“ اس نے ایک دم چونک کر پوچھا۔

”تمہیں معلوم تو ہے وہ مجھ سے بہت ناراض ہیں۔“

”تو پھر کیا اب ناراضگی ختم ہوگئی ہے۔“

”نہیں، انہوں نے مجھ سے ملنا گوارا ہی نہیں کیا۔ نہ جانے ان کو میرے بارے میں کیا شبہات ہیں۔ میں نے تو صاف صاف مہم کی

حالت کے بارے میں بتایا تھا پھر بھی..... پھر بھی وہ نہیں سمجھتے۔ کبھی کبھی تو مجھے محسوس ہونے لگتا ہے کہ قارہ سنے میں ایک انسان کا دل نہیں رکھتے۔ وہ اپنی ہر بات میں اصول، قواعد و ضوابط کو لے آتے ہیں۔ زندگی میں کبھی کبھی اصول توڑنے پڑتے ہیں۔“ وہ مایوسی سے بول رہا تھا۔

”ولیم! نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہونے لگا ہے کہ تم چرچ جوائن کر کے غلطی کرو گے۔“

”نہیں، کبھی نہیں۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں بولا۔

”کیوں، تم اسے ڈوق سے کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”اس لیے کہ میں جن مشکلات سے گزرا ہوں اب میں اپنا ذہن تبدیل نہیں کرنا چاہتا۔ میری زندگی کا خواب پائلٹ بننا تھا۔ تم جانتی ہو

اس خواب کو اپنے ذہن سے نوچنے کے لیے مجھے کتنا عذاب سہتا پڑا، ایک ایک لمحہ میرے لیے عذاب بن گیا تھا اور اب جبکہ میں یہ سوچ چکا ہوں اب اس سوچ کو پھر بدلنا میرے لیے ناممکن ہے۔ میں اپنے آپ کو بار بار مصیبتوں میں نہیں ڈالنا چاہتا۔“ وہ بڑا اعتماد لہجے میں بولا۔ نورس کی طرف دیکھتی رہی اور پھر خاموش ہوگئی۔

”مگر تم کیوں پریشان ہو؟ تم جیسی لڑکی کو پریشان دیکھ کر میں بھی پریشان ہو گیا ہوں۔“ وہ مدھم سی مسکراہٹ سے بولا۔

”کیوں، میں انسان نہیں ہوں؟“

”ہاں ہو مگر بہت بولڈ جس سے شاید مسئلے بھی دور بھاگتے ہیں۔“

”یہ تمہاری خام خیالی ہے۔“

”نہیں مجھے پورا یقین ہے۔“

”کبھی کبھی یقین بھی دھوکا دے جاتا ہے۔“

”اچھا ابھاؤ نہیں۔“

”کیسے نہ ابھاؤں۔ اس وقت تو میں خود شدید الجھن میں ہوں۔“ وہ آدھ بھر کر کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی۔

”کیا تم مجھ سے کچھ شے نہیں کرنا چاہتی یا پھر مجھے اس قابل نہیں سمجھتی؟“

”میرا خیال ہے دوسری بات زیادہ ٹھیک ہے۔“ وہ ہنسنے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے جو تمہاری مرضی۔“

”آئی کوڑا کٹر کے پاس لے کر گئے تھے؟“

”جہیں، حیدر اکل خود لے کر جائیں گے اور وہیں تمہیں بتانا تھا کہ ہم لوگ ادھر سے شفٹ ہو رہے ہیں۔“

”کہاں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”حیدر اکل کا گلیمرگ میں ایک گھر ہے ادھر۔“

”ولیم! حیدر اکل اچانک کہاں سے آئے۔ کیا تم نے زندگی میں پہلے بھی انہیں دیکھا.....؟“

”جہیں اور سما کی حالت ایسی ہے کہ میں ان سے کچھ بھی نہیں پوچھنا چاہتا۔ فوراً اب تو مہاجر وقت موت کی باتیں کرتی رہتی ہیں اور.....“

اور مجھے بہت خوف آتا ہے۔“ وہ اپنے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”کیوں؟“

”ان کے بعد میں کیا کروں گا۔ میری ماما تو میرے لیے سب کچھ ہیں جیسے کرائسٹ کے لیے مری۔ اوو گاڈ..... پلیز سیو ہر۔“ اس

کی آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی۔ وہ ولیم کو یوں پریشان دیکھ کر حریف کچھ کہہ کر اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”پھر کب شفٹ ہو رہے ہو؟“

”کل اکل لینے آئیں گے۔“

”ولیم! حیدر اکل دوسری کیونٹی سے نہیں ہیں کیا؟“ اس نے عجیب استغما میا انداز میں پوچھا۔

”ہاں مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“

”یونی! کیا تمہیں حیرت نہیں ہوئی؟“

”جہیں، بالکل نہیں۔“

”کیوں؟“

”ہو سکتا ہے مابعد میں اپنا مذہب بدل چکی ہوں۔“

”جہیں، یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ ایک سچا مسلمان کبھی مذہب بدل نہیں سکتا۔ ہمیشہ وہی اپنی راہ دہ لے لے ہیں جن کا ایمان بودا اور کزور جوتا ہے اور

جن کے دل دماغ کزور اور شبہات میں جھلا ہوتے ہیں اور حیدر اکل کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ ایک اچھی مسلمان خلی سے ہیں۔“

”تو پھر اس کا کیا مطلب ہوا؟“ ولیم نے یوں حیرت سے پوچھا جیسے اس کے سر پر ہتھوڑے برس رہے ہوں۔

”معلوم نہیں، میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ میں خود اسی وجہ سے الجھن کا شکار ہوں۔ میں تم سے بالکل ڈسکس نہیں کرنا چاہتی تھی مگر میں مجبوری میں ہوں۔“ لورا آہستہ سے بولی۔

”تم نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ پلیز تم اس وقت پہلی جاؤ۔ میں سخت مطمئن محسوس کر رہا ہوں۔ میں چند لمحوں کے لیے خاموشی چاہتا ہوں۔“ ولیم کی ہمیشہ سے یہی عادت تھی۔ جب وہ شدید الجھن کا شکار ہوتا تو دروازے، کمر کھیاں اور لامٹ بند کر کے اندر حیرے میں سوچتا رہتا اور ابھی بھی وہ اس ماحول میں اپنے آپ کو غم کر کے چند ثانیوں کے لیے اپنے آپ سے کچھ ڈسکس کرنا چاہتا تھا۔

”ٹھیک ہے میں چلتی ہوں مگر کچھ ہونے والا ہے۔ شاید بہت عجیب۔۔۔۔۔ بہت اذیتناک۔۔۔۔۔“ لورا آہستہ سے بولی اور کمرے سے نکل گئی۔ ولیم نے ماں کے چہرے کو بغور دیکھا۔ بیماری اور فضاہت نے صرف دو تین ماہ میں انھیں بالکل بدل کر رکھ دیا تھا۔ ان کے چہرے پر پھیلا کر ب اور پائیت سب کچھ تکلیف دہ لگ رہا تھا۔ وہ ان کے کمرے سے نکل گیا اور اس کمرے میں چلا گیا جو اس نے قیام کے دوران اپنے لیے سیٹ کیا تھا۔ وہ خاموشی سے دروازے، کمر کھیاں اور لامٹ آف کر کے کرسی پر بیٹھ گیا اور سوچتا رہا۔ مسلسل سوچتا رہا۔ وہ ہمیشہ ایسی سنگ کے بعد اپنے آپ کو ہلکا پھلکا اور مطمئن محسوس کرتا تھا مگر کئی گھنٹے گزارنے کے بعد بھی وہ شدید الجھن سے دوچار تھا۔ وہ جربا جربا کیا تھا۔ ایک بات کا سرا بھی اس کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی۔۔۔۔۔ بخونور میں پھنس گیا ہو۔ بیماریاں، ناراض قاور، قریب آتے ایگزاور، نور کی بائیں، حیدر اکل سے قربت داری، مالی پریشانیاں سب کچھ کس قدر تکلیف دہ تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے فرار چاہتا تھا مگر اب ایسی کوئی جائے چاہ نہیں تھی۔ قاور ناراض تھے اور نور خود الجھن میں تھی۔ وہ مزید پریشان ہو گیا۔

حیدر انھیں اگلے دن لینے آ گئے۔ ولیم اب حیدر اور ماں کی طرف ہر بات پر چونک کر اور تنقیدی نگاہ سے دیکھتا۔ ماما خاموشی سے جانے کے لیے تیار ہو گئی تھیں۔ حیدر انھیں گلبرگ میں ایک وسیع و عریض ویل فرنشڈ بنگلے پر لے گئے۔

”حیدر یہاں رہتے ہو؟“ ماما نے حیرت سے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جی نہیں، ڈینٹس میں۔“

”اور یہاں کون رہتا ہے؟“

”یہ آپ لوگوں کے لیے خریدیا ہے۔“ وہ آہستہ سے بولے۔ اس بات پر ولیم کے کان کھڑے ہو گئے۔ اسے شدید حیرت ہوئی۔ اس نے ماما کی طرف دیکھا اور پھر حیدر اکل کی طرف مگر خاموش رہا۔

”اس کی کیا ضرورت تھی؟“

”جی تم کسی غیر کے گھر پڑی رہو یہ ہمارے خاندان کی روایت نہیں۔“ ولیم نے پھر چونک کر دونوں کو دیکھا۔

”حوالی میں کون ہے؟“ شہلانے ایک دم بے خیالی میں پوچھا۔

”کوئی نہیں، بس ملازم ہیں۔ کبھی کبھی میں بھی چلا جاتا ہوں۔ بیٹھوں کی دیکھ بھال کے سلسلے میں یا پھر کوئی اور مسئلہ ہو۔“

"اچھا، سب ٹھیک ہیں نا؟"

"ہاں۔"

"ولیم کبھی..... کبھی....." وہ ایک دم رک گئی۔ حیدر کچھ بھاپتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"ہاں۔ کبھی، کیا کرنے کے ارادے ہیں؟"

"کچھ نہیں۔ جرج جو ان کرنے کا سوچ رہا ہوں۔" اس نے جان بوجھ کر ایسا کہا تھا۔ حیدر نے حیرت اور استغماہمیت لگا ہوں سے شہلا کی

طرف دیکھا اور شہلا نے حیدر کی طرف..... اس کی نظروں میں بلا کا کرب، مایوسی اور بے بسی تھی۔ ولیم کو بہت عجیب سا لگا۔ نور کی باتوں اور الجھنوں کی وجہ سے آئے گی۔ کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا۔ بیڑوں اپنی اپنی جگہ شدید الجھن میں گرفتار تھے۔

.....

ملک منصور واپس آ چکا تھا۔ اسے اب کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس کی پارٹی نے اس کا یوں استقبال کیا جیسے وہ کسی محاذ سے واپس آیا ہو۔ اخبارات نے اسے خصوصی کوریج دی۔ اس کے تو جیسے سارے گناہ و مل چکے تھے۔ وہ ہر طرح سے پاک صاف ہو کر آیا تھا۔ اب نہ کوئی کیس باقی تھا نہ کوئی مقدمہ کیونکہ اس کی پارٹی برسرِ اقتدار آ چکی تھی۔ اپنی حکومت سے کیسا خطرہ! ایسی بے برائی دیکھ کر اس کا غم دھم اور زیادہ ہو جاتا۔ اسے یوں لگتا جیسا سے نچاؤ کھانے کے لیے کسی نے چند ٹانوں کے لیے فطرنے کی بساط پر اسے مات دے دی تھی اور اب وہ صاف بچ لگا تھا مگر اس مہرے کو اب وہ اپنے ہاتھوں سے کھانا چاہتا تھا۔ شزا سے ایئر پورٹ لینے گئی۔ مسافروں اور پارٹی ورکروں کی اتنی بڑی تعداد جمع تھی کہ وہ چمک گئی۔ ملک منصور ا قدرت تم پر بڑی مہربان ہے، تم ہر دفعہ صاف بچ نکلتے ہو۔ نہ جانے کیوں قدرت تمہاری رسی دراز کر رہی ہے۔ اس نے بحیرہ چلائے ہوئے سوچا۔ ملک منصور اس کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا سگرا رہا تھا۔

"بحیرہ جنیل کی طرف موڑ لو۔" اس کے لہجے میں قلعیت تھی۔

"کیوں؟"

"بس ضروری کام ہے، سہیل سے ملنا ہے۔"

"ٹھیک ہے لیکن پہلے گھر چلتے ہیں۔"

"نہیں، میں اپنے ضروری کاموں کو موخر کرنے کا عادی نہیں۔" وہ دھڑک لہجے میں یو لاء اور شزا نے خاموشی سے بحیرہ و اس طرف موڑ لی۔

جیسے ہی وہ جنیل میں داخل ہوا، ہر طرف ہنگامہ مچ گئی۔ اس کی غیر متوقع آمد نے سب کو چوکا دیا۔ اس کی سیاسی حیثیت سے کس کو انکار تھا۔ وہ انکیشن سے باہر ہو گیا تھا اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ وہ سیاست سے ہی باہر تھا۔ اس کی پارٹی حکومت میں تھی اور وہ پارٹی کا لیڈر رہ چکا تھا۔ پارٹی اب بھی اس کے اشاروں کی منتظر رہتی تھی۔ وہ سیدھا سہیل کی طرف گیا۔ اس کے قدموں کی چاپ سہیل اچھی طرح پہچانتا تھا۔ وہ جنیل کی تاریک کوٹھڑی کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا تاکہ اسے نظر نہ آئے۔ ملک منصور کا..... ادھر ادھر دیکھا مگر دیوار کی طرف دیکھا۔

”تم ہاتھ میں بھی چلے جاؤ تو ملک منصور تمہیں ڈھونڈ لے گا۔ تم نے اسے دھوکا دینے کی کوشش کی ہے۔ تم بھی جیوتی شیر سے لڑنے چلی تھی۔“ ملک منصور کے لہجے میں نہایت نفرت اور حقارت تھی۔

”جیہیں، میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔“

”تم نے میرا کیرئیر داؤ پر لگا دیا۔“

”اور آپ نے میری زندگی کی کیا قیمت لگائی۔ یہی کہ میرے والے لکھ سسک سسک کر مر رہے ہیں۔ کوئی ان کا پرسانہ حال نہیں۔ آپ کتنی دفعہ ان کے پاس گئے ہیں۔ میں بھی مجبور تھا۔ جب آپ اپنا وعدہ بھول گئے تو مجھے بھی بھولنا پڑا۔ مفادات کے لیے سر دھڑکی بازی لگانا میں نے بھی آپ سے ہی سیکھا ہے۔“ سہیل بھی غصے سے بولا۔

”اور دشمن کو کچلنا، اس کو زخموں میں لے کر مات دینا شاید یہ نہیں سیکھا۔“

”ہاں اس میں، میں ہار گیا۔“ وہابیسی سے بولا۔

”لیکن مجھے ہار پسند نہیں۔ اس ہار کو اب میں تمہارے گلے کا ہار بنانا چاہتا ہوں۔ ملک منصور جب تک اپنے دشمنوں کو اپنے قدموں تلے روند نہ لے اس وقت تک سکون کا سانس نہیں لیتا۔“

”ٹھیک ہے، میں بھی آپ جیسے وحشی ورنہ سے سے زندگی کی بھیک نہیں مانگوں گا۔ کر گزریے جو آپ چاہتے ہیں۔“ سہیل بڑے مطمئن لہجے میں بولا۔ ملک منصور نے اس کی طرف دیکھا، گہری سانس لی، روپا اور جیب سے نکالا۔

”لیکن یاد رکھیے! قدرت اپنے مظلوم بندوں کا حساب خود لیتی ہے۔ اے اللہ! اس بندے سے گن گن کر حساب لینا۔ اس نے کئی زندگیاں کو اپنی خوشی اور مفادات کی بھیجٹ چڑھایا ہے۔“ سہیل نے چھت کی طرف منہ کر کے دعا کی۔

”تم جیسے لوگوں کی دعائیں پوری ہونے لگیں تو آسمان نہ پھٹ پڑے۔“ ملک منصور ہتھ لگا کر بولا۔

”فرعون بھی تو یہی کہتا تھا اور آپ بھی اس وقت اپنے آپ کو خدا سمجھ رہے ہیں۔“ سہیل الفاظ چبایا کر بولا۔

”یہ بھی تمہارا ڈھونگ ہے سزا سے بچنے کا مگر میں تم لوگوں کی رگ رگ سے واقف ہوں اس لیے اب جیسے زمین پر رہنے کا کوئی حق نہیں۔“ ملک منصور نے دو کاڑھ کر دیے۔ سہیل وہیں ڈھیر ہو گیا۔ ملک منصور اطمینان سے باہر آ گیا اور مجبور میں جینہ کر چلا گیا۔

”سہیل ٹھیک ہے نا۔“ شزانے ملک منصور کی طرف بغور دیکھ کر پوچھا۔

”ہاں بالکل! اور وہ آصف کا کچھ پتا چلا۔“ ملک منصور نے پوچھا۔

”ہاں، بہت مشکل سے ٹریس آؤٹ ہوا ہے۔ پہلے لیصل آباد میں تھا اور آج کل جھنگ میں ہے۔“

”جھنگ میں کس کے پاس؟“

”ہماری مخالف پارٹی کے ڈیرے پر۔ اب آپ اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے لے آئیں مگر جو کرنا ہے کر لیں۔ میرا کام تو صرف اسے

فریس آؤٹ کرنا تھا۔" شزا آہستہ سے بولی۔

"جھیک پڑا رنگ! تم نے میرا بہت ساتھ دیا۔" ملک منصور نے اس کا کندھا چھو رہا تھا۔

"ملک صاحب! آپ سے ایک بات کرنی ہے۔"

"ہاں ہاں کہو۔"

"شماگل بہت اپ سیٹ ہے اور اس نے اپنے آپ کو ختم کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔"

"وہاں ان شخص.....! لیکن کیوں؟"

"وہ بہت ڈسٹرب ہے۔ شاید ہماری وجہ سے۔ وہ آپ کو اور مجھے بہت مس کرتی ہے۔ پچھلے دنوں گھر آئی تھی۔ اس میں بہت زیادہ تبدیلیاں آ گئی ہیں۔ وہ پھر بھی ہو گئی ہے اور جنونی بھی۔ پلیز اس کے لیے کچھ کریں ورنہ میں مر جاؤں گی۔" شزا کی نیلی آنکھیں پھٹک گئیں اس نے ہجیرہ کی رفتار اور بڑھادی۔

"ملک! ایزی ڈارنگ! کون نہیں ہوتا۔ اس عمر میں ایسا تو ہوتا ہے۔ میں ذرا اس مسئلے سے قاریغ ہوں تو پھر خود اس سے ملنے جاؤں گا۔"

"آخروہ کب تک ہاسٹل میں رہے گی؟"

"اس بات کو چھوڑو، میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گا۔ میں نے کہا ہے نا۔" وہ یہ بات ڈسکس نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ شزا خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی مگر دل میں بے شمار خدشات تھے اس شخص پر نہ چاہے ہوئے بھی اسے یقین کرنا پڑتا تھا۔

شفیق گاؤں واپس آ چکی تھی۔ حیدر انکل نے فون کر کے اسے بتایا تھا کہ آصف جھنگ میں ان کے ایک دوست کے پاس ہے۔ ملک منصور کا مخالف حیدر کا گہرا دوست تھا۔ ملک منصور کے سکینڈل کے بعد ہر سیاسی شخصیت کی آصف سے ابھی خاصی شناسائی ہو گئی تھی۔ ملک منصور نے آصف کو لاہور آنے کو کہا تھا اور اپنا رانا یو بھی بھیجا تھا۔ شفیق آصف کی طرف سے مطمئن تھی مگر گلاس آ کر بھی وہ شدید ڈانٹ کر ب میں پھنسا تھی۔ سیکل کی اہم حالت اور عذرا کی باتیں اسے ہر وقت ڈنکی رہتیں۔ شدید گناہ کا احساس اس کے اندر کو تھوہلا کر رہا تھا۔ وہ ڈانٹتے سے قاریغ ہو کر اخبار پھیلانے سے پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جہاں اعدونی صفحے پر سیکل کی تصویر اور اس کے پڑا سراسر قتل کے بارے میں لکھا تھا اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے ایک دلچسپ خبر پڑھی۔ بار بار پڑھی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر دنا شروع ہو گئی۔ ایک بے گناہ انسان اس کی وجہ سے موت کی نذر ہو گیا تھا۔ خدا اور اقی اسے کیسے معاف کرے گا۔ وہ واقعی اس کا بل نہیں تھی کہ اسے معاف کیا جاسکا۔ اس کا مطلب ہے پایا واپس آ چکے ہیں اور..... پھر اسی لیے سیکل خوفزدہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پایا اسے نہیں چھوڑیں گے اس نے جلدی سے سحر کوفن ملایا۔ اس کا موہاگل بند تھا۔ نہ جانے وہ کیوں اپنا موہاگل ہر وقت بند رکھتی تھی۔ گاؤں آنے کے بعد ایک دو دو لہاس نے اسے فون کیا تھا پھر نہ جانے کیوں رابطہ منقطع ہو گیا..... اس نے حیدر انکل کو فون ملایا۔

"انکل! سیکل قتل ہو گیا ہے۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔" وہ آہ بھر کر بولے۔

”انکل! اسے پایا نے نقل کیا ہے۔“

”مگر اس بات کو کون مانے گا۔“

”انکل! میں عدالت میں گواہی دوں گی۔“

”کیا لاتعدہ! کیا تم چشم دید گواہ ہو اور تمہارے پاپا بہت شاطر ذہن کے مالک ہیں اس لیے بیٹان باتوں کو مت سوچو۔“

”مگر انکل! وہ بے گناہ تھا۔“

”ہاں میں ابھی طرح جانتا ہوں۔“

”انکل! کب تک ایسا ظلم اور نا انصافی ہوتی رہے گی۔“

”جب تک لوگ مجبور ہیں اور ملک منصور جیسے لوگ زندہ ہیں۔ اچھا اب تم اپنے ذہن پر زیادہ بوجھ نہ ڈالو۔“

”انکل! کیسے نہ سوچوں، وہ شخص میری وجہ سے مارا گیا ہے۔“

”تو پھر اب تم کیا چاہتی ہو؟“

”میں..... میں تو کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ میں تو بہت بے بس ہوں۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ انکل! میں ابھی اس کے گھر جانا چاہتی

ہوں۔ دفنانے سے پہلے ایک دفعا سے دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے، میں ڈرائیور کو بھیج دیتا ہوں۔ تم چلی جاؤ اور اپنی چادر وغیرہ اوڑھ کر جانا۔ ہو سکتا ہے تمہارے پاپا بھی وہاں ہوں۔“

”دو وہاں کیوں ہوں گے؟“

”ایسا ہی ہو گا تم دیکھ لینا۔ شاید تم نے خبر کی آخری لائن نہیں پڑھی۔ رسم گل ملک منصور کی کوئی پرہیزگاری کا خاص قریبی ملازم تھا۔“

”اوہ نو! ایسا نہیں ہو سکتا۔“ وہ چونک گئی۔

”ایسا ہی ہے، بس یہی سیاست ہے۔ میں ڈرائیور کو بھیج رہا ہوں۔“ حیدر نے فون رکھتے ہوئے کہا۔

اس کا باپ اتنا کریمہ انسان ہو سکتا ہے اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اتنا شاطر، اس قدر مدکار، نہ اس کے نزدیک انسان اہم تھے اور نہ ہی جذبے، نہ رشتے، نہ جانے یہ سب کچھ وہ کس کے لیے جمع کر رہا تھا۔ اتنی حرص، اتنا لالچ، اف خدایا! کاش ہم اس شخص کی اولاد نہ ہوتے۔ یہ کتنی زندگیوں کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ شاید ممانے ٹھیک فیصلہ کیا تھا اور اس شخص سے جان چھڑائی تھی۔ اس نے کرب سے سوچا۔ وہ بشری آپا کی ظاہر دانی چادر پہن کر گئی۔ سبیل کے گھر میں جیسے کہرام مچا تھا۔ اس کی ماں ابھی تک بے سندھ چادر پائی پر پڑی تھی۔ بس بے بسی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ بہنوں نے دروازہ پر برا حال کر رکھا تھا۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ کون آ رہا تھا، کون جا رہا تھا۔ ملک منصور اور شزا وہاں پہلے سے موجود تھے۔ شزا میت کے قریب ہی خاموش بیٹھی تھی اور ملک منصور باہر ٹینٹ میں دریوں پر۔ یہ شخص اور کہیں اس طرح بیٹھے، شفق نے اندر داخل ہوتے ہوئے ایک تک باپ کو دیکھا۔ اس کے اندر نفرت اور حقارت سے آتش خشاں پھلنے کو تھا۔ وہ خاموشی سے اندر چلی گئی اور ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ جنازے میں بس چند منٹ باقی تھے۔ اسے

سکیل کی باتیں، اس کا لہجہ اور آخری ملاقات سب کچھ یاد آ رہا تھا۔ پھر لوگ سیت اٹھانے آئے تو ملک منصور سب سے آگے تھا چارپائی کو کندھا دیے کے لیے۔ انسان اتنا سفاک بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے ذہن میں بار بار یہی الفاظ گونج رہے تھے۔ جیسے ہی جنازہ لے کر گئے وہ وہاں آ گئی۔ ستر لہا ہوتا جا رہا تھا اور تاریکی پھیلنے لگی تھی۔ زندگی کتنی مختصر ہے مگر کس قدر تکلیف دہ۔۔۔۔۔ اس کا زندگی اور انسانوں سے اظہار اظہار جا رہا تھا۔



سحر بروقت اپنے کمرے میں قید رہتی اور سوئی رہتی۔ جب سے اسے معلوم ہوا تھا کہ آفاق نے مددِ رخ سے شادی کر لی ہے وہ شدید ڈپریشن کا شکار تھی۔ آفاق اس خبر کے بعد گھر نہیں آیا تھا۔ اس نے ہر جگہ اسے ڈھونڈا تھا۔ ایک مہینہ تو وہ مری میں رہا پھر سوئٹزر لینڈ چلا گیا اور اب نہ جانے کہاں تھا۔ وہ اس کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی تھی۔ اس نے تنگ آ کر نشہ شروع کر دیا تھا۔ صرف یہی ایک رونا فریاد نظر آتی۔ وہ اپنے آپ سے کہتا دور بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اس گھر سے، اس کی فضا سے، اپنے ماضی سے اور اس حال سے، اس کا کوئی مستقبل نہیں تھا اس لیے اسے اس کی قطعی پروا نہیں تھی۔ اس نے کلب جانا چھوڑ دیا تھا۔ اپنے آپ کا کوئی ہوش نہ تھا بس ہر وقت آفاق اور مددِ رخ، نشہ اور وہ۔ اس گھر میں پہلے بھی وہ ایک ناکارہ وجود تھی جس کی حیثیت ایک کانس پر رکھے گلہ ان جتنی بھی نہ تھی اور اب کسی کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس کے اکاؤنٹ میں پیسے موجود ہوتے۔ آفاق اپنے اس غرض سے بے خبر نہیں تھا اور وہ یہ کہیے اڑاتی، کسی کو بھی اس سے سروکار نہ تھا۔۔۔۔۔ سوسائٹی کے یہی توفیشین ہیں۔ سب ترقی کی طرف گامزن تھے یا پھر ترقی کی طرف۔ اس کا کسی کو شعور نہیں تھا اور سوچنے کے لیے فرصت تو بالکل ہی نہیں تھی۔ اس لہو اور بے معنی زندگی کا حاصل کیا ہے؟ وہ سوچتی اور پھر سرکریٹ پھونکتے گئی۔



شائل کے اسکول سے رزلٹ کارڈ آیا تھا اور ساتھ پرنسپل کا لیزر بھی کہ وہ پڑھائی میں بالکل دلچسپی نہیں لے رہی۔ ہر مضمون میں اس کے نمبر صفر یا ایک دو تھے۔ دس نمبر سے زیادہ کسی مضمون میں نہیں تھے۔ پرنسپل نے والدین کو آنے کے لیے کہا تھا۔ شزار رزلٹ کارڈ دیکھ کر شدید پریشان تھی۔ اس نے ملک منصور کو بتایا۔

”یہ شائل کے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے۔ اس لڑکی نے تو تنگ کر کے رکھ دیا ہے۔“ ملک منصور جھجھکا کر بولا۔

”میں نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ شدید ذہنی بالجنوں کا شکار ہے۔“

”آخر اس کو تکلیف کیا ہے، برکت تو اس کو میسر ہے۔ پیسے اس کے اکاؤنٹ میں ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ پھر کس چیز کی کمی ہے؟“

”محبت کی، پیار کی اور اعتماد کی۔ ملک صاحب! اب وہ ہم پر اعتماد نہیں کرتی۔ وہ مجھ سے اب اپنی کوئی بات شیئر نہیں کرنا چاہتی۔ وہ ہر

بات، ہر مسئلے میں بہت شدت پسند ہوتی جا رہی ہے۔ وہ جتنی شدت پسند ہو رہی ہے اتنی غصہ و رنج بھی ہوتی جا رہی ہے۔ کاش! آپ اسے اس دماغ سے

تو پھر آپ کو معلوم ہوتا۔ وہ تو ہماری شائل ہی نہیں لگتی۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں وہ پاگل نہ ہو جائے۔“

”ہو جائے اگر اسے کسی کا احساس نہیں۔“ وہ غصے سے بولا۔

”ملک صاحب! آپ جانتے ہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اتنی بڑی بات اور آپ نے کس قدر عام انداز میں کہہ دی۔ وہ ہماری بیٹی ہے، کوئی کھلوانہ نہیں جو ٹوٹا ہے تو ٹوٹ جائے۔ کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ شزائی آنکھیں بھرا نکس اور آواز کپکپانے لگی۔

”اوکے ریلیکس اتم کل ہی چلی جاؤ۔ کل میری بہت اہم میٹنگ ہے ورنہ میں بھی چلتا۔ میں ڈرائیور کو کہتا ہوں تم صبح سویرے چلی جاؤ۔“

ملک منصور دھیسے لہجے میں بولا اور وہ خاموش ہو گئی۔

اگلے دن دو صبح سویرے مری کے لیے روانہ ہو گئی۔ شام ہو گئی تھی اس لیے وہ اسکول نہ گئی۔ اگلے دن صبح صبح ہی وہ اسکول پہنچ گئی۔ شائل کو بلایا۔ دو آئی تو وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کا حلیہ پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ وہ پہلے سے بے حد کمزور لگ رہی تھی۔ کندے ناخن، اس کے منہ سے بھی بہت بد بو آ رہی تھی۔ کندے چڑے ہوئے بالوں کی پونی، نہ جانے کب سے وہ نہیں نہائی تھی۔ دو بے حد گندی لگ رہی تھی۔

”شائل بیٹا! تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟“ شزائے حیرت سے پوچھا۔

”کیا.....؟ نو..... نو..... آئی اہم رائٹ..... ہینڈ رڈ پر سنڈ رائٹ..... آئی اہم وی بیٹ..... بیٹ..... بیٹ..... ایسٹ اینڈ ویسٹ..... ویسٹ از وی بیٹ..... آئی اہم وی بیٹ.....“ وہ بے ہودہ انداز میں الفاظ دہراتی رہی۔ شزائے دل قہقہہ کر رہی تھی۔

”کیا ہوا؟ آپ روکیوں رہی ہیں۔ رونے سے آنکھیں خراب ہوتی ہیں۔ آنکھیں خراب ہوں تو صحت خراب ہوتی ہے اور صحت خراب ہو تو انسان مر جاتا ہے۔ مر جائے تو اچھا ہوتا ہے مگر پھر بھی آپ کیوں رو رہی ہیں۔ رونے تو وہ ہیں جو بیمار ہیں اور جن کو چوٹ لگی ہو۔ آپ کو کہاں چوٹ لگی ہے۔ یلو آئی اہم وی بیٹ۔“

”خدا کے لیے چپ کر جاؤ۔“ وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر بولی۔

”ڈانٹیں کیوں ہیں، جائیں یہاں سے۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔ شزائے تھوڑے چہرہ چمپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ جا بھکی تھی اور وہ نہ جانے کتنی دیر رو رہی تھی۔ پھر وہ پریسل سے ملنے چلی گئی۔

”آئیے مسز منصور! ہمیں آپ کا شدت سے انتظار تھا۔ شائل کی حالت.....“

”ہاں میں دیکھ چکی ہوں۔ یہ کب سے ایسی ہے؟“

”جب آپ اسے چھوڑ کر گئی تھیں تو پورا ہفتہ اس نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ مسز منصور اوہاں کیا ہوا تھا کہ بیٹی نے اس قدر گہرا صدمہ لیا ہے۔ وہ بہت ڈپرے منڈ ہے۔ کبھی آپ اس کا کرا جا کر دیکھیں۔ ائی گاڈ! اس قدر گندا ہے اور پھر کسی کو اندر بھی سمجھنے نہیں دیتی۔ خدا اپنی صفائی کا خیال نہیں رکھتی۔ ہر وقت عجیب و غریب باتیں کرتی رہتی ہے۔ آئی اہم وی بیٹ..... ایسٹ اینڈ ویسٹ..... یہ جملہ دہراتے دہراتے وہ جھکتی بھی نہیں۔ کلاس میں وہ اپنی مرضی سے جاتی ہے اور جب جاتی ہے تو لڑ جھڑکراتی جاتی ہے۔ مسز منصور ابھتر رہی ہے کہ آپ اسے گھر لے جائیں، اس کا علاج کروائیں۔ ٹھیک ہوتی ہے تو پھر چھوڑ جائے ورنہ.....“

”نہیں، پلیز ایسی بات نہ کریں۔ میری زندگی تو صرف ان دو بچوں کے دم سے ہے۔“

”ٹھیک ہے مگر اس کی وجہ سے اسکول میں بہت ڈسٹربنس ہے۔ پلیز سمجھنے کی کوشش کریں۔“

”اور میرا کیا ہے؟“

”وہ تو ٹھیک ہے، آپ اس سے مل سکتی ہیں۔“

”اچھا آپ شائل کلبجھاویں اور اس کا سامان بھی، میں میرے مل لوں۔“

”ٹھیک ہے آپ صحت کریں۔“

وہ میرے ملے گئی۔ وہ خوش ہاش ملا۔ اسے دیکھ کر اسے قدرے اطمینان ہوا۔ وہ اس کے لیے کچھ چیزیں لائی تھیں۔ اسے دیں، وہ خوشی

خوشی چلا گیا۔

وہ کافی دیر بکھر رہی مگر شائل نہیں آ رہی تھی۔ وہ دوبارہ پرنسپل کے پاس گئی اور اس کے بارے میں پوچھا۔ پرنسپل نے آیا کو بلا یا اور اس کے

بارے میں پوچھا۔

”اس نے کمراندر سے بند کر لیا ہے اور دروازہ نہیں کھول رہی۔“ آیا نے بتایا۔

”مائی گاڈ.....!“ شزا گھبرا کر بولی۔

”آپ گھبرا نہیں نہیں، کچھ نہیں ہوتا۔“ پرنسپل خود گئیں۔ شزا بھی ساتھ تھی۔ پرنسپل نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ بہت آوازیں دیں مگر وہ تو

جیسے سن ہی نہیں رہی تھی۔ دروازے کی ایک سائیڈ پر روشن دان تھا۔ پرنسپل نے آیا کو ادھر سے جھانکنے کو کہا۔ آیا اور چڑھی تو مسکراتی ہوئی نیچے آ گئی۔

”جی وہ تو سوری ہے۔“ آیا نے بتایا۔ شزا نے سکون کا سانس لیا۔

”اب وہ تب ہی دروازہ کھولے گی جب وہ اٹھے گی اس لیے آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔“ پرنسپل نے اس سے کہا۔

”ٹھیک ہے، میں ریٹ باؤس جاتی ہوں۔ جب وہ اٹھے تو مجھے فون کر دیجیے گا۔“ شزا کہہ کر پرنسپل کے قدم اٹھاتی ہوئی باہر چلی گئی۔ وہ

شدید فانی اذیت میں تھی۔ اس نے جیسی جیسی دعائی گزاری تھی۔ اسے اس کا اتنا تھکن نہ تھا۔ ملک منصور نے اگر اسے محبت دی تھی تو لایع بھی دی تھی۔

خوشیاں نہیں دی تھیں مگر برکت فراوانی سے دی تھی اس لیے اس نے کبھی اپنے آپ کو اتنا پست، کمزور اور شکستہ محسوس نہیں کیا تھا جتنا وہ اب کر رہی تھی۔

اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے رختہ رختہ اس کے ہاتھوں سے جان نکلی جا رہی تھی۔ شائل سے اسے بہت محبت تھی۔ وہ تخیل میں خود اسے بیا بنے کے

خواب دیکھتی۔ ساری ریسیں پھڑکی کرتی۔ اس کے چاؤ اور نخرے اٹھاتی۔ اس نے خود کس طرح ملک منصور سے شادی کی تھی اور اس سے پہلے اس کے

کتے فیکر تھے، کتے ایکٹل تھے پھر بھی ملک منصور نے اسے قبول کیا تھا۔ وہ اپنا ماضی بھولنے کی کوشش کرتی مگر ماضی سے فرار ممکن نہیں۔ حال ماضی

کی طرف دیکھتا ہے اور مستقبل حال سے سوال کرتا ہے اور ہر زمانہ مشکوک وجود کو مٹانے کے درپے ہوتا ہے۔ یہی وقت کا فلسفہ ہے یا گھبراہٹ۔ اس

نے آہ بھر کر سوچا۔

اگلے دن صبح وہ اسے لے کر لاہور کے لیے روانہ ہوئی۔ سارا راستہ نہ جانے وہ کیا بڑبڑاتی رہی۔ کمزری سے باہر دیکھتی رہی، خود سے باتیں

کرتی رہی۔ کبھی کبھی اور بھی آواز میں آئی ایم وی بیسٹ کا گھر لگاتی۔

”مئی! آوازیں سن رہی ہیں؟“ اس نے یک دم ماں سے کہا۔

”کہاں..... کیسی آوازیں.....؟“

”اسکول کی بیل بج رہی ہے۔ یہ سنیں..... ابھی.....“ وہ بخور سنتے ہوئے بولی۔ شزانے اس کی طرف بے بسی سے دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔

”مم! آپ کو بتا ہے میرے پاس فیریز آتی ہیں اور کبھی کبھی گاؤ بھی، ایک مگسٹ بھی۔ میں آپ سے ملواؤں گی۔“

”پلیز چپ کر جاؤ اور تھوڑی دیر کے لیے سو جاؤ۔“

”نہیں، مجھے سونا پسند نہیں۔ جو سوتے ہیں وہ مر جاتے ہیں اور میں ابھی سونا نہیں چاہتی۔ آئی ایم وی بیسٹ..... لا..... لا..... لا..... لا.....“ وہ

گانے کی ٹون میں بولی اور ہاتھوں سے..... اشارے کرنے لگی۔ شزانے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس قدر حسین تھی کہ پہلی نظر میں کسی شہزادی کا گمان ہوتا۔ خوبصورت سفید رنگ، بخودی چہرہ، نکلی سرسئی آنکھیں، اوپر کو مڑی ہوئی ٹھنسی ٹانگیں، چھوٹی سی ناک اور خوبصورت تراشیدہ ہونٹ، دو بلی پتلی، لمبی سی، خوبصورت جواں سال لڑکی کہاں کھڑی تھی۔ شاید زندگی کے کسی خطرناک موڑ پر۔ آگے کھائی تھی یا کھڑوہ نہیں جانتی تھی۔ شزا..... سارا راستہ آنسو بہتی رہی اور اسے دیکھتی رہی۔ کبھی وہ تارل ہو جاتی۔ تارل اعجاز میں..... تیزی سے باتیں کرتی، پھر رک جاتی، پھر شروع ہو جاتی۔

وہ گھر پہنچی تو ملک منصور بیٹہ دم میں گاؤں میں لمبوس کسی سے فون پر باتیں کر رہا تھا گاڑی کی آواز سنتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ شائل کو دیکھ کر چٹکا پھرا پے آپ کو تارل کیا۔

”شائل! مائی کیوٹ چائلڈ! باؤ آ رہو ڈارلنگ؟“ وہ اسے پیار سے ساتھ لگاتے ہوئے بولا۔

”کائن..... آئی ایم وی بیسٹ..... ایسٹ اینڈ ویسٹ.....“ ملک منصور نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں، مازن موسائی کے لپھٹو۔“ شزاروٹے ہوئے بولی اور ملک منصور خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”کب سے؟“

”پچھلے کئی ماہ سے۔“ وہ ہونٹ چبانے لگا اور پھر فون ملایا۔ ”ڈاکٹر سے دہم لیا۔“

”کبھی کبھی نادانستہ کبھی ہوئی بات قدرت کیسے قبول کرتی ہے۔ کاش آپ کبھی ایسی بات زبان سے نہ نکالتے۔“ شزا کے ذہن میں ملک

منصور کے کہے ہوئے جملے گونجنے لگے اور وہ ہنسی روٹی رہی۔ شائل کو اس نے اس کے کمرے میں چھوڑا اسے بستر پر لٹایا اور خود باہر آ گئی۔

”ڈاکٹر سے اس کا سیشن ہے۔ کل صبح دس بجے۔“ ملک منصور نے فون رکھتے ہوئے کہا۔ شزا خاموش رہی۔

”اس میں پریشانی کی کیا بات ہے، وہ ٹھیک ہو جائے گی۔“ ملک منصور مضبوط لہجے میں بولا۔

”نہیں، مجھے اب ایسا نہیں لگتا۔ وہ شاید..... لب.....“ وہ آدھ بھر کر بولی۔

”کم آن شزا! وہ اس کے گرد بازو جامل کرتے ہوئے بولا۔

”میں اور وہ اتنے مضبوط اصحاب کے مالک نہیں جتنے آپ ہیں۔“

”ڈارلنگ! تو ہونا چاہیے۔ زندگی میں مضبوط ہونا پڑتا ہے۔“

”بولڈ، مضبوط، چالاک اور..... اور.....“ شزانے آنکھیں حیرت سے پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

”اور فرہی.....!“ وہ ہنسنے لگا۔

”ہاں مگر ہر ایک کے لیے یہ ممکن نہیں۔“ وہ اپنا آپ اس سے جھڑپتے ہوئے بولی۔

”اوکے ڈارلنگ! جسٹ ریٹیکس! میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔ ایک پارٹی ڈنر ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولا اور وہ خاموشی سے اسے دیکھتی

رہی۔ وہ اپنا قیمتی ڈریس پہنے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا پرلیم لگا رہا تھا۔ نیوی بلیو پیئٹ کوٹ میں گرے بالوں کے ساتھ وہ کس قدر وجہ لگ رہا

تھا۔ اس عمر میں بھی اس قدر رشک اور جھڑم مگر اس کا اندر کتنا مختلف تھا۔ وہ ایک بے حس انسان تھا۔ شزا سوچ رہی تھی اس کی بیٹی کی حالت اتنی

خراب تھی اور وہ ایک پارٹی ڈنر اٹینڈ کرنے جا رہا تھا اور ایسے ڈنر میں کیا کچھ ہوتا تھا وہ ابھی طرح جانتی تھی۔

”منصور! آفاق نے سدخ سے شادی کر لی ہے۔“ وہ اس کی طرف بخور دیکھتے ہوئے بولی۔

”اچھا۔۔۔ کب؟“

”کیا واقعی آپ کو علم نہیں یا پھر.....“

”دہ نظر آئے تو پتا چلے گا اور میں تو ابھی اپنی پوزیشن کے بارے میں ہی بہت الجھا ہوا ہوں۔ ایسے الجھے معاملات آسانی سے تو نہیں سلجھتے

گا اور سدخ کیسی بے وقوف ہے۔ اس لڑکے ساتھ شادی کر لی ہے۔ چلو دونوں بے وقوف مل گئے ہیں۔“ وہ قہقہہ لگا کر بولا۔

”مگر تو آپ کی سیکرٹری تھی۔“

”تھی، اب تو نہیں نا۔“

”اور اب.....“ ملک منصور نے معنی خیز مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا اور ہاں نکل گیا۔

ملک منصور اتنا باری زندگی کا حاصل کیا ہے۔ تم کتنے گندے اور گھناؤنے کام کرتے ہو۔ کیا تم واقعی انسان ہو۔ اگر ہو تو کیسے؟ تم تو انسان

کے روپ میں وحشی دہمے سے بھی بڑھ کر ہو۔ دو ٹیٹھی سو جتنی رہی۔ کبھی شامک کے ہارے میں اور کبھی ملک منصور کے ہارے میں۔ نہ جانے وہ کس

مٹی سے بنا تھا۔



آصف، حیدر کے سامنے بیٹھا تھا پریشان سا، متھمل سا۔

”اب کیا چاہتے ہو؟“ حیدر نے اس سے پوچھا۔

”میں جلد از جلد یہ ملک چھوڑ کر جانا چاہتا ہوں ورنہ ملک منصور اور اس کے آدمی مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

”اس کے علاوہ اور کوئی آپشن؟“

”نہیں، اب اس ملک میں میرا کوئی مستقبل نہیں۔ ہر کوئی دلوں ہاتھوں سے ایک دوسرے کو نوچ رہا ہے۔ مجھ جیسے ایماندار شخص کا لب یہاں بالکل گزاردہ نہیں۔ سر! آپ ہی بتائیے کیا ہم جیسے لوگ یہاں رہ سکتے ہیں جہاں عدالتیں، انصاف، پولیس، قحانے، پکھریاں، اخبارات ہر بر جگہ پر ان لوگوں کا قبضہ ہے۔ یہاں ایسی کوئی عدالت نہیں جہاں مجھ جیسے لوگ اپنا مقدمہ لے کر جائیں۔ کوئی پولیس تھانہ نہیں جہاں ان کے خلاف ایف آئی آر کٹائی جائے۔ سبیل مارا گیا اور اسے اس شخص نے جیل میں مارا۔ کیا ہوا وہ اس کی تہفین میں گیا، اس کے قتل کرائے، اخبارات میں خبر شائع ہوئی اور بس! امرنے والا وقار داری میں مارا گیا اور منوں مٹی تے دب گیا۔ جس نے گناہ کیا وہ دندنا تا بھر رہا ہے۔ اس کے ہاتھ اور گریبان تو صاف ہیں، گناہگار تو ہم لوگ ہیں۔ میں زندگی بچانے کے لیے مارا مارا بھر رہا ہوں۔ شکر ہے آپ مل گئے ورنہ۔۔۔“

”سبیل کو تمہاری بہت فکرتھی۔ اس نے ہی تمہاری مدد کو کہا۔ ٹھیک ہے میں تمہارے جانے کا بندوبست کرو دیتا ہوں۔ تم جلد چلے جاؤ گے۔“

”جھٹک پھر اب میں کہاں جاؤں؟“

”تم اپنے گھر چلے جاؤ۔ کچھ دن رہو پھر شاید موقع نہ ملے۔ میں جلد از جلد تمہارے کاغذات تکمیل کروانے کی کوشش کرتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے لیکن وہاں..... خیر چھوڑیے۔“



”جسٹس ڈراما تو پھر چھوڑ آتا ہے۔“

”اور اگر ملک منصور کو بھٹک پڑے گی تو؟“

”میں گاؤں کے زمیندار کو فون کر دوں گا۔ وہ تمہارا خاص خیال رکھے گا۔ گھبرانے کی بات نہیں اور یہ بھی ملک منصور کو یہی معلوم ہے کہ

تم جھٹک میں ہو۔ ہم بھی یہی ظاہر کریں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ مطمئن ہو کر چلا گیا۔

ولیم نے نور کو فون کر کے بلایا تھا۔ ماما کا کیو تھراپی کا دوسرا کورس ہونا تھا اور وہ حیدر انگل کے ساتھ ہاسپٹل جا رہا تھا۔ نور نے بھی وہیں آنے

کو کہا۔ ولیم اور حیدر باہر بیٹھے تھے جب نور پہنچی۔

”ہیلو انگل!“

”ہیلو بیٹا!“ اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ تینوں خاموش ہو گئے اور پھر حیدر تھوڑی دیر کے بعد چلا گیا۔

”ولیم بیٹا! مجھے ضروری کام ہے اس لیے جا رہا ہوں۔ جب فارغ ہو جاؤ تو مجھے فون کر دینا۔“ حیدر نے باہر نکلے ہوئے کہا۔ اس کے جانے

کے بعد دونوں خاموش نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ دونوں کے ذہنوں میں اُن گت سوال تھے مگر کوئی بھی پوچھنے میں ہکیل نہیں کر رہا تھا۔

”تمہارے ایگزیزٹو کب ہو رہے ہیں؟“ ہلا غرور نے سکوت توڑا۔

”جون میں۔“

”تجاری کیسی ہے؟“

”بہن ٹھیک ہے۔۔۔ کوئی خاص نہیں۔۔۔ ان حالات میں تجارتی کرنے کے لیے وقت ہی کہاں ملتا ہے؟“

”ولیم۔۔۔ تمہارا گھر کیا ہے؟“

”بہت اچھا ہے۔“

”حیدر انکل کی فیملی بھی ادھر ہی رہتی ہے؟“

”نہیں، انکل ڈینٹس میں رہتے ہیں۔ یہاں صوفیوں نے ہمارے لیے۔۔۔ آئی مین ہمارے لیے خریدا ہے۔“ ولیم کے لہجے میں بدگمانی سی تھی۔
”اچھا۔۔۔“ نور نے حیرت سے کہا اور پھر خاموش ہو گئی۔

مقامی داروغہ جو چکی جس نگران کی طبیعت بے حد خراب تھی۔ انیس بار بار انکلیاں آ رہی تھیں۔ بظاہر بھی محسوس ہو رہا تھا۔ رنگت ایک دم جلی جلی محسوس ہونے لگی۔ پورس سبکی بتا رہی تھی کہ وہ اب کافی رنکڑ کر رہی ہیں مگر موجودہ حالات سے تو یہی محسوس ہو رہا تھا کہ شاید بیان کا آخری لمحہ ہے۔
حیدر خود ہی انھیں لینے آ گئے۔ نور بھی ان کے ساتھ گھر چلی آئی۔ گھر میں قدم رکھتے ہی شہلا نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر ولیم کی طرف۔ ان کی حالت دیکھ کر نور ادھر ہی رک گئی۔ حیدر بھی کمرے میں ہی تھے۔ شہلا کی حالت دیکھ کر ان کے چہرے پر کرب کے آثار بہت نمایاں تھے۔ وہ بہت خاموش دکھائیں۔ شہلا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ نور نے اس کی طرف دیکھا پھر کسی بات کو محسوس کر کے خاموش رہی۔
”انکل۔۔۔ میں آپ کے لیے چائے لاؤں۔۔۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”ہاں۔۔۔ وہ خانہ ماں بچن میں ہی ہے اس کو کہہ دو۔۔۔۔۔“ وہ لے آتا ہے۔“ حیدر نے آہستہ سے کہا اور وہاں ہر نکل گئی۔

”حیدر۔۔۔ حیدر۔۔۔ شہلا آنکھیں بند کیے آہستہ سے پکارتی رہی۔

”ہاں۔۔۔ کہو، کیا بات ہے؟“ وہ کرسی سے اٹھ کر اس کے اوپر قدم رکھتے ہوئے بولے۔ ولیم صوفی پر بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

”حیدر۔۔۔ کیا۔۔۔ خدا مجھے معاف کرے گا۔۔۔ میں نے بہت گناہ کیے ہیں۔۔۔ دعا کرو، وہ مجھے معاف کر دے۔“ نہ جانے وہ کیوں ایسا

مسلسل بول رہی تھی۔ شاید وہ شدید تکلیف میں تھی، اسی وجہ سے باپ پھر موت سے نظر آ رہی تھی؟

”ہاں، شہلا۔۔۔ خدا کیوں معاف نہیں کرے گا۔۔۔۔۔ وہ رخن جو ہے۔“ حیدر کے منہ سے شہلا سن کر ولیم ایک دم چٹکا۔ وہ تو ساری زندگی

سز پزیر ہی رہا تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی تو وہ مری چلا گیا تھا اور ماما کے بارے میں وہ کبھی شکوک نہیں ہوا تھا اس لیے کیا جانے کی کوشش کرتا۔

”کیوں نہیں کرے گا۔۔۔ تم کیوں ایسا سوچ رہی ہو؟“

”میں اس قافلے میں نہیں۔۔۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”ایسا مت سوچو۔۔۔ میں تمہارے لیے دعا کروں گا۔۔۔ تم سونے کی کوشش کرو۔“

”ولیم کہاں ہے؟“

"یہاں ہے۔۔۔۔۔ جینا دھراؤ....." حیدر نے ولیم کو کہا۔ ولیم اٹھ کر ماما کے پاس گیا اور اس کے کان پر ہونے سخت باتوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔

"مما! آپ لڑک ہو جائیں گی۔ میں نے گاڈ سے دعا کی ہے۔"

”ولیم..... تم..... تم کربچن نہیں ہو، خدا کے لیے چھوڑ دو یہ سب، سنا تم نے.....؟“ وہ ایک دم خود ہی چھٹ پڑی۔ حیدر اور ولیم چمک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ حیدر کو خود بھی قطعی توقع نہیں تھی کہ وہ یوں اچانک خود ہی سب کچھ بول دے گی اور ولیم کو جو خشک تھا اب سب کچھ سامنے آنے والا تھا۔

”نہیں، ماما... آپ سبھرو میں نہیں ہیں۔“ ولیم نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”میں سب سے پہلے ہوں۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ شاید یہ میرا آخری لمحہ ہے۔ نہ تم کو چھن ہوا اور نہ میں۔ میں تو مسلم۔۔۔۔۔ ہوں اور تم۔۔۔۔۔ میں نے تو تمہیں کچھ بھی نہیں دیا۔ تم تو خود ہی کچھ مین گئے۔۔۔۔۔ اور میں دیکھتی رہ گئی۔ نہ جانے میں ہر دفعہ کبھی ہی کیوں رہ جاتی ہوں۔۔۔۔۔؟“ وہ آہستہ آہستہ بول رہی تھی اور آہستہ بہ آہستہ بہہ کر آنکھوں میں جذب ہو رہے تھے۔ نور بھی آ کر ان کے پاس کھڑی تھی۔ اس نے بھی ساری بات سن لی تھی۔ ولیم کو شدید دھچکا لگا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، زندگی کا وہ پرگلی تھی اور اسے علم ہی نہ تھا۔ ماما کے اس انکشاف پر اسے ماما پر غصہ آنے لگا وہ غصے میں اٹھ کر باہر چلا گیا۔

”شہلا۔۔۔۔۔ تم نے کیا کیا۔۔۔۔۔؟“ حیدر نے اس کے جانے کے بعد کہا۔

”حیدر.....! اگر میں یہ نہ کہتی تو میرا خدا شاید مجھے کسی مخالف نہ کرتا۔ میں مرنے سے پہلے ایک دفعہ اسے ضرور بتانا چاہتی تھی۔“

”گمراہی بڑی بات اور اتنی اچانک۔“ حیدر حیرانی سے بولے۔

”اگرچہ ایک موت آجائے تو..... پھر بھی اسے فیس تو کرتا ہی تھا۔“

”اجہا تم آرام کرو..... اور ان پر کوئی بوجھ نہ ہو۔“

”ہاں..... اب میں ٹھیک ہوں..... یہ بات مغز کی طرح میرے سینے میں پھست تھی اور میں اس مغز کو کھانا چاہتی تھی۔ اب میں ٹھیک ہوں۔“ نور خاموشی سے باہر نکل آئی۔ وہ مزید اچھٹکی تھی۔ دلہنہس جھکائے لاؤنج میں صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں غم و غصے سے سرخ ہو رہی تھیں۔

”کیا ہوا..... اس قدر پریشان کیوں ہو رہے ہو؟“ نور نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

”کیا یہ کوئی چھوٹی بات ہے..... ممانے یہ سب کیا، کیا..... اتنا بڑا ظلم..... اور اب جبکہ میں بیڑی پر قدم رکھنے والا ہوں، انھوں نے میرے قدموں سے زمین کھینچنے کی کوشش کی ہے..... اس اے گریت ٹریڈی..... ماما بہت.....“ وہ ہونٹ چبانے لگا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”ولیم جی! یہ سب ناانستہ ہے۔ شہلا نے مجھے سب باتیں بتائی تھیں۔ تمہاری ماں ہمارے معاشرے کا ایسا کیریکٹر ہے جو ساری زندگی گنج وقت اور موقع کی تلاش میں رہتا ہے اور ایسے لوگ کچھ کہنا چاہتے ہیں تو کبھی انھیں قطعہ نہیں ملنے تو کبھی موقع مناسب نہیں ملتا۔ کوئی قدم اٹھانا چاہتے

ہیں تو مصلحتوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور اسی کشش میں غلط فیصلے کر لیتے ہیں۔ بنا سوچے سمجھے کہ ان کے فیصلوں سے دوسروں کا کیا کیا کچھ داؤد پر لگ جاتا ہے۔ کتنا بڑا نقصان ہو جاتا ہے۔ معلوم نہیں قسمت یا قدرت بھی کیوں ایسے لوگوں کا ساتھ نہیں دیتی۔ نہ جانے ان کے اٹھتے قدم اٹھنے ہی کیوں پڑتے ہیں؟“ حیدر کے لہجے میں ہلاکی شکستہ تھی وہ ولیم کا کندھا تھپتھا کر بولے۔

”انگل!..... تو میں کہاں ہوں..... میں کون ہوں..... اور کہاں مکڑا ہوں؟“ وہ بھی غصے سے پھٹ پڑا۔

”تم اس وقت ایسی جگہ پر مکڑے ہو جہاں ایک طرف اونچی چوٹی ہے اور دوسری طرف گہری کھائی ہے۔ اب فیصلہ تم نے ہی کرنا ہے۔“

حیدر نے پیار سے اسے سمجھایا۔

”انگل..... ہر دفعہ مجھے ہی کیوں فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ قدرت کیوں مجھے اس طرح آزماری ہے..... اور ہر فیصلے میں مجھے کس قدر روٹی

الجنوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کاش! آپ اعزازہ کر سکیں لیکن اب میں جو ہوں..... وہی رہوں گا۔“ وہ بڑا اعتماد لہجے میں بولا۔ حیدر خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ لوزی آنکھوں میں بے پناہ حیرت تھی۔

”نہ جانے..... ماما جی میں کیا کیا کرتی رہی ہیں اور اب.....“ ولیم ایک دم سچ ہو کر بولا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“ حیدر ایک دم دہاڑے۔

”نہ آپ میری سمجھ میں آ رہے ہیں اور نہ ماما..... آپ دونوں میں کیا تعلق ہے اور پھر میں کون ہوں..... میرا آپ کون تھا.....؟“

”ولیم..... ایہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ لوزی نے حیرت سے کہا۔

”لوزی ماما نے مجھے دھوکا دیا ہے..... اور اب پھر.....“

”خاموش ہو جاؤ..... اور ان حالات میں آنکھیں بند کر کے سو جاؤ۔“ حیدر اسے قدرے ڈانٹتے ہوئے بولے۔

”کاش..... یہ آنکھیں ہیٹ بند رہتیں..... مگر..... میں نہیں جانتا ماما نے ایسا کیوں کیا۔ میں ان سے نفرت کرنے لگا ہوں۔“

”واٹ ٹان سنس..... تم لوگ والدین کے ہارے میں ایک دم رات کیوں بدل لیتے ہو؟“ حیدر نے پھر غصے سے کہا۔

”جب ان کا پاسٹ اس طرح کا ہوگا تو ایسا ری ایکشن بھی نیچرل ہے۔“

”وہ تمہاری ماما ہیں.....“ لوزی بھی ڈانٹتے ہوئے بولی۔

”لوزی..... اتم بھی مجھے ہی الزام دے رہی ہو؟“

”نہیں..... اپنے آپ کو ناول رکھو..... اور پھر بات کرو۔ تم غصے میں سب کچھ بھول رہے ہو۔“ لوزی نے لہجہ دہمیا کرتے ہوئے کہا۔

”والدین تو اولاد کے لیے سب کچھ داؤد پر لگا دیتے ہیں اور ماما نے مجھے داؤد پر لگایا..... ہر دفعہ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے؟“ وہ

رندھے ہوئے لہجے میں بولا۔

”تم غلط سوچ رہے ہو..... تمہاری ماں نے اپنا سب کچھ داؤد پر لگا کر تمہیں جنم دیا۔ تمہاری خاطر اس نے کیا کیا دکھ سہے ہیں۔ کس طرح کی

زندگی گزاری ہے..... کاش کبھی تمہیں اس کا اعزازہ ہو سکے۔“ حیدر نے کہا۔

”کاش وہ مجھے غم دینے کے بجائے، پہلے ہی غم کر دیتیں تو ان کا مجھ پر کتنا بڑا احسان ہوتا۔۔۔۔۔“

”ولیم۔۔۔۔۔ بڑا ایسا آپ کے لیے ایک آزمائش ہے اس کا بہادری سے مقابلہ کرو یہ سکون ہو کر سوچو۔۔۔۔۔ اور انہی ذہن پر اتنا بوجھ مت ڈالو۔ میں انہی چلتا ہوں۔۔۔۔۔ اور ماما کا خیال رکھنا۔“ وہ اسے پیار سے سمجھاتے ہوئے باہر نکل گئے۔

نور حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی اور صورت حال کا جائزہ لیتی رہی۔ ولیم صوفے پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ جیسے شدید ذہنی کرب میں مبتلا ہو۔

”آخر قصیں کیا بات اتنی پریشان کر رہی ہے۔۔۔۔۔؟“ نور نے پوچھا۔

”اتنی بڑی بات کہ ماما اس کیونٹی سے تعلق رکھتی ہیں جس کے لیے میرے دل میں قلعی اچھے جذبات نہیں اور یہ کہ میرا کسی بھی کیونٹی سے کوئی تعلق نہیں نہ میرا تعلق ایسٹ سے ہے نہ ویسٹ سے۔ کتنا بڑا اور سنگین مذاق ہے۔۔۔۔۔ یہ سب میرے ساتھ کیوں ہو رہا ہے؟“

”تمہارے دل میں ہمارے خلاف نفرت کیوں ہے۔۔۔۔۔؟“ نور نے چونک کر پوچھا۔

”میں نہیں جانتا۔۔۔۔۔ قادر سنیں گے تو کیا کہیں گے۔۔۔۔۔ اور ماما۔۔۔۔۔ ماما ساری زندگی میرے سامنے جھوٹ بولتی رہیں۔ مزہ پزیر کے نام سے سب کو دھوکا دیتی رہیں۔ نہ جانے انہوں نے مجھ سے اور کیا کچھ چھپایا ہے۔ میں ان پر کیسے اعتماد کر سکتا ہوں۔۔۔۔۔؟“ وہ کھٹی سے بولا۔

”ولیم! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی جلدی بے قابو ہو جاؤ گے۔ میں تو ہر لمحہ تمہاری اس عادت کو ہڈی کی کوشش کرتی رہی مگر لگتا ہے میں بری طرح ناکام ہوئی ہوں۔“ وہ مایوسی سے بولی۔

”تو پھر تم ہی تباہ۔۔۔۔۔ اگر تم میری جگہ ہو نہیں تو کیا کرتی۔۔۔۔۔؟“

”میں صرف خاموش ہو جاتی۔۔۔۔۔ سوچتی اور پھر وقت کو فیصلہ کرنے دیتی۔“

”تو کیا تم کوئی احتجاج نہ کر رہیں۔۔۔۔۔؟“

”ضرور کرتی۔۔۔۔۔ مگر اس طرح نہیں تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ کبھی کبھی حالات ہم سے انوکھے پھیلے کرواتے ہیں اور اس وقت ہم کتنے بے بس اور مجبور ہوتے ہیں۔ فیصلہ کچھ کرنا ہوتا ہے اور کرتے کچھ اور ہیں۔ تم ہی تباہ کیا ایسا نہیں ہوتا۔۔۔۔۔؟“ تب ولیم خاموش رہا۔

ماما ساری رات شدید کرب میں بستر پر تڑپتی رہی تھیں۔ وہ ہر کروٹ پر کراہ رہی تھیں۔ بار بار انہیں ابکا نیاں بھی آ رہی تھیں۔ ہر دفعہ کیمو تھراپی کے بعد انہیں شدید تکلیف کا سامنا ہوتا تھا۔ ولیم سامنے بیٹھا تھا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ نور جا چکی تھی اور وہ مسلسل ماں کے چہرے پر نظریں جمائے گہری سوچ میں ڈوبا تھا۔ ماں کے کراہنے کی آواز بھی اسے ان کی طرف حوجہ نہیں کر رہی تھی۔

”ولیم۔۔۔۔۔ ولیم۔۔۔۔۔؟“ وہ آہستہ آہستہ بلارہی تھیں مگر وہ کچھ بھی نہیں سن رہا تھا۔

”میں کہاں کھڑا ہوں۔۔۔۔۔ میرے آگے پیچھے کیا ہے۔۔۔۔۔ اور مجھے کہاں جانا ہے۔۔۔۔۔؟“ یہ سوالات اسے بار بار تنگ کر رہے تھے اور وہ ان کے جوابات ڈھونڈنے میں لگا تھا۔

”ولیم۔۔۔۔۔ ولیم۔۔۔۔۔“ انہوں نے سائیلنٹ فیل پر رکھے پانی کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ گلاس ہاتھ نہ آیا اور نیچے گر گیا۔ ولیم نے چونک

”کب سے لوہاری تھی مگر تم۔۔۔“

”اچھا..... میں لاتا ہوں.....“ دوپکن سے گلاس لیے چلا گیا انھیں سہارا دے کر اٹھایا اور گلاس کیوں سے لگایا۔ ماما کا وجود بیمار سے چپ رہا تھا۔ وہ بالکل بڈیوں کا تجربہ ہو گئی تھیں۔ نہ جانے کیسی میڈیسنز اور کیسا علاج تھا جو بڈیوں سے نکلے گوشت کو ابھی جلانے کے درپے تھا۔

مہربانی پی کر لیٹ گئیں۔ دلیم کا دل ایک لمحے کو مہما کی اس حالت پر کڑھنے لگا۔ اس نے انھیں لٹا دیا اور پھر مزید جھڑپ کر چڑھ گیا۔

”اودھ گا؟..... یہ میری کیسی آزمائش ہے..... میں کیوں اسکا اذیت سہہ رہا ہوں..... آخر کس لیے..... میرے ہم عمر لڑکے لڑکیاں کیسے ہر پریشانی اور غم سے آزاد ہیں اور میں اس قدر..... بے بس..... اور اتنی سخت آزمائش میں..... آخر میرے ساتھ ہی یہ سب کیوں ہوتا ہے.....؟“ وہ مسلسل سوچ رہا تھا۔ جب حیدر کا فون آ گیا۔ اس گھر میں آنے کے بعد اس نے دلیم کو ایک علیحدہ دھوپاگل لے کر دیا تھا۔

”ولیم بیٹا..... ماما کیسی ہیں؟“ حیدر نے پوچھا۔

”بہت تکلیف میں ہیں۔“

”اور تم کہاں ہو؟“

”ان کے پاس..... ان کے کمرے میں.....“

”اچھا..... یہ..... میڈیسن میں ڈراما سیر کے ساتھ بھجوا رہا ہوں۔ اس وقت جلدی میں پاؤں میں رہا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا، تکلیف زیادہ ہو تو یہ

”کھلا وکتا۔۔۔۔۔“

"ٹھیک ہے انکل.....!"

"اور تم ٹھیک ہو جاؤ۔۔۔۔۔؟"

“...”

"او کے ہائے۔۔۔۔۔" حیدر نے فون بند کر دیا۔

”یہ شخص بھی ایک معما ہے۔ نہ جانے فرشتہ ہے یا پھر.....؟ لیکن ماما کے خاندان سے صرف یہی ایک کیوں ماما کی طور کر رہا ہے؟“ ایک اور سوال اسے پریشان کرنے لگا۔ ماما نے آج تک اسے کسی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ نہ اس کے اپنے باپ کے بارے میں اور نہ ہی حیدر انکس کے بارے میں۔ اور انہیں ریٹ پر دو انہیں کا اتفاق دے کر چاچا تھا۔ اس نے ان کی ہدایت کے مطابق ماما کو دوائیں کھلا دی تھیں اور پھر آہستہ آہستہ ان کی تکلیف کم ہونے لگی..... اور وہ نیند کی آغوش میں چلی گئیں۔

ڈنر پارٹی ہائیڈے ان کے ٹیکوٹ ہال میں تھی۔ خوب انتظامات تھے۔ شہر کی کریم جمع تھی۔ تمام سیاستدان اپنی بیویوں کے ہمراہ آرہے تھے۔ ملک منصور نے اس پارٹی کا خصوصی طور پر اہتمام کیا تھا۔ فرار کے بعد آف دی اسکرین ہونے کے بعد جو طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں ایسے میں اس طرح کی پارٹی کا منعقد کرنا بہت ضروری تھا۔ ہر طبقہ نگر سے لوگ جمع تھے۔ سیاستدان، صحافی، پیرو کرٹس، بنگو کرٹس، ماڈلز اور ادیب دو انشور بھی۔ اتنی گرینڈ پارٹی تھی اور ملک منصور نے شہزاد کو اس کی بھگ بھی نہیں پڑنے دی تھی۔ اس دفعہ ملک منصور تو جیسے ہر ایک کو چوکا دیتے پر مصر تھا۔ اس کے پہلو میں ایک ایرانی نژاد خوش صورت جو اس سال صحافی آئیکھت تھی۔

آئیکھت کا حسن و جمال دیکھ کر ہر کوئی ملک منصور کو حسدور شک کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ آئیکھت کو پاکستان آئے ہوئے ابھی صرف چند روز ہی ہوئے تھے۔ اس سے پہلے دو بی بی سی کے نمائندہ کی حیثیت سے ایران اور مصر میں کام کرتی رہی تھی۔ اب وہ پاکستان چند روز کے لیے آئی تھی۔ علاقہ غیر میں اس علاقے کی غیر جانبداری اور ان کی رسوم و رواج کے بارے میں رپورٹ لینے وہاں گئی تو وہاں اس کی ملاقات ملک منصور سے ہوئی چونکہ وہاں ہر اس کو زبان کا مسئلہ تھا اس لیے ملک منصور اس کا ایک مضبوط مددگار ثابت ہوا اور تب سے آئیکھت کے ساتھ اس کے تعلقات بڑھنے لگے۔ وہ بے حد ذہین اور موقع شناس تھی۔ آج شہزاد کے بجائے آئیکھت کو دیکھ کر کئی ایک نے تو ملک منصور پر بیٹے بھی کئے جنہیں آئیکھت تو نہ سمجھ سکی مگر ملک منصور خوب انجوائے کرتا رہا اور حاصل اس پارٹی سے وہ دو فوائد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ایک تو آئیکھت کا انٹروڈکشن اور اس کی ایکسیس اور دوسرے پارٹی کے لوگوں کے درمیان تھوڑی بہت رنجشوں کو دور کرنا۔

مسز زہیر بھی خصوصی طور پر مدعو تھیں اپنے پیرو کرٹس سمیٹ کے ساتھ اور ملک منصور، مسز زہیر کے کلب میں ہو لڈ اور اس کی زبان کی گل افشانیوں سے انہی طرح واقف تھا۔ کسی کے بارے میں اچھے کمٹس لینے کے لیے مسز زہیر کو پہلے مدعو کرنا اور خصوصی پروڈکول دینا گویا اپنے لیے خصوصی روم ہمارا کرنے کے برابر تھا۔ اگر مسز زہیر کسی کی غور میں جاتی تو بال اس کے کورٹ میں ہوتی اور پھر باقی ٹیم جیتنا مشکل نہ ہوتا۔

”آئیے مسز زہیر! یو آر لٹلک سویک، اسارٹ ایڈ سوٹ!“ ملک منصور اس کی ج وچ دیکھ کر کچھ چالیسی اسٹائل میں خصوصی طور پر خوشدلی سے بولا۔ ملک منصور کے ان کمٹس پر زہیر صاحب بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

”تھینک یو ملک صاحب! آپ کی ایسی پڑ بوائی ہی تو ہمیں آپ کی محفلوں کی طرف کھینچ لاتی ہے۔ حسن اور حسن کی پڑ بوائی کرنا تو کوئی آپ سے سکھے۔ حسن کو چاند بھتا ہر کسی کے بس میں کہاں۔ اس وقت آپ بھی تو یوسف دانی لگ رہے ہیں اور پہلو میں چمکتا چاند، کیا کہنا۔“ مسز زہیر قہقہہ لگا کر بولی تو ملک منصور کا دل دیر قہقہہ فضا میں گونجنے لگا۔ زہیر صاحب کا تو گویا بیگم صاحبہ کی کھٹکوں میں قفل ہونا ان کے خطاب کو خواہ مخواہ دھت دینے کے مترادف تھا اس لیے وہ انہیں دہیں چھوڑ کر اپنے کسی بہم سے غورنگو ہو گئے۔

”یہ چاند کہاں سے چرایا؟“ مسز زہیر نے آئیکھت کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”قدرت ہمیں خود ہی لو لاتی ہے۔ ہمارا تو اس میں کوئی تصور نہیں اور دیسے بھی یہ اسم ہاکنی ہیں یعنی مبارک چاند۔۔۔ جیسا نام دیا حسن اور آپ نے بھی حسن کو صحیح جانچا ہے۔“ ملک منصور اک ادا سے بولا۔

”ماشاء اللہ! کیا قسمت پائی ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک شاہکار۔ شزا بھی کم قیامت تو نہیں۔“ وہ قہقہہ لگا کر بولی۔
 ”ہاں مگر وہ چاند گہنا گیا ہے اور خزاں رسیدہ چیزیں ملک منصور کا دل نہیں لہما سکتیں اس لیے قدرت خود بخود ہی شکر خودے کو شکر دے دیتی ہے۔“ ملک منصور نے پھر قہقہہ لگایا۔

”آپ پر تو مجھے شک آتا ہے۔“ مسز زہیر احمد کے حسد کو چھپا کر بولی۔
 ”جھجک یو! اور ہمیں آپ پر یار۔“ ملک منصور نے ہمرے تالاب میں گویا کنگر پینکا اور بڑے لاڈ سے کہا۔
 ”مگر ہر دفعہ تو آپ کا احباب کچھ اور ہی لگتا ہے۔“ مسز زہیر نے اپنے دل کا پھولا پھونٹے ہوئے عیسویں کیا اور جل کر کہا۔
 ”کیا کریں، قدرت سوجھی نہیں دیتی۔“ وہ ہمارے آپ کو صاف بچا گیا۔ وہ ایسی عورتوں کی چلن بازیوں سے خوب واقف تھا اور ان کی زبان، ان کے لفظوں اور ان کی اناجلی و مفہوم کو انہی کے لب و لہجہ میں ادا کرنے کا فن اسے خوب آتا تھا۔ ماحشرے کے اس طبقے سے بگاڑنے کا دوسوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

”غریب ہے، بھئی، ہمارے انگوڑہ جانے کھٹے ہی نکلتے ہیں۔“ وہ آہ بھر کر بولی۔
 ”بھئی تم ہمیشہ میری گڈ بک میں رہتی ہو۔“ ملک منصور پھر خرمشاہی لہجے میں بولا۔ تم اور ملک منصور کے قابل..... تمہارے بیک گراؤنڈ اور چلن بازیوں سے تو میں اچھی طرح واقف ہوں۔ شکر نہیں کرتی جو زہیر جیسا شوہر مل گیا اور تم ماڈرن سوسائٹی میں داخل ہو گئیں۔ ملک منصور نے اس کے جانے کے بعد سوچا۔ وہ آئینکھ کو ہر ایک سے ملو رہا تھا کہ وہ پاکستان میں خصوصی طور پر یہاں کی سیاست پر ریسرچ کرنے آئی ہے اور اس پروجیکٹ پر کام کرنے سے پہلے اس کے لیے اس طبقے کا ایکسپوز بہت ضروری تھا مگر ہر کوئی اس کہانی کے پیچھے ایک اور کہانی بنتی ہوئی دیکھ رہا تھا۔ نجر کی اذاتوں سے کچھ دیر پہلے پارٹی ختم ہوئی۔ خوب ہلاکلا ہوا۔

میوزک، ڈرنک، قہقہے، چٹکے، سیاست بازی اور خوب بھلچڑیاں چلتی رہیں۔ ملک منصور نے خوب دل کھول کر پیر لگایا تھا۔ سب کو بہت لطف آیا تھا۔ ہر ایک کو جو خصوصی پروٹوکول ملک منصور نے دیا تھا اس نے تو سب کے دلوں سے ملک منصور کے خلاف ساری رنجشیں مٹا دی تھیں۔ سب بہت خوش تھے۔ آئینکھ کا قیام اپنی ہی میں تھا اور وہ ملک منصور کی خصوصی مہمان تھی اس لیے ہوٹل میں بھی اس کے آرام کا خاص خیال رکھا جاتا۔

ملک منصور جس طرح محبت سے اسے لڑے کر رہا تھا اسے سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ علاقہ فیر سے لے کر یہاں تک ملک منصور نے ایک دفعہ بھی اسے کچھ ایسا نہیں کہا تھا جس سے وہ اس شخص کے کردار کے بارے میں غلط اندازہ لگاتی۔ وہ تو ہر جگہ اس کے لیے بہترین گائیڈ اور گارڈ ثابت ہو رہا تھا۔ وہ رات کے آخری پہرے سے خود ہوٹل چھوڑنے گیا اس کے کمرے تک اور بہت مختار اور محبت مہرے انداز میں اسے خدا حافظ کہا۔ وہ اس شخص سے رفتہ رفتہ بہت متاثر ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ باہر کے ملکوں میں گزارا تھا۔ وہ شخصیات کا اندازہ ان کے ذکر و کھاؤ اور گفتگو سے لگاتی تھی مگر اس شخص نے تو ہمیشہ اس سے بہت سلیبھ انداز میں بات کی تھی۔ کسی بھی وقت اس کے دل میں کوئی بدگمانی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ ملک منصور اسے ہوٹل چھوڑنے کے بعد گھر چلا گیا۔ شزا اور شائل دونوں بیڈروم میں سو رہی تھیں۔ وہ شائل کے بیڈروم میں لیٹ گیا۔

صرف اسی کا دروازہ کھلا تھا باقی سب دروازے رات کو بند کر دیے جاتے۔ شہزادہ شکیل کو اسپتال لے کر جانے کے لیے تیار تھی جب ملک منصور کمرے سے باہر نکلا۔

”آپ کب آئے؟“

”رات کو ہی۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔

”کیسی رہی پارٹی؟“

”ہاں، اچھی تھی۔“ اس نے سر دلچھ میں جواب دیا۔

”کس سلسلے میں تھی؟“

”بھئی پارٹی کی طرف سے تھی جو روٹین میں ہے۔ تم تو جرح کر رہی ہو اور ہاں شکیل کو لے کر جا رہی ہو؟“ اس نے اس کی توجہ ہٹانے کے لیے کہا۔

”ہاں۔“

”ٹھیک ہے جلدی جاؤ۔ ڈاکٹر سے مل گئے کیا ہوا ہے؟“

”آپ نہیں ملیں گے۔“

”نہیں، تم چلی جاؤ، میں بہت تھکا ہوا ہوں اور مجھے کچھ کام بھی کرنا ہے۔“ وہ اسٹاٹ سے بولا۔

”اچھا۔“ اس نے خاموشی سے چائے کا کپ ٹھیل پر رکھتے ہوئے کہا اور شکیل کو لے کر چل دی۔

ڈاکٹر نے تقریباً دو گھنٹے اس کا کیس بنانے میں لگائے۔ اس سے باہمی کیس۔ شہزادے بھی اس کے سارے سوالات کے ٹھیک ٹھیک

جوابات بتا دیے۔

”ڈاکٹر صاحب! آخر اس کو پراسیڈیم کیا ہے؟“ شہزادے پریشانی سے پوچھا۔

”میرے خیال میں انھیں شیزوفرینیا کا مرض لاحق ہے۔“

”شیزوفرینیا؟“ شہزادے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں، یہ ایسی نفسیاتی بیماری ہے جو دماغ پر دباؤ ڈالتی جارہی ہے پاکستان میں بھی اس کے مریضوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو رہا ہے۔“

”لیکن ڈاکٹر صاحب! اسے یہ مرض کیسے لاحق ہو گیا؟“

”شیزوفرینیا میں دراصل شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کی بہت ساری وجوہات ہوتی ہیں مگر شکیل کے کیس میں بھڑنس،

چانگداہڑ، فیملی انٹرایکشن جیسے عوامل زیادہ کارفرما ہیں۔ آپ نے جس طرح کی ہنسی بتائی ہے اس میں تو صاف یہی نظر آ رہا ہے کہ بچی بہت زیادہ

حساس ہے۔ آپ لوگوں نے حتی المقدور اسے اپنے سے دور رکھا۔ اس چیز کو تنہائی کو اس نے بہت زیادہ محسوس کیا۔ اندر ہی اندر وہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار

ہوتی رہی۔ اس کے نتائج میرا مطلب ہے آپ اس کی ملاحتوں سے خود ہی اندازہ کریں کہ حالات کہاں تک بگڑ سکتے ہیں۔“

”ڈاکٹر صاحب! یہ ٹھیک تو ہو جائے گی نا؟“ شزا آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے بولی۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں لیکن آپ کو اپنے رویوں میں تبدیلی پیدا کرنی ہوگی۔ اسے بہت زیادہ محبت اور توجہ کی ضرورت ہے۔ لڑائی جھگڑا تو

اس کے سامنے بالکل نہیں ہونا چاہیے اور ہاں ایسے مریض سے زیادہ بوجھ کچھ نہیں کرنی چاہیے۔ اگر تھوڑا سا بھی اشتعال دلایا جائے تو یہ لوگ زیادہ مشتعل ہو جاتے ہیں پھر خود کو اور دوسروں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور کبھی کبھی خودکشی بھی کر سکتے ہیں۔“ شزا کو ایک دم سب کچھ یاد آنے لگا۔

”کیا کبھی ایسا ہوا؟“ ڈاکٹر نے استغناء مایہ انداز میں پوچھا۔

”ہاں لیکن جب وہ ٹھیک تھی اس نے تین ہاں ایسی کوشش کی۔“

”اہل میں یہ بیماری اچانک نہیں ہوتی اس کا کافی لمبا چڑا ایک گراؤ ہے اور بہت سے ٹیکرز ہوتے ہیں۔ بحث دہانے سے اجتناب کریں۔“

”لیکن یہ تو ٹھنڈوں خاموش تھی رہتی ہے۔“

”ہاں میں اسی کی طرف آ رہا تھا۔ مسز منصور! میں نے یہ ساری ہدایات ایک کاغذ پر لکھ دی ہیں۔ ان پر سختی سے عمل کریں اور بالکل بہت محتاط

رویہ اختیار کریں۔“ ڈاکٹر نے میڈیکل بسکٹ نکلتے ہوئے کہا۔

”تھیک یو ڈاکٹر صاحب!“ وہ دھتکتے ہوئے بدلتی سے بولی۔ ”چلو ٹائل جینا!“ اس نے پیار سے کہا۔ وہ ڈاکٹر کے بی بی آپریشن کے

ساتھ مسلسل کھیل رہی تھی اور اسے کسی قیمت پر بھی چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔

”اٹھو چھوڑو!، ڈاکٹر صاحب ناراض ہوں گے۔“ شزا تھوڑے سخت لہجے میں بولی۔ اس نے آپریشن زور سے زمین پر پھینکا۔

”بیٹا! آپ کو اچھا لگتا ہے تو آپ لے جائیں۔“ ڈاکٹر نے محبت سے کہا تو وہ خوشی سے کھل اٹھی۔

”مسز منصور! ایسا تلخ رویہ تو کسی بھی صورت میں قابل قبول نہیں۔ آپ اپنے لہجے کو بالکل بدل دیں۔ وہ ناراض انسان نہیں۔“

”تو کیا یہ پاگل ہو گئی ہے؟“ شزا نے بے بسی سے پوچھا۔

”جی نہیں، ایسا مت کہیں۔ کسی بھی بیماری کا جب ایک ہوتا ہے تو اس وقت مریض ناراض تو نہیں ہوتا نا۔ آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔“

”ڈاکٹر صاحب! آپ فیس میں آپریشن کے پیسے بھی ڈال لیجیے۔“ وہ نرم لہجے میں بولی۔

”ارے مسز منصور! ایسی کوئی بات نہیں۔ بعض اوقات تو مریض ہمیں بھی گھر لے جانے کے لیے ہند ہوتے ہیں۔ آپ بے فکر رہیے،

ایسی کوئی بات نہیں۔“ ڈاکٹر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

کون اپنے رویے میں تبدیلی لائے گا۔ ملک منصور جس کے نزدیک اولاد قطعی اہم نہیں ہے۔ جو بیٹی کی ایسی حالت دیکھ کر روت بھر پارٹی

میں رہا۔ میں..... میں کس حد تک اسے مطمئن کر پاؤں گی۔ وہ سب کچھ جانتی ہے اور گھر کا ماحول کبھی بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ جس کی بنیادوں میں بے

حسی، آوارگی اور آلودگی شامل ہو چکی ہو کیا وہ لوگ بدلیں گے۔ کوئی بھی نہیں بدلے گا۔ کسی کے لیے بھی تو یہ لڑکی اور اس کی زندگی اہم نہیں۔ ٹائل از

تھنک..... اس نے گاڑی میں مایوسی اور بے بسی سے سوچا۔

یاد دلا رہا تھا کہ زندگی میں کس قدر اہم ہوتے ہیں۔ زندگی اور رہنے اور جب رہنے ہی بے بنیاد ہو جائیں تو زندگی بے معنی ہو جاتی ہے۔ محبت کی چاشنی سے تو زندگی کا مزہ ہے اور جن بچوں نے محبت کا لمس محسوس نہ کیا ہو وہ ایسے نہیں نکھر سکیں گے تو اور کیسے ہوں گے۔ مازن سوسائٹی کے شکوہ و جوجہ جس نہ توجہ ملتی ہے اور نہ محبت، جو ساری زندگی جذلوں کے لیے ہی تڑپتے تڑپتے مر جاتے ہیں۔

ٹریک کے ریڈیو سٹیشن پر ٹریک کا سلا ب دیکھا گیا تھا۔ ایک ہا کر نے زبردستی اخبار کا روٹرو سے اندر پھینکا۔ اس نے وقت گزارنے کے لیے اخبار کو الٹا پلٹا اور جلدی سے پیسے دیے۔ اخبار کے پچھلے صفحے پر ملک منصور اور آنکھ کی مسکراتی تصویریں تھیں۔ اس نے بے خیالی میں ہی تفصیل پڑھنا چاہی مگر پیچھے رکے ٹریک کے ہارن نے اسے چونکا دیا۔ اس نے جلدی سے گاڑی چلا دی اور ایک سائیڈ پر گاڑی پارک کر کے خبر پڑھنے لگی۔ ملک منصور کی طرف سے گریڈ پارٹی ایہ شخص کتنا جھوٹا ہے اور کس قدر مکار بھی۔ آنکھ کی تصویر پر وہ مسلسل نگاہیں مرکوز کیے ہوئے تھی۔ اس کے اندر شدید رقابت اور دکھ کا احساس بیدار ہونے لگا۔ ملک منصور اتم نہیں بدلو گے۔ عورت تمھارے لیے محض کھلونا ہی ہے اور اب اس کی شامت آئے گی۔ اس کی پنے برائی کا مطلب شہزادی کی نفی تھا اور جب کسی کو بھی اپنی ذات کی نفی کا احساس ہو تو وہ ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ اس وقت وہ بھی شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ کسی سے اپنا دکھ کہے مگر کوئی بھی تو پاس نہیں تھا۔ اس نے شکل کی طرف دیکھا۔ وہ ہم عمر و سب سے باہر دیکھ رہی تھی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر بکھری بکھری شخصیتوں کے ساتھ بیٹھی تھیں اور کوئی بڑا سانپ حال نہیں تھا۔



آصف کے کاغذات تیار ہو چکے تھے۔ حیدر نے اسے فون کر کے لایا ہوا آئے کو کہا تھا۔ اس نے اس کا اٹلی جانے کا اعلان کر دیا تھا۔ حیدر کا ڈرائیور اسے لینے گاؤں گیا تھا۔ وہ گھر والوں سے مل کر ابھی گاڑی میں بیٹھنے ہی لگا تھا کہ کہیں سے سنسناتی گولیاں اس کے سینے پر آ کر لگیں۔ اس کا ایک پاؤں گاڑی میں تھا اور ایک باہر، وہ وہیں زمین پر پڑنے لگا۔ ڈرائیور بدحواس ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا اور گاڑی کو ریس دے دی۔ آصف زندہ تھا یا مر گیا تھا اسے کچھ علم نہیں تھا۔ حیدر اس کی بات سن کے بے حد پریشان ہو گیا۔ ڈرائیور اس کے سامنے کھڑا اسے ساری تفصیلات بتا رہا تھا اور وہ سن کر سوچ میں پڑ گیا تھا۔

”تم واپس جاؤ مگر گاڑی میں نہیں اور اپنا حلیہ بھی بدل کر جانا۔ جا کر ساری صورت حال کا جائزہ لو اور یہ موبائل رکھو۔ میں تم سے خود رابطہ کروں گا پھر باقی کی باتیں بعد میں ہوں گی۔“ حیدر نے موبائل اسے پکڑاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے سر!“ اس نے موبائل جیب میں ڈالنے سے پہلے کہا۔

حیدر کو یقین تھا کہ یہ کارستانی ملک منصور کی ہی تھی۔ اس کے علاوہ آصف کی کسی اور کے ساتھ کوئی دشمنی نہ تھی مگر ملک منصور کو اس کی خبر ہونا بہت حیرت کی بات تھی۔ اس نے تو ہر ممکن طریقے سے اسے میخماز میں رکھنے کی کوشش کی تھی اور اب یقیناً وہ حیدر کے بارے میں بھی جان چکا ہوگا۔ اسے آصف پر یوں اچانک حملے کا سن کر سخت دکھ اور حیرانی ہوئی تھی۔ ملک منصور اس قدر سفاک تھا۔ پہلے سہیل کو خود قتل کیا اور اب آصف، شفیق بھی

اس سے محفوظ نہ رہی تھی۔ وہ کیسا انسان تھا۔ درمیں سے بڑھ کر وحشت اور زندگی اس کے اندر تھی۔ دہشت مایوسی کے عالم میں کرے کا چکر لگا رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر اخبار پر پڑی۔ ملک منصور کی آنکھ کے ساتھ ہستی مسکراتی تصویر۔ اس نے اخبار پکڑ کر بخور دیکھا۔

”تم واقعی شہلا کے قاتل نہ تھے۔ تم نے اس کی زندگی تو برباد کی ہی اس کے ساتھ اور بھی بہت سی زندگیاں گوداؤں پر لگا دی اور پھر بھی تم کس قدر مطمئن اور خوش نظر آ رہے ہو۔ ملک منصور! تم کس مٹی کے بنے ہو۔“ وہ اپنے آپ سے سوالات کر رہا تھا اور پھر گھڑی دیکھ کر اس نے سوبائل کا نمبر ملایا۔

”ہاں کیا خبر ہے؟“

”سر، وہ مر چکا ہے۔ لاش پوسٹ مارٹم کے بعد لواحقین کے حوالے کی جائے گی۔ مغرب کے بعد جنازہ ہے۔“ ڈرائیور نے اسے بتایا۔

”اچھا۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”سر، اب میرے لیے کیا حکم ہے؟“

”تم واپس آ جاؤ اور ہاں کوئی مشکوک شخص تو تمہیں وہاں دکھائی نہیں دیا۔“

”نہیں سر، سب گاؤں کے لوگ ہی ہیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے، تم واپس آ جاؤ۔“ حیدر نے کہا۔

اگلے دو تین دن وہ مسلسل اخبارات دیکھتا رہا۔ آصف کے بارے میں ذرا سی خبر بھی اخبار میں نہیں تھی۔ اس کا مطلب صاف ظاہر تھا مگر حقائق کے پس منظر میں کون دیکھتا ہے۔ وہ شفق کو کیسے بتائے گا۔ وہ تو پہلے ہی سہیل کی وجہ سے بہت ڈسٹرب ہے اور اب آصف.....

شفق، سہیل کی ڈیوٹی کے بعد شدید ذہنی اضطراب میں تھی۔ ایک تو گناہ کا شدید احساس اور دوسرے ہزارا کے الفاظ دن رات، اٹھتے بیٹھتے اس کے کانوں میں گونجتے رہتے تھے۔ نہ دن کو چین آتا اور نہ رات کو نیند۔ نہ وہ کسی سے دکھ شہز کر سکتی تھی نہ ہی کوئی کفارہ ادا کر سکتی تھی۔ کیا ساری زندگی یونہی سولی پر لٹتی رہے گی۔ شدید احساس زیاں نے اس کو بہت حد تک ذہنی الیمیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس نے جگ۔ آ کر سحر کا نمبر ملایا۔ بہت جلد جانے کے بعد کسی نے جگ۔ آ کرفون اکٹھا ہٹ میں اٹھایا تھا۔ وہ سوئے سوئے لہجے میں بول رہی تھی۔

”ہیلو سحر! تم کہاں ہو؟“ شفق آہستہ سے بولی۔

”کون؟“

”میں شفق بول رہی ہوں۔“

”کون شفق؟“

”سحر! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“

”میں سحر نہیں، میں تو حقیقتی ہوں۔ درود بھیک مانگنے والی اللہ کے نام پر، ہاں کون، بولو کون ہو تم؟“

”سحر! کیا تم نپٹے میں ہو؟“ وہ اس کی آواز اور لہجے سے اندازہ لگاتے ہوئے بولی۔

”ہاں مگر اب تو کجنت نشہ بھی نہیں ہوتا۔“

”آفاق کہاں ہے؟“

”آفاق..... آفاق..... میرا آفاق تو ماہر نے چھین لیا۔“ وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”اوماہی گاڑا کیا اس نے شادی کر لی؟“

”جہا نہیں، وہ تو مجھ سے روٹھ گیا ہے۔ مگر یہی نہیں آتا اور مجھ سے بات بھی نہیں کرتا۔ فون بھی نہیں کرتا اور اب تو مجھے مارتا بھی نہیں۔ میں اس کے بغیر مر جاؤں گی، ہانگل ہو جاؤں گی۔ وہ جانتا بھی ہے کہ میں اس سے بہت محبت کرتی ہوں اس دنیا میں سب سے زیادہ مجھ پر بھی مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ کیا تمہیں معلوم ہے؟“ اسے تو جیسے موقع ملا تھا وہ اچانک پھٹ پڑی تھی۔ دل چاہا تو اٹھا اپنا دل چیر کر اس کے سامنے رکھ دے۔

”سحرا تم فکر نہیں کرو، وہ آ جائے گا۔“ شفیق نے اسے تسلی دی۔

”نہیں، اب نہیں آئے گا۔ میں اس کے بغیر مر جاؤں گی۔ وہ تو مجھے دانا نے بھی نہیں آئے گا۔“

”سحرا صبر کرو، دیکھو صبر نہ ہارو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”اس گھر میں آج تک کچھ بھی تو ٹھیک نہیں ہوا۔“ اس نے خود ہی سو بائیں گھسے سے دور پھینکا۔ شفیق اس کے حالات سن کر بہت ڈسٹرب ہو گئی تھی۔ اس نے تو اپنا دکھ شہ زکرنے کے لیے اسے فون کیا تھا اور وہ خود ہی پریشان ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ حویلی کی اونچی اونچی دیواروں کو توڑ کر کہیں بھاگ جائے۔ گو کہ اس پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی اور وہ ادھر بھی نہیں گھر اس کا دل فرار چاہ رہا تھا اس نے حیدر کا ٹبر ملایا۔

”ہاں بیٹا کیا بات ہے؟“

”انگل! میں بہت پریشان ہوں اور شہزاد چاہ رہی ہوں۔ انگل میں آ جاؤں۔“ حیدر اس کی بات سن کر چٹک گیا۔ کہیں اسے آصف کی کوئی خبر تو نہیں مل گئی تھی۔

”بیٹا! آپ کیوں پریشان ہیں؟“

”معلوم نہیں۔ بس دل بہت پریشان ہے۔ نہ جانے کیوں ٹینشن ہی ہو رہی ہے۔ میں نے سحر کو فون کیا تھا اور.....“

”ہاں ہاں کہو، کیا بات ہے؟“

”وہ بہت زیادہ اپ سیٹ ہے۔ شاید آفاق نے شادی کر لی ہے۔“

”او آئی سی!“ حیدر کو اس کی پریشانی کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ ”ٹھیک ہے، ابھی ڈرامیڈ بہت معروف ہے۔ دو تین دن بعد میں اسے آپ کی طرف بھیجوں گا پھر آ جانا۔“

”ٹھیک ہے انگل!“ وہ مطمئن لہجے میں یولی اور حیدر سوچ میں پڑ گیا۔ وہ کیسے اس کو آصف کے ہارے میں بتائے گا جبکہ وہ پہلے ہی بہت ڈسٹرب ہے لیکن حقائق سے فرار تو ممکن نہیں۔ آج نہیں تو کل اسے حالات کا علم تو ہونا ہی ہے۔

دو دن بعد وہ ڈرائیور کے ساتھ شیر آگئی تھی۔ وہ واقعی بہت پریشان تھی۔ حیدر نے اسے بہت تسلی دینے کی کوشش کی۔

"انکل! میں سحر سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"ہاں تو ملے گی۔"

"اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں اسے اصرار ہوں؟"

"ہاں ہاں، مائنڈ کرنے کی کیا بات ہے؟"

"جھجک بھانگل! وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

اگلے دن اس نے سحر کو فون کیا۔ فون بھاری ہانگ کر کسی نے نہ اٹھایا۔ وہ رات کے سبک فون کرتی رہی مگر کسی نے فون اٹینڈ نہیں کیا۔ اسے سخت

تشویش ہو رہی تھی۔ حیدر صبح سے شیر سے باہر گیا ہوا تھا۔ اچانک فون کی بیل بجے گی۔ اس نے فون اٹھایا۔

"ہیلو کون؟"

"حیدر! انکل کہاں ہیں؟"

"آپ کون؟"

"میں ولیم بات کر رہا ہوں۔ ماما کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ انہیں اسپتال لے کر جانا ہے۔ ان کا سوبائل آف ہے اسی لیے مگر

فون کیا ہے۔"

"مگر وہ تو گھر پر نہیں۔ شیر سے باہر کسی ضروری کام کے سلسلے میں گئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، جب وہ آئیں تو انہیں میرا پیج ضرور دے دیں۔ اس وقت بہت اہم خبریں ہیں۔" اس نے فون رکھ دیا۔

تھوڑی دیر بعد ڈرائیور ڈاکٹر کا فون آ گیا۔ "بی بی جی! شادی کہاں ہیں؟"

"وہ تو گھر پر نہیں، آپ کون؟"

"میں ڈاکٹر ڈاکٹر رائیڈر بول رہا ہوں۔ بہت ضروری بات تھی۔ ان کا سوبائل بھی بند ہے اور بات بہت ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے، آپ پیغام دے دیں، میں ان کو دے دوں گی۔"

"آپ جی! ان کو بتا دیں کہ صف کی پوسٹ مارفم کی رپورٹ کا پتا چل گیا ہے۔"

"کیا مطلب! کیا ہوا صف کو؟" وہ چیختے ہوئے بولی۔

"جی! اس کو کسی نے دو تین دن پہلے قتل کر دیا تھا۔"

"اوہ نوا! یہ نہیں ہو سکتا۔" اس سے بولنا مشکل ہو گیا تھا اس نے فون رکھ دیا۔ فون بند کر کے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔ پہلے

سہیل اور اب آصف بھی اور اسے علم بھی نہیں ہوا۔ وہ بے گناہ انسان اور ان کا خون اس کی گردن پر تھا۔ پہلے وہ سہیل کی وجہ سے شدید دہنی کرب میں

جلاہی اور اب آصف بھی۔ سبیل مرتے دم تک اسے آصف کے بارے میں اصرار کرتا رہا اور وہ اس کے لیے یہ کام بھی نہیں کر سکی تھی۔ اس شخص کے لیے جس نے اپنی زندگی اس کے لیے داؤ پر لگا دی تھی۔ اُف خدایا! میں اس قدر ذلیل ہو سکتی ہوں۔ میری وجہ سے دو بے گناہ انسان موت کے منہ میں چلے گئے اور میں زندہ ہوں۔ مجھے تو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ وہ شدید ذہنی اضطراب میں تھی۔ ہر طرف سے صدمات نے اسے گھیر لیا تھا۔ وہ دے دے قدموں حیدر کے کمرے میں گئی اور لارینگ نیکل کی درازوں، شیفٹ کے اندرونی خالوں اور بیڈ کی سائڈ ٹیبلوں کی درازوں میں کچھ ڈھونڈتی رہی۔ کوئی ایسی چیز، کوئی ایسا اہتیار، کچھ بھی نہ تھا۔

اسے ایک دراز میں سے کچھ گولیاں ملیں۔ اس نے ساری کھالیں۔ شاید وہ حیدر شدید ڈپریشن میں لیتا تھا۔ وہ گولیاں کھا کر ادھر ہی بیڈ پر لیٹ گئی۔ باہر مسلسل کیٹ بیل بج رہی تھی۔ شیر شاہ کسی کام سے باہر گیا تھا۔ خانساں نے بہت دیر بعد اپنے کوارٹر سے آکر گیٹ کھولا تھا۔ شہلا اسد اپنے شوہر کے ساتھ بہت دُلوں کے بعد آئی تھی۔

”کیا بات ہے بابا! پاپا کہاں ہیں؟“ شہلا نے خانساں سے پوچھا۔

”وہ جی کسی کام سے شہر سے باہر گئے ہیں۔“

”آج کل کہاں ہوتے ہیں۔ نہ موبائل پر ملتے ہیں اور نہ گھر پر۔“

”معلوم نہیں جی، گھر پر ہی نہیں ہوتے۔ بی بی جی بھی گاؤں سے آئی ہوئی ہیں۔“

”کون بی بی؟“ شہلا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اسد گاڑی میں ہی تھا۔

”شفیق بی بی!“

”کہاں ہے وہ؟“ نہ جانے کیوں وہ جاتے جاتے رک گئی تھی۔

”اندھری ہیں۔“

”اچھا۔“ شہلا کے اندھ بھرا ایک دم غرت کا جذبہ پیدا ہو گیا اور وہ نادانستہ اندھ چلی گئی۔ خاموشی سے سارے کمروں کا جائزہ لیتی رہی۔ پاپا کے بیڈر دم تک جاتے جاتے اس کے قدم اچانک لرزے لگے۔ اس نے دروازہ کھولا۔ شفیق ان کے بیڈ پر نیم دراز تھی۔ کمرے میں بالکل اندھیرا تھا۔ شہلا کا خون کھولنے لگا۔ اس کی اتنی جرأت..... اور پاپا کیا وہ بھڑ..... وہ ایک دم صرف چند لمحوں میں یقین کی وادی سے ٹھوک و شبہات کی خار وار ہمازیوں میں الجھ چکی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ تھپڑ مارا دے اس لڑکی کے ٹپاک جسم کو پاپا کے مصفا بستر سے کہیں دور پھینک دے۔ وہ بہت دُلوں کے بعد اپنے آپ کو کپڑے کر کے آئی تھی اور اب صرف چند لمحوں میں جنونی ہو چکی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر لائٹ آن کی۔ اس کا خیال تھا کہ لائٹ آن کرنے پر وہ اٹھ جائے گی مگر وہ بے سدھ پڑی تھی۔

”تھماری یہ جرأت کہ پاپا کے بیڈر دم میں گھسی ہو اور ان کے بیڈ پر.....“ وہ چلائی مگر جواب نہ ملا۔ ”انٹرویو یہاں سے اور باہر فوج ہو جاؤ۔“ اس نے ہاتھ سے اسے جھٹک دیا تو اس کا ہاتھ اور سر ایک طرف کوٹک گئے۔ ادھ کھلی آنکھیں کچھ ادھری کہانی بتا رہی تھیں۔ وہ خود بھی ایک لمحے کو چنکی۔

اس کا ڈھیلا بے جان جسم..... اس نے جلدی سے بخش چپک کی۔ وہ بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اس نے ارد گرد دیکھا۔ ڈرائنگ ٹیبل پر گولیوں کی مکمل شیشی نظر آگئی۔

”مائی گاڈ!“ وہ کہتے ہوئے ہار بھاگی۔

”اسد..... اسد! جلدی سے اندر آئیں۔۔۔۔۔ وہ..... اس لڑکی نے شاید خودکشی کرنے کی کوشش کی ہے۔“

”کون شہلا..... کون لڑکی؟“ اسد نے گھبرا کر پوچھا۔

”وہ اندر ہے شفیق!“ وہ ہٹکاتے ہوئے بولی اور دونوں اندر بھاگے۔

”اس کی حالت تو بہت سیریس لگ رہی ہے۔“ اسد نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس کو جلدی سے اسپتال لے چلے ہیں۔“ وہ خود ہی بولی۔

”ہاں، ہاں! کو بلاؤ۔ اسے گاڑی میں ڈالیں۔“ جینوں نے مل کر اسے بڑی مشکل سے گاڑی میں ڈالا اور ایک پرائیویٹ اسپتال میں لے

گئے۔ ڈاکٹروں نے جلدی سے اس کا معہہ و واش کیا۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھی۔

”اگر آپ صرف چند منٹ اور لیٹ کرو جتے تو ان کا بچہ بہت مشکل تھا۔“ ایک ڈاکٹر نے دونوں سے کہا تو وہ خاموش ہو گئے اور خالی خالی

نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ شہلا مسلسل پاپا سے رابطہ کیے ہوئے تھی۔ رات کے دو بجے موبائل سے رسپانس ملا۔

”یہ شہلا تم اس وقت! خیریت تو ہے؟“

”ہاں پاپا! آپ کہاں ہیں؟“

”میں صبح فیصل آباد گیا تھا۔ ابھی واپس آ رہا ہوں۔ راتے میں ہی ہوں مگر تم نے اس وقت فون کیوں کیا ہے؟“

”پاپا! وہ میں اسپتال سے بول رہی ہوں۔“

”کیوں، خیریت تو ہے؟“

”ہاں، وہ دراصل شفیق نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ میں اچانک گھر گئی تو اسے اسپتال لے کر آئی۔“

”کیا..... کیا کہہ رہی ہو؟“ حیدر کے ماتھے پر ایک دم پینٹ آ گیا۔

”ہاں گھرباں وہ ٹھیک ہے۔ میں اور اسد اسپتال میں ہی ہیں۔“

”اودائی گاڈ! یہ اس نے کیا کیا۔ میں اسپتال ہی آتا ہوں۔“ حیدر نے ایڈریس لوٹ کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔ وہ خود ہی گاڑی ڈرائیو

کر رہا تھا اس لیے ڈرائیو کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ یہ لڑکی اس قدر جنونی بھی ہو سکتی ہے۔ اسے سخت افسوس ہو رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ولیم کا فون آ گیا۔ ”انگل! آپ کہاں ہیں، ممہ کی طبیعت بہت خراب ہے۔ میں اسپتال سے بول رہا ہوں اور آپ کو

مسلسل فون کر رہا ہوں۔ میں اور نور بہت مشکل سے انھیں اسپتال لائے ہیں۔ انگل! آپ آ رہے ہیں نا؟“ ولیم نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”کیوں کیا ہوا؟“

”آج ان کو خون کی لٹی ہوئی ہے۔“

”ادو! حیدر پریشانی سے بولا۔“

”اکھل! وہ ہوش میں بھی نہیں۔“

”جینا آپ گھبراؤ نہیں۔ میں آ رہا ہوں۔ ایک گھنٹے تک پہنچ جاؤں گا۔“ حیدر نے موبائل آف کیا۔ وہ سخت شش و پنج میں تھا۔ دلوں زندگیاں خطرے میں تھیں، دلوں کو بچانا ضروری تھا اور وہ تنہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس طرف جائے۔ نادانستہ اس نے گاڑی کا رخ شوکت خانم کی طرف موڑ دیا۔ وہ سہرہمچکائی پریشان بیٹھا تھا۔ نور کو زبردستی اس نے بڑے چچا کے ساتھ بھیج دیا تھا جس کو لینے خود ہی اسپتال پہنچ گئے تھے۔

”شہلا کیسی ہے اب؟“

”معلوم نہیں۔“ ولیم کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”اچھا میں ڈاکٹر سے مل کر آتا ہوں۔“ وہ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر سے ملنے چلا گیا۔

”فکری بات نہیں۔ کچھ کھانگ ہوگئی تھی اس لیے لٹی ہوئی ہے۔“ ایک دم موبائل بجنے لگا۔

”ہاں شہلا! یوں کیا بات ہے؟“ اچانک حیدر کے منہ سے نکلا۔ ولیم نے پھر چند کمزاس کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں میں گہرا استغہام

تھا۔ ”میں ابھی تھوڑی دیر تک پہنچتا ہوں۔“ اس نے موبائل بند کر کے ولیم کی طرف دیکھا۔

”میری بیٹی کا فون تھا مجھے اسپتال جانا ہوگا۔“ ولیم کہیں کہیں گھوم رہا تھا اور خاموشی سے حیدر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کوئی چیز کہیں انک سی گئی

تھی۔ وہ کچھ پوچھتا چاہتا تھا مگر اسے اس کا کوئی حق نہیں تھا اور ہمت بھی.....

”میرا وہاں جانا بہت ضروری ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ جلدی آ جاؤں۔ کل تک تو اسپتال میں رہنا پڑے گا اور اگر میں نہ آ سکا تو مجھے

فون کرونا۔ میں ڈرائیور کو بھیج دوں گا اور وہاں میں نے بلز کی پے منٹ کر دی ہے اور یہ اے ٹی ایم کارڈ ہے۔ اس کا یہ پاس ورڈ ہے۔ اگر میں نہ ہوں تو

اس سے پیسے لٹوا لینا۔“ حیدر نے اسے اے ٹی ایم کارڈ پکڑاتے ہوئے کہا۔ ولیم خاموشی سے اس فرشتہ صفت انسان کی طرف دیکھتا رہا جس کے

ہارے میں وہ کچھ کچھ مشکوک بھی تھا اور معترف بھی۔ وہ اس کے مرتبے کا تعین نہیں کر سکا تھا۔ وہ شخص اس کے دل کے کسی گوشے میں برا بھلا ہو چکا

تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا جیسا بھی تھا اس کی عزت کرنے کو دل چاہتا تھا اس کی کسی بات کو رد کرنے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

حیدر اسپتال پہنچا تو وہ بستر پر بے ہوش پڑی تھی۔ شہلا اس کے پاس ہی تھی ادا سمد گھر چاچا تھا۔ ساری رات دلوں اسپتال میں عمارت ہے تھے۔

”پاپا! آپ کہاں رہ گئے تھے؟“ شہلانے بے صبری سے پوچھا۔

”مجھے چانگ شوکت خانم جانا پڑا۔ ایک مریض بہت بیمار تھا۔ ڈاکٹر اس کے ہارے میں کیا کہتے ہیں؟“

”معدہ دال کر دیا ہے۔ تھوڑی دیر تک ہوش میں آ جائے گی مگر پاپا یہ آپ کے پیڈروم میں اور ٹیلیفون بھی اس نے آپ کے روم سے لی

تھیں۔ آپ نے اسے اتنی لبرٹی دے رکھی ہے۔“ شہلا آہستہ مگر قدرے چپچپے ہوئے لہجے میں بولی۔ وہ اس کی زندگی سے زیادہ اس کی حیدر کے مگر میں موجودگی سے پریشان تھی۔

”شہلا! تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ جو بھی تمہارے دل میں ہے صاف صاف کہو۔ ذرا معنی جملے اور لہجہ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔ حیدر کا اندر باہر ہمیشہ صاف رہا ہے اور رہے گا اور اسے اپنی کسی بھی بات پر کوئی شرمندگی نہیں۔“ حیدر مضبوط لہجے میں بولا۔

”آئی ایم سوری امیر ایہ مطلب نہیں تھا۔“ حیدر نے بھرپور لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھ کر گہری سانس لی اور خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد شفقت نے آنکھیں کھولیں۔ حیدر سامنے نظر آتا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”انگل! میں کیوں زندہ ہوں۔ مجھے کیوں بچایا؟“

”تم نے کتنی بڑی حرکت کی ہے۔ کیا تمہیں اس کا اندازہ ہے؟“

”انگل! میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ میری وجہ سے دو انسان مارے گئے۔ سہیل بھی اور اب آصف بھی۔ میں اپنے آپ کو کیسے معاف کروں گی۔“ وہ سسکتے لگی۔ حیدر نے شہلا کی طرف دیکھا۔ وہ شرمندہ سی کھڑی تھی۔

”تمہیں کس نے بتایا؟“ حیدر نے اس سے پوچھا۔

”ذوالفقار ڈرائیور نے اور آپ نے مجھے بالکل بھی نہیں بتایا۔ میں بہت بری ہوں انگل! بہت بری، میں اب کیا کروں گی۔“ وہ مسلسل رو رہی تھی اور آنسو ٹپکے میں جذب ہو رہے تھے۔

”ہمت کرو بیٹا! ان کی موت ایسے ہی لکھی تھی۔“ حیدر نے اسے حوصلہ دینا چاہا۔

”میری وجہ سے، میں اس کی وجہ بنی۔“

”اپنے ذہن پر بوجھ مت ڈالو۔ قسمت کا کٹھا کوئی نہیں مناسکتا۔“ وہ خاموش ہو گئی اور آنکھیں بند کر لیں مگر بند آنکھوں سے بھی آنسو مسلسل بہتے رہے۔



ولیم بے حد مضطرب تھا۔ ماما کے اس انکشاف کے بعد اس موضوع پر دوبارہ کوئی بات نہیں ہوئی تھی مگر اس نے آج حیدر انگل اور ماما کی باتیں سن لی تھیں۔ وہ بار بار انہیں اصرار کر رہی تھی کہ ولیم کو ایک دلدادہ ان کی زندگی میں کلمہ پڑھا کر مسلمان کرویں اور حیدر انگل بار بار یہی کہہ رہے تھے کہ جبر سے نہیں بلکہ جب ولیم کا اپنا دل چاہے گا تب وہ ایسا کریں گے۔ اس کی باتیں سننے کے بعد وہ مگر سے باہر نکل آیا تھا۔ موسم بہت سرد و سرد تھا مگر نہ تو اسے موسم کی شدت کا احساس ہو رہا تھا نہ دگ دپے میں سرایت کرتی خف کا۔ اس کا اندر تو مسلسل جل رہا تھا۔ یہ سب کیسے ممکن ہوگا؟

اودہ کانسٹ، اودہ گاڈا آئی ایم ریلی سک آف لائف اسے کوئی راستہ اور کوئی منزل کہیں بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ اس کے قدم ٹاڈا ناستہ قادر کی طرف اٹھ گئے۔ وہ کسی جائے پناہ کی تلاش میں ان کی طرف چلتا گیا۔ امید کی کرن روشن تھی۔ قادر کو وہ کیسے ساری صورت حال بتائے گا اور وہ کس

طرح اس پر یقین کریں گے۔ وہ قادر کے گھر پہنچا تو کچھ گاڑیاں باہر کھڑی تھیں۔ اسے باہر بھاگ کر دے میں ہی بیٹھنا پڑا۔ باہر شدید ٹھنڈ ہو رہی تھی۔ نوکر نے بس اسے یہی بتایا تھا کہ کوئی کارن ڈرائیونگ آ رہا ہے اور قادر ان کے ساتھ معروف ہیں۔ کب فارغ ہوں گے وہ نہیں جانتا تھا۔

”آپ ان کو بتادیں کہ دلیم آیا ہے۔“ اس نے بڑا امید بھرا لہجہ میں کہا۔

”وہ تو میں نے ان کو کب کا بتا دیا ہے۔“

”تو پھر؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔

”آپ ایک دفعہ اور۔۔۔۔۔“

”ان کا کہنا ہے کہ انھیں بار بار ڈسٹرب نہ کیا جائے۔“ نوکر نے کہا اور اندر چلا گیا۔ اسے سخت مایوسی ہو رہی تھی۔ قادر اسے نہ جانے کیوں اتنا نظر انداز کر رہے تھے۔ اس کا قصور اتنا بڑا تو نہیں تھا۔ اس کا دل کٹنے لگا اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ ایسی بے اعتنائی اور بے رحمی پر وہ مایوسی سے اٹھا اور گیٹ سے باہر نکل گیا۔ ہوا میں قدرے خشکی پڑ چکی تھی اور اس نے ایک بیڈو کڑا کا پتلا سا سونہ بن رکھا تھا۔ اس نے جبرجبری سی لی۔ اسے ایک دم شدید سردی محسوس ہونے لگی۔ سارا جسم کپکپاہٹ کا شکار ہو گیا۔ نہ جانے اندر کیسی تہذیبی آلی تھی کہ سارا وجود لرز نے لگا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ پوجھل قدم اٹھاتا ہوا سڑک کے کنارے کنارے چلتے لگا۔ چاک ایک گاڑی چلتے چلتے رک گئی۔

”سیلوینک مین!“ گاڑی سے نور کے بڑے بچے باہر نکلے۔

”سیلوینک!“

”کیا آج سڑکیں تاپنے لگے ہوں؟“ مٹکل نے خوش انداز میں پوچھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ بس یونہی ادھر آیا تھا مگر طبیعت خراب ہو رہی ہے۔“

”کیا ہوا؟“ انھوں نے اس کی کٹائی پکڑتے ہوئے کہا۔ ”اوہ! تمہیں تو بخار ہو رہا ہے۔ چلو میں تمہیں گھر چھوڑ کر آتا ہوں۔ سنا ہے تم

نے گھر چھوڑ دیا ہے۔ اب کہاں رہتے ہو؟“

”گلیبرگ میں۔“

”ٹھیک ہے، مجھے راستہ بتاتے جاؤ۔ میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔“

”جیسی اگل! میں ٹیکسی کر لیتا ہوں۔“

”ارے بھئی، میں بھی ادھر ہی جا رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ جب اس کے بتائے ہوئے ایڈریس پر انھوں نے گاڑی روکی تو وہ گھر دیکھ کر چوہے۔

”تم میرا مطلب ہے آج کل کس کے ہاں مہمان ہو؟“

”حیدر اگل کے۔“ وہ بے پردائی سے بولا۔

”کون حیدر؟“

”وہی جو فٹنگی ہیں۔“

”سید ضار حیدر کے؟“ انور چچا اپنی سیٹ سے اچھلتے ہوئے بولے۔

”ہاں شاید۔“

”وہ تمہارے کیا لگتے ہیں؟“

”معلوم نہیں، ہمارے کوئی کزن ہیں۔“ وہ اکٹاہٹ سے بولا۔

”مگر وہ تو سید ہیں۔“

”میں نہیں جانتا۔“ وہ بے زاری سے گاڑی سے اترتے ہوئے بولا اور اندر چلا گیا مگر بچا کافی دیر وہیں گاڑی میں بیٹھے۔ اٹی سید می

کڑیاں ملا تے رہے۔ مہاس کو دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں۔

”تم کہاں چلے گئے تھے؟“ انھوں نے فحاشت سے اس کی نکائی پکڑتے ہوئے کہا جو بخار سے تپ رہی تھی۔

”گاڑی کی طرف گیا تھا مگر.....“

”مگر کیا؟“

”وہ مجھ سے ناراض ہیں اس لیے انھوں نے مجھ سے ملاقات نہیں کی۔“

”تم کیوں ان کی طرف بار بار جاتے ہو؟“

”میں بہت پریشان ہوں اور آپ نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ مہاس جو باتیں آپ کو اب پریشان کر رہی ہیں۔ میرے بچپن میں ہی آپ

نے اس کے بارے میں کیوں نہیں سوچا تھا اور اب مجھ کو رہا ہے پر کھڑا کر دیا ہے۔“ وہ قدرے غصے سے بولا۔

”ہاں نہ جانے کیوں مجھ سے ہمیشہ غلطیاں ہی ہوتی رہی ہیں۔ میں مانتی ہوں کہ تم میری وجہ سے ذاتی اذیت میں مبتلا ہو کر میں کیا کروں۔

میں کبھی بھی دور اندیش نہیں رہی۔ وہی مصلحتوں کے ہاتھوں خاموشی سے سر جڑ کر رہی اور غلطیاں اور گناہ مجھ سے سرزد ہوتے رہے۔ میں

انسانوں کے ہجوم میں کھڑی ایک بے حد کمزور مخلوق ہوں۔ جس طرف سے رٹا آیا اسی طرف بہہ گئی اور گناہ کرتی رہی۔“

”کیسے گناہ؟“ اس کا چہرہ بخار سے چمپ رہا تھا اور دل انجانے خدشوں سے کہہ مٹا کہیں کچھ اور انکشاف نہ کریں۔

”تمہارا باپ پیڑ کرچن تھا اور میں مسلم۔ وہ تمہارا وجود نہیں چاہتا تھا مگر تم میری زندگی تھے۔ جس نے تمہاری وجہ سے مجھے طلاق دی۔ میں

نے اسے ہی تمہیں نام دینے کو کہا۔ کیسی بڑی غلطی تھی۔“ اس کے چہرے پر ابھری ہڈیوں پر آنسو تھینے لگے۔ ولیم نے چوبک کہاں کی طرف دیکھا۔

”مہاس آپ.....!“ وہ بھنپلا کر بولا۔

”تمہارا نام صرف اسی کا دیا ہوا ہے اور کچھ بھی نہیں۔“

”تو آپ نے مجھے کیا دیا؟“ وہ قدرے چپکے لہجے میں بولا۔

”میں نے..... میں نے.....“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اسے ولیم کا سوال بڑا انوکھا لگا۔ وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

”تمہیں میں نے مرکز جنم دیا اور پھر جیسے پلاسٹک تھمارے سامنے ہے مگر میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ کوئی بھی ماں اولاد پر احسان نہیں کرتی۔“

”کاش آپ مجھ پر یا احسان نہ کرتیں۔ آپ نے مجھے ادھوری زندگی دی ہے۔ انسانوں کے اس جنگل میں نہ تو میرا کوئی نام ہے، نہ وجود، نہ کوئی شناخت اور نہ ہی کوئی پہچان، میں کیا ہوں؟ کون ہوں؟ میرا منی کیا تھا؟ میرا حال کیا ہے اور میرا مستقبل کیا ہوگا؟ آپ نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ نہ جانے اس کہانی میں بھی سچائی ہے کہ نہیں۔“ وہ سختی سے بولا۔

”ولیم! خدا کے لیے یوں نہ کہو۔ میں نے تمہیں کچھ نہیں دیا۔ میں جانتی ہوں مگر میں نے تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔“ اس کی آنکھوں میں ہلا کا کرب تھا اور لہجے میں بے حد بے بسی!

”مما! آپ نے بہت ظلم کیا ہے۔“

”اور مجھ پر جو کچھ ہوا؟“ وہ بھنگی آنکھوں کے ساتھ اٹھ کر بستر پر لیٹ گئی۔ ولیم وہیں صوفے پر کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ ولیم کی باتوں پر اس کا دل کٹنے لگا۔

وہ بھی تو اپنی شناخت و صوفے نے نکلی تھی۔ شناسائی کے سفر پر اس نے بھی تو قدم رکھے تھے مگر اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ جو اس کے ساتھ ہوا تھا وہی کچھ اس کی اولاد سمجھ رہی تھی۔ ولیم کے اندر بھی ویسا ہی کرب تھا۔ ویسا ہی الاؤ تھا اور ویسا ہی آنکھ لٹاں..... ادھر سے اور بکھرے وجود کا۔ ٹوٹی پھوٹی شخصیت کا، بے حقیقت انسان کا۔ کہیں وہ بھی ایسی غلطیاں نہ کرتا جائے جو اس سے سرزد ہوئی تھیں۔ آنسو اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔ کونسی میں صرف ایک نوکر تھا افضل جو کلنگ بھی کرتا تھا اور گھر کے دوسرے کام بھی کرتا تھا۔ شام سے اس کی طبیعت بھی خراب تھی اور گھر پر کوئی بھی نہیں تھا کہ کوئی انہیں پانی کا گلاس ہی پوچھتا۔ ولیم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ تو گھر سے صرف ناشتا کر کے نکلا تھا اور مسلسل گھومنے پھرنے کے بعد بخار میں تپتا ہوا لوٹا تھا۔ کوئی پرسان حال نہ تھا۔ موبائل مسلسل بج رہا تھا۔ کوئی اٹھ کر ٹیکل سے اسے اٹھانے والا نہیں تھا۔ شب بڑی مشکل سے اٹھ کر نکلیں۔ دوسری طرف نور پور رہی تھی۔

”آئی! کیا بات ہے۔ فون کوئی ریسیڈ نہیں کر رہا تھا۔ چکا تار ہے تھے کہ ولیم کو بہت بھار ہے اب کہاں ہے؟“

”ہاں، سو رہا ہے۔ جی پی تم قہوڑی دیر کے لیے آ کیوں نہیں جاتیں۔“

”کیوں، خیریت تو ہے؟“

”ہاں ٹھیک ہے، ولیم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ لگ بھی پیار ہے اور مجھ میں بھی ہمت نہیں۔ اگر تم ہرانہ مٹاؤ تو آ جاؤ۔“

”ٹھیک ہے آئی، میں آ جاتی ہوں۔“ اس نے فون رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آ گئی۔ ولیم کا ہاتھ اور تیز ہو گیا تھا۔ اس نے آ کر اسے دودھ گرم کر کے دیا اور دوائی کھلائی۔ ماما کے لیے جس ہٹیل۔ ولیم کو اٹھا کر اس کے کمرے میں لٹایا اور ماما کے پاس آ گئی۔

”نورا! ولیم بہت پریشان ہے۔“

”کیوں آئی؟“

”تم بھی حقیقت جانتی ہو مگر وہ حقیقت ماننے کو تیار نہیں۔ کوشش کرو کہ اسے واپس لاؤ حقیقت کی طرف، سچائی کی طرف۔ میں اپنی زندگی میں اسے مسلمان دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”آئی! وہ بہت ڈسٹرب ہو چکا ہے اور کسی بھی موضوع اور خاص طور پر اس موضوع پر بات ہی نہیں کرنا چاہتا۔“

”ہاں میں جانتی ہوں مگر پلیز کوشش تو کرو کہ میں آرام سے مرقو سکوں۔“

”آئی! آپ ٹھیک ہو جائیں گی اور ولیم بھی۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

”جا کر دیکھو اس کا بھار کم ہوا ہے کہ نہیں ورنہ کچھ پٹیاں بھی رکھ دو۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ اٹھ کر اس کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ بے ہوشی کی کیفیت میں تھا۔ اس نے اپنا سر دھاتھا اس کے گرم ماتھے پر رکھا۔ اس

نے بھر بھی آنکھیں نہ کھولیں۔ اس نے ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنی شروع کیں۔ کافی دیر وہ پٹیاں رکھتی رہی۔ بخار کی حدت کچھ کم ہوئی تو اسے بھی نیند آنے لگی۔ وہ ماما کے کمرے میں آ کر صوفے پر لیٹ گئی۔ تھکاوٹ سے اسے سخت نیند آ رہی تھی۔

صبح جب بیدار ہوئی تو ولیم نہ جانے کب سے اٹھ کر لاؤنج میں بیٹھا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر چمکا۔

”نورا تم کب آئی؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”تم سناؤ کیسے ہوا؟“

”ہاں اب کافی بہتر ہوں مگر تم کب آئی؟“

”یہ بھی خوب رہی ساری رات تمہاری خدمت کرتی رہی۔ ٹھنڈی پٹیاں رکھتی رہی اور جناب کیسے انجان بن رہے ہیں۔“

”ریٹلی؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”تو اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔ میں نے فون کیا تو آئی نے آنے کو کہا، میں آ گئی۔ کک بھی بنا رہے۔ اب جلدی سے بناؤ ناشتا

کیا کر دے۔“ وہ جلدی جلدی بولی اور وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”نورا! وہ اس کے قریب آ گیا۔“

”ہوں؟“

”جھٹک ہوا“ اس کی آنکھوں میں آنکھ سے پانی بھر آیا۔

”کوئی اپنے آپ کو بھی تھیک پڑھتا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی تو اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔
 ”اب بھارتو نہیں۔“ اس نے اس کی کلائی پر اپنا ٹھٹھا ٹاؤک ہاتھ رکھا۔ ”اب کوئی خاص تو نہیں۔“ وہ خود ہی بولی اور ولیم نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

”نور! میں ٹوٹ گیا ہوں۔ اکیلا رہ گیا ہوں اس دنیا میں۔“ وہ اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے جکڑ کر شدید دکھ سے بولا۔
 ”ولیم! میں نے تم سے ہزار دفعہ کہا ہے مجھ دوتے اور منٹاتے ہوئے لوگ قطعی پسند نہیں۔“ وہ قدرے غصے سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی۔
 ”مگر اس وقت میں بہت ٹوٹ چکا ہوں۔“ وہ بے بسی سے بولا۔
 ”تو ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے۔ پہلے ہٹاؤ ناشتا کیا کرو گے۔ پھر میں تم سے بات کرتی ہوں۔“
 ”کچھ نہیں۔“

”کچھ کیوں نہیں۔ میرا خیال ہے پورج بناتی ہوں۔“
 ”نہیں، میں نے نہیں کھانا۔“ وہ بچوں کی طرح منہ ہٹا کر بولا۔
 ”اچھا تو پھر کارن فلکس تو کھا لو گے؟“
 ”ہاں۔“

”تم بیٹھو میں ابھی لاتی ہوں۔“ وہ منہ مو کر کچن میں چلی گئی۔ آئی کے لیے بھی ناشتا بنایا، اپنے لیے اور اس کے لیے بھی۔ دونوں ڈائمنگ ٹیبل پر بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ دونوں خاموش تھے۔

”ہاں اب ہٹاؤ کیا بات ہے؟“ وہ ٹیکن سے منہ صاف کرتے ہوئے بولی۔
 ”نور! میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ کیا ایسا کبھی کسی کے ساتھ ہوا ہے؟“ وہ روہانے لہجہ میں بولا۔
 ”پھر بھی کچھ تو ہٹاؤ۔“ وہ انجان بننے ہوئے بولی۔
 ”تم سب کچھ جانتی ہو اور انجان بن رہی ہو۔“ وہ جھنجھلا کر بولا۔

”تم خواہ تو ادا لہجہ ہے ہو۔“
 ”کیا تمہارے نزدیک کوئی بات بھی اہم نہیں؟“
 ”مثلاً کیا اہم ہونی چاہیے؟“

”شاید تم بات سننے کے موڑ میں نہیں۔“
 ”نہیں، تمہیں کس نے کہا؟“
 ”پلیز!“ وہ پھر جھنجھلا کر بولا۔

”اچھا بھئی مکمل کربات کر دو میں کچھ سمجھوں نا۔۔۔“

”میرا ماضی، میرے حال کو سمجھو رہا ہے۔ میں ایسے دور رہا ہے پر کھڑا ہوں جہاں میرا وجود، میری شناخت سب کچھ اوجھڑا ہے۔ میں تو شاید۔۔۔ اور مراد اب مجھے سب کچھ سمجھنے کو کہہ رہی ہیں۔ یہ سب کس طرح ممکن ہے۔ میں تو بہت کنفیوز ہو رہا ہوں۔“

”اس میں کنفیوزن کی کیا بات ہے۔ حلیٹ سے وحدانیت کی طرف کیوں نہیں آ جاتے؟“ وہ آہستہ سے بولی۔

”کیا مطلب؟“ وہ چونکا۔

”جو خدا تھا ہے اس کے ساتھ کیوں بہت سوں کو شریک کرتے ہو۔“ وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”اچھا یہ بتاؤ کہ تم دن رات لگا کر ایک شاہکار پینٹنگ بناتے ہو۔ کیا تم یہ بات سننا پسند کرو گے کہ میں نے پاتھری ممانے اس میں برابر کا کام کیا۔ کیا تم ان کو کچھ کرینٹ دو گے جبکہ انھوں نے یا میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

”کبھی نہیں۔“ وہ قدرے سختی سے بولا۔

”تو پھر پوری دنیا کو تخلیق کرنے والا کس طرح پسند کرے گا کہ اس کی خدائی میں کسی کو شریک کیا جائے اور ان کو جنھیں اس نے خود بنایا ہو یا جسے انسان نے بنایا ہو۔ انسان کے اندر عقل ہے اور عقل میں ایک پیمانہ ہے جسے منطق کہتے ہیں اور جو سچائی اور حقیقت پر خود بخود کلک کرتا ہے۔ اسلام تو محض وحدانیت، محمد ﷺ، مہدیت اور انسانیت پر قائم ہے۔ ہم خدا کی وحدانیت کو مانتے ہیں کہ ہماری عقل میں موجود سچائی کا پیمانہ اس پر کلک کرتا ہے اور محمد ﷺ کی مہدیت پر یقین رکھتے ہیں کیونکہ منطق اس کو بھی مانتی ہے۔ ہمارا راستہ تو فلوک و شبہات سے پاک سیدھا راستہ ہے جس میں کہیں کوئی جھول نہیں۔ ہمیں اپنے پاپ دھونے کے لیے نہ تو گناہ میں اشران کرنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی قادر کے سامنے کھینچنے کی۔ ہم تو سیدھے اس کے پاس جاتے ہیں۔ ترن جمنا وغیرہ کی سفارش یا ویلے کے اور سرگوشیوں میں اپنے دل کا حال اسے سناتے ہیں۔ وہ جو ہمارے دلوں کے اندر رہتا ہے۔ جو شرک سے قریب ہے جو انسان اور بندے کے تعلق کو سمجھتا ہے اور اس تعلق کی نزاکتوں کو بھی، بندے کی مجبور یوں، لاچار یوں کو بھی اور اس کی سرکشیوں کو بھی۔ ہمارے دین میں جبر نہیں۔ سب کے لیے راستے کھلے ہیں۔“ نور کی اس بات پر اس نے چونک کر دیکھا۔ حیدر انکل کے الفاظ اسے یاد آنے لگے۔

”اس کا کیا مطلب ہے کہ ہمارے دین میں جبر نہیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”بھئی خدا نے انسان کو عقل دی، تو میں دیں۔ اسے جانچنے کے پیمانے دیے اور پھر راستے بتادیے اور اس سے کہہ دیا جو چاہے منتخب کرو۔ ہادی بھی آ گیا اور ہدایت بھی۔ اب جو دونوں کو قبول کرے تو فلاح میں ہے، نہ قبول کرے تو نقصان میں ہے۔ یہ تو دلوں کے معاملے ہیں۔ جس پر دل لیک کہہ دی حقیقت ہے۔ اسلام زبردستی کا قائل نہیں۔ دراصل تم حقیقت سے نا آشنا ہو۔ تمہیں خدا اسلام کا علم ہے نہ خدا سے شناسائی کا۔“

”کیا تمہیں یہ سب ہے؟“ دلیم نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں شکر ہے۔ تمہوڑا بہت مگرز یاد نہیں۔“

”تمہیں یہ سب کچھ کس نے بتایا ہے؟“

”کسی نے نہیں، میں نے سب کچھ خود پڑھا ہے۔ اس پر سوچا ہے اور پھر میرے دل و دماغ نے اس پر لپیک کہا ہے اور پھر میں نے سب کچھ مان لیا۔ جب میں نے دل سے مان لیا تو وہ میرا ایمان بن گیا۔ ولیم! تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو؟“ اس نے ایک دم بات کا رخ موڑا۔

”کیوں؟“

”یونہی پوچھ رہی ہوں۔“

”کیا یہ بات پوچھنے کی ضرورت ہے۔ کیا تم نہیں جانتیں؟“

”نہیں۔“ دو سہاٹ لہجے میں بولی۔

”کیا تم واقعی نہیں جانتیں کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔“

”نہیں، مجھے کیا معلوم؟“

”تو رہنموت!“

”کیا تم نے مجھے کبھی بتایا؟“

”تو کیا تم واقعی نہیں جانتیں؟“ اس کی حیرت میں اضافہ ہو رہا تھا۔

”جو تم نے کبھی مجھ سے کہا ہی نہیں اسے میں کیسے جان سکتی ہوں۔“

”کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میرے لیے زندگی میں صرف دو لوگ اہم ہیں ماما اور تم۔“

”ہاں لیکن اس میں محبت کی مقدار اور کیا کٹش کو تو نہیں بتایا۔“ وہ مسکراتی ہوئی بے پروائی سے اسے چڑانے کا انداز میں بولی۔

”محبت کو جانچنے کا دنیا میں کوئی پیمانہ نہیں۔ جب کوئی پیمانہ ہی نہیں تو میں کیسے بتاؤں؟“

”تو اس دنیا کے خالق کو حلیٹ کے پیمانے میں مانتے ہو۔ بڑی حیرت ہے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ ایک دم بھونچکا رہ گیا۔

”تم محبت کو جانچ نہیں سکتے تو خدائی کو کیسے جانچ سکتے ہو ولیم! اسرار سے تمہارا اختیار ہے۔ بس تمہیں قدم بڑھانے کی ضرورت ہے۔ ہم

تمہیں فوری نہیں کریں گے۔ یہ تمہارا اپنا فیصلہ ہوگا۔ تمہارا اندر تمہیں بتائے گا کچھ کیا ہے۔ جو کچھ ہے اس کو مان لو اور جس کو مان لو اس پر ایمان لے

آؤ۔ بس اس کے بعد اس موضوع پر میں کچھ نہیں کہوں گی۔ ہاں بس دعا کروں گی۔“

”کیسی دعا؟“

”یہ خدا اور میرے درمیان راز ہے۔ جب تم کسی راز کو پالو گے تو پھر تمہیں بھی بتا دوں گی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”میرا خیال ہے اب تم ٹھیک ہو، میں گھر جاؤں۔“ وہ ڈانچنگ ٹھیل سے سب برتن سینچتے ہوئے بولی۔

”ہاں تمہاری مرضی ہے۔“

”اچھا میں تمہارے لیے اور آٹلی کے لیے کچھ بنا کر کچن میں رکھ جاتی ہوں۔ چچا بھی گھر میں منتظر ہوں گے۔“ وہ بول رہی تھی اور ولیم کچھ

بھی نہیں سن رہا تھا۔

نور جا چکی تھی اور وہ وہیں بیٹھا تھا گہری سوچوں میں گم، دورا ہے پر قدم بڑھانے تو کیسے اور کس طرح، بنا سوچے، سمجھے، جانچے اور آزمائے۔ اتنا بڑا فیصلہ جو ساری زندگی کو تبدیل کر دے محض چند لمحوں میں تو نہیں کیا جاسکتا۔ وہ جس بچ پر چل نکلا تھا جس کی تعلیمات پر اس نے غور و فکر کیا تھا۔ جس مشن پر وہ جانے کی تیاریاں کر رہا تھا سب کچھ کیسے بدل دے۔ اومائی گاڈا وہ بار بار اپنے سر کے بالوں کو سمجھ رہا تھا۔ کنپٹیوں کو دوبارہ ہاتھ۔ بتار کی حدت پھر سے اسے محسوس ہونے لگی تھی۔ اندر ہی اندر کوئی چیز بھر دیا ڈال رہی تھی۔ آتش فشاں شاید لاوا اکٹھا کر رہا تھا۔ اس کی سفید رنگت سیب کی طرح سرخ ہو رہی تھی۔ نہ کوئی راہ فرار ہے اور نہ ہی جائے پناہ۔۔۔ کہاں جاؤں؟



”آفاق! تم مجھے اپنے گھر کیوں نہیں لے کر جاتے۔ ہم کب تک اس کلیٹ میں رہیں گے۔“ مدرخ کراچی میں اپنی خالہ کے گھر تین ماہ سے رہ رہی تھی۔ آفاق سے شادی کرنے کے بعد وہ سوئٹزر لینڈ، ہانگ کانگ، مونسٹن کے بعد اب نین ماہ سے خالہ کے گھر مقیم تھی۔ خالہ خود تو ڈینٹس میں رہتی تھیں اس لیے ان کا کینٹ میں کلیٹ خالی تھا۔ آفاق سے وہ بار بار لاہور جانے کو کہتی مگر وہ سنی اُن سنی کر دیتا۔ مدرخ اس سے عمر میں چھ سال بڑی تھی۔ وہ تو ملک منصور کو پھسانے لگی تھی مگر آفاق فکے میں آ گیا۔ آفاق ابھی اتنا گھٹیا نہیں ہوا تھا۔ زمانے کی اونچ نیچ اور بدلے رنگوں کا اسے شعور نہیں تھا۔ اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں تھی کہ اس نے عمر سے شادی کر لی۔ وہ عمر کے ساتھ جس طرح کی زندگی گزارتا آ رہا تھا، مدرخ کے ساتھ اسے بہت محتاط ہونا پڑتا تھا۔ وہ اپنا قصہ برائوں اور چیزوں پر نکالتا۔ مدرخ کو اسے سنبھالنا آتا تھا۔ وہ جب انتہائی شے میں ہوتا تو وہ خاموشی سے کمرے سے باہر نکل جاتی اور اس وقت تک نہ لوٹی جب تک وہ نارمل نہ ہو جاتا۔

”آفاق! تم میری بات کا جواب نہیں دے رہے؟“ مدرخ نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش تھا۔ عمر کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

”تم بے شک مدرخ سے شادی کر لو۔ جو کچھ مرضی کرو مگر اسے گھومت لانا۔“ وہ جانتا تھا کہ عمر کے ساتھ اس نے بڑی زیادتیاں کی تھیں۔ ہر رات کھاس کے لیے قیامت بٹایا تھا اور اس کے وجود سے اس کی زر خیزی تک چھین لی تھی۔ اس خنجر زمین میں دو حریف تھوہر کے بیچ نہیں آگاتا جانتا تھا۔

”آفاق! تم بولتے کیوں نہیں۔ میں تمہارے مگر جانا چاہتی ہوں جو تمہارا ہے اور میرا ہے۔“ مدرخ محبت سے بولی۔

”نہیں مدرخ! نہ میرا کوئی گھر ہے اور نہ تمہارا۔ وہ ملک منصور کا گھر ہے اور ہم وہاں نہیں رہ سکتے۔“

”لیکن عربی تو وہیں رہتی ہے۔“ مدرخ نے گہری نذر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں وہ وہاں شفق کی وجہ سے ہے۔“ آفاق نے بات بتانے کی کوشش کی۔

”اچھا اگر شفق اس کو، اس فقیرنی کو قبول کر سکتی ہے تو کیا مجھے قبول نہیں کرے گی؟“ مدرخ قدرے نچوٹ سے بولی۔

”نہیں، میں نے کہہ دیا تاہم وہاں نہیں جاسکتے۔“

”مگر میں وہاں جاؤں گی؟“

”میں نے کہا نا ہرگز نہیں۔“

”اور میں دیکھوں گی مجھے کون روکے گا۔“ وہ غصے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ آفاق ایک دم شش میں آ گیا اور اسی طرح اس پر کون اور گھونسوں کی برسات شروع کی جیسے وہ عمر پر کرتا تھا۔ مدرخ نے ایک دم زمانے دار تھپڑا سے مارا۔ آفاق کا تو سر گھوم گیا۔ اسے ہرگز تو قیغ نہیں تھی کہ مدرخ یوں ری ایکٹ کرے گی۔

”تم ہوش میں ہو، مجھے تو تم بالکل ابھار لگ رہے ہو۔“ مدرخ نے اسے ہمنجوڑتے ہوئے کہا اور آفاق جیسے کسی رو بوٹ کی طرح اپنے اعضا اڑھیلے چھوڑ کر بیلے پر بیٹھ گیا۔ مدرخ اس کے کندھے دبائے لگی۔

”کیا تم جانتے ہو تمہیں دور ہوتا ہے؟“ آفاق نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور دیکھنا ہی رو گیا۔ یہ نیا انکشاف اس کے لیے قدرے حیران کن تھا۔ وہ اسے جھٹلاتا چاہتا تھا مگر کچھ نہ بول سکا۔

”اپنے آپ کو نارمل رکھو ورنہ پاگل کہلاؤ گے۔ میں تمہیں ٹھیک کروں گی۔ تم بہت امیچور ہو، کبھے تم آج میں کہوں گی بس اس پر عمل کیا کرو ورنہ تم اپنے آپ کو کھو دو گے۔“ وہ آہستہ آہستہ سرگوشیوں کے انداز میں اس کے کان کے پاس یوں بول رہی تھی جیسے اسے پہچاننا نہ کر رہی ہو۔ وہ اس کی باتوں کو سن بھی رہا تھا۔ کچھ بھی رہا تھا اور ان پر عمل کرنے کا جہیز بھی کر رہا تھا جیسے اس کی بخش مدرخ کے ہاتھ میں تھی۔ مدرخ اس کے ہاتھوں کو دبائے ہوئے آہستہ آہستہ اس کی کلائیوں، بازوؤں اور پنوں کو اپنی تھری انگلیوں کی پوندوں سے دبائے ہوئے اس کی گردن کے پیچھے مسلک کو پوندوں سے دبائے لگی اور وہ جیسے مدھوش ہو رہا تھا۔ اس کو سکون مل رہا تھا جس طرح آ کو ٹیگر میں نیڈلز کو مخصوص جگہوں پر رکھا جاتا ہے اسی طرح وہ اپنی پوندوں سے مخصوص جگہوں کو دبا رہی تھی۔ یہ فن اس نے یوگا کلب میں ایک پارٹی لڑکی سے سیکھا تھا۔ اس نے مدرخ کے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا جیسے زندگی میں پہلی دفعہ کسی نے اسے سمجھا ہو۔ کوئی تو ہے پوری دنیا میں۔ سحر کہیں دور چلی گئی تھی۔ اب صرف مدرخ تھی صرف وہ رخ اور اس سے بڑھ کر دنیا میں اب اسے کوئی عزیز نہ تھا۔

”ہاں، میں تمہیں لے جاؤں گا۔ بہت جلد ہم لاہور چلے جائیں گے۔ میں تمہارے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تم ہی میری زندگی ہو۔“ وہ اس کے ساتھ یوں لپٹ رہا تھا جیسے بچہ ماں کے ساتھ ضد منوانے کے لیے لپٹتا ہے اور مدرخ اپنی کامیابی پر مسکرا رہی تھی۔



ملک منصور نے موہاٹل پر نبرو دیکھا اور مسکرا دیا۔ آنکھ کا نبرو دیکھ کر اس نے گہری سانس لی۔ وہ عورتوں کی نفسیات اور ان کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے کا ماہر فنکار تھا۔ فون بار بار بج رہا تھا۔ ہلا خراس نے فون اٹھایا۔

”ہیلو آنیٹک کیا بات ہے؟“ وہ بڑی اداس سے بولا۔ دور رہی تھی۔ سسکیاں بھر رہی تھی اور کچھ بھی نہیں بول رہی تھی۔

”ڈیز کیا مسئلہ ہے، میں ہوں نا؟“ اس نے لاڈ سے کہا۔

”منصور ابائی ہم از نو مورو۔۔۔ شی از کیا کھانڈ۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”اوہ نو!“ وہ ایک دم چلا۔

”نہیں!“

”لیکن کب اور کیسے ہوا؟“

”آج صبح، میں کب سے فون کر رہی ہوں مگر آپ فون ہی انیڈ نہیں کر رہے تھے۔“

”ہاں میں بڑی قضا لیکن میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔“ اس نے اپنی پتھر کی رفتار مزید بڑھا دی۔ وہ جلد سے جلد پی سی پہنچا۔ آنیٹک کا رورہ کر رہا

حال تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی اس کے گلے لگ کر رونے لگی اس دیا ر غیر میں صرف ایک ہی اہم انسان اسے نظر آیا تھا۔ جس پر وہ اندھا حادہ کر سکتی تھی۔

”آئی ایم ایک سٹر پبلی سوری نا اب تم کیا چاہتی ہو؟“

”میں ابھی واپس جانا چاہتی ہوں۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”اچھا میں ابھی سٹیشن کفرم کروا تا ہوں۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ آنیٹک نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں

میں آن گت سوال تھے۔

”تمہاری حالت ایسی نہیں کہ تم اکیلے جاؤ اس لیے میں خود تمہارے ساتھ جاؤں گا کیونکہ تم مجھے بہت عزیز ہو، آئی میڈو!“ ملک منصور کی

آنکھوں سے محبت جھلک رہی تھی اور لہجے سے مٹھاس۔ وہ ہمیشہ سے ایسے لمحوں کا منتظر رہتا تھا جب عورت خود کو تنہا اور بے بس محسوس کرتی ہو۔ جب

اسے مضبوط سہارے کی ضرورت ہو۔ جب اسے تحفظ چاہیے ہو جب وہ اپنے آپ کو اندر سے ٹوٹنا پھوٹنا محسوس کر رہی ہو اور جب کسی ایک پر اعتماد

کرنے کو طبیعت چل رہی ہو۔ آنیٹک اس کے ساتھ لگ کر اونچی آواز میں رونے لگی اور وہ اس کے خوبصورت شولڈر کٹ بالوں میں محبت سے

الٹیاں پھیرنے لگا۔ آنیٹک آدمی سے زیادہ دنیا گھوم چکی تھی اور بہت بولڈ تھی جاتی تھی۔ وہ اپنے پروڈیشن میں بہت ماہر تھی۔ بڑی بڑی شخصیات

سے چمچے چمچے سوالات کر کے ان کو زچ کرنے کی عادی تھی۔ اس کی بولاخس کو لوگ بہت انجوائے کرتے تھے اور اب وہ بے بسی کی تصویر بنی ملک

منصور کے ہاتھوں میں ایک کھلونائی بنی تھی۔ ملک منصور کے لیے یہ قیاسی تجربہ نہیں تھا۔ وہ ایسے مواقع سے فائدہ اٹھانا خوب جانتا تھا۔ اس نے تہران

کے لیے دو ایمر جنسی سٹیشن لیں اور فوراً تہران کے لیے روانہ ہو گئے۔ آنیٹک سارا راستہ روتی رہی اور ملک منصور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے

اور اسے ساتھ لگائے تسلیاں دیتا رہا۔

آنیٹک کا بھائی اسمعی شیرازی انھیں ایئر پورٹ پہ لینے آیا تھا۔ آنیٹک اس کے گلے لگ کر روتی رہی۔ آنیٹک کی ماما کی میت بس دفنانے

کے مراحل میں تھی۔ وہ لوگ سیدھے قبرستان پہنچے۔ آنیٹک ماما کی میت کے ساتھ لپٹ کر روتی رہی۔ اس کی ایک بڑی بہن ہادیہ ناصر اور بھائی اسے

تسلیاں دیتے رہے۔ جنازے کے بعد وہ ان کے گھر آیا تو ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ آنیٹک کے سر میں شدید درد تھا۔ وہ سلپنگ پلوے لے کر سو گئی۔

آنیکٹ کے بہن بھائی اور چند عزیز ملک منصور پر فدا ہو رہے تھے۔ اس کی اتنی محبت اور ہمدردیوں کا بار بار شکریہ ادا کر رہے تھے اور ملک منصور کا سرخسر سے بلند ہو رہا تھا۔ اس نے اسی وقت پاکستانی سفارت خانے میں فون ملایا اور وہاں پاکستان کے سفیر سے بات کی اور ذاتی طور پر ایک تعویجی مغل منعقد کرنے کو کہا کیونکہ سفیر اس کا گہرا دوست تھا۔ وہ لوگ اس کے اس قدم کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ ان کی توقعات سے بڑھ کر ان کے لیے سب کچھ کر رہا تھا۔

وہ دو دن وہاں رہا اور یہ دو دن ان سب کے لیے بہت مسرور کن تھے۔ گو کہ آنیکٹ بہت اداس تھی۔ اس نے بیس سال کی عمر میں اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا کیونکہ اس کے باپ کی اچانک موت ہو گئی تھی اور ماما کو ہالڈ کیئر کا مرض لاحق ہو گیا۔ وہ دن رات محنت کرتی۔ در در خاک چھاتی رہتی ماما کے علاج کے لیے۔ کبھی کبھی بہت ایڈوانس اور سکی کام بھی کرنے پڑتے کیونکہ ان میں پیسے زیادہ ملنے کے امکانات ہوتے۔ وہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر سب کام کرتی کیونکہ ماما کے علاج کے لیے اسے بہت محنتوں کی ضرورت تھی۔ بھائی ابھی چھوٹا تھا اور پڑھ رہا تھا لیکن اتنی جگہ دوڑ بھی ماما کو نہ چھوڑ سکتی۔ اس کی ماما کے ساتھ بہت انچسٹ تھی مگر اسے زیادہ عرصہ گھر سے دور رہنا پڑا اور ماما کی جدائی سہنا پڑی لیکن اسے خوشی کا احساس تھا کہ وہ گھر سے دور رہ کر بھی ماما کی خدمت کر رہی تھی لیکن اب تو جیسے سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی کا مقصد ماما کی دن رات کی محنت کا سبب، اب وہ کس کے لیے سب کچھ کرنے لگی۔ سب کچھ بے معنی لگ رہا تھا۔ ملک منصور اسے بہت تسلیاں دیتا ہوا وہاں آ گیا تھا۔ وہ اسے چھوڑنے لیتا رہا گئی تھی۔

”آنیکٹ! اب رونا نہیں۔ کسی سے تمہارے یہ آنسو برداشت نہیں ہوتے اور سنو! پاکستان جلد واپس آ جانا۔ کوئی وہاں تمہارا بہت شدت سے منتظر ہوگا۔“ اس نے محبت سے کہا۔ آنیکٹ نے قدرے حیران کن نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ملک منصور تمہیں تم سے بڑھ کر چاہتا ہے۔ تم اس کی زندگی بن چکی ہو اور تمہاری چاہت کے لیے وہ سب کچھ قربان کر سکتا ہے۔“ وہ سرگوشی کے انداز میں اس کے کندھے پر بازو رکھتے ہوئے بولا۔

آنیکٹ اس کے لفظوں اور لہجے کے بحر میں گم ہو رہی تھی۔ اس کا اپنا وجود مٹ رہا تھا اور وہ ملک منصور کی ذات میں غم ہو رہی تھی۔ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ بس اس کی طرف دیکھتی رہی۔ شاید وہ بھی اندر سے ایسا ہی چاہتی تھی۔ پاکستان میں ایک ماہ کے قیام کے دوران ملک منصور نے اس کی جس طرح پڑائی کی تھی اور جتنی محنت بڑھائی تھی اس کے لیے تو اپنی ہستی مٹا دینا بھی کچھ معنی نہ رکھتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی چمک پیدا ہوئی مگر شاید وہ جگہ اور وقت نامناسب تھے یا پھر یہ انکشاف اتنا اچانک اور حسین تھا کہ وہ اسٹنڈ ہو کر رہ گئی تھی۔

”تو کیا میں انتظار کروں؟“ ملک منصور نے خدا حافظ کہنے سے پہلے پوچھا۔ وہ گہری سوچوں میں گم تھی۔ فیصلہ کرنے یا نہ کرنے کی پھوٹن میں۔

”یو لو! آنیکٹ! آنیکٹ نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ خوش ہو گیا۔

”جیتک پو!“ خوشی سے بولا۔ وہ خوش خوش لوٹ رہا تھا۔ کامیاب و کامران اپنے ہر مشن میں ہمیشہ کی طرف کامیاب..... کچھ لوگوں کی قسمت میں قدرت کا میاں ملتا ہے۔ جس چیز میں ہاتھ ڈالتے ہیں وہ آپ ہی آپ سونا بن جاتی ہے ملک منصور نے مسکرا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اسے اپنا آپ آسمان پر اڑتا ہوا محسوس ہوا۔



شزا اپنے آپ کو ہر وقت مشکل کے ساتھ مصروف رکھتی۔ اس کا بہت خیال رکھتی۔ وہ انیس وقت پر دیتی۔ باہر گھمانے پھرانے کے لیے لے جاتی مگر وہ ہر وقت خاموش روایت کی طرح گم صم بیٹھی رہتی۔ شزا کچھ پر بھتی تو اٹھ پلٹا جواب دیتی۔ ایک بات کے جواب میں دس بے ربط جملے سناتی۔ کبھی عجیب و غریب آوازیں نکالتی تو کبھی عجیب و غریب الفاظ اور محاورے استعمال کرتی اور ان کو ناں اسٹاپ ڈیڑھائی رہتی۔ اٹھ بیوں کے ساتھ کھیلتی رہتی۔ وہ اپنے آپ سے بالکل لاتعلقی ہوتی جا رہی تھی۔ شزا خود اسے کپڑے پہناتی۔ اس کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھتی۔ کافی دنوں کی کیر اور دواؤں کے بعد وہ اسے ایک دن کچھ بہتر محسوس ہوئی۔ جب اس نے خود کنگھی کی اور ناشتے کی ٹیبل پر مناسب انداز میں ناشتا کیا وہ نہ روزانہ کبھی وہ فراہمڈ اٹھنے کو چاہئے میں ڈال دیتی تو جیم کو پلیٹ میں اٹھنے کی طرح پھیلا کر اوپر تک چھڑکتی اور کانٹے سے کھانا شروع کر دیتی۔ شزا کو ناشتا بھی اسے خود ہی کرنا پڑتا تھا۔ آج وہ اسے دیکھ کر قدرے مطمئن ہوئی تھی۔ اس نے خود ہی سلاکس پر جیم لگایا اور آرام سے کھا رہی تھی کہ ملک منصور اچانک آ گیا۔ وہ چار پانچ دن بعد گھر لوٹا تھا۔ شزا اسے یوں اچانک دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ ان دنوں اس نے نہ گھر فون کیا تھا نہ کسی اور طرح کو ٹیکہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ شزا کو اس پر سخت غصہ تھا۔ بیٹی اتنی بیمار اور اس شخص نے ایک دفعہ بھی اس کو فون کر کے نہیں پوچھا تھا۔

”ہائے ڈارلنگ! کیسی ہو؟“ اس نے شزا کو مخاطب کیا۔ دنوں خاموشی سے ناشتا کرتی رہیں۔ شزا نے کوئی جواب نہ دیا۔

”بیمار! کیسی ہو بیٹا؟“

”ٹھیک ہوں، آپ نے ٹرین کی آواز سنی ہے۔ دل بچ رہی ہے۔“ اس نے ایک دم اٹھ کر ٹرین کی طرح چمک چمک کرنا شروع کر دیا۔

شزا امر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ وہ چہرے لیے پہلے اسے بالکل ٹھیک سمجھ رہی تھی۔ اب بالکل تبدیل لگ رہی تھی۔

”اٹس دی ری سیڈ؟“ ملک منصور بولا۔

”آپ کو اس سے کیا۔ سی آپ کی اولاد تھوڑی ہے۔“ شزا جھمکے سے بولی۔

”اچھا یا نکشاف اب کر رہی ہو۔“ وہ مسکون لہجے میں بولا۔

”منصور! کچھ تو خدا کا خوف کریں۔ آپ اس طرح بی بیو کر رہے ہیں جیسے وہ آپ کی سوتیلی اولاد ہو۔“

”اوہ آئی سی! اس طرح کہنا۔ شزا! کیوں ناراض ہو رہی ہو۔ میں مصروف ہی اٹھا ہوں کہ میرے پاس وقت نہیں ہوتا۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔ اچانک مجھے ایمان جانا پڑا۔ وہ پاکستان کے سفیر احمد علی شیروانی کی قریبی رشتے دار کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ مراسم اٹھانے اچھے تھے کہ اچانک جانا پڑا۔ گھر فون کیا مگر تم مصروف تھیں۔ ظاہر ہے پھر دو دن رہنا پڑا۔ تعویذ اچھاں ہوا۔ دعائے مغفرت کرانے کے بعد رات کو تو لوٹا ہوں اور اب گھر آ رہا ہوں۔ تم نے اخبارات میں پڑھا تو ہوگا۔“ ملک منصور نے بات تو زبردستی بتائی۔

”جہیں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”تم کفر کر سکتی ہو اگر مجھ پر یقین نہیں۔ یہی ایسی مصروفیات سے اب انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اتنی سا کہ بتا کر آپ پیچھے تو نہیں ہٹ سکتے۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

کی آواز آئی۔ سزا جلدی سے اندر داخل ہوئی۔ شعل کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ نیچے کاٹ کا گلدان ٹوٹا پڑا تھا۔ اس نے مقتول ہو کر گلدان اپنے سر پہ مار لیا تھا۔ سزا تو سر پیٹ کر رہ گئی۔ جلدی سے اس کا سر دیکھا۔ ڈھم زیادہ گہرائی میں آ گیا تھا اور کوئی کرچی بھی سر میں نہیں چھپی تھی۔ وہ جلدی سے اس کے سر پر جنڈج لگا کر ایک پرائیویٹ کلینک میں لے گئی۔ وہ سخت پریشان تھی۔ اسے ڈریسنگ کروانے کے بعد وہ گھر لے آئی۔ ملک منصور لائٹ آف کیے پر مسکون سو رہا تھا۔ شعل کو میڈیسن کھلا کر اس نے اسے سلا دیا تھا۔ ڈاڈا نے اس کے قدم سر کے کمرے کی طرف اٹھ گئے۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھول کر جھانکا۔ وہ کارپٹ پر بے ہوش پڑی تھی اور پاس رکھے ایش ٹرے اور اس کے ارد گرد مگرینوں کے ادھ چلے کھود کا ڈیرہ پڑا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا۔

اے خدا یا ایہ گھر ہے یا ناگل خانہ..... وہ شہید یعنی اضطراب میں جھٹا ہو گئی تھی۔

شفیق گھر آ چکی تھی اور حیدر اسے بیٹا سمجھا رہا تھا۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں کے بارے میں اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے اسے آمادہ کر رہا تھا۔ شہلا بھی اس کے ساتھ گھر جا چکی تھی۔

”انگل امیں کیا کروں۔ میں اتنے گناہوں کے بوجھ تلے کیسے جی پاؤں گی۔ میں اپنے ذہن سے سب کچھ جھٹکنا چاہتی ہوں مگر سب کچھ جوں کا توں رہتا ہے۔ میں بہت کمزور اور بے بس ہوں۔ مجھے کچھ نہیں آ رہا میں کیا کروں۔ آپ ہی بتائیے میرے گناہوں کا کیا کفارہ ہونا چاہیے۔ سکیل اور آصف کے ناحق خون میری گردن پر ہیں جو مجھے ایک ہل بھی چھن نہیں لینے دے رہے۔“ وہ شہید یعنی اذیت میں تھی اور جھجھکتے ہوئے سب کچھ بول رہی تھی۔

”کیا تم نے خدا اپنے ہاتھوں سے انھیں قتل کیا ہے؟“

”لیکن بچہ تو میں بنائی ہوں۔“

”بہت سی باتوں کی بہت سی وجوہات بنتی ہیں مگر زمانہ اور عقل اسے تسلیم نہیں کرتے ہیں جو حقیقت ہو اور حقیقت کو جو بھی عملی جامہ پہنائے وہی تصور اور ظہر رہتا ہے۔“

”تو بہت سے ایسے گناہ جن کا تعلق صرف اور صرف انسان اور خدا سے ہو جنھیں بندہ اور خدا جانتا ہو تو کیا ان کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہوتی۔ کیا قدرت انھیں معاف کر دیتی ہے؟“

”تم بھی ٹھیک کہتی ہو لیکن اب تم کیا کر سکتی ہو۔ کیا اپنے آپ کو قتل کر کے تم کسی ایک شخص کو بھی ذمہ دلا سکتی ہو یا پھر اس طرح کوئی کفارہ ادا کر سکتی ہو تو میں تمھیں ضرور ایسا کرنے کو کہتا لیکن یہ سب بے معنی ہے۔“

”میں اس اذیت سے کیسے اپنے آپ کو نجات دلاؤں جو میں لمحہ بہ لمحہ سہہ رہی ہوں۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے میں کس قدر کرب میں

ہوں۔“

”میں اچھی طرح جانتا ہوں لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ ان کچھ تاؤں کا کوئی فائدہ نہیں اس لیے اگر اس اذیت سے نجات چاہتی ہو تو ان کے خاندانوں کے لیے کچھ کر سکتی ہو تو کرو۔ یہی ایک طریقہ ہے اور یہی راستہ ہے۔“ حیدر نے کہا تو وہ اس کی بات سن کر سوچ میں پڑ گئی جیسے اس کے ذہن کی سوئی کہیں ایک گئی ہو۔

”ہاں جیٹا، یہی ایک راستہ ہے۔ اپنے آپ کو ان کے لیے وقف کر دو۔ ان کی تلافیں کم کرنے کی کوشش کرو۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ تمہیں معاف کر دیں۔“ حیدر کے سمجھانے پر وہ کچھ سمجھ گئی تھی اسی لیے خاموش ہو گئی۔

”انگل ایش کچھ دن ادھر ہی شہر میں رہنا چاہتی ہوں۔“

”ہاں ہاں بیٹا، یہ گھر آپ کا اپنا ہے۔ جہاں چاہو رہ سکتی ہو۔ اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔“

”جینک برا نگل!“ وہ آہستہ سے بولی اور وہ مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

.....

ولیم ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر لیٹا بری طرح کرا رہا تھا۔ اسے سخت بخار تھا۔ سارے جسم پر کچکی طاری تھی۔ باہر شدید ٹھنڈ اور دھند تھی۔ اس نے آہستہ سے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ایک تقریرتی اس کے پاس بیٹھی تھی۔

”اٹھ گیا ہے پتہ! آنکھیں تو کھول۔ شکر کر مولا نے تیری جان بخشی کی۔ منے تو بھی تو اللہ کو بس پیارا ہی ہو گیا۔ تیری حیاتی تو بس مولا کا کرم ہے۔ ساری رات ٹھنڈے پانی میں ٹانگیں پڑی رہیں، تنے کچھ الم ہے۔“ ہنر بھی تقریرتی بول رہی تھی اور اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

”تو کدھر کر رہے ہے؟“ وہ اس سے پوچھ رہی تھی اور موٹی سی گند کی سی رضائی سے اس کی ٹانگیں ڈھانپ رہی تھی۔

”میں کہاں ہوں؟“ وہ آہستہ سے کرا جاتا ہوا بولا۔

”پتہ تو لگرنہ کرا تو بس نام بتا دو۔ منے خود تنے گھر سے کسی کو بلاؤں ہوں۔“

”ایک کانڈ پسل دو۔“ اس نے بمشکل کہا۔ وہ عورت چٹکی سے باہر نکل گئی۔ نہ جانے کہاں سے کانڈ کا کنوا اور چھوٹی سی پسل ڈھونڈ کر لائی اور اسے پکڑائی۔ اس نے بمشکل گھر کا ایریس لکھ کر دیا۔

”تو بس لینے رہو۔ میں ابھی آؤں ہوں۔“ وہ کانڈ سنبھال کر باہر نکل گئی۔

”ولیم کل شام سے گھر سے نکلا تھا اور رات بھر گھر نہیں آیا۔ اور اگلے دن کی دوپہر ہو چکی تھی اور اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔ شہلا بہت پریشان تھی۔ اس کی طبیعت بھی بہت خراب تھی۔ اس نے حیدر کو فون کر کے بلایا اور وہ ہر جگہ اس کے ایک دو دوستوں کے گھر باٹل ہر جگہ تلاش کر رہا تھا۔ نور بھی فون سن کر پہنچ چکی تھی۔ سب کو حیرت تھی کہ وہ کہاں چلا گیا تھا۔ وہ تو ماما کی دوائیاں لینے گیا تھا اور خانساں کی موٹر سائیکل پر گیا تھا البتہ اے ٹی ایم کارڈ اس کے پاس تھا مگر وہ کہاں جاسکتا ہے۔ شہلا بار بار اپنے آپ سے پوچھتی۔ حیدر اسے تسلیاں دیتا مگر وہ خود بھی اندر ہی اندر پریشان تھا۔ کہیں سے کوئی خبر نہیں مل رہی تھی۔

”اٹکل! اگر آپ کہیں تو میں اپنے بڑے بچے سے بات کروں۔ وہ پولیس میں ہیں۔“ نور نے مشورہ دیا۔

”نہیں، ابھی اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے تھوڑا سا انتظار کر لینے دو۔“

”مگر حیدر! میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ وہ تو کبھی بھی کہیں نہیں گیا۔ اسے تو یہاں کے راستوں کا بھی علم نہیں۔ وہ کہاں جا سکتا ہے۔“ شہلا

بے صبری سے بستر پر تڑپ رہی تھی۔

”پلیز شہلا! حوصلہ کرو۔ وہ آ جائے گا۔ میرا دل کہتا ہے وہ آ جائے گا۔“ حیدر نے اسے تسلی دی اور کہیں فون ملانے لگا۔ ”میں ابھی اپر

لیول پر بات نہیں کر رہا۔ پہلے خود تلاش کر لوں تو پھر۔“ وہ باہر جانے لگا تو شہلا نے استغہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اسے کہاں ڈھونڈ دے؟“

”میں ابھی آتا ہوں۔“ وہ گیٹ تک پہنچا ہی تھا کہ وہ فقیرنی کا نڈکا ٹکڑا لے لے گیٹ پر کھڑی تھی۔ وہ اسے بھانکنے لگا کہ جیب سے پیسے

لے لے لگا۔

”نہ صاحب جی! میں تو تیرے بہت کی خبر لاؤں ہوں۔ وہ سویرے سے مارے پاس ہے۔ مولانے کرم کیا وہ بچ گیا۔ وہ تو مارے سائیں

نے اسے چھپڑ میں دیکھ لیا۔“

”چھپڑ میں؟“ حیدر نے حیرت سے پوچھا۔

”آں..... آں..... ساری رات نماز کی ٹانگیں ٹھنڈے برف پانی میں ڈبی رہیں۔ اس کو گھر لے آؤ۔ مولانے چل بھی سکے ہے کہ نہیں۔“

”کیا مطلب؟“ حیدر چونک گیا۔

”خود ہی چل سکے، کھو، امیں تو کچھ نہیں مالوم۔“

”اچھا گاڑی میں بیٹھو۔“ حیدر نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ نور بھی باہر آ چکی تھی۔

”اٹکل! کیا کچھ معلوم ہوا؟“ وہ فقیرنی کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”ہاں اور شاید وہ ٹھیک نہیں۔“

”اٹکل میں آؤں؟“

”نہیں، تم شہلا کے پاس رہو۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں اور وہ اکیلی بھی ہے۔ اس کو بتاؤ کہ میں دلیم کو لینے جا رہا ہوں۔“ حیدر نے کہا تو وہ

خاموشی سے اندر چلی گئی۔ اس نے شہلا کو بتایا تو اسے قدرے سکون ملا۔

وہ فقیرنی حیدر کو اندر چکی میں لے گئی۔ دلیم کو اس حالت میں دیکھ کر اسے سخت حیرت ہوئی۔ اس کے سر پر چوٹ لگی تھی اور اس فقیرنی نے

اس کے سر پر ہلکا سا کپڑا باندھا تھا۔

”دلیم بیٹا! کیا ہوا؟“ حیدر نے پیار سے کہا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

”اٹکل! میں کہاں ہوں؟“

”اٹھو بیٹا! میں قسمیں لینے آیا ہوں۔ گھر چلو۔ تمہاری سہ ماہیت پریشان ہیں، جیت کرو۔“ حیدر نے رضائی پیچھے کی اور اسے سہ ماہی کے کراٹھانا چاہا مگر اس کی دونوں ٹانگیں تو جیسے سن ہو گئی تھیں۔ ان میں ہانکل حرکت باقی نہیں تھی۔ حیدر کو شدید شاک لگا۔ اس نے خود اس کے پاؤں زمین پر رکھے اور اسے کھڑا کرنے کی کوشش کی مگر اگلے ہی لمحے وہ حیرانم سے زمین پر گر گیا۔ حیدر جیسے صحت مند توانا شخص سے بھی اسے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔

”اماں! کوئی بندے ہاں ہیں تو ان کو بلاؤ۔ اسے گاڑی تک لے جائیں۔“ حیدر نے تقیرنی سے کہا۔

”جی صاحب جی!“ وہ ہاں ہل گئی اور دو تین جوان بڑکوں کو ہاں سے بلا لائی جنہوں نے اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈالا۔ ولیم قد کاٹھ میں سب سے لمبا تھا۔ اگرچہ بلا چلا تھا مگر پھر بھی اسے اٹھانا قدرے مشکل ہو رہا تھا۔ حیدر نے تقیرنی کو کچھ پیسے دیے اور اس کا شکریہ ادا کر کے واپس آ گیا۔ اس نے گاڑی کا رخ ایک پرائیویٹ اسپتال کی طرف موڑا۔ ڈاکٹروں نے فوراً اس کو ایڈمٹ کر لیا۔ اس کے ٹیسٹ لیے جا رہے تھے۔ بخار کم کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اس نے گھروفن کر کے نوز کو صورت حال بتائی کہ ولیم کو بخار ہے اس لیے وہ اسے اسپتال لے آیا ہے۔ اسے خود ایک اہم میٹنگ کے لیے بھی جانا تھا۔ اس نے اپنے پی اے کو وہاں بلا لیا اور خود میٹنگ اینڈ کرنے چلا گیا۔ رات گئے وہ وہاں سے لوٹا تو ولیم ابھی تک بے ہوش تھا۔ حیدر نے سرجن سے ملاقات کی اور اس کی آنکھوں کے بارے میں پوچھا۔

”حیدر صاحب! آئی ایم سوری..... رہ پوڈس کچھ ہو پفل نہیں۔ شاید ساری رات شدید خفہ اور خفہ پانی میں رہنے کی وجہ سے ان میں حرکت باقی نہیں رہی۔ دھن ہو سکتی ہیں۔ خدا سے امید ہے کہ رفتہ رفتہ ٹھیک ہو جائے گا مگر فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتے۔ آپ تو خود ڈاکٹر ہیں۔ پھوٹیشن کو بہتر سمجھ سکتے ہیں۔“ ڈاکٹر کے لہجے میں جھمی مایوسی کو اس نے محسوس کر لیا۔ اسے سخت الجھن ہو رہا تھا کہ وہ شہلا کو کیسے سب کچھ بتائے گا جبکہ وہ خود انتہائی سیریس حالت میں بستر پر ہے۔

”ٹھیک ہے، آپ علاج جاری رکھیے۔ کیا فزیو تھراپی سے کچھ ممکن نہیں؟“

”میں نے کہا تھا ہم ہر ممکن طریقے سے کوشش کریں گے کہ وہ نارمل ہو جائے لیکن اس کے لیے وقت درکار ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا تو وہ خاموش ہو گیا۔

اس نے اگلی صبح فون کر کے نوز کو اسپتال بلا لیا اور اسے ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھی بے حد پریشان ہو گئی۔ اس کے لیے بھی یہ ایک ناقابل برداشت صدمہ تھا۔ وہ تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسی آفتا اس پر آ پڑے گی۔

”اٹکل! لیکن یہ سب کیسے ہوا؟“

”معلوم نہیں، میں نے تو اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ وہ شدید بخار میں تھا۔ اب پوچھتے ہیں مگر جو بھی ہوا بہت برا ہوا ہے۔“ حیدر کے چہرے پر بھی افسردگی اور مایوسی چھائی تھی۔ ولیم آنکھیں کھولے چہت کو گھور رہا تھا۔

”ولیم کیسے ہوا؟“ نوز اپنے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ لا کر بولی۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"لیکن بیٹا! تم کہاں گئے تھے اور یہ سب کیا ہوا؟"

"اگلے امی اے ٹی ایم کارڈ سے پیسے لینے کہیں میں گیا تو وہاں پہلے ہی ایک شخص موجود تھا۔ میں نے خیال نہ کیا اور پیسے نکال لئے۔ اس نے شاید ماؤنٹ دیکھ لیا یا مگر کیا ہوا مجھے سمجھ نہیں آیا۔ اس نے مجھ سے کارڈ چھیننے کی کوشش کی۔ میں باہر بھاگا اور سوئٹس سائیکل جڑی سے چلانے لگا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس کے کتنے ساتھی میرا پیچھا کر رہے تھے۔ ایک دم پورا گینگ میرے پیچھے پڑ گیا۔ میں اندھا دھند سوئٹس سائیکل دوڑاتا رہا کہ ایک لڑکا میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھ سے کارڈ چھینا اور پھر کسی نے میرے سر پر کچھ مارا۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہ رہا۔ آنکھیں کھلیں تو اس فقیر کی جھونپڑی میں تھا اور وہی بتا رہی تھی کہ کسی جوہڑ کے خضفے سے بیخ پانی میں میری انگلیں ساری رات پڑی رہی تھیں۔ جسم باہر تھا۔ اگلے امیری انگلیں حرکت نہیں کر رہیں۔ کیا اب.....؟" اس نے استغما یہ لگا ہوں سے حیدر کی طرف دیکھا۔

"نہیں بیٹا، ایسی کوئی بات نہیں۔ میری ابھی سرجن سے بات ہوئی ہے اور وہ بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ یہ قحطی پرالم ہے۔ تم اپنی دل پاد سے جلدی ٹھیک ہو جاؤ گے۔ بس کوشش کرو انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" حیدر نے اسے تسلی دی مگر نور کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اسے شدید صدمہ ہو رہا تھا۔ اس کا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہ رہا تھا مگر وہ اس کے سامنے رونے نہیں چاہتی تھی کیونکہ وہ تو خود اسے ہمیشہ تسلی دیتی آ رہی تھی اب کیسے اس کے سامنے حوصلہ باندھتی۔

دو تین دن بعد ولیم کو وکیل جیٹر پر بٹھا کر گھر لے جایا گیا۔ اسے اپنی اس بے بس حالت پر شدید دکھ ہو رہا تھا۔ شہلا اسے یوں دیکھ کر جیسے سکے میں آگلی تھیں۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی ولیم کی طرف دیکھیں تو کبھی جیٹر کی طرف..... سب کچھ اتنا چانک اور غیر متوقع تھا کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ ایسا ممکن ہو سکتا ہے۔ وہ اتنی ہی دیر خاموش رہیں۔ کبھی نور کی طرف دیکھیں، کبھی حیدر کی طرف تو کبھی ولیم کی طرف۔

"ولیم بہت جلد اچھا ہو جائے گا۔ انکڑوں نے بہت تسلی دی ہے۔ بس چند ہفتوں کی بات ہے۔" حیدر قدرے اونچی آواز میں بولے۔

"اگلے! چند ملے..... تو کیا میں ایسے ہی رہوں گا؟" ولیم نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں بیٹا، مجھ جی ہے۔" حیدر سمجھانے کے انداز میں بولے۔

"مگر پھر بھی کب تک؟" ولیم جانے پر مصر تھا۔

"یہی دو تین ہفتے۔" حیدر نے اس سے کہا تو وہ خاموش ہو گیا۔

اس کے لیے یہ بے بسی اور صدمہ برداشت کرنا قطعی مشکل ہو رہا تھا۔ وہ تو بچپن سے اپنے آپ کو فضاؤں میں اڑاتا ہوا محسوس کرتا آیا تھا۔ جہازوں کو اڑاتا ہوا، پرندوں کے سنگ پرواز کرتا ہوا اور جب فادر نے روح کی پرواز کی بات کی تو اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سمجھایا۔ اتنی آزمائشیں بھرنے والا، زندگی اور انسانوں کو بہت اونچائی سے دیکھنے والا یکدم زمین پر ریگتے کیڑے کے مانند آگرا تھا۔ اتنی بے بسی کہ وہ قدم چلنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ دوسروں کا سہارا بننے کا خواب دیکھنے والا خود بے آسرا ہو گیا تھا۔ وہ آنکھیں بند کرتا تو وہ آنسوؤں سے بھر جاتیں۔ کھولتا تو آنسو

اشک بن کے بہہ نکلتے۔ وہ جن شدید جذبات سے دوچار ہو رہا تھا اس نے اس کو اندر سے بے حد کمزور اور کھوکھلا کر دیا تھا۔ کاش وہ زندہ نہ پچتا۔ ایسی بے بسی کی زندگی سے تو موت بہتر تھی۔ وہ ہار ہار اپنے دل میں دعا کرتا۔ کیسی بے چارگی تھی۔ اس ستر مرگ پر تھی اور وہ اپانچ بنا این پیاں رگڑ رہا تھا۔ زندگی کی سانسیں بدلوں کے لیے مشکل ہو رہی تھیں مگر اس کاڑی کو دونوں سمجھ رہے تھے۔

اگر نور اور حیدر اکل نہ ہوتے تو کیا ہوتا۔ وہ اکثر ان دونوں کی تار و پود کی تار و پود سے متاثر ہو کر سوچتا۔ وہ شخص پہلے ممالی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اب وہ اسے بھی ہاسٹل لے کر جاتا تھا۔ ایک مستقل انٹینڈنٹ کریم خان انھوں نے اس کے لیے مقرر کر دیا تھا۔ وہ ہر روز اس کی ہانگوں کی مالش کرتا۔ اس کو ایک سرساز کر داتا اور فزوقرانی کے لیے دی اب اسے ہاسٹل لے کر جاتا۔ نور ہر روز اس کا حال پوچھنے آتی۔ اس کے لیے اور ممالی کے لیے کھانے بناتی۔ اس کے قراڑیتر کے ایگزاحزمی ہونے والے تھے مگر وہ ان دونوں بھی روزانہ چکر لگاتی۔ اسے حوصلہ دیتی مگر اب اس سے ناراض نہیں ہوتی تھی۔ پانچ مہینے گزر گئے تھے فزوقرانی کا اثر ہو رہا تھا اور سندھائیوں کا۔ جیسے جیسے دن گزر رہے تھے، ولیم کا ڈپریشن بدھتا جا رہا تھا۔ ممالی سے دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتیں۔ ستر پر لٹی اندر دی اندر نہ جانے کیا کچھ سہتیں۔ وہ کیموقرانی کے چار کوس کر دیا چکی تھیں اور اب ان کا دل مزید اس کے بارے میں سوچ کر گھبراتا شروع ہو جاتا تھا۔ اتنی اذیت سہتے سہتے وہ غر حال ہو گئی تھیں۔ پورے جسم کی جلد جیسے جل چکی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے رگوں میں دوڑنے والا خون بھی جل کر سیاہ ہو چکا تھا۔ سر پر بال تھے نہ آنکھوں اور بھوڑاں پر انھیں دیکھ کر خوف سا آتا تھا اور ولیم کو دیکھ کر انھیں ہوتا تھا۔

ولیم اب بہت جھنجھلائے لگا تھا۔ شہلا کے ساتھ بھی بدتمیزی سے بات کرتا اور کریم خان کو تو اکثر مارنے کو پکارتا اور اکثر غصے میں کوئی نہ کوئی چیز اپنے آپ کو مار لیتا۔ حیدر اس کی وجہ سے بہت پریشان ہو رہے تھے۔ نور استقامت کے بعد فارغ ہو کر ادھر ہی آ گئی تھی۔ انور بچا اس پر بہت برے تھے مگر وہ کسی کی پروا کب کرتی تھی۔ جب وہ کوئی کام کرنا چاہتی تھی، کر کے رہتی تھی اور ایسا کرنے کو حیدر اکل نے کہا تھا کیونکہ ولیم کی حالت روز بروز بگڑ رہی تھی اور حیدر اکل کو خسر ہونے کے تانے ایک میٹنگ کے سلسلے میں پیرس جانا تھا۔ ان کا وہاں قیام دس روزہ تھا اس لیے انھوں نے نور کو وہاں رہنے کو کہا۔ شیر شاہ کو بھی انھوں نے وہاں ان کی دیکھ بھال کے لیے بھیج دیا۔ وہ ہر روز دن میں دو تین دفعہ فون کرتے۔ ولیم اور شہلا کی خیریت پوچھتے۔ کوئی مسئلہ نہ تھا تو وہ بتاتی۔

ولیم زیادہ تر اندھیرے کمرے میں بند رہتا۔ اس نے اب فزوقرانی کے لیے بھی جانا چھوڑ دیا تھا۔ کریم خان کو بھی کمرے میں نہیں آنے دیتا تھا۔ نہ وہ میل جیمز پر بیٹھتا نہ ممالی کے پاس جاتا اور نور سے بھی اکثر اکڑا کرتا۔ نور اس کے لیے سوپ بنا کر لاتی تھی۔ کمرے میں بالکل اندھیرا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر لائٹ آن کی تو وہ ایک دم بڑا اکڑا گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ نور کو دیکھ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

”ولیم اٹھو! سوپ پی لو۔“ نور نے اس کے بیڈ کے پاس رکھے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش رہا۔

”ولیم اٹھو!“ اس نے اس کا بازو آہستہ سے پکچے کیا۔

”مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔“ دو غصے سے چلا یا تو وہ چونک گئی بلکہ قدرے ڈر بھی گئی۔ وہ تو ہمیشہ مجھے لمبے میں بات کرنے کا عادی تھا۔ وہ

خدی تو ہو رہا تھا مگر اتنا زیادہ اسے قلعی تو نہیں تھی۔

"ولیم! میں کہہ رہی ہوں اٹھو۔" وہ بھی اپنی بات پر ہند تھی اس نے اس کا بازو مضبوطی سے پھپھہ ہٹایا۔

"ہاں! دیکھ لو میری بے بسی، مجھ پانچ بلوے، لنگڑے کود کچلو۔ ہار ہار اٹھنے کو کہہ دی ہو، کیسے اٹھوں؟" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گیا۔

"ولیم! تم اس قدر جلدی صحت ہار جاؤ گے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"کیا ابھی بھی جلدی ہے، مجھے دو ماہ ہو گئے ہیں اس طرح بستر پر ایذاں رگڑتے، اس جسم کو تھپتھپے تھپتھپے۔ فوراً تم مجھے شوٹ کیوں نہیں کر دیتی۔ پلیز مجھ پر احسان کرو۔" وہ بے بسی سے بولا۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نا اور تمہیں شوٹ کر دے۔ اور جو تم سے محبت کرتی ہے۔ دن رات تمہاری صحت کے لیے دعا نہیں کرتی ہے۔ وہ خود تمہیں اپنے ہاتھوں سے شوٹ کر دے۔" وہ قہقہے سے بولی۔

"کیا تم اب بھی مجھ سے محبت کرتی ہو؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، پہلے سے بھی زیادہ۔"

"نہیں، تم محبت نہیں اہمردی کر رہی ہو۔"

"ٹھیک ہے، اہمردی بھی ان کے ساتھ کی جاتی ہے جن کے لیے دل میں محبت ہو اور میں تم سے محبت بھی کرتی ہوں اور اہمردی بھی، سمجھے تم؟"

"کیا ابھی بھی مجھ جیسے پانچ انسان کے ساتھ؟"

"ہاں، تم میری محبت کو کسی بھی شے میں نہ قول سکتے ہو نہ ناپ سکتے ہو اور میں تمہیں پانچ نہیں صرف اور صرف ایک اچھا انسان سمجھتی ہوں۔ ایسا جس کو میں نے سب سے بڑھ کر چاہا ہے اور چاہتی رہوں گی۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اسے اس کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"تم کب تک ایسا کرتی رہو گی؟"

"جب تک تم ٹھیک نہیں ہو جاتے اور اپنے پاؤں پر نہیں چلتے۔"

"میں اب کبھی بھی نہیں چل پاؤں گا۔" وہ مایوسی سے بولا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ یہی حقیقت ہے۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"لیکن میں کہتی ہوں تم جلد چل پاؤ گے اور مجھے نہ صرف یقین ہے بلکہ یہ میرا ایمان بھی ہے۔" وہ مہم ارادے سے بولی۔

"تم حقیقت کو تسلیم کیوں نہیں کرتیں؟"

"میں صرف خدا پر ایمان رکھتی ہوں۔ ساری چائیاں، ساری کرائٹیں اور مجھ سے اس کی اولاد سے وابستہ ہیں۔"

"تمہارا خدا مجھے کبھی ٹھیک نہیں کرے گا۔"

”کیوں اس کی تم سے کیا دشمنی ہے؟“ وہ مسکرا کر بولی۔

”کیونکہ میرا اس پر ایمان ہے اور نہ اپنے خدا پر۔“

”تو پھر کس پر ہے؟“

”کسی پر نہیں۔“

”ٹھیک ہے، میں بحث نہیں کرتی۔ مجھے تو جس پر پورا یقین اور اعتماد ہے اس تک تو رسائی کرنے دو پھر دیکھتے ہیں کون کس کو چھوڑتا ہے۔“

وہ یقین لہجے میں بولی۔

”تم کیا کرو گی؟“

”ابھی تو تم سوچ بیٹھ گئے۔ آج سے میں ایک ویلیفڈ پڑھوں گی اور پھر تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔“ وہ یقین آمیز ہو کر بولی۔

”ہو نہ یہ ایسا کہنا کس قدر آسان ہے۔“

”اس کے لیے کہنا اس سے بھی زیادہ آسان ہے۔ وہ صرف ”کن“ کہتا ہے اور زندگی وجود میں آ جاتی ہے۔ گارے کے ٹکٹے ہوئے

وجود میں روحیں پھونکتی ہیں اور پھر ان روحوں کو قبض بھی دیا کرتا ہے۔“ وہ بول رہی تھی اور وہ محو ہو کر سن رہا تھا۔

”اب جلدی سے سوچ بیٹھ۔ بس انگریز ہو جاتا چھوڑ دو میرے لیے، کیا تم میرے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے۔“ نور نے اس کے ہاتھ کو اپنے

ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ کر محبت سے کہا۔

”تمہارے لیے..... تمہارے لیے۔“ وہ خاموش ہو گیا اور اس کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگا کر سسکتے لگا۔

”میں تمہیں یوں سسکتا ہوں نہیں دیکھ سکتی۔ صرف میری خاطر ناراض ہونا اور مایوس ہونا چھوڑ دو۔ کوئی بھی شکوہ، کوئی بھی دکھ اور تاراجی

تمہاری باتوں اور لہجے سے نہ چٹکتے۔ وعدہ کرو تم آئندہ ایسا کچھ نہیں کرو گے۔ تم تمہا نہیں ہو۔ میں زندگی کی آخری سالوں تک تمہارے ساتھ ہوں۔

اگر تم اپنا جی بھی رہے تو تمہاری بیساکھی بنوں گی اور جب تم چلنا شروع کرو گے تو تمہارے ہر قدم کے ساتھ میرا قدم اٹھے گا۔ معذرت انسان کو یہی مایوسی

ہوتی ہے تاکہ وہ زندگی میں تمہارا نہ جائے گا۔ میرا تم سے وعدہ ہے تم کبھی بھی زندگی میں تمہا نہیں رہو گے اور نور جو بات کہتی ہے وہ کرتی ہے وہ کرتی بھی

ہے بشرطیکہ.....“ وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”بشرطیکہ کیا؟“

”اگر خدا بھی ایسا چاہے۔ جب وہ نہیں چاہتا تو انسان شدید بیماریوں اور خواہشوں سمیت بھی کچھ نہیں کر پاتا۔“ وہ قلعیت سے بولی۔ وہ

نور کی بات سن کر ایک لمحے کے لیے بہت بڑا امید ہوا تھا اور دوسری بات سن کر ایک دم پھر تاریکی کی طرف جانے لگا۔ مایوسی کا سایہ اس کے چہرے پر

پھرانے لگا۔

”کیا ہوا؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”تم..... تم مجھ سے جدا نہ ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر میں بھی زندہ نہیں رہوں گا۔“

”ڈونٹ بی کلی! ہم دونوں دنیا میں تھا آئے تھے اور تمہاری جانتا ہے۔ تم حقیقت پسند ہو۔“

”تم مجھے الجھاتی ہو۔ جب میں حقیقت پسند ہو کر سوچتا ہوں تو تم مجھے خواب دکھاتی ہو اور جب میں خوابوں میں کھوتا چاہتا ہوں تو تم تلخ

حقیقت کی باتیں کرتی ہو۔ تم ہمیشہ میرے ساتھ ایسا کیوں کرتی ہو؟“

”کیونکہ میں ایسی ہی ہوں۔ میں نے زندگی کے دونوں نرغ دیکھے ہیں اس لیے میری سوچ بھی ایسی ہی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

”اب تم سوپ پی لو۔“ نور نے باؤل اس کے آگے کیا اور وہ خاموشی سے سوپ پیئے لگا۔

”تم پڑھائی کیوں نہیں شروع کرتے۔ وقت کیوں ضائع کر رہے ہو؟“ نور برقی سیٹے ہوئے بولی۔

”بہت مشکل ہے۔ اب میرا ذہن کچھ زڈ نہیں رہا۔“

”یہ کوئی لالچ نہیں۔ کل سے پڑھائی شروع کرو۔ وقت بہت قیمتی ہے۔ انسان کو وقت کی قدر کرنی چاہیے۔“ وہ کہتے ہوئے کمرے سے

نکل گئی اور دلیم اس کی باتوں کو ذہن میں ڈھرانے لگا۔ نور بہت پازینڈ ہے۔ وہ بار بار یہی سوچ رہا تھا۔

رات گئے دو بجے کی گھانڈ پڑھ کر اس کے کمرے میں آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈائری، چھوٹی سی عربی میں کتاب تھی اور ایک گلاس پانی

کا تھا۔ دلیم بہت دنوں کے بعد ایک کتاب کھول کر بیٹھا تھا۔ وہ بغیر کچھ کہے صوفے پر بیٹھ گئی۔ دلیم نے اسے مخاطب کرنا چاہا مگر اس نے اسے ہاتھ

کے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا اور چھوٹی کتاب سے پڑھنا شروع ہو گئی۔ ڈائری سے جیسے وہ ہدایات لے رہی تھی اور پھر پانی پر پھونک مارتی پھر

اس کی ٹانگوں پر پھونکنے مارتی۔ دلیم حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا انہماک، اس کا سراپا، سفید چادر میں لمبوس، ملکوتی حسن، لیے، عقیدت

سے آنکھیں بند کیے وہ اسے اس وقت بہت مختلف لگ رہی تھی۔ اس نے تین دفعہ یہ عمل ڈھرایا اور پھر پھونک مار کر پانی اسے پیئے کو کہا۔

”اس میں کیا ہے؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”میرا ایمان اور تمہاری صحت کی دعا۔“

”اس سے کیا ہوگا؟“ وہ بے اعتبار سے لہجے میں بولا۔

”کوئی فضول بات نہیں ہوگی۔ بس تم اسے پیو گے۔“ وہ جھکنا نہ لہجے میں بولی اور اسے پانی پینا پڑا۔ وہ خاموشی سے کمرے سے نکل گئی۔

دلیم اس کی محبت اور لگن کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے ایک دم شدت سے احساس ہونے لگا کہ وہ واقعی تنہا نہیں تھا۔ اتنی محبت، اتنی

چاہت، اتنا غلوس..... اس لڑکی نے تو اپنا گھر اس کے لیے اور اس کی ماس کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ وہ جذلوں کو سمجھتی تھی۔ چاہتیں نچھاور کرنا جانتی تھی۔

ہر ایک کا درد اپنے دل میں محسوس کرتی تھی، وہ کس قدر محترم ہے۔ کس قدر پیاری ہے۔ دلیم کے دل میں اس کی چاہت کے لیے ایک نیا درد ہوا۔ اس

سے قبل وہ اس کو چاہتا تھا مگر اس کو احساس تھا کہ چرچ جو ان کرنے کے بعد وہ اسے چھوڑ دے گا۔ جدائی کی سوچ اس نے ہمیشہ ذہن میں رکھی تھی اس

لیے وہ کوئی بھی قدم بڑھانے سے گریزاں تھا لیکن جب سے اس نے زندگی کی مایوسیوں میں قدم رکھا تھا..... اس کا کیریئر، مستقبل سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اس کے وجود کی شناخت مبہم تھی۔ نور اس موڑ پر اسے اپنے قریب، بہت قریب محسوس ہوتی ہوئی دکھائی دی۔ پہلے وہ اس سے صرف محبت کا دعویدار تھا اور اب پوزیٹو محبت کا علمبردار بننا چاہتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھی وہ اس سے دور ہو، یہ سوچنا بھی اس کے لیے محال تھا۔ جب کبھی وہ مگر جانے کا کہتی تو وہ بار بار یہی پوچھتا۔ ”کب آؤ گی؟“ اور وہ مسکراتی۔ وہ اس کی ضرورت فنی جارہی تھی۔ محرم راز یا پھر کچھ اور..... وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ہر جذبہ ابھی پرویس میں تھا۔

نور نے کتابوں کا ڈیر لاکر انیس کین کے درمیان لگا دیا تھا اور ہر چیز اس کے بیڈ کی سائڈ پر ترتیب دے دی تھی۔ ایک قتل بھی پاس رکھ دی تاکہ جب وہ کمرے سے باہر ہو وہ اسے قتل بجا کر بلا لے۔ اس نے کمپیوٹر، ٹی وی، ڈی وی ڈی، ہر چیز اس کے کمرے میں اور اس کی پہنچ میں ترتیب سے رکھی تھی۔ وہ زیادہ تر دقت سما کے پاس رہتی اور گاہے بگاہے اس کے پاس آتی۔ اسے پڑھنا ہوا یا مصروف دیکھ کر وہ کمرے سے باہر نکل جاتی۔ اس نے واقعی پڑھنا شروع کر دیا تھا اور جب سے پڑھنا شروع کیا تھا پڑیشن بھی کم ہو گیا تھا۔ وہ ہر رات مخصوص وقت پر کمرے میں آتی۔ کچھ پڑھ کر پھونکتی۔ اسے پانی پلاتی اور مٹی جاتی۔ ہر پھونک کے ساتھ اس کے دل میں اس کے لیے محبت کا نیا جذبہ بیدار ہوتا اور وہ جذبہ حریت، تقویت، بکارت۔

حیدر دس دن کے بعد آگئے تھے اور وہ دیکھ کر کافی خوش ہوئے تھے کہ دلم میں کافی پاز پڑ چھ آ گیا ہے۔ وہ جس طرح سوچ کر آئے تھے اس کے برعکس وہ انھیں مسکراتا ہوا ملا کر شہلا کو دیکھ کر وہ پریشان ہو گئے تھے۔ وہ بس چراغ سحری لگ رہی تھی۔

”نور بیٹا تھیک ہو! آپ نے ان لوگوں کو بہت سنبھالا اور نہ میں پریشان ہو رہا تھا اور ہاں جسیں ایک خوشخبری سنائی تھی۔“ حیدر نے پڑ امید ہو کر بتایا۔

”جی انکل!“

”میں ولیم کا کس جرنی میں بھی ڈسکس کر کے آیا ہوں۔ انھوں نے فکشی پر سلف امید دلائی ہے۔ آگے دیکھو جو خدا کی مرضی۔ یہاں تو ایک پرسف کی امید بھی نہیں تھی اور دیکھو اتنا مجھے پیرس سے جرنی جانا پڑا۔“

”واقعی انکل!“ وہ خوش ہو کر بولی۔

”ہاں مگر ابھی تم ولیم سے اس کا ذکر نہ کرنا۔ ایسی بات سن کر انسان کی امید بندھ جاتی ہے۔ اگر خدا خواستہ کچھ اور ہو جائے تو پھر ڈی پڑیشن سے لکنا مشکل ہو جاتا ہے۔“ حیدر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”تھیک ہے انکل!“

”اب تم گھر جانا چاہو تو مٹی جاؤ۔ تمہارے گھر والے کہیں ناراض نہ ہو جائیں۔“

”ہاں، اور چچا کا موڈ کچھ آف تھا لیکن میں رات کو چکر لگا کر دوں گی۔ وہ دراصل میں نے ولیم کے لیے ایک وکیل شروع کیا ہے۔ اس کے لیے مجھے آنا پڑے گا۔“ وہ اپنی ہی لے میں بولی تو حیدر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا اور پھر ان کے لبوں پر مسکراہٹ سی پھیلی۔

"بہت محبت کرتی ہو اس سے؟" حیدر نے پوچھا۔ وہ جہاں باخا موٹا رہی اور سر جھکا لیا۔

"خدا کرے جس کو تم چاہتی ہو وہ تمہارا ہی بنے۔ اگر انسان سمجھے تو دنیا میں یہ خدا کی طرف سے بہت بڑی عطا ہے۔" حیدر کی آواز بھرائی اور انہوں نے بمشکل ٹھوک نکلا۔ نور کو کچھ کچھ انداز تھا مگر آج حیدر کی زبان سے ایسی باتیں سن کر وہ انسر وہو گئی تھی۔

"انگل میں جاؤں؟" وہ اب حریف وہاں رکنا نہیں چاہتی تھی۔

"ہاں جیسا شکریہ" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ وہ جا چکی تھی۔ مگر سونا سونا لگ رہا تھا۔ سب اس کی محسوس کر رہے تھے۔ اس کے وجود کی خوشبو ہر طرف رچ بس گئی تھی۔



آنکھ کے لیے اب گھر میں رہنا دشوار ہو رہا تھا۔ بھائی جاب پر چلا جاتا۔ بہن اپنے گھر جا چکی تھی۔ وہ گھر میں تنہا بیٹھی ماما کو بہت مس کرتی۔ ہر روز ملک منصور کے فون کا وہ شدت سے انتظار کرتی۔ وہ صبح سویرے اسے ضرور فون کرتا پھر رات کو۔ وہ اس کی باتوں کی مادی ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے لہجے کی مٹھاس میں وہ اپنا پور پور ماحول محسوس کرتی۔ ملک منصور اسے پاکستان آنے کے لیے کہہ رہا تھا ہمیشہ کے لیے اور اس بیٹگی پر وہ بار بار سوچ رہی تھی۔ وہ دور رہے پر کھڑی تھی۔ اس نے بھائی بہن سے مشورہ کیا تو دونوں نے ملک منصور کے حق میں ووٹ دے دیا۔ وہ ملک منصور سے مل چکے تھے اور اس سے بہت حائر تھے مگر آنکھ گہری سوچ میں تھی۔ اس نے پاکستان میں وہ کر سیاست پر جتنی دیر سوچ کی تھی اس نے اس کے ذہن میں بہت سے شبہات پیدا کر دیے تھے۔ اس کی پاکستان کی سیاست پر گہری نظر تھی اور یہاں کے سیاستدانوں سے بھی اچھی طرح واقف تھی اس لیے وہ ملک منصور کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ کوئی بھی فیصلہ کرنا اس کے لیے نہ جانے کیوں مشکل ہو رہا تھا۔

وہ ملک منصور کی ہر بات، لہجے اور الفاظ کو ذہن میں ڈھرتی۔ انھیں جانچنے کی کوشش کرتی۔ اسے کہیں بھی ملک منصور میں کوئی عیب نظر نہیں آتا۔ وہ شخص واقعی اس قابل ہے کہ اس پر اعتبار کیا جائے لیکن اس کی ذاتی زندگی..... نہیں جو جذباتوں کو سمجھنے والا ہو، محبت کی زبان تک جسے رسائی ہو اور جو پڑ برائی کے فن سے بھی شناسا ہو وہ کبھی دھوکا نہیں دے سکتا۔ وہ سوچ کر خود ہی مسکرا دی۔ اس پر اعتبار کیا جاسکتا ہے۔ اس نے ہلا خریفہ کر لیا تھا۔

اس نے موبائل پر نمبر ملا یا۔ ملک منصور اس وقت ہاتھ روم میں تھا اور ڈریسنگ روم پر پڑا موبائل مسلسل بج رہا تھا۔ درندہ اکٹر موبائل ہاتھ روم میں ساتھ لے جاتا تھا۔ نہ جانے آج کیسے بھول گیا تھا۔ شزائید روم میں داخل ہوئی تو موبائل بج رہا تھا۔ اس نے اٹھا یا تو آنکھ بول رہی تھی۔

"ہیلو! میں آنکھ بول رہی ہوں۔ ملک منصور کہاں ہیں؟" اس نے ششہ انگریزی میں پوچھا۔

"وہ مصروف ہیں۔"

"اچھا انھیں تاویجیجیجی کہ میں آج شام کی ٹھانٹ سے پاکستان آ رہی ہوں۔" اس نے مزید کچھ کہے بغیر فون بند کر دیا۔ شزائے جلدی سے اپنے موبائل پر اس کا نمبر لایا اور موبائل رکھ دیا اور باہر نکل گئی۔ ملک منصور ہاتھ روم سے نکلا تو نمبر دیکھنے لگا اور فوراً اس کا نمبر ملا یا۔

"ہیلو ڈرائنگ اسوری میں بڑی تھا۔" وہ مسکراتا ہوا بولا۔

”ہاں، مجھے معلوم ہے اسی لیے اسٹینڈ نہیں کر رہے تھے۔ میں آج شام کو پاکستان آ رہی ہوں۔“ وہ بھی مسکراتے ہوئے بولی۔
 ”رینلی انٹیک پوسٹ ہارٹ..... دیکھ دیکھ! کب سے یہ آنکھیں تہجاری منتہر ہیں۔ آئی لو یو سوچ آ“ وہ مسکراتے ہوئے بولا اسی لیے
 شزا کرے میں داخل ہوئی تو ملک منصور نے اپنا لہجہ بدلا اور گلا کھٹکھٹاتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہے شیروانی صاحب! میں ایئر پورٹ پہنچ جاؤں گا۔ ہاں ہاں بھائی، آپ میرے غی مہمان ہیں۔ آپ کو لینے میں خود آؤں گا۔“
 اس نے جلدی سے فون بند کر دیا۔ شزا نے کن آنکھیں سے اسے دیکھا۔ ملک منصور اقم اور تہجاری مکاریاں، کیسے کیسے دعوے دیتے ہو۔ وہ بے وقوف
 لڑکی بھی اب اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی تباہ کرنے پر تگی ہے۔ تم بہت مکاریاں انسان ہو۔
 ”کون آرہا ہے؟“ شزا اول ہی دل میں مسکراتے ہوئے بولی۔

”وہ میں نے بتا تھا نا، امیر ان میں جو میرے دوست ہیں شیروانی صاحب، وہ کچھ روز کے لیے یہاں آرہے ہیں۔“
 ”اچھا تو کیا یہاں میرا مطلب ہے گھر میں ٹھہریں گے؟“
 ”یہاں..... یہاں؟ کم آن شزا! اس گھر میں یہ تو فقیروں اور سر پھروں کا ٹھکانا ہے۔ یہاں تو کوئی دوون نہیں رہ سکتا۔“
 ”رینلی منصور ایہ آپ کہہ رہے ہیں۔ شکر ہے آپ کو آج اعزاز تو ہوا کہ یہ کن کن لوگوں کا ٹھکانا ہے۔ اس میں مزید اضافہ کر لیں۔ یہاں
 پاگلوں اور بھٹیوں کا بھی ٹھکانا ہے۔“

”کون؟“ ملک منصور ایک دم چٹکا۔
 ”آپ کی بہو صاحبہ بڑے کھڑ ہیں۔“
 ”اوہو! اس فلاحیت نے یہ کام بھی شروع کر لیے۔ شزا! بس اس کو یہاں سے نکالو۔ میرے گھر کو گندگی کا ڈھیر بنادیا ہے اس نے۔“
 ”نہیں..... میں یہ نہیں کر سکتی۔“ وہ دو دو ٹک لہجے میں بولی۔
 ”کیوں؟“

”اس لیے کہ وہ آفاق کی بیوی ہے اور میں کسی کے ساتھ بھی کوئی نسل نہیں چاہتی۔“
 ”اچھا، مجھے جلدی جانا ہے۔ تم ناشتا لگواؤ۔“ اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا اور اینٹری کا بھر پور اسپرے اپنے اوپر کیا۔ وہ اس کی ہات سن
 کر دل مسوس کر رہ گئی۔ ملک منصور آف تہجاری مکاریاں اور چالاکیاں..... اس نے دل میں کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

ملک منصور، آنکھ کوریسو کرنے کے لیے آدھا گھٹنا پہلے ہی ایئر پورٹ پہنچ گیا تھا۔ اس نے گاڑی میں ہر طرف پھولوں کا ڈھیر لگا رکھا
 تھا۔ ایسی پنیرائی تو اس نے آج تک کسی اور کی نہیں کی تھی۔ وہ خود بھی حیران تھا۔ جب شزا اس کی زندگی میں آئی تھی تو اس نے سوچا تھا اب اور کوئی
 نہیں۔ اس کے بعد کتنی بڑکیوں سے مراسم ہوئے مگر شادی کے لیے صرف آنکھ پند آئی۔ وہ ہلک اور آف وائٹ اسکرٹ اور کوٹ میں بہت حسین
 لگ رہی تھی۔ اس کے بلوٹ شارت ہنر اور فیس کٹ بہت حد تک لیڈی ڈایا سے ملے تھے۔ کوئی ایک دفعہ دیکھا تو چونک کر دوبارہ ضرور دیکھا۔ ملک

منصور سارا لگائے بھاپ اڑاتی رات میں بھی اپنے اندر ایک حرارت اور محک سی محسوس کر رہا تھا۔ آج کل اسے نہ سیاست کی لگڑ تھی اور نہ ہی کوئی اور سوائے آنکھ کے۔

”وکیلہ ڈار لنگ!“ اس نے اسے آہستہ سے کہا کیونکہ ارد گرد بہت سے لوگ جمع تھے اور ملک منصور ایک جانی بچانی شخصیت تھی۔ وہ پریس سے نہیں ڈرتا تھا بلکہ پریس اس سے ڈرتا تھا۔ کوئی بھی ایسی خبر جو ملک منصور کو ناراض کرتی تو پھر اس کے بعد اس اخبار کے ایڈیٹر سمیت کسی کی بھی خیر نہ ہوتی۔ وہ اس گندی چھلی کی طرف کڑی ڈالنے سے پہلے ہزاروں سوچے لیکن پھر بھی وہ حیا رکھتا رہتا۔

ملک منصور نے جیسے ہی گاڑی کا دروازہ کھولا تو مدھوش کرنے والی پھولوں کی خوشبو نے آنکھ کا بھرہراستہال کیا۔ وہ چونک گئی۔ گاڑی میں ہر طرف رنگ برنگے پھولوں کے گلدستے بڑے قریب سے رکھے تھے۔ گاڑی کے فرش اور سیٹوں پر گلاب کی پتیوں کا ڈھیر تھا ایسی پتیوں پر ایسی ماحبت۔ اس نے محبت اور حیرت سے ملک منصور کی طرف دیکھا۔ اس کے لبوں پر پھیلی مسکراہٹ اور آنکھوں سے جھلکنی مستی نے اسے اور سرور کر دیا۔

”اتنا سب کچھ.....؟“ وہ ہونٹ چباتے ہوئے بولی اور گاڑی کی سیٹ سے چپاں صاف کرتے ہوئے بولی۔

”یہ تو کچھ بھی نہیں آنکھ!“ اس دن کا سوچو جب تم مسر منصور بن کر ملک منصور کے دل کے تاروں کو چھیرو گی اور پھر اس دھرتی پر تم اپنے آپ کو جنت میں محسوس کرو گی۔ ہر شے تمہارے قدموں میں ہوگی۔ تم نے مجھے بہت خوش کیا ہے۔“ وہ گاڑی کا ٹرن لیتے ہوئے ایئر پورٹ سے نکلے ہوئے بولا اور اس کے کندھے پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھا۔

”کیا میں واقعی..... آئی مین آئی ڈونٹ بلیواٹ!“ وہ جھینپتے ہوئے بولی۔

”میں نے تمہیں کہا تھا تم اپنے آپ کو اس دنیا کی خوش قسمت ترین عورت سمجھاؤ اور ہاں تم لاہور میں نہیں رہو گی۔“

”تو پھر کہاں؟“

”اسلام آباد میں..... بلیو ایریا میں، میں نے تمہارے لیے ایک ویل فریڈ کھر خرید لیا ہے اور جانتی ہو اس میں ہر چیز تمہاری چائس کی ہے۔“

”مثلاً؟“ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں۔

”اس کے کمرے، کارڈش، کراکری، فرنیچر، بینڈنگز سارا ڈیکورم، کلرز سے لے کر آنکھیں تک صرف اور صرف تمہاری پسند کا خیال رکھا ہے۔“

”آپ کو میرا شیٹ کیسے معلوم ہوا؟“

”ایک ایرانی اسٹریٹرز کچھ بیٹرنے اسے ڈیکوریٹ کیا ہے اور وہ میرا ملک تمہاری بہن اور بھائی سے لیتا رہا ہے۔ یہ ایک سر پرانز تھا جو میں تمہیں دینا چاہتا تھا۔“

”لیکن میں نے تو یہاں آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔“

”مجھے معلوم تھا تم ضرور آؤ گی۔“ وہ مکارانہ مسکراہٹ سے بولا۔

”آپ کو کیسے معلوم تھا؟“ آنکھ کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔

”مجھے اپنی محبت پر اٹھنا تھا اور ویسے بھی محبت میں اتنی تڑپ ہوتی ہے کہ کسی کو مزاحمت کرنے کا موقع نہیں دیتی۔“

"آپ بہت کوئیڈنٹ ہیں۔"

”ہاں وہ تو میں ہوں۔“ وہ تہجد لگا کر بولا۔ ”آج تم ریٹ کرنا۔ کل ہم اسلام آباد چلیں گے۔ پہلے تمہارا گھر قصص دکھاؤں گا پھر اس گھر میں قصص سنواؤں گا۔“

"وقت ٹھیک ہے لیکن یہاں میری ایک دو کمیٹس بھی ہیں۔"

”کیسی گفتگو؟“ اس نے چمک کر پوچھا۔

"جو انجیشن ہوئے ہیں اس کی پالیسیوں کے سلسلے میں ایک رپورٹ تیار کرنی ہے۔ رات کو ہی مجھے بلائی جی کی طرف سے فکس موصول ہوا ہے۔ بہت اہم اور سیکرٹ ہے۔"

”میں نہیں۔۔۔ سب تم حویلیوں کا مہمان ہیں دلچسپی نہ لو، ہم اپنی زندگی شروع کرنے والے ہیں لہذا ایسی مصروفیات بلکہ تم جاب ہی چھوڑ دو۔“

”میں نے منور اب سے محض جاہ نہیں بلکہ میرے لیے ایک دشمن بن چکا ہے۔ کیا آپ میری جاہ کے خلاف ہیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں نہیں، ہرگز نہیں..... میں تو لبرل ورکنگ۔ لیکن کو پسند کرتا ہوں۔ زندگی میں قہرل تو انہی عورتوں کی وجہ سے ہے اور مجھے زندگی میں قہرل بہت پسند ہے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”تو پھر کب شادی کا پروگرام ہے؟“ وہ بات کا رخ موڑتے ہوئے بولا۔

"دس ہندوؤں کے بعد، پہلے میں وہ کام مکمل کر لوں پھر۔"

”لمحیک ہے ڈیریز ایووش اقم میرے پاس ہو یہ احساس ہی میرے لیے بہت خوش کن ہے۔“ اس نے کچڑی آواری میں داخل کر کے ہوئے کہا۔ دونوں نے پہلے ڈرنگیا اور پھر ملک منصور نے اسے اس کا کمرہ دکھایا۔ اس نے اپنے لیے ایک دوسرا کمرہ ایک کروایا تھا اور انیکہ کو اس کی یہ ادا بہت پسند آئی تھی۔ اس کی شرافت پر اور یقین آ گیا تھا۔ اس کا انتخاب بہت بہتر تھا۔ وہ مطمئن ہو گئی اور سنبھلنے لگی۔

اگلے دن وہ اسلام آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ ملک منصور نے گاڑی خود ڈرائیو کرنے کا پروگرام بنایا۔ اپنے ایئر جانی سے سفر کا لطف نہیں آتا اور وہ اس کی رفاقت اور سفر کی طوالت دونوں سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ آٹھ گھنٹہ بعد ہی اندر ہی اندر بہت خوش تھی۔ اپنا گھر دیکھ کر وہ تنگ رہ گئی۔ اس قدر خوبصورت، ہر چیز اور ہر کمرہ واقعی اس کی چٹائیں کا تھا۔ سب اس کی سوچوں سے بڑھ کر حسین تھا۔

”پسند آیا؟“ ملک منصور نے اس کی آنکھوں سے چھلکتی مسرت دیکھ کر پوچھا۔

”دادا! اس رُغلی امیزجک..... وغیرہ نقل!“ کو حیرانی سے بولی۔

”نہیں، یہ ایسے گتے لگے گا جب تم اس میں چلتی پھرتی نظر آؤ گی۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”کیا آپ واقعی مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں؟“ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

”اگر کبھی ہوتا چاندل کھول کر دکھا دوں۔“ اس نے اسے بازوؤں کے حصار میں مضبوطی سے جکڑتے ہوئے کہا۔

”نہیں، مجھے آپ پر پورا یقین ہے۔“ وہ بھی مسکرا کر بولی۔ اسی لمحے آنکھوں کا موبائل بجنے لگا۔

”افو! یہ کون ہے؟ کہاں سے آچکا؟“ ملک منصور نے ہی اس کا موبائل پکڑتے ہوئے مجھ جلاتے ہوئے کہا اور غبرو دیکھا۔

”آئیٹک ایئر کس کا ہے؟ بہت عجیب سا ہے۔“ اس نے موبائل پر نمبر اسے دکھاتے ہوئے کہا۔

”معلوم نہیں، آپ نے بات نہیں کی۔“

”نہیں، میری آواز سن کر شاید کسی نے بند کر دیا ہے۔“

”شاید آفس سے کسی کا ہو۔“

”نہیں، ہے تو پاکستان سے کال مگر نمبر کچھ مختلف ہے۔ بہر حال چھوڑو اس بات کو، مگر تمہیں پسند آیا؟“

”ہاں، بہت زیادہ۔“

”ٹھیک ہے، اب میرے میں تمہارا سٹے ہے۔ کیا تم اسلام آباد میں کچھ روز رکنا چاہتی ہو؟“

”ہاں، ایک دو روز۔“

”ٹھیک ہے، میں کل صبح واپس لاہور چلا جاؤں گا۔ آج ایک دوست کے ہاں پارٹی کی اہم میٹنگ کے سلسلے میں جا رہا ہوں۔ تم اپنا خیال

رکنا۔ آداب میں تمہیں ہوٹل ڈراپ کر دیتا ہوں۔“ وہ مسکراتی ہوئی اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ باہر موسم بہت ٹھنڈا اور ہاتھ مگر گاڑی میں ہر طرف حرارت

تھی۔ ملک منصور کی قربت کی اور اس کے گار کی سمجھنے سمجھنے، اس کے گلون کی اور اس کی باتوں کی خوشبو ہر طرف ایک خوشگوار سا احساس تھا۔

”تمہارے لیے ایک اور سر پرانز ہے۔“ ملک منصور نے کہا۔

”کیا؟“ وہ چونکی۔

”تمہیں پرنسوز، انالین جیلری اور وائنٹ گولڈ دو ڈائنمنڈ بہت پسند ہیں نا۔ میں نے یہ سب امریکا اور فرانس سے منگوائے ہیں۔ ایک دو

روز میں سب کچھ یہاں پہنچ جائے گا۔“

”ریٹلی!“ وہ پھر حیرت سے بولی۔

”ہاں، میں نے کہا نا کہ تم۔۔۔۔۔ ایک مرتبہ پھر آئیٹک کا موبائل بچاؤ۔ اس نے چمک کر نمبر دیکھا۔ اب دوسرا نمبر تھا۔ وہ ہیلو ہیلو کرتی

رہی مگر فون بند ہو چکا تھا۔

”آئیٹک! یہ کون ہو سکتا ہے جو اس طرح ڈسٹرب کر رہا ہے۔ تم اپنا موبائل پیسج کر لو۔“ وہ قدرے غلے سے بولا۔

”اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ بعض اوقات سیکٹر ٹھیک طرح سے نہیں جاتے۔ اگر رانگ کا لڑ بھی ہوں تو ہمارا کیا جاتا ہے۔“ وہ

بہت سکون سے بولی۔ ملک منصور کو اس کے لہجے کی چٹائی پر یقین آ گیا۔

”اچھا اپنا خیال رکھنا اور کوئی مسئلہ ہو تو مجھے رنگ کر لینا۔“

”گڈ نائٹ!“ اس نے اسے ڈراپ کرتے ہوئے کہا۔

”گڈ نائٹ!“ وہ بھی مسکراتے ہوئے بولی اور ہال میں داخل ہو گئی۔



مدرخ بہت خوش تھی۔ اس کی خواہش پوری ہو رہی تھی۔ آفاق اسے لے کر گھر جا رہا تھا۔ اس نے اسے کتنی مشکل سے سنا یا تھا۔ کیسے کیسے
حرے آزمانے تھے وہ کہیں جا کر ماتا تھا۔ وہ بھی جیسے جیسے اس کے نرود پر کنٹرول کرنا سیکھ رہی تھی ویسے ہی وہ اس کے ہاتھ میں کٹ پتلی بنتا جا رہا
تھا۔ بعض اوقات تو وہ بالکل اس کے اشاروں پر یوں تاجتا جیسے ریلوٹ ہو اور اس کا ریوٹ کنٹرول مدرخ کے ہاتھوں میں ہو۔

”آفاق! ہم سیدھے گھر ہی جائیں گے نا؟“ مدرخ نے جہاں میں اس سے پوچھا۔

”جیہیں، پہلے ہوٹل میں اسٹے کریں گے۔ کل صبح گھر جائیں گے۔“

”آفاق! تم سوچ نہیں سکتے میں کس قدر خوش ہوں۔“

”اس میں اتنی خوشی کی کیا بات ہے؟“ وہ بدلی سے بولا۔

”تم نہیں سمجھ سکتے۔ ساری زندگی ایک گھر کی خواہش میں، میں نے کیا کیا پڑ نہیں بیٹے اور اب خدا مجھے میرے اپنے گھر سے نوازنے لگا
ہے۔“ اس کی آنکھوں میں خوشی سے پانی بھرا آیا۔ آفاق اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا اور گہری آہ بھری۔

اگلے دن دو بجے کے قریب جیسے ہی آفاق اور مدرخ نے گھر میں قدم رکھا، ہر طرف چھائی یا سیت، مایوسی اور ستانے نے ان کا استقبال
کیا۔ اتنا بڑا گھر اور ہر طرف چھائی اُداسی..... زندگی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ آفاق نے لاڈلج کا دروازہ کھولا تو لاڈلج میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ اپنے
بیڈروم کی طرف بڑھا تو کمرے میں پچھلے دھویں اور سگریٹ کی مخصوص بو نے اس کا استقبال کیا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ سحر کا رپٹ پر مری حالت
میں پڑی تھی۔ سگریٹ ایش ٹرے میں آدھ جلا پڑا تھا۔ اس میں سے ہلکا ہلکا سا دھواں نکل رہا تھا۔ ہر طرف سگریٹ اور پڑیوں کے ٹکڑے اور رکھ بکھری
پڑی تھی۔ اسے دیکھ کر ایک دم آفاق کو دھچکا سا لگا۔ وہ جب اسے چھوڑ کر گیا تھا تو وہ ایسی نہیں تھی۔

”سحر..... سحر..... اٹھو..... یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟“ آفاق اس کے اوپر جھکتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھیں اور ان کے گرد پچھلے سیاہ جلتے
اس کی داستانِ فراق اور غم ستار ہے جسے اس نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔

”کون آفاق..... آفاق تم آگے..... کب آئے.....؟“ وہ اس کے بازوؤں میں جھپتی ہوئی اس کے گلے لگ کر رونے لگی۔ مدرخ
عذارت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”ہاں، میں آ گیا ہوں۔“

”تم کہاں چلے گئے تھے؟“

”یہیں تھا اب آ گیا ہوں۔ اب نہیں جاؤں گا مگر تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟“

”جب سے تم مجھے چھوڑ کر گئے ہو..... میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تم جانتے ہو نا؟“ وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ مدرخ کو اس کی باتوں پر
خاصہ رہا تھا اور آفاق اس کی دل جوئی میں مصروف تھا۔ اس نے اسے اٹھا کر بیڈ پر لٹایا۔

”آفاق! کیا تم نے مدرخ سے شادی کر لی؟“ وہ آنکھیں بند کیے مدھوشی کے عالم میں بول رہی تھی۔ آفاق خاموش رہا اور ایک تک

درد والے کے پاس کھڑی مدرخ کو دیکھا۔

”تم بے شک شادی کر لو مگر اس کو گھر نہ لانا۔ تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے، کیا ہے نا۔“ وہ یکدم خاموش ہو گئی اور مدرخ کو آفاق کے سارے بہانے اور گھر نہ لانے کی جیلہ ہالیاں یاد آنے لگیں۔ ”تو یہ بات تھی۔“ اس نے دل میں دہرایا۔ وہ اسے بستر پر لٹا کر مدرخ کے پاس آیا۔

”آؤ، میں تمہیں شوق کے کمرے میں لے چلا ہوں۔ وہ بھی نظر نہیں آ رہی۔ شاید کہیں باہر گئی ہوئی ہے۔“ آفاق قدرے فحش محسوس کر رہا تھا۔ مدرخ خاموشی سے اس کے ساتھ باہر آ گئی تو شاکل لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ شاید وہ ابھی ابھی آئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں جوس اور پانی کا گلاس تھا۔ وہ ٹیبل پر رکھے جوس اور پانی کو ایک دوسرے میں اظیل کر دیکھ رہی تھی۔

”ہیلو شاکل! کیسی ہو؟“ آفاق نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”تم کون ہو اور یہ لڑکی..... ہمارے گھر میں چور کہاں سے گھس آئے۔ ماما..... ماما..... چور آ گئے..... چور.....“ وہ اونچی آواز میں چیخنے لگی۔ شزا اپنے بیڈروم سے بھاگتی ہوئی آئی تو سامنے آفاق اور مدرخ کو دیکھ کر ٹھک گئی۔

”اودہ تو یہ تم ہو۔“ اس نے تنگی نظروں سے مدرخ کو دیکھ کر کہا۔ شاکل ابھی بھی چیخ رہی تھی۔

”چپ کرو شاکل! یہ چور نہیں بلکہ بی بی لکسن کے روپ میں چور آئی ہے۔ واقعی تمہاری اندر کی آنکھیں کھلتی ہیں۔“ وہ ہلکے سے چپچپے ہوئے لہجے میں بولی تو مدرخ تڑپ اٹھی۔

”پلیز مسز منصور! ماضی کو دہرانے سے فائدہ۔“ وہ قدرے طعنے سے بولی۔

”ہاں بھئی، واقعی ماضی کو دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ تم لوگ تو اپنے مقصد میں دیسے بھی کامیاب ہو چکی ہو۔ تم اور تمہاری بہن..... ایک نے پانچ بچوں کے باپ کو پھنسا لیا اور ایک نے اتنے امیر باپ کے جیسے کو..... واقعی کیا کہا۔“

”ہاں تو بسا بھی تو آپ نے ہی بچائی تھی۔ ہم تو بس مہرے تھے۔ ملک منصور کو پھنسانے کے لیے مجھے ہی بھیجا تھا نا۔ وہ تو آپ کا پول کل کیا اور نہ.....“ اس نے بھی وار کیا تو شزا اٹھلانے لگی۔

”آفاق! تم اسے اس گھر میں نہیں رکھ سکتے۔“

”کیوں؟ آپ کون ہوتی ہیں اسے روکنے والی؟“

”ایک گند تو سنبھالا نہیں جا رہا اور ایک اور لے آئے ہو۔ یہ گھر ہے کہ کوڑا دان۔“

”اس گھر میں دیسے بھی کوڑا ہی آتا رہا ہے۔ پھول تو کبھی نہیں سجے۔ جہاں اتنے ہیں وہاں یہ بھی سکی۔“ آفاق نے اس پر وار کیا تو اس نے خشکیں لٹا ہوں سے اس کی طرف دیکھا اور شاکل کا ہلاد پکڑتے ہوئے اندر چلی گئی۔ وہ اس کو لے کر شوق کے کمرے میں چلا گیا۔ ہر چیز پر گردی چھائی تھی اور چیزیں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ یوں معلوم ہو رہا تھا نہ جانے کب سے کمر اس کے بغیر خالی پڑا ہو۔

”آفاق! اس گھر میں میرا کمر کون سا ہے؟“ وہ جو کچھ سوچ کر آئی تھی سب کچھ اس کے برعکس تھا۔ وہ قدرے سختی سے بولی۔

”جہاں ہو، سا جاؤ۔“ وہ بھی اکڑ لیجے میں بولا۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ گھر اس قدر.....“

”میں اسی لیے تمہیں یہاں نہیں لانا چاہا تھا۔“

”کیا وجہ تھی یا کچھ اور.....؟“ اس نے طوریہ لیجے میں پوچھا۔

”کیا مطلب؟“

”مجھے تو لگا جیسے کسی کی محبت میں تم ایسا نہیں کرنا چاہ رہے تھے۔“

”یہ تمہارا دہم ہے۔“

”دہم پر بھی حقیقت کا گمان ہونے لگتا ہے جب حقیقت خود خود سامنے آ جائے۔“

”جو مرضی چاہے سمجھو۔“ وہ غصے سے بولا۔

”تم مجھے بتاؤ میں کہاں جاؤں؟“

”مجھے نہیں معلوم، جہاں جانا چاہتی ہو جاؤ۔ جہاں رہنا چاہتی ہو وہ بس مجھے ڈسٹرب نہ کرو۔“ وہ بھراپے حواس کھونے لگا اور وہ اس کی

بات سن کر خاموش ہو گئی۔ وقت اور محسوس ہونے لگا کہ خاموشی سے پکڑیشن کو چنڈل کیا جائے۔

”تم ادھر لیٹ جاؤ۔“ اس نے بیڈ پر سے کھڑے پڑے اٹھا کر ادھر ادھر کرتے ہوئے کہا۔ وہ خاموشی سے لیٹ گیا تو اس نے اس کے

پاؤں کے انگلیوں اور انگلیوں کی پوروں کو اپنی انگلیوں سے دبانا شروع کیا تو وہ جیسے بڑ سکون ہونے لگا۔ اس کے پاؤں کو اپنی گود میں رکھے ہوئے وہ

گہری سوچ میں تھی۔ یہاں سب کچھ بہت منتشر ہے اور یہاں گزارہ کیسے ہوگا اسی لیے آفاق ایسا ہے۔ انسان کی سوچ پر اس کے ماحول کا گہرا اور دیرپا

اثر ہوتا ہے۔ گرد و پر ستائی کے پیچھے ہمیشہ گرد و ماحول ہوتا ہے۔ تمام کھری اور ادھوری شخصیات ہمیشہ منتشر ماحول اور غلامی پر دان چڑھتی ہیں اور

بھی خلا سازی زندگی ایک کمی بن کر محسوس ہوتا رہتا ہے۔ ایسی شخصیات کبھی بھی گھر کر سامنے نہیں آتیں۔ ہر طرف خلا ہی خلا نظر آتا ہے۔ اکثر لوگ کلب

میں پر ستائی ڈیو پینٹ کے حوالے سے بھی باتیں ڈسکس ہوتی تھیں۔ شائیل، آفاق اور سحر تینوں ایک ہی ماحول کے پروردہ نظر آ رہے تھے۔ اس نے

اس کی طرف دیکھا۔ اب وہ بڑ سکون ہو کر سو رہا تھا۔ وہ اٹھی اور کمرے میں چکر لگانے لگی۔

وہ جگمگ بھی تھی اور شاعر بھی۔ بچپن سے دونوں بینیں کس کس طرح کے حالات کا سامنا کرتی ہوئی یہاں تک پہنچی تھیں۔ ماں باپ کی

وفات کے بعد خالہ کے گھر، خالہ کے گھر سے بچھو کے گھر اور وہاں سے درنگ و دین باطل اور پھر وہاں سے آشیانوں کی تلاش میں سرگرداں، کیسے

کیسے مردوں کے ہاتھوں ذلیل ہوئیں جہاں قدم رکھتیں وہ ریت کے نیلے ثابت ہوتے۔ ویسے بھی گھروں کی بنیاد رشتے ہوتے ہیں اور رشتوں کی

بنیاد محبت، جذبے اور چائیاں ہوتی ہیں اور یہاں سب کچھ مفقود تھا۔ جس گھر کی تنہا میں وہ خرپتی ہوئی یہاں تک آئی تھی وہ تو سرائے بھی ثابت نہیں ہو

رہا تھا جہاں سانس لینے کو انسان کچھ لمبے ہی بڑ سکون ہو کر گزارے۔

”پہ...ک...لگ...کون؟“ اس نے حیرت سے آفاق سے پوچھا۔

”عشِ مہربخ ہوں۔“ وہ خود ہی بولی۔

”63... تم... تم... تم نے... اور اسے گم بھی لے آئے۔“ وہ بدحواس ہوتے ہوئے غصے سے پوچھ پڑائی۔

”ہاں تو اس میں تمہیں کیا مسئلہ ہے؟“ مددخ نے غصے سے کہا۔ آفاق شرمندگی سے دونوں کے درمیان کھڑا تھا۔

”آفاق! میں تمہارے ساتھ کسی اور کی جھلک بھی اس گھر میں نہیں دیکھ سکتی۔ تم نے مجھے براہ کیا میں خاموش رہی۔ تم مجھے مارتے پھرتے رہے میں چپ رہی۔ تم نے مجھ سے میرے وجود کی شناخت اور زندگی بھی چھین لی۔ میں تڑپتی رہی مگر خاموش رہی مگر میں نے تم سے صرف ایک بات کہی اور تم وہ بھی نہ کر سکے۔ آفاق! کاش..... کاش میں تمہارے لیے اتنی ہمدانیں کر سکوں کہ تم زندگی کی ایک ایک سانس کے لیے اس طرح تڑپو جس طرح میں تڑپتی رہی ہوں۔ جیسے کبھی میں دور سے ایک ایک روپے کی بھیک مانگتی تھی تم بھی ایسے زندگی کی بھیک مانگو۔ کاش میں ایسا کر سکتی۔“ وہ بھوٹ بھوٹ کر رونے لگی۔ آفاق کچھ نہ بولا اور بو جھل قدم اٹھا تاہوا کمرے میں واپس چلا گیا۔

”سنو! اب یہ تمہارا گھر نہیں۔ صرف اور صرف میرا گھر ہے اور میں اس گھر کو تمہارے کندے، تقین زدہ وجود سے جلد ازلہ پاک کر دیکھنا چاہتی ہوں۔ خود ہی یہاں سے نکلنے کی راہ لو ورنہ مجھے یہ کام خود کرنا پڑے گا۔“ مدرخ اس کے قریب بیٹھ کر سرگوشیوں کے انماز میں اسے دھمکیاں دینے لگی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مدرخ کی طرف دیکھا جیسے اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ شزا اور ملک منصور اس کے بہت خلاف تھے۔ اس سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے مگر آج تک کسی نے بھی اسے ہوں گھر سے نکلنے کو نہیں کہا تھا اور وہ تو آتے ہی اس کے سر سے سائبان اور قدھموں کے نیچے سے زمین چھیننے کی بات کر رہی تھی۔ اس کا وجود خطرے میں تھا۔ اسے ہر طرف خطرے کی گھنٹیاں سنائی دینے لگیں اور وہ خوفزدہ ہو گئی۔

”اور تم مرنا تو مسلمان ہی مرنا۔“

ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ چاروں طرف دبیز پردے اور پھیل لیپ کی مدھم روشنی سے پھیلی گھٹن میں وہ جیسے اپنے آپ کو کسی قبر میں محسوس کر رہا تھا۔ آیت کی آواز مسلسل اس کے دماغ میں گونج رہی تھی جیسے دماغ کے برقیے سے چپک گئی تھی۔ اس نے صبح سویرے ٹی وی آن کیا تو یہ آیت سن کر اس کے اندر ایک دم کوئی لاداسا جوش مارنے لگا۔ اس نے غصے میں جلدی سے مچنل بدلا مگر وہ تو جیسے پٹلی کی طرح اس کے دماغ سے چپک گئی تھی۔ وہ بار بار ذہن سے جھٹکتا، اپنے آپ کو مختلف سوچوں میں الجھاتا۔ جھنجھلا کر اپنے آپ کو کہتا کہ اس نے کیوں ٹی وی آن کیا۔ یہ مسلمانوں کا پردہ پیکٹز..... اس کا دل اندر ہی اندر رکتا ہڈیاں بک رہا تھا مگر کسی طور سے تسلی ہی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ جتنا جھٹکتا، جتنا ہڈیاں بکنا وہی الفاظ بھر نہ جانے کہاں سے اچانک آ کر اسے جس جس نہیں کر دیتے۔ سارا دن وہ اپنے آپ سے لڑتا کہ اور الجھ الجھ کر تھک گیا تھا اور جیسے ہی اس نے سونے کی کوشش کی پھر وہی آیت اس کو سونے نہیں دے رہی تھی۔

”اوہ گاڈ.....!“ وہ بڑبڑایا۔ ”اوہ..... کرائسٹ.....“ وہ کہتے کہتے نادانستہ رک گیا۔ ”سٹیکٹ سے وہ آیت کی طرف کیوں نہیں آتے۔“ نور بلارہی تھی۔ ”میں الجھ گیا ہوں، کہاں پھنس گیا ہوں، میرے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں کہاں جاؤں؟“ وہ اپنے آپ کو بے حد شکست، جھنجھلیا ہوا، کمزور و بے بس، مظلوم و ناکار و انسان سمجھ رہا تھا جو صرف اور صرف اپنی ایک سوچ پر بھی قاصر نہیں تھا۔ وہ اس سوچ کو جھٹلانا چاہتا تھا اور وہ نہیں جھٹلا سکتا تھا۔ وہ محض اس ایک آیت کو اپنے دماغ سے کمر بچ نہیں سکتا تھا۔ ”وہ علم اتم بے حد کمزور انسان ہو، بہت بڑے.....“ وہ سر پکڑ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے ہر طرف تاریکی پھیل گئی تھی۔ ایسی تاریکی جو کالے ناگ کی طرح چمن پھیلائے اسے لوہے کی بوڑس رہی تھی۔ وہ اتنا جھنجھلا گیا کہ رونے لگا۔

”گاڈ! مجھے صرف ایک لمحے کی پرسکون نیند دو۔ آئی ریسٹ ہو.....“ اس کا دماغ زور زور سے بج رہا تھا۔ جیسے بولتے بولتے اچانک ہاپنے لگا ہو۔ جیسے تیز تیز چلتے ہوئے رک جانے پر دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہو۔ دل کی دھڑکن کی طرح دماغ بھی مسلسل دھڑک رہا تھا۔ ٹک..... ٹک..... اور وہ اسے خاموش نہیں کر پا رہا تھا۔ ”چپ کر جاؤ..... خدا کے لیے چپ کر جاؤ۔“ میں پورا دن الجھا رہا ہوں۔ سو نہیں پایا۔“ اس نے اپنے سر کے بالوں کو کھینچنا شروع کر دیا۔ جتنی زیادہ وہ التجائیں کر رہا تھا اتنی ہی زیادہ الجھ رہا تھا۔ اس نے یسپ کی روشنی میں ناٹم عین کو دیکھا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ اس نے سائیلنٹ فون پر رکھا پانی کا گلاس اٹھا کر پیا مگر کوئی شے بھی اندر کی جھنجھلاہٹ کو کم نہیں کر پا رہی تھی۔

”آئی بیسٹ مسٹر.....“ وہ تسلی دینے کے لیے اپنے آپ سے بولا۔ ”آئی بیسٹ دیم آل..... آئی بیسٹ.....“ وہ چلانے لگا اور جیسے ہی خاموش ہوا اندر سے آواز ابھری۔ ”اور تم مرنا تو مسلمان ہی مرنا۔“

”کیوں کیوں میں مسلم..... نہیں..... یہ کبھی نہیں ہوگا۔“ وہ چلا چلا کر جواب دینے لگا۔ اس کی چیخوں نے سکوت کے پردے کو تار تار کرنا شروع کیا۔ ہر طرف مرقش آواز کی لہریں کائنات کے سکون کو درہم برہم کرنے لگیں۔ شبلا اس کی آوازیں کر ایک دم بیدار ہو گئی تھیں۔ ان کا دل لرزنے لگا۔ خدا غور سے کہیں وہ پاگل تو نہیں ہو رہا تھا۔ رات کے اس پہر اس کی چھٹی، اللہ نہ کرے یا اللہ اس پر کرم کر، اپنا رحم کر، اس طرح جس دلدل

میں اور بخود میں پھینے انسانوں اور اپنی مخلوق پر کرتا آیا ہے۔ شہلانے انھیں کی کوشش کی مگر اٹھ نہ سکیں۔ لیٹے لیٹے دونوں ہاتھ دعا کی صورت میں اوپر کی طرف بلند کیے۔

بہت عرصے کے بعد وہ اپنے خدا سے کچھ مانگ رہی تھی۔ بالکل اس طرح جب حیدر کے لیے وہ لیٹے لیٹے، اٹھتے بیٹھتے اچانک ہاتھ فضا میں بلند کر کے دعا کرتی تھی۔ حیدر نہ ملتا تو اس نے دعائیں کرنا بھی چھوڑ دیں اور عبادت بھی۔ خدا سے سرگوشیاں بھی چھوڑ دیں اور حاجات بھی۔ آج جب اسے عرصے کے بعد ولیم کے لیے ہاتھ اٹھائے تو آنسوؤں کی جھری لگ گئی، نادانستہ پادانستہ صرف دو ہفتیوں کے لیے وہ دل کی گہرائی سے اپنے رب کو پکار رہی تھی۔ اس نے تو اپنے لیے بھی اس کو پکارنا چھوڑ دیا تھا جو کبھی اس کا بھی محرم راز تھا اور پھر وہ کیسے بدل گئی یا پھر زمانے نے اسے بدل دیا۔ وہ کھڑے پاؤں لگا جب وہ پیٹر کے ساتھ چرچ میں داخل ہو رہی تھی۔ پیٹر صرف نام کا کرچن تھا اور وہ نام کی کچھ بھی نہیں رہی تھی۔ ملک منصور نے اس سے اس کے وجود کی شناخت اور اہمیت چھینی تھی اور پیٹر نے اس کا نہ سب..... وہ تو ٹھنکے گارے کا خالی وجود رہ گئی تھی جو جہاں چاہے رکھ دے، جہاں چاہے بیٹھ دے۔ جب چاہے توڑ دے اور جس وقت چاہے چھوڑ دے اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس کے گناہ جہاں کا خمیر سرزدش کرنے لگا۔ اس نے قرآن کے حکم کو نالا تھا۔ ”اور مسلمان عورتیں مشرک مردوں سے نکاح نہ کریں۔“ اس وقت تو وہ اندھی ہو رہی تھی۔ اپنی ذات کے نشے میں خود کو کھودیا تھا۔ اس نے اپنے رب کا فرمان نالا تھا۔ اس کی حدوں کو پار کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے قرآن پڑھا تھا مگر سب کچھ بھلا دیا تھا اور اس وقت خمیر نے بھی اسے نہیں چھوڑا تھا جیسے اب چھوڑ رہا تھا۔ ولیم کی چھٹیں بلند ہو رہی تھیں اور وہ بستر پر ایڑیاں رگڑتی ہوئی تڑپ رہی تھی۔ وہ سختی بے بس، کمزور اور نادان انسان تھی۔ کیا یہ سب میرے گناہوں کا نتیجہ ہے۔ میں یوں سسک سسک کر مر رہی ہوں اور ولیم نہ جانے کس لیے تڑپ رہا ہے۔ وہ بھی بستر پر ایسی ہی ایڑیاں رگڑ رہا ہے جیسے میں موت مانگتی ہوں اور وہ زندگی مرد دونوں کو کچھ بھی نہیں مل رہا۔ یا اللہ! مجھے معاف کرو۔ اس کا دل چاہا کسی طرح اٹھے اور اپنے رب کے حضور ہاتھ رگڑ رگڑ کر معافیاں مانگے مگر شاید اب اس کا وقت نہیں رہا تھا۔ اسے اس کی توفیق نہیں ہو رہی تھی۔ معافی مانگنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ اس کے دربار میں جانے کے لیے ناگوں میں سکت نہیں رہی تھی۔ اس کے سامنے کھڑے ہونے کا اون نہیں مل رہا تھا۔ ”وہ جسے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔“ ایک آیت اس کے ذہن میں ابھری۔ آنکھیں پھر چشموں کی طرح اٹل پڑیں۔ ولیم اسے اپنا گناہ لگ رہا تھا۔ جس بات سے خدا نے روکا تھا وہ اس غیر ممنوعہ کا شرف تھا۔ وہ اب کبھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ اس کے دل سے آواز آئی۔ نہیں..... یا اللہ! یا نہ کرنا۔ تجھے تجھے تیرے مجھے کا واسطہ..... مجھے کتنا نام نہان پرآئی ہے اور وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

”کیا تم اس قابل ہو کہ اس ہستی کا واسطہ دو جس کی عظمت، ذات، اخلاق اور مصیبت کی پروردگار قسمیں کھائے..... کائنات کا مالک..... ارض و سما کا خالق اپنی محبوب ہستی کو جھٹلانے والے پر غضب ناک ہوتا ہے۔ کیا تم ہو اس قابل.....؟“ ایک اور آواز نے سرزدش کی۔ وہ اور شدت سے رونام شروع ہو گئی اور مرغ بلبل کی طرح تڑپنے لگی۔ اپنے ہاتھ اٹھا اٹھا کر بستر پر مارنے لگی۔ ولیم کی چھٹیں اب تنم گئی تھیں مگر اب اس کے اندر اس کا دل چچ رہا تھا۔

”تم اس قابل نہیں..... تم اس قابل نہیں.....“ اسے لگ رہا تھا جیسے خدا اس سے بہت زیادہ ناراض ہے اور کچھ بہت دور ہو رہا ہے۔ وہ اسے

روکنا چاہتی تھی مگر گزرا کر تو بہ کرنا چاہتی تھی مگر وہ سن ہی نہیں رہا تھا۔

”ہاں، میں ہوں اس قافلہ..... نہ تو میں نے تیری ذات میں کسی کو شریک ٹھہرایا اور نہ ہی مجھے کچھ کی عہدیت میں شک کیا تو پھر..... تو مجھ سے کیونکر ناراض ہو گیا۔ میں مانتی ہوں میں نے گناہ کیا ہے مگر تو نے بھی تو اپنے آپ کو زمین اور ان کو رحمت اللعالمین کہا ہے۔ انھوں نے تو کافروں سے بھی درگزر فرمایا۔ میں کافر ہوں نہیں۔ تو جانتا ہے میں کافر نہیں۔“ وہ بڑبڑانے لگی۔

”ہاں اور تو ایمان والی بھی نہیں۔“ کسی نے پھر ٹھوکا دیا۔ وہ پھر سسکتے لگی۔ اس کے پاس دلائل ختم ہونے لگے، وہ خاموش ہو گئی۔ اندر کی آواز کہیں گم ہو گئی۔ سکوت چھانے لگا اور وہ پریشاں و پشیمانی سی بچے کو بھگوانے لگی۔ لہجہ بدلتا بھلتا شیخ کے موسم کے مانند آنسو پڑا آنسو پکانے لگی۔ موسم پھلتا رہا اور آنسو چھپتے رہے اور پھر شیخ نہ جانے کب بچھ گئی۔

ولیم سلپیٹنگ بلوے کر سوراہا تھا۔ پیچھے چلا جاتے ہوئے اس نے دروازے سے گولیاں نکال کر کھائی تھیں اور پھر وہ کب سو گیا اسے کچھ خبر نہ تھی۔ سارا دن وہ سوتا رہا اور وہ بار بار کک سے اس کے بارے میں پوچھتی رہی۔ نور بھی نہیں آئی تھی۔ وہ سوراہا تھا۔ کک نے اسے آواز میں بھی دیں مگر وہ گہری نیند میں سوراہا تھا۔

”اے مجھوڑ کر ہلاؤ۔ کہیں وہ.....“ وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے افضل سے کہا۔

”جی ہاں جی جی“ وہ باہر نکل گیا۔

”اس کی سانسیں دیکھنا۔ وہ..... وہ زندہ تو ہے ناں۔“ اس نے پیچھے سے آہستہ سے آواز دی اور پھر ایک دم خاموش ہو گئی۔ ”خدا نہ کرے اسے کچھ ہو۔ جو بھی کیا میں نے کیا۔ اس کا تو کوئی قصور نہیں۔“ وہ پھر بڑبڑائی۔

”جی وہ کہہ رہے ہیں تمھاری دیر بعد انھیں گے۔“ افضل نے آکر اطلاع دی تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ شکر ہے وہ ابھی زندہ ہے۔ جیسے اسے اس کی زندگی کا پرانا منہ لگا ہوا تھا۔ رات کو جیج کیوں رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ وہ اس سے کیسے پوچھے۔ وہ تو اس سے قحطی سے بات کرنے لگا تھا۔ شام گہری ہونے لگی۔ آج نور آئی تھی نہ ہی حیدر۔ تمھاری اور ادا سے شدید ڈپریشن ہونے لگا۔ جب ایک دم حیدر کی گاڑی کا پارلر سنائی دیا۔ وہ اس کے کمرے میں آیا تو حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”آج نور نہیں آئی؟“ حیدر نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں، کیوں؟“ اس نے بھی حیرانی سے پوچھا۔

”آج تم نے کپڑے نہیں بدلے۔ سہیل آ رہی ہے۔“ حیدر آہستہ سے بولا۔ نور روزانہ اسے کپڑے خود پہنچ کر داتی تھی۔

”حیدر! میرے جسم کی نہیں، میرے گناہوں کی بدلیو ہے۔ میرے گناہوں کے پھوڑے اب پھٹے شروع ہو گئے ہیں۔“ وہ بے بسی سے آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے بولی۔

”کیا مطلب! تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟“

”حیدر! خدا مجھ سے ناراض ہے۔ وہ مجھ سے بات نہیں کرتا۔“

”تم کیا کہہ رہی ہو؟“

”حیدر! میرا گناہ واقعی ناقابل معافی ہے۔“

”شہلا! قصص کیا ہو گیا ہے؟“

”یوں! اے پلیز یلو۔۔۔۔۔ بتاؤ۔۔۔۔۔؟“

”وہ رخصت ہے، انسان نہیں۔ وہ تو بس ہر ایک پر مہربان ہے۔“ حیدر نے آہستہ سے جواب دیا۔

”تو پھر وہ مجھے کیوں معاف نہیں کر دیتا۔ ہم جیسوں کے بارے میں قرآن کیا کہتا ہے؟“

”تم جیسے کیا مطلب؟“ حیدر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”جو مسلم، نہ کافر، نہ منافق اور نہ ہی مرتد۔“ حیدر خاموش ہو گیا اور سوچنے لگا۔ وہ اس کے جواب میں کون سی آیت کا حوالہ دے۔ کس

دلیل کو پیش کرے۔ وہ سوچوں میں گم بیٹھا تھا۔

”حیدر! قرآن کہتا ہے کہ اس نے اس واضح کتاب میں کسی خشک اور ترشے کا ذکر نہیں چھوڑا تو کیا اس نے ہم جیسوں کا ذکر نہیں کیا۔ ہمارا

ذکر کرتا اس نے پسند نہیں کیا۔ حیدر! اس کے بارے میں واقعی ہماری کوئی جگہ نہیں۔ اس نے واقعی ہمارا ذکر نہیں کیا۔“ وہ رونے لگی۔

”شہلا! احسن کیا ہو گیا ہے۔ کسی باتیں کرنے لگی ہو۔ تم نے اور میں نے قرآن پاک کا ترجمہ رشید صاحب سے اکٹھے پڑھا تھا کیا تم

بھول گئیں جب وہ کہتا ہے۔ ”وہی تو ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کے قصور معاف فرماتا ہے اور جو تم کرتے ہو سب جانتا ہے۔“

حیدر نے صہمت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اس کے آبلہ پائینے میں جیسے ٹھنڈی پھواری پڑ گئی۔ وہ خاموش ہو گئی۔ حیدر بھی خاموش تھا۔

”ماپوسی کفر ہے۔ انسان گناہگار ہے، بھٹک جاتا ہے مگر وہ رخصت ہے۔ وہ بھٹک دل اور تنگ نظر نہیں۔ اس سے اچھی امید رکھو۔“ حیدر نے

اس کی مضطرب حالت دیکھ کر اسے دلاسا دینا چاہا۔

”حیدر! کیا واقعی وہ مجھے معاف کر دے گا؟“

”یہ تو آنسوؤں کی شدت اور دلوں کی تڑپ میں مضمر ہے مگر مجھے یقین ہے جو عداوت سے اس کی طرف قدم بڑھاتا ہے وہ رحمت کے

دروازے کبھی بھی اس پر بند نہیں کرتا۔“

”حیدر! کیا میرا گناہ معاف کیا جاسکتا ہے؟“

”شہلا! مجھے یہ آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ تم خدا اور اس کے احکامات سے نا آشنا تو نہ تھیں۔ سید صاحب نے قصص قرآن ترجمہ کے

ساتھ پڑھوایا اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم عبادت گزار بھی تھیں مگر تم نے فیصلہ کرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے بھی نہ سوچا کہ خدا تم سے ناراض ہو

جائے گا۔ تم اس کی کتنی بڑی حد کو توڑنے جا رہی تھیں۔ کیا واقعی تم نے کچھ نہ سوچا۔ ایک لاطم قصص پر اتنی حیرت نہیں ہوتی جتنی اس پر جو علم بھی رکھتا ہو

اور عقل بھی۔ "حیدر نے نہ چاہتے ہوئے بھی یہ سوال کر ڈالا۔ وہ حیدر کی طرف دیکھنے لگی اور پھر گہری آد بھری۔

"اسی لیے تو میں اپنے آپ کو ناقابل معافی سمجھتی ہوں۔ حیدر! اس وقت میرے ذہن میں صرف یہی ایک سوچ تھی کہ میں ایک انسان ہوں جس کے کچھ حقوق ہیں اور میں نے کسی بھی بات کے بارے میں نہ سوچا۔ سب کچھ پس پشت ڈال دیا۔ سب کچھ بھلا دیا کہ میں کون ہوں۔ میں تو صرف یہ چاہتی تھی کہ کوئی تو مجھے انسان مانے اور مجھ سے انسانوں جیسا سلوک کرے۔ کوئی تو خوشبو بھی محبت کرے جو ایک سچا انسان دوسرے سے کرتا ہے۔ کوئی تو ہو، کوئی ایک تو ہو۔" اس کی آنکھیں پھر برسنے لگیں۔

"کیا تمہارے لیے یہی کافی نہیں تھا کہ جس "کوئی" کو تم ڈھونڈنے لگی ہو کیا وہ حیدر نہیں؟ تم جانتی تھیں کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا تھا اور اسی کی وجہ سے شاید مجھ سے بھی گناہ مرزد ہو گیا۔ میں اپنی بیوی کو وہ محبت نہ دے سکا جو شاید اس کا حق تھا۔"

"حیدر! تم نے ایسا کیوں کیا۔ حیدر! کو اس کا حق کیوں نہ دیا؟"

"معلوم نہیں شہلا! شاید اس کے دل میں کوئی گہرے گئی تھی یا پھر میرے قدم ہی کسی نے جکڑ لیے تھے۔ ہم دونوں بس اپنی اپنی جگہ سناکت تھے۔ بہت جذباتی، وہ مجھے معاف نہیں کرتی تھی اور میں بھی اسے وہ مقام نہ دے سکا۔ وہ روشنی رفتی، میں بھی اسے نہ مٹاتا اور جب مٹاتا تو وہ نہ مانتی۔ بس زندگی کیسے گزر گئی سمجھ ہی نہیں آیا۔ شہلا ہماری محبت کی نہیں جذباتیت کی پیداوار ہے اس لیے اس میں شعلہ لگاتی ہے اور کبھی کبھی ایسی کڑواہٹ آگتی ہے کہ میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں جس پودے کے بیج کو محبت سے نہ پویا گیا ہو اس کے پھل سے مٹھاس اور سائے سے خشک کی توقع ہی بے بنیاد ہے۔ کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے مجھ سے بہت بڑا گناہ مرزد ہو گیا ہے۔" وہ آد بھر کر بولا۔ شہلا اس کی بات سن کر خاموش ہو گئی اور اس کی طرف دیکھتی رہی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" حیدر نے ہلکا خفائی دہر کے بعد سکوت توڑا۔

"سوچ رہی ہوں ہم کیسے بھگ گئے۔ انسان کو بھگنے میں صرف چند لمحے لگتے ہیں اور وہ بھٹکتا جاتا ہے جیسے پیاز کی چوٹی سے لڑھکتا پتھر گرتا ہی چلا جاتا ہے۔ شاید انسان بھی اصل ترین کھانوں میں جا کر دم لیتا ہے پھر اسے معلوم ہوتا ہے کہ جس پھسلن پر اس نے قدم بھانے کی کوشش کی تھی اسے تو اس نے بہت ہموار زمین سمجھا تھا۔ اُف! ایزنگ کی کس قدر مشکل ہے۔ حیدر! ہم بھگ گئے۔ ہم کیوں نہ مطمئن ہو گئے۔ ہماری رو میں کیوں منتشر اور بے قرار رہیں اور یہ وہ انتشار تھا کہ ہم بھگ گئے۔ ہم گنہگار بن گئے کاش۔۔۔۔۔" وہ ایک دم پھر خاموش ہو گئی۔

"شہلا! افراتو فراتو نہ بھگتے تھے۔ سارے کے سارے انسان خطا کار ہیں اور بہترین خطا کار وہ ہیں جو بہت زیادہ توبہ کرنے والے ہیں اور میں تو دن رات اپنے رب سے معافی مانگتا رہتا ہوں۔ تم بھی توبہ کرو۔" گویا حیدر بھی آج صاف کوئی سے اعتراف جرم کے موڑ میں تھا۔

"کیا ہمیں معافی مل جائے گی؟" وہ پھر بے چینی کے عالم میں بولی۔

"میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں؟"

"اس ستر مرگ پر انسان جس طرح امید و ہم کے درمیان مفر کر رہا ہوتا ہے وہ بہت تکلیف دہ ہے کاش تم سمجھ سکو۔"

”تم مطمئن ہو جاؤ، اس کی رحمت انسان کے گناہوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔“ حیدر نے پھر اسے تسلی دینا چاہی اور اسی لمحہ نور کرے میں داخل ہوئی۔

”آئی ایم سوری، میں نے ڈسٹرب تو نہیں کیا۔“

”نہیں بیٹا! ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ آج کافی لیٹ آئی ہو۔“ حیدر نے اس سے پوچھا۔
 ”ہاں انکل! آج میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اس لیے لیٹ ہو گئی پھر یاد آیا کہ آئی کو پہنچ بھی کرانا ہوتا ہے اس لیے میڈیٹر کھا کر آئی ہوں۔“

”جینک پو بیٹا! تم ہمارے لیے اتنا کچھ کر رہی ہو۔ خدا تمہیں اس کا اجر دے۔“ شہلانے لپٹے لپٹے اسے دعا دی۔ حیدر نے بھی اس کی طرف پرستش نظروں سے دیکھا تو وہ ہار نکل گئی۔ شہلا کو پہنچ کر آنے کے بعد وہ ولیم کے کمرے میں آئی تو وہ بیڈ پر بیٹھا چائے پیا رہا تھا۔ اس کی متورم آنکھیں اور چہرہ رات کی کہانی سن رہے تھے۔ وہ ابھی تک الجھا الجھا سا لگ رہا تھا۔

”ولیم! کیا بات ہے تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔“ نور نے حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
 ”نہیں، میں ٹھیک ہوں۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”میری طرف دیکھ کر بات کرو۔ کیا مسئلہ ہے؟“

”کچھ نہیں، کیا تم کل جلدی آ سکتی ہو؟“

”ہاں کیوں، کہیں جانا ہے کیا؟“

”ہاں، بہت دن ہوئے چرچے کئے ہوئے۔ میں چرچ جانا چاہتا ہوں۔“ اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر چہرہ لٹکا ہوں سے کہا جیسے وہ کسی قابل اعتراض جگہ کے بارے میں بات کر رہا ہو۔ نور اس کی بات سن کر ایک دم چنگی۔ کوئی چیز چھتا کے سے اندر ہی اندر ٹوٹی۔ اس نے گہری سانس لی اور خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”ٹھیک ہے، کتنے بجے آ جاؤں؟“ اس نے آہستہ سے پوچھا۔

”صبح نو بجے کے قریب۔“ اس نے بھی بے دلی سے جواب دیا۔ نور اٹھ کر باہر آ گئی۔ اسے سخت محسوس ہو رہا تھا۔ اسے نہ جانے کیوں یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ رفتہ رفتہ وہ اسے سچائی کی طرف لے آئے گی مگر وہ اپنی جگہ پر ہی کھڑا تھا اور وہ اپنے مقصد کی کامیابی کا تعین کر کے بیٹھی تھی۔ اسے سب کچھ سراپ نظر آنے لگا۔ ساری محنت اکارت جاتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایک انسان کے دل کو بدلنا بہت مشکل ہے۔ اس نے سوچا۔ دلوں کو صرف خدا ہی بدل سکتا ہے۔ وہ سنگین پتھروں سے غصے بہا سکتا ہے تو کیا دل اس سے بھی زیادہ سخت ہو سکتے ہیں۔ یا اللہ! ولیم کے دل کو بدل دے آئی کے لیے اور میرے لیے۔ اس نے دل ہی دل میں گڑ گڑا کر دعا کی اور خاموشی سے حقیقتہ پڑھ کر اس کی جانگوں پر پھونک مارنے لگی۔ ولیم حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے امید تھی آج وہ ایسا نہیں کرے گی لیکن اس کی مستقل مزاجی دیکھ کر وہ ٹھنک سا گیا اور زبان سے کچھ نہ بولا۔ وہ بھی

خاموشی سے خدا حافظ کہہ کر نکل گئی۔

اس رات وہ سکون سے سوئی۔ ذہن میں کسی چنگاری نے آگ نہ لگائی۔ کوئی طوفان نہ برپا ہوا۔ کسی بھی شے نے ظالم اور تذبذب میں نہ جکڑا۔ وہ مطمئن ہو گیا۔ وہ محض ذہن کا وقتی رجحان تھا اور یہ تو انسانی نفسیات ہے کہ کبھی کوئی بات ایسی ذہن میں آگتی ہے کہ ہزار بار کھرچ، صاف ہی نہیں ہوتی لیکن پھر ایسی غائب ہوتی ہے کہ دوبارہ بھول کر بھی یاد نہیں آتی۔ وہ مطمئن ہو گیا۔ اس نے رات کو بھر پور اسٹڈی کی اور پھر سو گیا۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے نور بجلی تھی اور وہ بھی تیار ہو رہا تھا۔ افضل نے اسے گاڑی میں بٹھایا اور وہ خاموشی سے ڈرائیو کرنے لگی۔

”نور! کیا بات ہے۔ تم کیوں خاموش ہو؟“

”میری طبیعت کل سے خراب ہے۔ ابھی بھی مجھے بخار ہے۔“

”تو تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟“ اس نے ایک دم حیرت سے پوچھا اور گیر پر دکھے اس کے ہاتھ کو چھوا تو چونک گیا۔ ”واقعی تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔ تم آئیں کیوں؟“

”تمہاری خواہش کے لیے۔ تم جانتے ہو میں تمہیں کبھی بھی الٹا نہیں کر سکتی۔“

”انورہ! یہ کیا حماقت ہے۔ تم بیمار ہو اور تم..... چلو واپس چلو۔“

”نہیں، اب تم چرچ سے ہوتی آؤ تو بہتر ہے۔ تمہارا سا قاصد مل گیا ہے۔“ اس نے چرچ کے سامنے گاڑی روکی۔ اسے چرچ میں چھوڑ کر وہ خود گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لیٹ گئی۔ باہر قدرے ٹھنڈ ہو رہی تھی۔ گو کہ موسم بدل رہا تھا مگر ابھی بھی فضا میں نکلی باقی تھی۔ اکا دکا لوگ چرچ آ رہے تھے۔ چرچ کے احاطے میں ہر طرف اونچی اونچی ہاڑوں اور لمبے لمبے ستیڈے کے درختوں نے چرچ کی سگو اور فضا میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ سردیوں کی تاریک رات جیسی گہری خاموشی ہر طرف چھائی تھی۔ وہ وکیل چیتڑ پر بیٹھا کرائسٹ اور در میری کے تجسس کے سامنے سر جھکا کر، آنکھیں بند کیے، ہاتھ باندھے ہوئے آہستہ آہستہ سرگوشتیاں کر رہا تھا۔ اپنا غائبانہ کر رہا تھا۔

”میں بہت پریشان ہوں۔ بہت بکھرا ہوا، مجھے سکون چاہیے۔ مجھے اپنی طرف لے آؤ۔ مجھے اپنی طرف لے آؤ ورنہ میں..... میں بکھر جاؤں گا۔“ وہ گہرے ناسف میں کھویا آہستہ آہستہ سر ہل رہا تھا۔

”اور تم مرنا تو مسلمان ہی مرنا۔“ پھر آیت نے پوری شدت سے نہ جانے کہاں سے آ کر اس پر حملہ کیا۔ ”اف! یہ کہاں سے..... وہ تو اسے ہولا چکا تھا۔ اس کا اندر بکھر بھجلائے لگا۔ اس کی روح تڑپنے لگی۔ وہ تو مطمئن ہو چکا تھا اور اب پھر مضطرب ہونے لگا۔ یہ سب کیا ہونے لگا تھا۔ کرائسٹ کے سامنے بیٹھ کر وہ کیا سوچ رہا تھا۔ کاش کوئی جسم شے سے ٹک کرتی تو وہ اس کے پرچے اُڑا دیتا اور اب اپنے اندر سے کہاں سے اسے صاف کرے۔ یہ سب کیا تھا.....“ میں گناہ کر رہا ہوں..... اوہ گاؤ! وہ بکھر کر کے بال بونچے لگا۔“ مجھے اپنی طرف لے آؤ..... اوہ گاؤ.....! وہ اب زور زور سے پڑ پڑانے لگا۔

”یا اللہ! اس کی ہدایت کی طرف رہنمائی کر۔ اس کو اپنی طرف لے آ، سچائی کی طرف۔“ نور آنکھیں بند کیے سخت بخار میں جھلا پورے

خلوص کے ساتھ، دل کی گہرائیوں سے اس کے لیے دعا کر رہی تھی۔ ایسے خلوص اور سچائی کے ساتھ جی دعا جو فرش تک بغیر کسی رکاوٹ کے پہنچتی ہے۔
 ”کرائسٹ! مجھے معاف کر دو۔ درمیری۔۔۔ گاؤ۔۔۔“ وہ بڑبڑا رہا تھا۔ التجائیں کر رہا تھا، گڑگڑا رہا تھا۔ اس کا سر گھٹنوں کے ساتھ لگان کے حضور جھکا چلا جا رہا تھا۔

”اس کا اندر بدل دو۔ اسے اپنی طرف لے آؤ۔“ وہ بھی مسلسل دعائیں کر رہی تھی۔ نیم بے ہوشی میں بڑبڑا رہی تھی، گڑگڑا رہی تھی۔
 کراہتی آواز اور پیار جسم کے ساتھ التجائیں کر رہی تھی پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔ نہ جانے کتنی ہی دیر گزر گئی۔ ہاہر دھوپ کافی پھیل چکی تھی۔ کسی نے گاڑی کا شیشہ کھٹکھٹایا۔ اس نے بڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ بوڑھا چوکیدار اسے اٹھارہا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے بڑبڑا کر پوچھا۔

”ولیم صاحب آپ کو اندر بلا رہے ہیں۔“

”اوہ آئی سی امیں تو بھول ہی گئی۔ بابا، آپ میرے ساتھ اندر آئیے۔ ہم اس کو اندر سے لے آتے ہیں۔“ دو چوکیدار کو روکتے ہوئے بولی اور دونوں نے اسے لاکر گاڑی میں بٹھایا۔ اس نے ویل چیر کو فونڈ کر کے ڈوکی میں رکھا اور گاڑی ڈرائیڈ کرنے لگی۔ دونوں خاموش تھے۔ ولیم وٹوڈ سے مسلسل باہر دیکھ رہا تھا اور کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ بہت الجھا ہوا لگ رہا تھا۔ مختلف تاثرات اس کے چہرے پر نمودار ہو رہے تھے جیسے کبھی کسی بات کو جھٹلا رہا ہو، تروید کر رہا ہو، مان رہا ہو، چمک رہا ہو، الجھ رہا ہو۔ وہ بھی کن آنکھیں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے بدلے ہوئے رویے سے چمک رہی تھی۔ چرچ جانے سے پہلے وہ اس قدر خاموش اور الجھا ہوا نہیں تھا اور اب بہت پریشان لگ رہا تھا۔

”لگتا ہے تم چرچ جا کر کافی بے سکون ہو گئے ہو۔“ نور نے جان بوجھ کر پوچھا۔

”لوں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔“ وہ پھر خاموش ہو گیا۔ نور کو اس کے جواب سے حیرت تشویش ہونے لگی۔

”پھر تارے کو ٹھیک نہیں ہوا؟“

”نہیں۔“ اس نے گہری سانس لے کر جواب دیا۔ وہ بھی خاموشی سے ڈرائیڈ کرنے لگی۔ اسے کمرے میں چھوڑ کر وہ باہر نکلنے لگی تو رک گئی۔

”ولیم! میرے وطنیہ کے چالیس دن پورے ہو گئے ہیں اور اب میں کل سے یہاں نہیں آیا کروں گی۔“

”کیوں کیا مطلب؟ کیا تم مجھے چھوڑ کر جا رہی ہو؟“ وہ ایک دم بے مبری سے بولا۔

”نہیں لیکن میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“

”اوہ اچھا! شکر ہے یہ بات ہے۔“ اس نے سکھ کا سانس لیا۔

”ولیم! کیا تمہیں اپنی تنہائی سے بہت ڈر لگتا ہے؟“

”ن۔۔۔۔۔ نہیں تو۔۔۔۔۔ مگر میں۔۔۔۔۔“ وہ اس سے کچھ شہ تر کرنا چاہتا تھا مگر خاموش رہا۔

”میں دیکھ رہی ہوں تم اپنی سوچوں کو اب الفاظ دینے سے ڈر لے گئے ہو۔ تم کیوں الجھ رہے ہو۔ اگر اسی طرح الجھتے جاؤ گے تو تم جنونی ہو

”ٹھیک ہے اب میں چلتی ہوں۔ میں حیدر انکل کو بتا دوں گی۔ وہ ویسے بھی آنٹی کے لیے نرس کا انتظام کرنے کی بات کر رہے تھے۔ ضرورت ہوئی تو فون کر لیتا۔“ وہ کہہ رہی تھی مگر وہ سن نہیں رہا تھا، کہیں کھویا ہوا تھا جیسے کسی پھنوس میں کشتی لہہ بہ لہہ ڈوب رہی ہو۔ اس کی سوجھیں گرداب میں پھنس رہی تھیں۔ لہہ بہ لہہ نیچے کو ستر کر رہی تھیں اور سارے جذبے جیسا فنا ہو رہے تھے۔ ختم ہو رہے تھے۔ وہ ڈوب رہا تھا۔ ساحل کہیں دور تھا۔ شاید افق کے پار..... نظروں سے دور..... ہر شے سراپا تھی..... دو جا بکلی تھی اور وہ سر جھکائے کہیں کم ہو چکا تھا۔



وہ سہیل اور آصف کے گھر ہو کر آئی تھی۔ ان لوگوں کی مالی اور اخلاقی مدد کر کے آئی تھی۔ دونوں خاندان تو اسے سمجھا سمجھ کر اس کی پذیرائی کرتے رہے اور بہت سی وعائیں دے کر رخصت کیا۔ اسے گوندا طہینان محسوس ہوا۔ اندر کی طاقتوں سے قدرے جان چھوٹی۔ وہ ناشتا کرنے کے بعد حسب عادت اخبار پھیلانے سامنے بیٹھی تھی کہ ایک دم چنگی اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ طلق خشک ہونے لگا۔ دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔ سارا جسم کاپٹنے لگا۔ وہ بار بار خبر پڑھ رہی تھی۔ وہ اونچی آواز میں چیخا چلانا چاہتی تھی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتی تھی مگر آواز جیسے کسی صحرا میں گم ہو گئی تھی جہاں ہر طرف ریت کے گولے اسے ادھر سے ادھر اٹھا کر پھینک رہے تھے۔ اس نے جلدی سے موبائل کا نمبر ملایا مگر وہ بڑی تھا۔ آف لائن تھا۔ یہ سب کیا ہو گیا۔ وہ اخبار اٹھا کر پھر پڑھنے لگی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی نظریں دھوکا کھا گئی ہوں۔ اس نے کوئی غلط خبر پڑھ لی ہو۔

"آفاق کیسے مر سکتا ہے اور مدد نہ ملے گی۔" بحر نے دلوں کو ٹوٹ کر دیا ہے۔ بحر نے..... بحر تو آفاق سے بہت محبت کرتی تھی۔ "وہ خود ہی بڑا رہی تھی۔ اس نے پھر نمبر لایا مگر وہ مسلسل آنکھ جابھاتا تھا۔ اس نے پھر اخبار اٹھا کر خبر پڑھی۔ بحر نے نشے میں دھند دلوں کو ٹوٹ کر دیا تھا اور پھر اپنے آپ کو بھی گولی مار لی تھی مگر وہ زخمی اور ڈنکی حالت میں اسپتال میں داخل تھی۔ اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ آفاق اس کا بھائی، چھائیوں اور نکلنے کا ساتھی، اسے اس سے کتنی محبت تھی اور وہ کیسے مر گیا۔ اتنی جلدی..... پہلے فلک اور اب آفاق، آنسو ٹپ ٹپ کرنے لگے۔ آفاق! تم اس طرح نہیں جا سکتے۔ میں کیسے زندہ رہوں گی۔ تم بے شک دور تھے مگر زندہ تو تھے۔ تم نے تو زندگی میں تنخیاں ہی دیکھی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کسی بھی پر سکون نہیں رہا تھا۔ اس نے بہت مختصر زندگی گزاری تھی۔ ایک ڈال سے دوسری ڈال پر، بے سود اوڈانیں بھری تھیں۔ بے مقصد گھومتا پھرتا رہتا تھا۔ نہ جانے کس کی تلاش میں..... اس نے پھر نمبر لایا۔ وہ پھر بیڑی تھا۔ اس نے مگر کانمبر لایا۔ کسی اجنبی آواز نے ہیلو کہا۔ اس نے کانچی آواز میں جنازے کا دُعا پڑھا۔

”شام کو مغرب کے بعد۔“ فون بند کر دیا گیا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ صبح کے گیارہ بج رہے تھے اور شہر بچنے میں دو تین گھنٹے تو ضرور لگیں

گئے۔ پہلے ڈرائیور سے لینے آئے گا اور پھر اسے لے کر جائے گا۔ وہ ہار ہار حیدر کو فون ملائی رہی مگر اس کا موبائل آف تھا۔ اس نے ڈرائیور ڈرائیور کا موبائل نمبر ملا یا اور اسے جلدی گاؤں آنے کو کہا۔

”بی بی جی! میں پانچ بجے پہنچ جاؤں گا۔“

”نہیں، جلدی آؤ۔ میری جیسی ہے اور تم اس وقت کہاں ہو؟“

”میں جی جہلم سے بات کر رہا ہوں۔ حیدر صاحب آگے منگائے گئے ہیں۔ کوئی سرکاری کام تھا۔ میں ان کو چھوڑ کر لاہور آ رہا ہوں۔ وہ رات کو خود آ جائیں گے۔“

”تو جی جہلم سے جلد سے جلد پہنچنے کی کوشش کرو۔“

”جی بی بی! میں بس آ رہا ہوں مگر تم تو لگے گانا۔ جہلم سے شہر پر وہ ٹھیک ہے جی، آپ میرا انتظار کریں۔“ اس نے فون بند کر دیا۔

اس کے لیے ایک ایک لمحہ شدید کربناک ہو رہا تھا۔ وہ مسلسل رو رہی تھی۔ آفاق اس کی نظروں کے سامنے محو رہا تھا۔ سحر اتم نے کیوں ایسا کیا۔ تم بھی تو اس سے بہت محبت کرتی تھیں۔ یہ محبت کرنے والوں کو اچانک کیا ہو جاتا ہے۔ اتنے سفاک، اتنے ظالم، اس قدر خوفناک وحشی و دہشت گرد کیوں بن جاتے ہیں۔ جیسے ہی سردخ کی طرف خیال جاتا تو جیسے کچھ سمجھ آنے لگتا۔ وہ اپنی محبت میں شراکت داری برداشت نہیں کر سکتی ہوگی۔ شاید اس لیے..... شاید یہی وجہ تھی مگر آفاق..... اس کے ساتھ کیوں ایسا کیا..... کیوں؟ وہ رو رو کر پاگل ہو رہی تھی۔

سحر کا بہت خون بہہ چکا تھا۔ وہ کس طرح ہسپتال پہنچائی گئی۔ کون لایا، کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس کے پاس اب کوئی بھی نہیں تھا۔ باہر پولیس کھڑی تھی اس کا بیان لینے کے لیے۔ شاید اس کی حالت بھی خطرے میں تھی۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ ڈاکٹر بھی کوئی توجہ نہیں دے رہے تھے۔ خون مسلسل بہہ رہا تھا۔ نہ کوئی آپریشن کر کے گولی نکال رہا تھا اور نہ کوئی اسے پراپرلی چیک کر رہا تھا۔ بس کاشن رکھ کر وینڈر کر دی گئی تھی۔

”ڈاکٹر صاحب! الزمہ کا بیان لینا ہے۔“ ایک سپاہی نے سرجن سے پوچھا۔

”ہاں، لے لو، کس نے روکا ہے۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔

”کیا وہ بیان دینے کی حالت میں ہے؟“

”ہاں، ہاں جاؤ۔“ سرجن نے اسے ہاتھ لٹے ہوئے کہا۔ وہ نرس کے ساتھ اندر گیا۔

”بی بی! آنکھیں کھولو۔“ نرس نے اسے مہینوزا۔

”اول.....“

”بیان دو۔“ سپاہی نے کہا۔

”ہاں، میں نے قتل کیے ہیں۔ گولیاں ماری ہیں۔ دھوکے دیے ہیں۔ دھوکے کمرے نکال رہی تھی۔“ اور وہ پھر خاموش ہو گئی۔

”ٹھیک ہے، ادھر سائن کر دو۔“ مگر اس کے ہاتھوں میں جان ہی نہیں تھی۔ نرس نے بین کی سی ای انگوٹھے پر لگا کر کاغذوں پر انگوٹھا لگا

دیا۔ کارروائی ختم ہو چکی تھی۔ وہ بے بس، بے آسرا پڑی تھی۔ ایک دم اس نے آنکھیں کھولیں۔ چاروں طرف دیکھا اور پھر کچھ یاد آنے لگا۔ مہر رخ اس سے کہہ رہی تھی۔ جلدی اس گھر سے نکلو۔ سڑکوں پر بھیک مانگو یا پھر کہیں اور جاؤ مگر یہ گھر خالی کر دو۔ اس نے اس کا سامان پیک کر کے لاؤنج میں رکھ دیا تھا۔

وہ اس وقت کتنی بے بس تھی جب وہ اسے دھکے دے کر گھر سے باہر نکال رہی تھی۔ وہ رو رہی تھی شدت سے۔ کہاں جائے، کوئی بھی تو آسرا نہ تھا۔ شزا گھر نہیں تھی اور مہر رخ آفاق کو بتائے بغیر سب کچھ کر رہی تھی۔ آفاق سو رہا تھا اور وہ اسے دھکے دے رہی تھی، بوڈیل کر رہی تھی۔ وہ لڑھکتی ہوئی راستے کے پتھر کی طرح ٹھوکریں کھاتی ہوئی گیٹ سے باہر پھینگی جا رہی تھی۔ وہ بھکارن جو تھی اس لیے اسے دھکے دیے جا رہے تھے۔ پیدا آئی بھکارن جس کے نصیب میں پہلے دن سے ہی دھکے کھائے گئے تھے۔ دھکے، ٹھوکریں، کالیاں، جھڑپاں کچھ بھی تو نہیں بدلاتا تھا۔ کیا نصیب بھی بدل سکتا ہے۔ وہ ٹوٹ چکی تھی، بکھر چکی تھی۔ ریزہ ریزہ ہو چکی تھی۔ مہر رخ بھری شیرنی کی طرح اس پر ٹوٹ رہی تھی۔ اسے جھجھوڑ رہی تھی۔ مسلسل کچھ کے نگار رہی تھی، دھکار رہی تھی۔ اس نے آخری ٹھوکر مار کر اسے گیٹ سے باہر دھکا دے دیا تھا۔ وہ دریاں سڑک پر پٹیختی تھی جیسے ٹھکی ہادی بھکارن سارا دن چلتے چلتے تھک ہار کر لب سڑک بیٹھ جائے اور اس کا کاسہ بھی خالی ہو۔ اس کے اندر شدید انتقام کی چنگاریاں آہستہ آہستہ بھڑک رہی تھیں جوالا کھسی بننے کو تیار تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ پلٹی ہوئی چند قدم کے فاصلے پر پی سی او پر آئی اور ایک فون کرنے کی اجازت مانگی۔ پی سی او کے مالک نے اس کا حلیہ دیکھ کر اسے فون کرنے دیا۔ اس نے ذہن ہندو ڈال لیا۔ ہوئے مسز زہیر کا نمبر لایا اور انہیں ساری بات بتائی۔

”تم..... تم جیس تو چاہیے کہ ان دونوں کو شوٹ کر دو۔“ مسز زہیر غصے سے بولی۔ جوالا کھسی کو آگ بھری ہوا ملی۔

”مگر میرے پاس ریوا لوند نہیں۔“

”تم فکر کیوں کرتی ہو۔ تم کہاں ہو، میں تمہیں دوں گی۔ میرے پاس بہت سے بغیر لائسنس کے ریوا لوند ہیں۔ میں ابھی لوڈ کر کے لاتی ہوں۔“ مسز زہیر نے فون بند کر دیا اور چہرہ لہلہ میں وہ اس کے سامنے تھی۔ اسے گاڑی میں بٹھا کر انہوں نے گیٹ کے سامنے اتارا۔

”ذرا بھی نہ ڈرنا اور نہ گھبرانا۔ ایسے مردوں کا ایسا ہی انجام ہوتا چاہیے اور مہر رخ تو ویسے بھی بہت ذلیل ہے۔ میری اس کی پرانی دشمنی ہے۔ ملک منصور کے سامنے جب میں نے اس کا سارا پول کو لا تو بڑی تھلائی تھی۔ شزا نے اس کو ملک منصور کو پھانسنے کے لیے بھیجا تھا۔ خیر تم چھوڑ دو، دونوں میں سے کسی کو بھی نہ چھوڑنا۔ دونوں اس قابل نہیں۔ آفاق نے تمہیں کس طرح ہانچہ بنا دیا اور پھر خود دوسری شادی بھی کر لی۔ یہ مرد تو ہوتے ہی ہر جاتی ہیں۔“ وہ مسلسل بول کر اس کے اندر انتقام کی آگ کو بھڑکا رہی تھی۔ وہ خاموشی سے سن رہی تھی۔ اندر ہی اندر جلتے جھپٹے کوکٹوں کی طرح دھک رہی تھی جیسے کسی عچے سے ہوا دینے سے وہ دھکے ہیں اور پھر ایک دم آگ بھڑک اٹھی۔ اس نے گیٹ کو دھکا دیا اور بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اندر بھاگتی ہوئی گئی۔ مہر رخ ڈانٹنگ ٹیبل پر بیٹھی ناشتا کر رہی تھی۔ اس کی طرف اس کی پشت تھی۔ اس نے دو تین گولیاں اسے ماریں۔ اس نے دیہن بغیر اس کی طرف دیکھے ٹیبل پر سر رکھ دیا۔ آفاق کو لیں کی آواز سن کر جیسے ہی باہر آیا، اس نے اس پر بھی دو گولیاں کیے اور پھر اپنے پیٹ کی طرف رخ کر کے ریوا لوند چلا دیا۔ تینوں وجود خون میں لٹ پٹ تو پ رہے تھے۔ خون بہہ رہا تھا، سانس اکڑ رہی تھیں۔ زخم گھیاں ختم ہو رہی تھیں۔

تینوں لمحہ بہ لمحہ ساکت ہو رہے تھے۔ پھر کیا ہوا وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ تو بس اتنا جانتی تھی کہ آفاق مر گیا۔ اس کا آفاق مر گیا تھا۔ وہ چہیت کو محسوس کرتی تھی۔ اسے چہیت میں آفاق نظر آ رہا تھا۔ وہ اسے بھی ہار ہاتھ اور اس کی طرف جانا چاہتی تھی۔ ہمیشہ کے لیے اس کے دھڑکنے مانا چاہتی تھی۔ میں آ رہی ہوں۔ تمہارے بغیر میں کچھ بھی نہیں۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ تجھی بالکل تجھی محبت، دنیا کی ہر شے سے زیادہ، تمہیں میں کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔ ہم دونوں ہاں صرف ہم دونوں اور کوئی نہیں۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ ہمیشہ کے لیے آواز ختم ہو گئی۔ کاشن خون میں بھیک مٹی تھی اب قطر و قطر دس رہا تھا جیسے کوئی دھم مسلسل رستا رہتا ہے۔ اسے لاوارث لاشوں کے ساتھ رکھ دیا گیا تھا کیونکہ اس کا کوئی والی وارث نہیں تھا۔ وہ کسی کی بیٹی نہیں تھی۔ اس کی قیمت لے کر اس کا باپ نہ جانے کہاں جا چکا تھا کہ پھر اس نے کبھی بھی مڑ کر خبر نہ لی۔ وہ کسی کی بیوی نہیں تھی۔ اسے تو کبھی بھی بیوی کا وہ نہ نہیں ملا تھا۔ وہ تو بھلا کر تھی اسی لیے لاوارثوں کی طرح مر گئی اور وہ کسی کی ماں بھی نہیں بن سکی تھی۔ انیس تو شرف والیاں بنی ہیں اور وہ تو دکھلا رہی ہوئی، اور نامہ و غیر ذہ ویران کیسے تھی جس پر پالا پڑا تھا اور اس کی زرخیزی کہیں کم ہو گئی تھی۔ اس کا نام نشان باقی نہیں رہا تھا جیسے وہ کبھی تھی ہی نہیں۔ نہ نظریہ، نہ رول اور نہ نام..... وہ تو سمر کی ہوا میں کہیں کم ہو چکی تھی۔

شوق جنازے سے کچھ دیر پہلے گھر پہنچی تو لان میں دونوں لاشیں رکھی تھیں۔ مٹے کے پاس چند ناشا سا مورتیں بیٹی تھیں۔ شرا بھی ایک کونے میں تھی۔ دو نقاب والی چادر لیے اندر داخل ہوئی۔ نہ کوئی رو رہا تھا اور نہ ان کی بات کر رہا تھا۔ وہ آفاق کی میت کے پاس بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔ شرا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور اس کے پاس کھٹک آئی۔

”شوق..... تم..... تم اگلینڈ سے کب آئیں؟“ مگر وہ رو رہی اور اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ ملک منصور سلیڈ اکڑے سوٹ میں ہشاش بشاش، چہرے پر معنوی افسردگی طاری کیے ہوئے اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ کچھ اور لوگ تھے۔ وہ سب مٹھیں اٹھانے کے لیے آ رہے تھے۔ آفاق کی میت اٹھانے کے لیے وہ زور زور سے چیختے گئے۔ ملک منصور نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور جیسے سکتے میں آ گیا ہوں۔

”تم..... تم کہاں سے آئی ہو؟“ اس نے ارد گرد دیکھتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں اس سے پوچھا۔

”ہاں، آپ نے تو مجھے ماری دیا تھا۔ آپ تو ہیں ہی قاتل، دنیا کے ظالم ترین انسان..... قاتل باپ..... پہلے لک کو مارا پھر مجھے اور اب آفاق کو بھی آپ نے ہی مارا ہے۔“

”کیوں اس بند کرو، تمہیں تو میں بعد میں دیکھوں گا۔ خاموش ہو جاؤ۔“

”نہیں، میں چپ نہیں رہوں گی۔ ساری دنیا کو بتاؤں گی۔ آپ نے سہیل کو قتل کیا اور پھر آصف کو بھی۔“

”شٹ اپ!“ ملک منصور نے خراغ سے زوردار ٹھہرا سے مارا۔

”آج میں ساری دنیا کو بتاؤں گی۔ اس سفید سوٹ میں کتنا بڑا قاتل چھپا ہوا ہے، ہر ایک کا قاتل۔“

”میں کہہ رہا ہوں دفع ہو جاؤ اندر!“ وہ اس کا بازو کھینچ کر اندر لے جانے لگا۔ وہ اسے گھسیٹ رہا تھا اور دو چلا رہی تھی۔ ہر کوئی حیرت اور خاموشی سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے سب کے سب ہاتھ کے نیچے بن گئے ہوں۔ اس نے ایک دم جھلکے سے ہاتھ چھڑایا اور بھاگتی ہوئی گیٹ سے

باہر نکل گئی۔ چار دیوہیں آدمی گیٹ کے اندر آدھی باہر فرش پر پڑی تھی۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور ڈرائیور کو جیڑی سے چلانے کو کہا۔ ملک منصور نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کسی کو اشارہ کیا اور ایک سفید کروٹا ان کا پیچھا کرنے لگی۔

”بی بی جی، آپ گھبرا نہیں نہیں۔“ ڈرائیور نے تسلی دی۔

”حیدر انکل کہاں ہوں گے؟“

”اس وقت تو مطمئن نہیں لیکن رات کو دس بجے انھوں نے گلبرگ والے گھر مجھے آئے کو کہا تھا۔“ ڈرائیور نے بتایا۔

”بس وہیں مجھے لے چلو۔“

”ٹھیک ہے۔“ گاڑی مسلسل ان کا پیچھا کر رہی تھی۔ ڈرائیور بھی انکے پیچھے ڈرائیور تھا۔ وہ بھی ان کو ڈانچ دے رہا تھا مگر اس نے ایک دم گاڑی چھان آباد علاقے کی طرف موڑ دی۔ گلیوں اور بازاروں سے ہوتا ہوا وہ اب سنسان سڑک پر تھا۔ دور دور تک کوئی روشنی نہ تھی۔ اب کوئی گاڑی پیچھا نہیں کر رہی تھی۔

”آپ ہر سکون ہو جائیں، اب وہ لوگ ہمارا پیچھا نہیں کر سکتے۔ میں نے ان کو بہت ڈانچ دیا ہے۔ ویسے یہ لوگ کون تھے؟“

”میرے باپ کے کارندے!“ وہ آہستہ سے بولی تو وہ چونک گیا مگر خاموش رہا اور گاڑی چلاتا رہا۔ اس نے گیٹ کے سامنے جا کر ہارن دیا۔ حیدر کی گاڑی پورچ میں کھڑی تھی۔ افضل نے گیٹ کھولا۔

”حیدر انکل آگئے ہیں؟“ اس نے ڈرائیور سے پوچھا۔

”ہاں، وہ کمرے میں بی بی جی کے پاس ہیں۔“ افضل نے بتایا۔

”مجھے جلدی سے ان کے پاس لے چلو۔“ وہ بیکھلائی ہوئی بولی۔

”انکل! انکل! آپ کہاں چلے گئے تھے۔“ اس نے روتے ہوئے کہا۔ اس کا جسم مسلسل کانپ رہا تھا۔ وہ اور گرد دیکھے بغیر ان سے پوچھ رہی تھی۔ اس کے سر پر نہ چادر تھی نہ دوپٹا۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا جیسے موت کے منہ سے آئی ہو۔ حیدر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور ایک نظر ہسٹر پر پڑی شہلا کی طرف..... اسے پکارتی ہوئی کھینچ کر آئی تھی۔ وہ مسلسل پوچھ رہی تھی اور وہ حیرت میں ڈوباؤں کو دیکھ رہا تھا۔

انکل..... آپ کو مطمئن ہے آفاق مر گیا ہے..... بحر نے آفاق کو گولی مار دی ہے اور..... اور اب پاپا کے لوگ میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔ میں آفاق کو دیکھنے گئی تھی..... انکل سب کچھ ختم ہو گیا..... آفاق..... بھی مر گیا..... پہلے لک مر گیا..... اور اب آفاق..... نہ جانے میں کب تک زندہ رہوں گی۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر روتا شروع ہو گئی۔ اس کی لپکی بندھی ہوئی تھی اور سانس بے درجہ ہو رہی تھی۔ وہ شدید صدمے سے غمگین ہو رہی تھی۔ ایک دم درخشاں ہو کر گئی۔

شہلا تو سب کچھ سن کر سیکھنے میں آگئی وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں رہی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے وہ پتھر کی ہو گئی ہو۔ حیدر نے جلدی سے شیخ کو ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ اسے پانی پلا یا اور اپنی گاڑی سے فرسٹ ایڈ باکس منگوا کر اس میں سے اینکشن نکال کر اسے لگائے۔ وہ خود اس سچویشن

سے ایک دم بہت پریشان ہو رہے تھے۔ وہ تو شہلا سے برہات چھپاتے آ رہے تھے اور اب برہات اس کے سامنے خود بخود آ گئی تھی۔ وہ یوں ساکت لپٹی تھی جیسے سانس بھی نہیں لے رہی ہو۔ بس آنسوؤں آنکھوں سے بہہ بہہ کر نکلے میں جذب ہو رہے تھے۔

”شہلا ہمت کرو۔۔۔ تم منصور کو کبھی طرح جانتی تو ہو۔۔۔ اس انسان سے یہی توقع کی جاسکتی ہے۔ وہ بہت ظالم انسان ہے۔“

”اور میں اس سے بڑھ کر۔۔۔ میرے گناہوں کے پھل کتنے کڑے، کیسے ہیں۔۔۔ سب کچھ میرے سامنے آ گیا ہے۔۔۔ سارے بکھرے ہوئے وجود پر۔۔۔ دو شفق تو نہیں لگ رہی۔۔۔ میری شفق ایسی نہیں تھی۔۔۔ یہ تو بہت بکھری بکھری ہے۔۔۔ اور فلک کب مر گئی۔۔۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا اور تم نے بھی مجھ سے چھپایا۔۔۔ میں اپنے بچوں کی قاتل ہوں۔۔۔ میں ہی اپنے بچوں کی دشمن لگی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرا ایک فیصلہ ان کی زندگیوں کو کیسے تباہ و برباد کر دے گا۔ کسی ماں نے ایسے نہیں کیا ہوگا جو کچھ میں نے کیا۔۔۔ میں نے جس طرح شفق کو دتے بلکے چھوڑا۔۔۔ دو آج بھی وہی غم نظر آئی۔۔۔ خدا مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔۔۔ اور اب مجھے معاف بھی نہیں کرنا چاہیے۔“ وہ دونوں ہاتھ زور زور سے اپنے چہرے پر مارنے لگی۔

”شہلا یہ کیا حماقت ہے۔۔۔ کیا کر رہی ہو؟“ حیدر نے زبردستی اس کے ہاتھ کو پکڑا۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

”میرا آقا بھی مر گیا۔۔۔ فلک بھی اور میں زندہ ہوں اب مجھے بھی مر جانا چاہیے۔“ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ اس کی چیخیں بلند تر ہو رہی تھیں۔ ولیم ایک دم چمک گیا اور وصل چتر تیزی سے چلا تا ہوا اس کے کمرے کی طرف بڑھا۔ حیدر ان کے پاس بیٹھنے ان کے ہاتھوں کو سختی سے اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھے اور وہ رو رہی تھیں۔ ولیم کا خون ایک دم کھولنے لگا۔۔۔ اسے ہوا میں کچھ نہیں آ رہی تھی۔ اسے حیدر پر فضا نے لگا۔۔۔ نہ جانے وہ ماما کے ساتھ۔۔۔ کہ وہ چلا رہی تھیں۔۔۔ دوخت ہو کھلا گیا۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے۔۔۔؟“ وہ دھسے سے حیدر کی طرف دیکھ کر بولا۔

”کچھ نہیں۔۔۔ حیدر آہستہ سے بولے۔

”مگر مجھے تو کوئی اہم بات لگ رہی ہے۔۔۔ اس کے لہجے میں بلا کا طعنا۔ شہلا ابھی تک رو رہی تھی۔ حیدر نے حیرت سے ولیم کی طرف دیکھا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

”کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔؟“ جواباً وہ خاموش رہا۔ شہلا پھر اپنے چہرے پر تھپڑ مارنے لگی۔

”خود دیکھ لو۔۔۔ اسے میں اس حرکت سے روک رہا تھا۔۔۔ نہ جانے ہماری اولادیں لمحوں میں کیوں ہر گمان ہو جاتی ہیں۔۔۔ تم لوگوں کے دلوں میں ایمان اور احماد کتنا کم ہے۔۔۔ کسی نیچے تک پہنچنے میں ذرا سی بھی دیر نہیں لگاتے اور ایک دم فیصلہ کر لیتے ہو۔ تم لوگ کتنے جذباتی ہو۔۔۔“ حیدر کو بھی اب فضا رہا تھا مگر وہ اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھے ہوئے تھے۔

”ماما۔۔۔ ماما۔۔۔ کیا کر رہی ہیں۔۔۔؟“ اب ولیم نے اس کے ہاتھوں کو روکنا چاہا مگر وہ شدت جذبات و غم سے بالکل غمگین ہو رہی تھی، رو رہی تھی، ہسکیاں بھر رہی تھی۔

”آغریات تو بتائیں، کیا ہوا ہے.....؟“ اس نے انھیں منہ پھڑکا۔

”کون نہیں۔۔۔۔۔ کس تم سب یہاں سے جاؤ۔۔۔۔۔ مجھے تنہا چھوڑ دو۔۔۔۔۔“ اس نے ہچکچاہٹ مہرتے ہوئے کہا۔

”نہیں، آپ کو جتنا ہوگا۔ آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں۔۔۔؟“ وہ بھی بخند تھا۔

”تم جاؤ یہاں سے۔۔۔ وہ شدید ڈپریشن میں ہے۔۔۔“ حیدر نے آہستہ سے کہا تو وہ خاموش ہو گیا اور باہر جانے لگا۔۔۔ ایک دم مڑا۔۔۔

اس کی طرف دیکھا۔

”آئی ایم سوہی! انکل۔۔۔“ وہ قدرے شرمیلی سے بولا۔ حیدر خاموش رہے۔۔۔ وہ کمرے سے باہر نکل چکا تھا۔

”اب روئے سے کیا فائدہ؟“ حیدر نے اسے سمجھایا۔

”تو میں کیا کروں..... تم ہی بتاؤ..... اپنے گناہوں اور ان کی تباہی پر روکوں بھی نہ تو کیا کروں..... حیدر میرا دل بھٹ رہا ہے..... خدا کے

لے جیسے کوئی ایسا انجکشن لگا دو..... کہ میں مزید کچھ سننے کے لیے زندہ نہ رہوں..... پلیز کچھ تو کرو..... خدا کے لیے.....“ وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ رہی تھی۔

”ہوش میں آ کر شہلا..... یہ کہا جاگل بن ہے.....“ وہ قدرے نکلی سے اور ڈانٹتے ہوئے بولے اور اسے اس کی دواؤں میں سے شہلا

دی..... جہد بریشان تھے، کمری کی پشت سے لپک لگائے کمری سوچ میں گم تھے اور دو آہستہ آہستہ نیند کی وادی کی بھول بھلوں میں کہیں گم ہو رہی تھی۔

ولیم سخت نامور ہوا تھا انہما نے میں اس سے کتنی ملاحزرت ہوئی تھی۔ حیدر انکل، باکل بھی ایسے نہ تھے جیسے اس وقت اس نے سوجا۔ اس

نے بلا واسطہ انداز میں ہر طرح سے ان کا جائزہ لیا تھا۔ ان کی اور سماجی باتوں سے اس نے یہ تو اندازہ لگالیا تھا کہ وہوں کی ماضی میں کافی الجھن و رہی

تھی لیکن ان کے چہرے سے بھتی شرافت اور عظمت کو وہ کبھی شک کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ عظمت اور شرافت کے پیمانے میں قطعی کم وزن نہیں

رکھتے تھے۔ اس نے ان پر شک بھی کیا اور پھر بھی..... وہ سخت پریشان ہو رہا تھا اس سے یہ سب پروا نہ تھی۔ اس نے نور کو فون ملا یا۔ وہ

اس سے یہ بات از جلد شمر کرنا چاہتا تھا۔ نکل جا رہی تھی مگر کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا پلا خرکافی بارشانی کرنے کے بعد کسی خاتون نے فون اٹھا۔

اس نے نور کا پوچھا۔

"وہ تو کراچی مچی ہے۔۔۔۔۔" خاتون نے بتایا۔

"کب؟" حیرت سے ریسو اس کے ہاتھ سے چھوٹنے لگا۔

”دو تین دن ہو گئے ہیں۔۔۔“

”اور واپس کب آئے گی۔۔۔؟“

”معلوم نہیں۔۔۔۔۔“ دوسری طرف سے فون رکھ دیا گیا۔

یہ انکشاف اس کے لیے سخت حیران کن تھا۔ فوراً اسے کچھ بتائے بغیر چاک کہیں چلی گئی تھی۔ ”نہیں..... وہ کہیں نہیں جاسکتی۔ اس نے

مجھ سے وعدہ کیا تھا اور ہوں اچانک..... مجھے بتائے بغیر..... نو..... نو..... اس اسما سہیل..... نور ایسا نہیں کر سکتی..... وہ تو کبہ ری تھی کہ وہ بتا رہے اس لیے نہیں آسکے گی..... اس کا مطلب ہے اس نے مجھ سے جھوٹ بولا..... لیکن اس کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی اور..... ویسے بھی اس نے آج تک مجھ سے جھوٹ نہیں بولا۔ اس نے کیونکر یہ کیا..... آؤ خدیں؟“ وہ الجھ رہا تھا۔

”دنیا میں کوئی رشتہ پاییدار نہیں..... ہم سب کو کبھی نہ کبھی..... کہیں نہ کہیں..... جلد یا بدیر..... ہالا غریب دوسرے سے جدا ہونا پڑتا ہے..... یہی زندگی ہے.....“ ایک دن نور سے سمجھاری تھی اور اب اس کے کہے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

”لیکن میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا..... تم جانتی ہو..... میں اپنا ج اور مفرد ہوں..... تمہارے سہارے کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا..... تم مجھے ہوں زندہ موت نہیں دے سکتی ہو..... میں کیسے سروانید کروں گا۔“

وہ سخت ڈپریشن کا شکار ہو رہا تھا۔ پہلے عمارت تنگ کر رہی تھی اب تنہائی اور ڈپریشن.....

حیدر بیس رک گئے تھے۔ گھر کے سارے کینن اس وقت شدید ٹینشن میں تھے۔ شفق شدت غم سے غم حال بالکل بے ہوش پڑی تھی۔ شہلا شدید احساس گناہ سے تڑپ رہی تھی اور وہ لمب شدت عمارت سے بے چین ہو رہا تھا حیدر کا یہاں ٹھہر جانا ہی مناسب تھا حیدر نے ایک نرس کو کال کیا تھا۔ نور انہیں بتا کر گئی تھی کہ وہ کراچی کسی اہم کام کے سلسلے میں جا رہی ہے اور چند دن اسے وہیں لگ جائیں گے۔ اس نے دلم کو بھی رنگ کیا تھا مگر وہ سو رہا تھا اس لیے اس نے اسے ڈنٹر نہیں کرنا چاہا۔ حیدر رات تک دم میں بیٹھنے والا تھا اور رات بھر سے ساری بات سن رہے تھے اور گہری سوچ میں گم تھے۔

”یقیناً انہوں نے گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیا ہوگا.....“

”معلوم نہیں سر..... اندھیرا ابھی اتنا گہرا نہیں تھا۔“

”ذوالفقار اب تم اس گھر کی طرف مت آنا اور اس گاڑی کو بھی استعمال نہ کرنا چند روز کے لیے فیکٹری کے گیراج میں کھڑی کر دو..... تم میری لینڈ کروڑزراستعمال کر لیا کرو..... اور میرے لیے بلیک وی بی آئی اور شیر شاہ کو بھیج دو.....“ حیدر نے اسے ہدایات دیں۔

”ٹھیک ہے سر اب میں چلتا ہوں.....“ ذوالفقار اٹھ کر چلا گیا تو وہ شہلا کے کمرے میں آگئے اور وہاں پر موجود نرس سارہ کو شہلا کے بارے میں مختلف ہدایات دینے لگے۔ وہ اس کی دوائیوں کے بارے میں سمجھا رہے تھے۔ جب شفق حورم آنکھوں اور چہرے کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی..... اس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ انجکشن کی وجہ سے اس کا سر بہت بھاری ہو رہا تھا۔ وہ پورا دن اور رات سوئی رہی تھی۔ شہلا اس کی طرف مسلسل دیکھ رہی تھی مگر اس نے ایک دفعہ بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا..... شہلا کا بیڈ کونے میں لگا تھا اور وسیع چوکور کمرے کے اس کونے میں روشنی بھی قدرے کم تھی۔ حیدر اس سے کافی فاصلے پر صوفے پر بیٹھے تھے..... ایک صوفہ کم بیڈ شہلا کے بیڈ کے پاس تھا جبکہ دوسرا صوفہ..... ٹی وی ٹرائی اور ٹیبل اس سے کافی فاصلے پر بیڈ کی پائنتی کی جانب رکھے تھے..... حیدر دونوں کو براہ رو کر رہے تھے۔

”اٹکل..... اب میں کیا کروں گی..... کہاں جاؤں گی پاپا کے لوگ یہاں تک بھی آسکتے ہیں۔“ وہ قدرے تشویش سے بولی۔

”گھبرانے کی بات نہیں..... اس گھر کا انہیں کبھی بھی ظلم نہیں ہوگا۔“ حیدر نے اسے تسلی دینا چاہی۔

"اگل آپ نے یہ گھر کب خریدا.....؟ آپ نے بتایا بھی نہیں....."

"بس کچھ ماہ پہلے....."

"اگل..... سہرا ہسپتال میں ہے اور....."

"نہیں..... وہ بھی اب ذمہ نہیں رہی..... میں نے اسپتال فون کیا تھا۔"

"سب.....؟" وہ پریشان ہو کر اپنی جگہ سے اٹھی۔

"کل رات کو....."

"اور..... اس کو کس نے دیکھا..... پاپا اس کی میت کو تو گھر نہیں لائے ہوں گے۔"

"ہاں..... اسے لاوارث قرار دے کر ایڈمیٹسٹ کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ مجھے ساری بات کی خبر بہت بعد میں ملی..... ورنہ..... خیر....."

اب تم پریشان نہ ہو۔"

ایک دم شہلا کو زور سے کھانسی ہوئی تو حیدر نادانستہ اٹھ کر اس کی طرف لپکے شفق نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا اور وہ بھی حیدر کے پیچھے گئی۔ ایک نیم مردہ..... بڑیوں کا وجود..... گہری سیاہ رنگت کے ساتھ بستر پہ پڑا کھانسی رہا تھا۔ نہ سر پر بال نہ جسم پر گوشت..... کوئی بھی اجنبی ایک دفعہ دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتا۔

"اگل..... یہ کون ہیں؟" شفق نے حیرت سے پوچھا۔

"حیدر نے شہلا کی طرف دیکھا..... وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں نفی کا اشارہ کر رہی تھی..... اسے نہ بتانے پر اصرار کر رہی تھی۔ حیدر نے

گہری سانس لی۔ شفق کے حیرت زدہ مشکوک چہرے کی طرف دیکھا۔

"شفق یہ تمہاری ماں ہے شہلا....." وہ آہستہ سے بولے۔ شفق نے حیرت سے منہ کھولا اور منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

"ن..... سن..... نہیں....." وہ بغیر کچھ کہے بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ حیدر سر جھکائے پیشے تھے۔

"حیدر..... یہ کیا کیا.....؟ وہ تو پہلے ہی شدید عیالیت میں ہے اور اب....."

"حقیقت کو چھپانے سے بہت سی سختیاں ختم لیتی ہیں اور ویسے بھی سچ نے ایک نہ ایک دن ظاہر تو ہونا ہی ہوتا ہے..... اسے سارے

صدے ایک ساتھ برداشت کر لینے دو....."

"اور اگر وہ اس کو بٹھاتی تو....."

"نہیں، ایسا کچھ نہیں ہوگا..... اس نے زندگی میں بہت سختیاں دیکھی ہیں۔ بہت اذیتیں سہی ہیں اور ایسے انسانوں کا اندر ایسی باتوں کا

عادی ہو جاتا ہے..... اس لیے ایسے شاکس انہیں زیادہ ڈسٹرب نہیں کرتے۔"

"ہاں..... اس نے میری گود سے جدائی تک..... اور اب تک نہ جانے کتنے دکھ سہے ہیں۔ پلیز اسے جا کر دیکھو..... اسے سمجھاؤ..... کہ وہ

روئے نہ..... وہ روتی ہے تو میرا دل تڑپنے لگتا ہے۔ میں گناہ کے احساس سے اور غملائے لگتی ہوں..... پلیز حیدر جاؤ..... پلیز....." وہ اس سے التجا

کر رہی تھی۔ حیدر اٹھ کر گئے تو وہ بستر پر ادھم سے لیٹی سسکیاں بھر رہی تھی۔

”شفق..... شفق بیٹا..... اٹھو..... ایسے پی ہو نہیں کرتے.....“ حیدر نے پیار سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”انگل یہ سب کیا ہے..... اور میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے..... آخر میرے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے..... ماما..... یہاں کیوں آئیں..... اور

آپ نے انھیں کیوں اس گھر میں رکھا ہے جہاں میں آئی ہوں..... انھیں کیوں یہاں رکھا ہے؟“

”بیٹا وہ اس دنیا میں بالکل تنہا ہے اور بیمار بھی..... تم نہیں جانتیں کہ وہ اب صرف چند لمحوں یا لمحوں کی مہمان ہے۔ اسے برین ٹیمر ہے۔

آپریشن تو ہوا..... مگر ٹیمر پھر پھیل رہا ہے..... وہ کہاں جاتی..... کب تک غیروں کے گھر میں پڑی رہتی اس لیے میں اسے اس گھر میں لے آیا۔“

”انگل آپ کیوں لائے..... انھیں ان کے دوسرے شوہر کے پاس کیوں نہیں چھوڑ دیا۔ اب وہ کہاں ہے..... جس کے لیے مجھے، آفاق

اور فلک کو چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔“ وہ غصے سے بول رہی تھی اور آنسو بہہ رہے تھے۔

”اس نے اسے بھی چھوڑ دیا.....“

”اور اب جب کسی قابل نہیں رہیں تو یہاں آ گئیں۔“

”دو خور نہیں آئی..... میں اسے لایا ہوں۔“

”کیوں انگل؟“

”کیونکہ تاپا اب انے اسے طبیوں کی طرح پلاتا تھا اور انھوں نے مرتے ہوئے مجھے وصیت کی تھی کہ زندگی کے کسی بھی موڑ پر اسے تنہا نہ

چھوڑوں وہ اس سے بہت محبت کرتے تھے اور شاید جانتے بھی تھے کہ جتنی شوگر کریں وہ کھا چکی ہے کہیں زندگی میں تنہا نہ جائے..... میں نے یہ بات

کسی کو نہیں بتائی صرف تمہیں بتا رہا ہوں..... تم بھی اسے معاف کر دو۔“

”نہیں انگل..... میں انھیں معاف نہیں کر سکتی..... وہ ہماری زندگیوں کے ساتھ بھلی ہیں..... کیا وہ رات میں بھول سکتی ہوں جب ہم

بالکل تنہا تھے اور فلک تڑپ رہی تھی..... وہ کیسے مر گئی ہمیں پتا ہی نہ چلا..... میں اور آفاق..... پانگوں کی طرح کمرے میں گھومتے رہے، روتے اور

چلاتے رہے، ماما پکارتے رہے مگر وہ تو اپنے شوہر کے ساتھ تھیں..... اور پاپا شزا آنتی کے ساتھ ہی مومن منانے گئے تھے انگل میں ان دونوں کو

معاف نہیں کر سکتی..... آفاق..... اس کی تو کوئی زندگی ہی نہ تھی..... وہ آوارہ فگلوں کی طرح سکون کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا..... میں جانتی تھی

اس کے اندر آگ تھی۔ ایک لاوا تھا جو ہر وقت پھٹنے کو تیار رہتا تھا..... میں نے اس کے چہرے پر ایک دفعہ بھی مسکراہٹ اور تہنید نہیں دیکھا..... میرا

بھائی خود اندر ہی اندر جلتا رہا..... اور پھر بجھ گیا.....“ اس نے سسکیاں بھرنا شروع کر دیں..... ”اور میں خود..... کیسے بھک گئی میں نے کیسے کیسے گناہ

کیے..... قتل بھی کیے اور..... ان سب باتوں کی صرف دہی ذمے دار ہیں۔ انگل میں یہاں نہیں رہوں گی..... ایک دن بھی نہیں رہوں گی۔ آپ مجھے

گواہ بھیج دیں۔ میں ان کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی.....“ اس کے اندر شدید نفرت تھی جو وہ اگل رہی تھی۔

”شفق بیٹا..... پلیز کول ڈاؤن ہو جاؤ۔ اس وقت تمہاری ماما کو تمہاری ضرورت ہے، کوئی بھی نہیں جو اسے سنبھال سکے۔ میں بہت مشکل

سے وقت رہے پاتا ہوں اور اسے فلی ٹائم اینشن چاہیے.....“ حیدر نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”نہیں اگل۔۔۔ میں اتنی وسیع القلب نہیں۔ کہتے ہیں ماں باپ کا دل بہت وسیع ہوتا ہے جس میں اولاد کی برخطا اور گناہ سا سکا ہے مگر اولاد کا دل کبھی بھی اتنا بڑا نہیں ہو سکتا اور ماں تو اولاد کے لیے ہر قربانی دے سکتی ہے لیکن ہماری ماں نے تو ہمارے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔۔۔ اب وہ مجھ سے کچھ توقع نہ کریں۔۔۔ میں ان کی کچھ نہیں لگتی۔“ وہ غصے سے پھٹ پڑی۔

”شفق اگر ہر انسان یوں سوچنا شروع کر دے تو اس دنیا میں سانس لینا بھی دشوار ہو جائے۔ انسان کا وجود تو انسانیت سے ہے۔“ حیدر نے پیار سے سمجھانا چاہا۔

”اگل تو کیا ہم نے کبھی زندگی میں سکون کا سانس لیا۔۔۔ ہم نے تو ایک دن کیا ایک لمحہ بھی اپنے آپ کو پرسکون محسوس نہیں کیا۔۔۔ ہم تو ہر وقت دیکھتے لوگوں کی طرح اندر ہی اندر سلگتے رہے ہیں۔“ اس کی آنکھیں میٹھ آئیں۔

”تو کیا تم اس حالت میں بھی اپنی ماں کو محاف نہیں کرو گی۔۔۔؟“ حیدر نے استغیاب سے لہجے میں پوچھا۔

اگل پلینز اس موضوع پر بات مت کریں۔ میں پہلے ہی بہت ڈسٹرب ہوں اب مزید کچھ نہیں سوچنا چاہتی ورنہ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔

میرے دل میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں۔۔۔ ہم نے تو ان کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے۔“ وہ قدرے سختی سے بولی تو حیدر پریشان ہو کر ہا ہر نکل گئے۔

”حیدر وہ ٹھیک تو ہے نا؟“ شہلا اسے یوں انسرود دیکھ کر بولی۔

”ہاں۔۔۔ اب بہتر ہے۔“

”حیدر وہ میرے بارے میں کیا کہتی ہے؟“

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔“

”تم کچھ چھپا رہے ہو۔۔۔۔۔“

”جب کہنے کو کچھ نہ ہو تو چھپانا کیسا۔۔۔؟“

شہلانے گہری سانس لی اور خاموش ہو گئی۔

حیدر ولیم سے کچھ ناراض تھے اس لیے وہ اس کے کمرے میں نہیں گئے۔ البتہ انھیں اور نرس کو ہدایات دے رکھی تھیں کہ دونوں کا ہر ممکن خیال رکھیں۔ شفیق دانش روم میں تھی وہ حیدر کے ساتھ گاؤں جا رہی تھی۔ حیدر لاؤنج میں بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے ولیم وکیل جیٹ پر آہستہ آہستہ ان کی جانب بڑھا۔

”اگل۔۔۔۔۔ آئی ایم سوری۔۔۔۔۔ آپ مجھ سے ابھی تک ناراض ہیں۔۔۔۔۔“ حیدر نے اس کی طرف بخور دیکھا اور خاموش رہے۔

”آئی ایکسٹریملی سوری۔۔۔۔۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا۔۔۔۔۔“

”ولیم تم کو جہان لوگوں کی سوچ بہت چھوٹی اور دعوے بہت بڑے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ سب کچھ لمحوں میں جہاک کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔۔۔۔۔ تم لوگوں کو نہ تو کسی پر اعتبار ہے اور نہ ہی خود پر اعتماد تم لوگ تو مٹی کے پھر پھر ہو جو دوبارہ ٹککتے جسم ہو۔“ ان کے لہجے میں غصہ اور انگریزوں کی الفاظ میں قدرے کاٹ

اور نظروں میں نکلی تھی۔ ولیم خاموش رہا۔

شفق ایک دم دوازدہ کھول کر باہر نکل..... اور ولیم کو دیکھ کر فکس..... ”مشرق و مغرب کا خوبصورت احتراج.....“ وہ چنکی۔
”حیرت انگیز حد تک ماما کی ہیسیہ.....“ ولیم نے اسے حیرت سے دیکھ کر سوچا۔ شفق نے حیدر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں گہرا

استہمام تھا۔

”شفق یہ تمہارا اسٹیپ برادر ہے۔“ ولیم..... اور ولیم یہ تمہاری اسٹیپ سسٹر ہے ”شفق“ اور اگر تم دونوں اسٹیپ کا ورڈ نکال دو تو تم دونوں
بین بھائی ہو..... جو کہ ایک خوبصورت ترین رشتہ ہے۔“ حیدر نے قدرے اطمینان سے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی
طرف دیکھا اور خاموش رہے۔

”انکل چلیں.....“ وہ اس کو ایک دم نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے..... میں اپنا ریپ کیس لے آؤں.....“ وہ اٹھ کر اوپر کمرے میں چلے گئے..... جہاں وہ آرام کرتے تھے۔ شفق صوفے پر

بیٹھ گئی۔

”آپ ماما سے بہت ملتی ہیں..... اور آپ کی آواز بھی۔“ ولیم نے بات بدھانے کے انداز میں کہا۔

”جی نہیں، میں ان سے بالکل نہیں ملتی..... تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔“ وہ غصے سے بولی۔

”آپ ماما سے ناراض لگتی ہیں..... کیا آپ ان سے ملی ہیں..... وہ بہت پیار ہیں.....“

”جو گناہ کرتا ہے وہ اسی طرح.....“ وہ اچانک خاموش ہو گئی۔ ولیم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، وہ بھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اس کا خوبصورت چہرہ..... نیلی آنکھیں..... بھورے بال..... کمر اس والا لاکٹ۔

”کیا تم کو کچن ہو.....؟“ شفق نے قدرے چپے ہوئے انداز میں پوچھا۔ ولیم اس کی بات سن کر بوکھلا سا گیا..... اور کچھ سوچنے لگا۔

”ہاں..... ہاں..... میں کچن ہوں.....“ وہ آہستہ آواز میں بولا لیکن اسے یوں غصوں ہوا جیسے شفق دنیا کی کسی حقیر ترین مخلوق سے

مقابلہ ہو۔

”تمہاری ماما بھی کچن ہیں.....“ اس کے لہجے میں پھر جھنجھکی۔

”معلوم نہیں، شاید نہیں۔“

”کسی گندی زندگی ماما نے گزار دی ہے.....؟“ وہ پھر حقارت سے بولی۔

”کیا مطلب؟“ ولیم نے حیرت سے پوچھا۔

”گناہوں سے بھری دلدل میں..... نف ہے ایسی زندگی پر..... بچوں کے ساتھ ساتھ ایمان کو بھی داؤ پر لگا دیا کفر کی خاطر.....“ وہ غصے

سے بولی۔

”آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟“ ولیم اس کی باتوں پر دھکی ہو رہا تھا۔

”ایک مسلمان عورت جب کمر کو جنم دے تو اس سے بڑھ کر اس کی بد نصیبی کیا ہوگی۔۔۔ اور پھر چلتا بھرتا گناہ بھی ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہے۔۔۔“ اس کے اندر آتش فشاں پھٹ چکا تھا اور اب لاوا آہستہ آہستہ باہر آ رہا تھا وہ ہر ممکن انداز کا زہرا لگتا چاہ رہی تھی۔

”آپ مجھ پر طرکیوں کر رہی ہیں۔۔۔“ اس نے توجہ سے اس کی طرف قدم بڑھا دیا اور وہ بھڑکی ہوئی شیریں کی طرح اس پر تازی توڑ حملے کر رہی تھی۔ اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر پوچھا۔

”اس لیے کہ تمہارے باپ نے ماما کو بہکایا۔۔۔“

”مگر میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔۔۔“

”اب تو جان گئے ہونا۔۔۔“ وہ طرکیہ لہجے میں بولی۔

”میرا اس میں کیا قصور ہے۔۔۔؟“

”تو ہمارا کیا قصور تھا۔۔۔ جب ہم تینوں بہن بھائیوں کو چھوڑ کر تمہارے باپ کے ساتھ چلی گئیں۔۔۔ تم جانتے ہو۔۔۔ فلک سب سے پھوٹی صرف دو سال کی میری گود میں روتی رہی۔۔۔ آفاق چنگار ہا اور ماما چلی گئیں۔۔۔ اب وہ دونوں مر گئے ہیں اور میں زندہ رہ گئی ہوں۔۔۔ میں ان کو اس حالت میں دیکھنے کے لیے زندہ رہ گئی ہوں۔ اب تم دونوں تڑپ تڑپ کر جیو گے۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔۔۔ جس طرح ہم تڑپے ہیں۔۔۔ روئے ہیں۔۔۔ تم اور ماما بھی اسی طرح روؤ۔۔۔ جس طرح ہمارا رونا کوئی نہیں سنتا تھا۔۔۔ تم لوگ بھی روؤ، سسکو۔۔۔ اور کوئی بھی تمہاری مدد کو نہ آئے اور خدا تم لوگوں کے ساتھ بھی تو کر رہا ہے۔۔۔ ماما کی کیسی خوفناک حالت ہے اور تم اس قدر متحاج۔۔۔“ اس نے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔۔۔ ولیم حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔۔۔ اس کی باتیں سن کر اس کا اندر کا پھٹے لگا۔۔۔ وہ تو قطعی توقع نہیں کر رہا تھا کہ کوئی زندگی میں اسے یوں بددعا دے گا۔۔۔ اور وہ اس کے سامنے بیٹھ کر نہ صرف اسے کوس رہی تھی، بددعاں بھی دے رہی تھی اور وہ خاموشی سے سن رہا تھا۔ حیدر بریف کیس لے کر آئے۔۔۔ شفق کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ٹھٹھکے۔۔۔ ولیم کی طرف دیکھا۔۔۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔۔۔ وہ خاموشی سے دروازے کی طرف چل پڑے۔۔۔ وہ بھی بنا کچھ کہے اور دیکھے ان کے پیچھے باہر نکل گئی۔

ولیم کا وجود انکاروں پر لوٹ رہا تھا نہ جانے وہ انکاروں کی کیسی چادر بچھا گئی تھی جس میں وہ بری طرح جھلس رہا تھا اس کی باتیں اس کے کانوں میں پھلنے سیسے کی طرح مسلسل نشتر چھو رہی تھیں۔۔۔ اتنی کڑواہٹ۔۔۔ اتنا زہر۔۔۔ اس کا حلق سوکھ رہا تھا۔ اس میں مسلسل کانٹے چھو رہے تھے۔۔۔ ”چلتا بھرتا گناہ۔۔۔ چلتا بھرتا گناہ۔۔۔“ اس کی سخت توجہن ہوئی تھی۔۔۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر روئے۔۔۔ اتنا روئے کہ اس کا دل پھٹ جائے۔ اس کا دماغ پھٹ جائے۔۔۔ کاش وہ یہ سب نہ سنتا۔ کاش وہ اس سے بات نہ کرتا۔ کاش وہ اس سے نہ ملتا۔۔۔ ہر لمحہ تاسف و ملال سے بڑھتا۔۔۔ وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔۔۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہ تھا۔۔۔ اور شاید شفق کے پاس بہت کچھ تھا۔ وہ اپنے کمرے میں لوٹ آیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

شہلا کو سخت دکھ ہو رہا تھا کہ وہ اس سے ملے بغیر چلی گئی تھی۔ وہ اعدادہ کر سکتی تھی کہ اس کے دل میں ماں کے لیے کتنی غرت تھی۔ اس کا مطلب ہے اس نے اسے معاف نہیں کیا تھا۔ حیدر بھی جا چکا تھا اور وہ بھی اس سے ملنے نہیں آیا تھا۔ اس نے غرس کے ذریعے ولیم کو بلا دیا۔

”ان کو خدا دیکھیں نہیں آسکا۔ میری طبیعت خراب ہے۔“ وہ سختی سے بولا۔۔۔۔۔ مسلسل رونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ شفق کے کہے ہوئے الفاظ نے اس کی روح تک کو جھلٹی کر دیا تھا۔ نرس نے یہی پتلا مایا تو وہ تڑپ اٹھی۔ ولیم بھی اس سے نفرت کرنے لگا تھا۔

”با خدا لایا۔۔۔۔۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ میں کب تک۔۔۔۔۔ آخر کب تک پونجی سب کے ہاتھوں ذلیل ہوتی رہوں گی۔۔۔۔۔ کیا مجھے سمجھنے والا کوئی بھی نہیں ہے۔۔۔۔۔ تو تو مجھے اور میری مجبور یوں کو سمجھتا ہے۔۔۔۔۔“

”سائرہ۔۔۔۔۔ مجھے سہارے سے اس کے کمرے میں لے چلو۔۔۔۔۔“ اس نے نرس کو کہا۔

”میزم۔۔۔۔۔ آپ کیسے نہیں گی۔۔۔۔۔“

”کوشش کرتی ہوں۔۔۔۔۔“

”وہ اس کے سہارے بمشکل چلتی ہوئی ولیم کے کمرے میں گئی تو وہ بستر پر لیٹا تھا۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھے وہ آہستہ آہستہ سسک رہا تھا۔

”سائرہ تم جاؤ۔۔۔۔۔“ اس نے نرس کو کہا تو وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

”کیا بات ہے ولیم۔۔۔۔۔ بیٹا کیا تم مجھ سے ناراض ہو۔۔۔۔۔؟“ وہ جیسے محرم بنی اس سے سوال کر رہی تھی۔

وہ خاموش رہا۔

”کیا تم رورہے ہو۔۔۔۔۔؟“ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی تو اس نے سختی سے ہاتھ چھڑایا اور اس کے ہاتھ کو پرے دھکیلا۔

”آخر تم بتاؤ تو سہی کیوں ناراض ہو۔۔۔۔۔ ولیم پلیز اس طرح مت کرو۔۔۔۔۔ ورنہ میں مرجاؤں گی۔۔۔۔۔ میں بہت مشکل سے تمہارے پاس

آئی ہوں۔“

”مجھے جہاں آپ لے زندہ و رسوائی کی قبر میں ڈال دیا ہے۔۔۔۔۔ وہ کیا ہے۔۔۔۔۔ مجھے آپ کی وجہ سے کیا کچھ سننا پڑ رہا ہے۔“

”کیا سننا پڑ رہا ہے۔۔۔۔۔ اور کس نے کہا؟“ اس نے حیرت سے کہا۔

”آپ کی بیٹی نے؟“

”شفق نے۔۔۔۔۔ اس نے کیا کہا تم سے۔۔۔۔۔؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”اس نے مجھے آپ کا ”چٹا بھرتا گناہ“ کہا ہے اس سے بڑھ کر مجھے کون ذلیل کرے گا۔۔۔۔۔ کاش آپ مجھے پیڑ اسی نہ کرتیں اور اگر

کیا تھا تو مجھے وہیں چھوڑ آئیں۔ میرا ملک اور میرا مذہب تو وہاں کا ہوتا جہاں کا میں ہوں۔ یہاں تو میں ایک تماشائین گیا ہوں۔ آپ سب مسلمانوں

کے درمیان ایک کافر۔۔۔۔۔ آپ کیسے مسلمان ہیں۔۔۔۔۔ مجھ سے یوں بی بیہو کرتے ہیں جیسے میں کوئی ناپاک انسان ہوں۔ آپ نے مجھے ایک نجاست بنا

دیا ہے۔۔۔۔۔ آخر آپ لے ایسا کیوں کیا؟“ وہ الجھانے لگا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ میں ہی سب کی گناہگار ہوں۔۔۔۔۔ ہر کوئی مجھے ہی قصور وار سمجھتا ہے۔۔۔۔۔ میں مانتی ہوں مجھ سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ کیا میرے

اقرار کی سزا ہے کہ ہر کوئی مجھ پر حملہ کرنے کے لیے تیار رہتا ہے اپنے گناہ کا اقرار خدا کے سامنے کرو تو وہ بھی معاف کر دیتا ہے مگر تم لوگوں نے تو مجھے

اس کٹہرے میں کھڑا کر دیا ہے جہاں میرے لیے کوئی معافی نہیں۔۔۔۔۔“ اس کی بھی آنکھیں برسنے لگیں۔

"آپ بتائیں میں کیا کروں۔۔۔ کہاں جاؤں۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ مجھے واپس بھیج دیں میرے لیلے کے پاس۔"

"کیا کہا۔۔۔ کیا کہا تم نے۔۔۔ اس کے پاس جس نے مجھے طلاق صرف تمہاری وجہ سے دی تھی جو کہا تھا کہ اسے تمہارا وجود ہی نہیں چاہیے کل کو کہیں میں اسے تمہاری وجہ سے تنگ نہ کرو اور تمہاری زندگی کے بدلے میں نے طلاق لینا منظور کی۔۔۔ اس باپ کے پاس واپس بھیج دوں۔۔۔"

اس کا جسم غصے سے قرقرانے لگا۔

"پھر آپ مجھے یہاں کیوں لائیں؟"

"تمہارے بہت سے کہیں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔۔۔ تم جتنی سزا مجھے دینا چاہتے ہو۔۔۔ اس کا فیصلہ کر لو۔۔۔ جہاں میں نے اتنا سہا ہے یہ بھی سہہ لوں گی۔۔۔ لیکن اس طرح میں مجرم بن کر اپنی زندگی کے دن پورے نہیں کر سکتی۔۔۔ ہو سکتا ہے یہی میری زندگی کا آخری دن ہو۔۔۔" اس نے اورد گرد دیکھتے ہوئے آہ بھر کر کہا۔

دلیم نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔۔۔ اور اپنے وجود کو سمجھنے ہوئے اس کے گھٹنے پر اپنا سر رکھ دیا وہ اس کے سر کو گود میں رکھ کر والہانہ چومنے لگی اس کے سارے وجود سے دو انگوٹوں کی جھبک آرہی تھی مگر وہ تو ایسے بے قراری سے اس کے ساتھ چمٹا تھا جیسے کوئی چھوٹا سا بچہ بہت دنوں کی جدائی کے بعد ماں کے سینے سے لپٹ کر اپنی اداسی دور کر رہا ہو۔

"شفتی نے جو کچھ بھی کہا ہے اسے بھول جاؤ۔۔۔ وہ بہت دنگی ہے اور وہ مجھ سے ناراض بھی ہے۔ تم تو میرے پاس رہو اور میں جتنی محبت تمہیں دے سکتی تھی وہی۔۔۔ مگر وہ نہ تو باپ کی محبت کو پا سکی اور نہ ماں کی۔۔۔" اس نے اس کی پیشانی اپنے ہنڈیوں والے ہاتھ میں لے کر ان پر چڑی زدہ ہونٹ دکھادیے۔۔۔ وہ روتا رہا۔۔۔ وہ اسے سہلاتی رہی۔۔۔ اور اس کے اندر کی کدورت اور نفرت رفتہ رفتہ آسودگی کے ساتھ بجتی گئی۔

راجکماری

راجکماری جناب ڈاکٹر کرم حسین شاہ اور اسی کا اسلامی تاریخ پر تحریر کردہ ناول ہے۔ یہ ناول آسام کے خالص راجہ کرشن کمار اور حاکم بنگال علی گلی خان کے بیچ ہونے والے لرزہ خیز معرکہ خیز دشمنی کہانی ہے۔ آج کل اسلامی تاریخ پر بہت کم ناول لکھے جا رہے ہیں کیونکہ تاریخی ناول لکھنے کے لئے بہت زیادہ تحقیق اور مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس ناول میں ڈاکٹر کرم حسین نے بہت خوبصورتی سے اس وقت کے ماحول اور معاشرت کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس جنگ کے تاریخی واقعات بیان کیے ہیں۔ امید ہے ڈاکٹر کرم حسین کی یہ کاوش آپ کو پسند آئے گی۔

"راجکماری" کتاب گمر پور دستیاب ہے۔ جسے اسلامی تاریخی ناول سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

جب سے شاکل نے تین خون آلود انسان تڑپتے، سکتے دیکھے تھے اس واقعے نے اس کے ذہن پر گہرا اثر کیا تھا۔ وہ جتنی چلاتی اپنے کمرے میں چلی گئی اور اس نے خوفزدہ ہو کر اپنا کمرالاک کر لیا تھا۔ شزاوردادہ ناک کر کے تھک چکی تھی مگر وہ کھواتی ہی نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے وہ چوکیدار کی مدد سے کمز کی کاشیشہ تڑا کر اندر داخل ہوئی اور یہ دیکھ کر بے تکلفی اس کے ہاتھوں اور سر سے خون بہہ رہا تھا اور وہ بے ہوش پڑی تھی۔ اس کی سانس بھی آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔۔۔۔۔ باہر آفاق اور ماورخ کی مٹیں پڑی تھیں شزاوردادہ سے ہوش میں لانے میں مصروف تھی۔ اس نے ڈاکٹر کو فون کر کے بلایا اس نے انجکشن لگا کر اسے سلا دیا۔

شفیق کی آمد سے ملک منصور کی بہت سکی ہوئی تھی۔ ہر نظر میں استغہام تھا۔ وہ باپ کو سر عام رسوا کر کے گئی تھی لیکن ملک منصور نے کمال ہوشیاری سے اس بات کو کور کرنے کی کوشش کی تھی اس نے سب کو بتا دیا کہ اس کا ذہنی توازن بگڑ چکا تھا اور وہ خوشنیں ہاؤس میں ایڈمٹ تھی نہ جانے کیسے وہاں سے بھاگ آئی مگر کوئی بھی اس کی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا کیونکہ وہ جس گاڑی میں بیٹھ کر فرار ہوئی تھی وہ خوشنیں ہاؤس کی نہیں بلکہ اس پر مخصوص گرین لکری نمبر پلیٹ تھی اور شفیق بھی بظاہر نارمل لگ رہی تھی۔

ملک منصور اندر ہی اندر رکھول رہا تھا بڑی مشکل سے اس نے اپنے آپ کو سنبھالا تھا اور ان کی تدفین کی تھی۔ اس کے بعد وہ اور اس کے کارندے مسلسل اس کی تلاش میں تھے۔ اسے کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ زندہ کیسے بچ گئی اور اتنا عرصہ کہاں رہی۔ کیا ایسا بھی ممکن تھا اور سب سے بڑھ کر کہ اسے پتا کس نے دی تھی۔۔۔۔۔ کون ایسا ہو سکتا ہے جو ملک منصور سے دشمنی مول لے۔۔۔۔۔ اس کا ذہن مسلسل سوچ رہا تھا۔۔۔۔۔ اور ایک دم اس کے ذہن میں "حیدر" کا نام گونجنے لگا۔۔۔۔۔ یقیناً وہ حیدر ہی ہوگا۔ حیدر کے علاوہ یہ کام اور جرأت اور کوئی نہیں کر سکتا تھا۔۔۔۔۔ اس نے پی اے سے حیدر کا نمبر ملانے کو کہا۔ حیدر شفیق کو چھوڑنے کا ڈن جا رہا تھا۔

"ملک منصور ہات کر رہا ہوں؟"

"ہوں۔۔۔۔۔ حیدر نے گہری سانس بھر کر کہا۔

"شفیق کو میرے حوالے کر دو۔۔۔۔۔"

"کون شفیق۔۔۔۔۔؟"

"میرے ساتھ بحث مت کرو۔۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔"

"ملک منصور میں ایسا لہجہ سننے کا عادی نہیں ہوں۔۔۔۔۔ اور نہ ہی کوئی عام انسان ہوں جس کے ساتھ آپ جیسی چاہیں گفتگو کریں۔" حیدر نے فیسے سے موہاں آف کر دیا اور شفو پورہ جانے کے بجائے اس نے ریٹال خورد جا کر گاڑی روکی۔ وہاں ان کے دیرینہ دوست نجیب احمد رہتے تھے۔ دورات وہیں ٹھہرے اور ان سے کہا کہ وہ شفیق کو جلد از جلد پٹا ور میں تقسیم آپا کے ہاں پہنچا دے۔۔۔۔۔ شفیق حیران ہو رہی تھی کہ وہ اس کے لیے کتنی ٹینشن لے رہے تھے۔ پہلے دن کی ملاقات سے لے کر اب تک وہ اس کے لیے مضبوط ڈھال بنے ہوئے تھے۔ ایسے ساتہاں جس کے سائے تلے آ کر وہ اپنے آپ کو بہت محفوظ محسوس کرتی تھی۔ اس کا اندر ڈر رہا تھا۔ اسے اپنے باپ کے لیے ہاتھوں کا بخوبی اعزاز تھا۔ وہ تو پاتال سے بھی اپنے

دشمنوں کو نکال لانے کا عادی تھا اور اب تو وہ اسے کبھی بھی نہیں چھوڑے گا مگر حیدر اسے بہت تسلیمیں دے رہے تھے۔۔۔۔۔

”میں بہت جلد تمہیں پتا دے دوں گا۔۔۔۔۔ تبسم آپ کے شوہر آری میں ہیں۔ وہاں تم ہر طرح سے محفوظ ہوگی۔ گھبراؤ نہیں۔“

”انگل کیا ہم دوبارہ زندگی میں مل سکیں گے۔۔۔۔۔“ نہ جانے وہ کیوں بے یقینی کا شکار ہو گئی تھی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔۔۔ انشاء اللہ۔۔۔۔۔ میں تم سے کوئی ٹکٹ رکھوں گا اور سنو زندگی میں اتنی جلدی بہت نہیں ہارتے۔۔۔۔۔ زندگی کا

ہر لمحہ آزمائشوں سے بڑھتا ہے۔۔۔۔۔“

”کاش ہر کوئی آپ جیسا باہمت اور وسیع القلب ہو۔۔۔۔۔ میں نے آپ کو بہت تنگ کیا ہے۔ آئی ایم سوری۔۔۔۔۔“ وہ منکھورانہ لہجے میں بولی۔

”اگر تمہارے دل میں میرے لیے کوئی اچھا جذبہ ہے تو اس کی خاطر اپنی ماما کے بارے میں اپنا دل صاف کرنے کی کوشش کرو۔ وہ چراغ

سحری ہے کسی بھی وقت بجھ سکتا ہے۔“

”انگل۔۔۔۔۔ میں اپنی زندگی کے سات سالوں کی اذیتوں کو کیسے بھول جاؤں کاش میں آپ کو وہ لے سکتی جب لندن میں ہم ان سے جدا

ہو رہے تھے انہوں نے ہمیں چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔۔۔۔۔ اس وقت ہم کتنا رو رہے تھے مگر ممانے ہماری خاطر بھی اپنا فیصلہ نہیں بدلا۔۔۔۔۔ سوری میں سب

کچھ نہیں بھول سکتی۔ نہ جانے کتنی تمہارا میں ہم نے خوف میں گزارا۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ کتنے لمبے اذیت میں۔۔۔۔۔ جب ہمیں مایوسیوں نے گھیرا تو کوئی

ایک بھی دلا سا دینے کے لیے ہمارے پاس نہ تھا اور ہم۔۔۔۔۔ بکھکتے تھے۔۔۔۔۔ بکڑتے تھے۔۔۔۔۔ برا ہوئے تھے۔ کسی نے نہ ہمیں سمجھایا اور نہ بچایا۔۔۔۔۔“

وہ پھر سسکتے لگی۔ اس کی بات سن کر حیدر خاموش ہو گئے۔

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ میں جا رہا ہوں۔۔۔۔۔ اپنا خیال رکھنا۔“ خدا حافظ کہتے ہوئے اور نجیب احمد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وہ باہر نکل آئے۔

موبائل آن کیا تو ملک منصور کی کال ان کی منتظر تھی۔

”حیدر۔۔۔۔۔ مجھے سیدھی طرح بتاؤ۔۔۔۔۔ شفق کہاں ہے۔۔۔۔۔؟“ ملک منصور غصے سے بولا۔

”حیرت ہے۔۔۔۔۔ نیچا تمہاری ہے اور پوچھ مجھ سے رہے ہو۔۔۔۔۔“ حیدر بے سکون لہجے میں بولے۔

”مجھے معلوم نہیں تھا وہ بھی اپنی ماں پر مکی ہے جس کی طرح وہ بچپن کے واقعات نہ بھلا سکی۔۔۔۔۔“ ملک منصور کے لہجے میں زہر بھرا ہوا تھا۔

”تم تو پھر بہت کڑور شخص ہو جو دونوں کو نہ بدل سکے۔۔۔۔۔“

”جسٹ شٹ اپ۔۔۔۔۔ اور اسے میرے حوالے کر دو۔۔۔۔۔“ ملک منصور غصے سے دہاڑا۔

”تمہاری بیٹی ہے خود ڈھوڑو اور آئندہ مجھے فون کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں بدکردار اور بد اخلاق لوگوں سے بات کرنا بھی پسند نہیں

کرتا۔۔۔۔۔“ حیدر نے فون غصے سے بند کر دیا۔ ملک منصور نے موبائل غصے سے پرے پھینکا۔ شزا اس کی باتیں سن رہی تھی وہ شکیل کی وجہ سے بے حد

پریشان تھی اور ملک منصور شفق کی وجہ سے۔

”منصور۔۔۔۔۔ شکیل بہت بیمار ہے۔۔۔۔۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا اس نے اس واقعے کا شدید اثر لیا ہے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ شزا بول رہی تھی مگر وہ

سن نہیں رہا تھا۔ وہ تو کہیں گم تھا۔ کسی گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا شہزادہ کی عدم دلچسپی دیکھ کر بھڑک اٹھی۔

”میں آپ سے بات کر رہی ہوں۔“ وہ غصے سے بولی۔

”لیکن میں اس وقت کوئی بات سننا نہیں چاہتا۔“ وہ بھی غصے سے بولا۔

”تم کب تک یوں غریب کی ذمہ داری اٹھاتے رہو گے۔ جتنا کتنا تمہارا گھر بکھر چکا ہے اب اور کس بات کے منتظر ہو تم انسان نہیں۔۔۔۔۔ کبھی نہ کبھی کسی انسان کے دل میں بھی کسی کے لیے درد جاگ اٹھتا ہے مگر تمہارا دل تو جیسے پتھر کا ہے۔۔۔۔۔ شہنشاہ کس قدر چار ہے تمہیں اعزاز ہے۔ کسی کی خاطر اپنی گہری چالیں چل رہے ہو۔۔۔۔۔“ شہزادہ چلا تے ہوئے بولی۔

”بھری باتوں میں دغل دینے کی کوشش مت کیا کرو۔۔۔۔۔ تمہیں شہنشاہ کی زیادہ فکر ہے تو جاؤ اسے پاگل خانے چھوڑ آؤ۔۔۔۔۔ اور سنو۔۔۔۔۔ اگر تم اس گھر میں ہو تو میرا احسان مانو۔۔۔۔۔ ورنہ تم جیسی عورتوں کو تو میں دو دن میں قاریع کر دیتا ہوں۔۔۔۔۔“ وہ اس پر دھاڑتے ہوئے بولا۔

”کیا کہا۔۔۔۔۔ مجھے جیسی عورتوں کو۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ تم کس قماش کے انسان ہو۔ جانتے ہو۔۔۔۔۔ گھٹیا۔۔۔۔۔ بدکردار۔۔۔۔۔ ذلیل ترین۔۔۔۔۔ دھوکے باز جس سے شیطان بھی پتا نہ آئے۔“ شہزادہ بھی غصے سے پھٹ پڑی ملک منصور نے دو تین تھپڑاے مارے۔۔۔۔۔ شہزادہ چلائے لگی۔ اسے شور و غل سے ایک دم شہنشاہ کی آنکھ کھل گئی وہ جلدی سے باہر آئی اور باپ کو یوں مارے ہوئے دیکھ کر بدحواس ہو گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔۔۔۔۔ ہونٹ نیلے پڑنے لگے۔۔۔۔۔ آنکھیں جیسے پتھر سی گئیں، وہ وہیں گر گئی۔

شہزادہ اب کچھ چھوڑ چھا اس کی طرف بھاگی۔۔۔۔۔ اور اس کا سر گود میں رکھ کر تجھیں مارنے لگی کسی کمدو کے لیے پکارنے لگی۔۔۔۔۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ ملک منصور جا چکا تھا۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا اور وہ خود اسے گاڑی میں ڈال کر اسپتال لے گئی۔ وہ شدید صدمے سے دوچار تھی۔ شہنشاہ نیم مردہ حالت میں بستر پر پڑی تھی۔ وہ گیلی آنکھیں کھولتی کبھی بند کرتی کبھی ہنستی کبھی خاموش ہو جاتی۔

”اس کو الیکٹرک شاخس دینے پڑیں گے۔“ ڈاکٹر نے بتایا۔

”کیوں۔۔۔۔۔؟“

”آخری کوشش ہے، شدید پر سنائی ڈس آرڈر اسے اس اسٹیج پر لے آئی ہے۔“ ڈاکٹر کہہ رہا تھا اور وہ ہونٹوں کی طرح سن رہی تھی۔

”پر سنائی ڈس آرڈر۔۔۔۔۔“ وہ بڑبڑا رہی تھی۔ جیسے کچھ نہیں سن رہی تھی کچھ بھی کہیں ذہن میں آنا نہ کیا تھا۔۔۔۔۔ وہ الجھ گئی تھی پھنس گئی تھی کسی بھنور میں۔۔۔۔۔ کسی گرداب میں۔۔۔۔۔ مگر بے پانی میں غوطہ زن ذمہ داری کی چند سانسوں کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی مگر سب کچھ ناممکن نظر آ رہا تھا۔۔۔۔۔ وہ شدید کرائس میں تھی۔ شدید ہونی خزان میں۔۔۔۔۔ شاید پر سنائی ڈس آرڈر اسے بھی آہستہ آہستہ اندر ہی اندر چاہ کر رہا تھا۔



آنکھیں، ملک منصور کی باتوں پر حیران ہو رہی تھی۔ وہ آج اسے بہت کمزور۔۔۔۔۔ مضمحل۔۔۔۔۔ اور قدرے عمر رسیدہ لگ رہا تھا۔۔۔۔۔ وہ ایسا تو نہیں تھا وہ تو ہمیشہ اس کی صاف ستھری، اعلیٰ اعلیٰ شخصیت دیکھنے کی عادی تھی۔۔۔۔۔ اس کی خوبصورت باتیں اس کو تعویذ بخشتی تھیں۔۔۔۔۔ اس کا نرم گرم ہلب ولب،

خوشبوؤں سے مہلر سانس، مدھوش کرتی نظریں..... اور اب وہ ٹوٹ پھوٹا لگ رہا تھا..... ملک منصور ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ ذہنی سے ہار ماننے والا تو نہیں تھا۔ کیا وہ ہار مان گیا تھا..... وہ اس سے ملنے رات کے دو بجے اسلام آباد چلا آیا تھا..... وہ ہوٹل میں مقیم تھی اور اس نے فون کر کے اسے اطلاع دی تھی۔ وہ حیران تھی کہ وہ کافی دنوں کے بعد آیا تھا۔ اس دوران اس نے اس سے کوئی رابطہ بھی نہیں کیا تھا اور اب اچانک..... رات کے اس پہر.....

”آپ اس وقت..... اور بہت پریشان لگ رہے ہیں؟“ آنکھ نے حیرانی سے پوچھا۔

”ہاں..... میں بہت ڈپریشن میں ہوں اس لیے تمہارے پاس آیا ہوں۔ آنکھ مجھے سکون چاہیے۔ صرف چند لمحوں کے لیے.....

میں..... میں..... بہت الجھ چکا ہوں.....“ وہ آنکھ کا نرم و نازک ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔

”لیکن بات کیا ہے، میں آپ کو یوں اس طرح کبھی سوچ بھی نہیں سکتی.....“ آنکھ حیران ہو رہی تھی۔

”میں تم سے ہلکا سا جلد شادی کرنا چاہتا ہوں اور نہ میں کھر جاؤں گا۔ میں انتظار نہیں کر سکتا.....“ وہ قدرے بے صبری سے بولا۔

”آپ کو کیا ہو گیا ہے..... ابھی آپ کو آرام کی ضرورت ہے..... میں آپ کو ٹیبلٹ دیتی ہوں..... آپ سو جائیے..... میں صبح آپ سے

بات کروں گی.....“

”نہیں..... مجھے تمہاری ضرورت ہے.....“ وہ شکست لہجے میں بولا۔

”نہیں..... آپ کو آرام کی اور سکون کی ضرورت ہے.....“ آنکھ نے محبت بھرے لہجے میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ جیسے مطمئن ہو

گیا۔ اس وقت وہ مکمل طور پر آنکھ کے رحم و کرم پر تھا..... آنکھ نے ٹیبلٹ سائینڈیکل کی دواز میں سے نکال کر اسے پانی کا گلاس دیا۔ اس نے

خاموش سے گلاس لیا اور ٹیبلٹ کھا کر اس کے بستر پر لیٹ گیا..... آنکھ صوفے پر بیٹھی گہری سوچ میں مگ تھی۔ یہ شخص اسے اب الجھا رہا تھا..... اس

نے جو فیصلہ بہت دن پہلے کیا تھا اب اس پر سوچنے کا ایک اور موقع مل گیا تھا۔ اسے نیند نہیں آرہی تھی اور وہ سوچتا تھا پورا کمر اس کے خزانوں سے گونج

رہا تھا۔ وہ صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔ ملک منصور کے ساتھ گزرا ایک ایک لمحہ اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا اور وہ اس میں سے اب کچھ تلاش

کرنے کی کوشش میں تھی۔ فیصلہ بہت مشکل تھا مگر اسے کرنا تھا۔

صبح جب وہ بیدار ہوا تو وہ آفس کے کام کے سلسلے میں جا چکی تھی ایک میٹج لکھ کر وہ سائینڈیکل پر رکھ گئی تھی۔ اس نے اسے موبائل پر کال کی

مگر وہ جلدی میں اپنا موبائل ادھر ہی چھوڑ گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ خود ہی آ گئی۔ ملک منصور اب قدرے بہتر لگ رہا تھا۔ نہادھو کر شیو کر کے، اسکن

شرٹ اور براؤن پینٹ میں لمبوس وہ پھر پہلے جیسا لگ رہا تھا آنکھ نعدی بیو جنر کے ساتھ ڈینم کی ہی داسکٹ اور اسکاٹے بیو شرٹ پہنے ہوئے

تھی..... اس کے بال قدرے بڑھ چکے تھے اور جسم بھی قدرے کمزوری کی طرف مائل تھا..... البتہ اس کے چہرے پر پھیلی یاسیت نے اس کے چہرے

کی دلکشی کو بہت حد تک مائع کر دیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

”کیا بات ہے..... تم کچھ بیمار لگ رہی ہو..... اور بہت غصہ بھی.....“ ملک منصور نے اس کے گرد بازوؤں کا گھیراٹھ کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں، پچھلے دنوں میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی.....“ وہ آہستہ سے اپنے آپ کو اس کے گلے سے آزاد کراتے ہوئے بولی۔

”اور تم نے مجھے بتا دیا نہیں.....“ وہ قدرے بے مبری سے بولا۔

”ایسی خاص بات نہیں تھی۔ بس بتا رہا تھا..... مگر اب تو میں ٹھیک ہوں۔“

”جہیں..... تم اب بھی مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی ہو..... چلو میں ابھی تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتا ہوں..... سنو..... مجھے پہلے والی

آنکھٹ چاہیے..... خوبصورت..... مرمریں..... نرم و نازک..... گل بدن.....“ وہ اس کے سامنے کھڑا ہو کر بولا۔

”اور اگر وہ نفل کی تو.....“

”تو..... تو..... میں اسے کہیں سے بھی ڈھونڈ نکالوں گا..... چاہے اس کے لیے مجھے کسی بھی گہرے سمندر میں کودنا پڑے یا پھر آسمان پر

سفر کرنا پڑے۔“ وہ مسکرا کر بولا اور اس کی پیشانی پر اپنے لب رکھنا چاہے آنکھٹ فوراً پیچھے ہٹ گئی۔ ملک منصور نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا وہ

ہر طرح سے اس سے فرار حاصل کرنے کی کوشش میں تھی اس کا رویہ ملک منصور کے لیے بہت حیران کن تھا۔

”کیا بات ہے..... تم کچھ پریشان اور بیزاری لگ رہی ہو؟“

”نہیں..... آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے.....“

”سنو..... میری آنکھٹ کہاں ہے.....؟“ وہ پھر اس کی طرف محبت پاش نظروں سے بڑھا۔

”وہ..... وہ شاید کہیں گم ہو چکی ہے۔“ آنکھٹ اس کی طرف پشت کرتے ہوئے بولی۔

”جہیں..... ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ملک منصور بازی جیت کر کبھی ہار نہیں سکتا اس نے ہارنا سیکھا ہی نہیں اور جس دن اس نے اپنی ہار کو قبول کر

لیا وہ شاید اس کی زندگی کا آخری دن ہو گا لیکن مجھے یقین ہے وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔“ وہ بڑبڑاتی لہجے میں بولا۔

آنکھٹ خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئی وہ شدید الجھن کا شکار لگ رہی تھی۔

”آنکھٹ تمہیں کیا ہو گیا ہے..... ڈارلنگ تم اس طرح بی ہو کر رہی ہو خرم کچھ کیوں نہیں رہی کہ میں تم سے کس قدر محبت کرتا ہوں اور

اس وقت مجھے تمہاری اشد ضرورت ہے مگر تم بہت بدلی بدلی لگ رہی ہو کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں رہی.....؟“ ملک منصور اس کے سامنے صوفے پر

بیٹھ کر بولا۔ وہ خاموش تھی۔ شاید مناسب الفاظ کی تلاش میں..... یا پھر مناسب موقع کی۔

”بولو..... ڈارلنگ..... تمہارے دل میں جو کچھ ہے بولی دو..... میں نے تم سے محبت کی ہے اور تمہاری ہر پریشانی میری پریشانی ہے۔

میں تمہارا ہر دکہ ہر پریشانی اور ہر الجھن شہر کرنا چاہتا ہوں..... پلیز بولو تو سہی.....“

ملک منصور نے اس کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اسے پیار سے چکارتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا کر کہا۔ وہ خاموش رہی۔

”بولو نا..... کیا بات ہے.....؟“ اگر میری کوئی بات تمہیں بری لگی ہے تو کہہ دو میں تمہاری کسی بات کا برا نہیں مانتا اس کا۔ تم مجھے دنیا کی ہر

ہستی سے زیادہ عزیز ہو اور تمہاری آنکھوں میں حیرت ان آنسوؤں کے بدلے میں دنیا کی قیمتی سے قیمتی شے قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا

کیا تم میری محبت کی آرائش کرنا چاہتی ہو..... یا پھر مجھ سے دور جانا چاہتی ہو.....“ ملک منصور نے اسے اعتماد بخشے ہوئے کہا۔

”ہلو..... ڈارلنگ..... میں تمہارے دل کی آواز سننا چاہتا ہوں۔“ وہ بہت محبت سے نرم لہجے میں بولا۔

”میں..... آپ سے شادی نہیں کر سکتی.....“ وہ نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔ ملک منصور نے گہری سانس لی..... بڑے مشاہدہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا اور صوفے سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ آنکھ اس کے جواب کی منتظر تھی۔

”کیا تم شادی نہیں کر سکتیں پھر کرنا نہیں چاہتیں؟“

”اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور سوچ میں پڑ گئی۔

”تم الجھن میں مت پڑو..... اگر تم نہیں کر سکتیں تو اس میں یقیناً کوئی مصلحت یا پھر تمہاری کوئی مجبوری ہوگی اور اگر کرنا نہیں چاہتیں تو پھر تمہارے دل میں میرے لیے نفرت یا بھڑبھڑائی ہے۔ اب بتاؤ ان دونوں میں سے تم کس الجھن کا شکار ہو کیونکہ اگر اب تمہارے دل میں میرے لیے بدگمانی ہے تو یقیناً تم کسی غلط فہمی کا شکار ہو..... اور میں وہ غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں.....“ وہ آہستہ آہستہ اسے لفظوں کے جال میں الجھا رہا تھا اور وہ مزید الجھ گئی تھی اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے..... سچ کہے یا جھوٹ۔

”ہلو..... آنکھ.....“ وہ آہستہ سے اس کے قریب آ کر بولا۔

”میری کچھ مجبوریاں ہیں اس لیے..... اس لیے میں شادی نہیں کر سکتی۔“ اس نے جلدی سے کہہ دیا۔ وہ اس پتھویشن سے جلد از جلد فرار چاہتی تھی..... وہ اس کی قربت اور رقابت سے دور بھاگنا چاہتی تھی۔

”کیا وہ مجھ سے شیر نہیں کرو گی؟“ اس نے پھر کہا۔

”نہیں.....“ وہ غصے سے لہجے میں بولی۔

”آنکھ تم مجھے جو بتائے بغیر چھوڑ سکتی ہو لیکن میں تمہیں وہ جانے بغیر کیسے چھوڑ دوں؟ کچھ تو بتاؤ..... کچھ تو کہو..... ورنہ..... میں.....“

آنکھ نے خاموش مگر استغناء مہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم سوچ بھی نہیں سکتیں میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ میرا نہ تو سیاست میں دل لگ رہا ہے نہ بزنس میں موائے تمہارے۔“

”خدا کے لیے..... بس کریں..... محبت..... محبت..... یہ سب جھوٹ ہے..... فراہ ہے..... آپ جیسا شخص زندگی میں کسی سے محبت نہیں کر سکا۔ آپ کو صرف اور صرف اپنے آپ سے محبت ہے۔ اپنی دولت سے اور اپنے اثاثوں سے..... آپ نے تو مجھے استعمال کرنا چاہا..... میں ہی بے وقوف تھی..... جو آپ کی محبت اور ذرات کے بحر میں کھو گئی۔“ آنکھ غصے سے پھٹ پڑی اور شدت جذبات سے اس کا گلا دھرنے لگا۔ اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ ملک منصور خاموشی سے صوفے پر پرسکون ہو کر بیٹھ گیا اور گہری غوروں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ وہ اس کی بات پر بالکل نہ ہلکا ہلکتا ہوا آہستہ سسکا ہوا اس کے لمحوں پر پھینٹنے لگی۔

”بس..... کچھ اور..... میرا خیال ہے ابھی تمہارے دل میں بہت کچھ ہے اور راز میر میں وہ سب کچھ من کر تمہارا کھار س کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولا اور آنکھ اس کو پرسکون دیکھ کر اور بھڑک اٹھی۔

”آپ کو اطلاع تھی کہ میں پاکستان کس مقصد کے لیے آ رہی ہوں اور آپ نے میرے لیے محبت کا سنہرا جال بچھایا۔ میں سوچ میں پڑ گئی اور خوش فہمی کا شکار ہو گئی کہ محبت جیسے حسین اور نازک جذبہ اور رشتے کو کوئی بھی شخص یوں کسی کو ایک سیلاٹ کرنے کے لیے استعمال نہیں کر سکتا میں نے زندگی میں کسی سے محبت نہیں کی تھی۔ اس جذبے سے نا آشنا تھی اور..... بہک گئی یا پھر آپ نے مجھے بہکا لیا.....“ دو قدرے رو ہانسی ہو کر بولی۔

”یہ سب تمہیں کس نے بتایا.....؟“ دو بغیر گھبرائے اور پریشانی ظاہر کیے بولا۔

”یہ تمہانے مجھے بچانا چاہا اور اس لیے راستے پیدا کر دیے.....؟“

”سنو آئیکٹ..... مجھے علم تھا کہ تم پاکستان کس مقصد کے لیے آ رہی ہو۔ ہماری حکومت کی پالیسیوں اور ہمارے بارے میں رپورٹس انٹری کرنے ہمارے فراڈ کیسز کے بارے میں معلومات حاصل کرنے..... لیکن جب تم اپنے مشن پر آئی تھیں تو تمہیں کچھ علم نہیں تھا۔ اس کی فیڈ بیک تمہیں آہستہ آہستہ ملتی تھی۔ پچھلی مرتبہ جب تم آئیں تو تب تک تمہیں ٹیکس موصول نہیں ہوئے تھے یہ سب کچھ تمہیں اب ملا ہے لیکن مجھے تم سے..... اور تمہارے مشن سے قطعی کوئی خطرہ نہیں تھا اس کو میں نے بہت لاکھلی لیا..... اس ملک کا بڑے سے بڑا طاقتور اور کرپٹ شخص اور انجینیئیر میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ملک منصور نے کبھی کبھی گولیاں نہیں سکیں اگر ہمارے خلاف ثبوت اکٹھے کیے جا رہے ہیں تو غافل ہم بھی نہیں..... میں نے بھی ہر ایک کے بارے میں ڈاکیومنٹس اکٹھے کیے ہوئے ہیں اور میں نے ان چیزوں سے بالاقلم سے محبت کی ہے۔ مجھے دنیا میں کسی سے خطرہ نہیں..... ہر ایک کو اس کی اوقات کے مطابق ذیل کرنے کا فن میں بخوبی جانتا ہوں..... لیکن اس کے ساتھ ساتھ میری ایک کمزوری ہے جو صرف تمہیں بتا رہا ہوں۔ میں حسن پرست ہوں..... اور تمہارا آتھیں حسن مجھے کس کس طرح بہکا تا ہے اور بھڑکا تا ہے..... تم اعزازہ نہیں کر سکتیں۔“ دو بہت سلجھے ہوئے اعزاز میں الفاظ پر زور دے کر بولا۔

”بس کریں..... منصور..... کس حسن کی بات کر رہے ہیں، ہر بات کی لٹس ہونی چاہئیں۔ ایک بیوی کو طلاق دینی..... دوسری ویسے Suffer کر رہی ہے..... اور آپ کی فیملی کس قدر فیلڈ ہے..... مجھے سب علم ہے اور..... ابھی..... چند روز پہلے آپ کی بہو اور بیٹا قتل ہوئے ہیں۔ یہ سب کیا ہے..... آپ نے تو مجھے ڈسٹرب کر کے رکھ دیا ہے۔“

”اور..... تو تمہیں سب خبریں ہیں۔“

”ہاں..... آپ کب تک مجھ سے جھوٹ بولتے رہیں گے۔“

”میں نے تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولا..... تاؤ میں نے کب جھوٹ بولا..... تم نے میری فیملی کے بارے میں کب پوچھا اور میں نے تمہیں کب جھوٹ بتایا..... رہی بات بیوی کو طلاق دینے کی تو طلاق اس نے خود لی اس کا کیریئر چھوڑ دیا تھا اور یہی بات اس کے بچوں کے لیے ڈسٹربنس کا باعث بنی میں نے تو انہیں ہر آسائش دی مگر وہ فیلڈ ہی رہے اور میں جانتا ہوں یہ سب باتیں تمہیں شزل نے بتائی ہیں۔“ دو زبردست مسکرا کر بولا۔

اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی روئیں۔ وہ ہونٹوں کی طرح اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”اگر تمہیں یاد ہو تو آج تم اپنا موبائل ادھر ہی بھول گئی تھیں..... اور اتفاق سے میں نے سارے نمبر ٹریس آؤٹ کر والے ہیں جہاں

جہاں سے وہ دفن کرتی تھی شزانے بہت کوشش کی کہ اپنے آپ کو چھپائے، ہر لمحہ غصہ، ہراس، ہراس کے مگر تم عورتیں ہیٹھ کہیں نہ کہیں حماقت کر ڈھنسی ہو اور کوئی نہ کوئی کلیو چھوڑ دیتی ہو..... چھوڑو..... ڈارنگ کن چکروں میں پڑ گئی ہو..... صرف یہ سوچو کہ میں تم سے واقعی محبت کرتا ہوں....." وہ جھنجھلا کر بولا۔ آئیکہ پوری بھڑاس نکالنے کے بعد اب خاموش بیٹھی تھی وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ شخص کتنا کھاگ لٹکے گا..... وہ ہر بات میں شاعر نکلا ڈی کی طرح صاف بچ نکلا تھا..... لٹاؤہ پکڑی گئی تھی۔ شزا اور وہ اس کے چہرے پر یاسیت کا رنگ نمایاں تھا۔

"سوئٹ ہارٹ..... شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں..... ملک منصور کا دل بہت وسیع ہے..... اس میں تم اپنی ساری کمزوریوں اور خامیوں سمیت آسانی سے سما سکتی ہو..... کیا تم اپنے لیے میری اتنی محبت کو بھول بیٹھی ہو..... کس طرح میں شدت سے تمہاری آمد کا منتظر تھا..... اور تمہارے مگر کی آرائش..... آئیکہ حسن پاکستان میں بھی بہت ہے..... جس طرف لٹاؤہ لٹا کر دیکھوں..... حسن بچتا ہوا میرے پاس آ جاتا ہے مگر تمہیں تو میرے دل نے پسند کیا ہے..... اور میرا دل جسے پسند کر لے..... وہ شے میری نہ ہو یہ کبھی نہیں ہوا....." وہ قلعیت سے مسکرا کر بولا۔

"مگر شزا کو بھی تو آپ کے دل نے ہی پسند کیا تھا....."

"ہاں..... مگر وہ اس دل میں سانس لے گی۔"

"شادی کے بعد تو اس سے آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ آپ کسی سے شادی نہیں کریں گے اور نہ ہی کسی کی طرف دیکھیں گے..... تو پھر....." وہ قدرے معصومیت سے سب کچھ اچھٹے کو تیار تھی۔

"اچھا..... اور کیا کیا کچھ شزانے بتایا۔" وہ بھرپور قہقہہ لگا کر بولا۔ آئیکہ نے حیران کن لٹاؤہ لٹا کر اس کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر بے شاشت اور سکون ہی سکون تھا۔

"بہت کچھ....." وہ بھی بڑا سکون لہجے میں بولی۔

"اپنی اپنی آہز رویشن ہے..... تم صرف اتنا اس سے پوچھیں کہ اگر ملک منصور اتنا برا ہے تو کیوں اس کے ساتھ رہ رہی ہے۔ وہ خود بخود ہے این جی او چلا رہی ہے پھر اس نام نہاد شادی کو کیوں بھاری ہے۔ رہی میری بات تو مجھے اسے ساتھ رکھنے میں کسی قسم کا نہ فائدہ ہے اور نہ نقصان..... شی اور جھنگ ٹوٹی ایسے آل..... لاٹلی پو آ..... ڈارنگ..... اوٹلی پو آ....." وہ اس کے قریب آ کر محبت بھرے لہجے میں بولا۔

آئیکہ اب حماقت نہ کر سکی..... اور خاموشی سے سر جھکا لیا.....

"آج تمہیں میرے دل کی دھڑکن سن کر یقین کرنا ہوگا اس میں صرف اور صرف میری کیوٹ آئیکہ ہے....." وہ اسے بھیجتے ہوئے بولا..... آئیکہ جیسے آکٹوپس کے ٹھپے میں بری طرح جکڑی جا چکی تھی..... وہ رفتہ رفتہ اس پر حادی ہوتا جا رہا تھا..... آنکھوں کے راستے دل کا اخبار چھپت رہا تھا۔ اس کی سانسوں میں اس کے گلوان اور ایکسٹی کی خوشبو رچ بس رہی تھی..... وہ پہلے والی آئیکہ نہیں رہی تھی..... ایک نیا وجود جنم لے رہا تھا..... یہ زندگی تھی یا سراب..... یہ سب سراب تھا..... یا پھر فریب..... وہ کچھ ٹھنکن نہ کر سکی۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ صبح کے دس بج رہے تھے۔ وہ جلدی سے اٹھا اور داش روم میں چلا گیا۔ فریش ہو کر باہر نکلا تو آئیکہ لیٹی ہوئے

آنکھیں کھولے اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور وہ اس کی طرف مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں.....؟“

”مجھے لاہور بہت ضروری کام سے جانا ہے..... رات تک آ جاؤں گا اور پھر ہم شادی کر لیں گے..... اور اپنے گھر میں رہیں گے..... اب تو تمہیں مجھ سے شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہے نا.....“ وہ تہہ ناک کر بولا تو وہ بھی مسکرا دی۔

”مہم کیا ہوا ہے.....“ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”مکیا رو بج رہے ہیں.....“

”اوہ..... مجھے تو بہت ضروری کام تھا..... آفس جلدی پہنچنا تھا.....“

وہ ایک دم اٹھتے ہوئے بولی۔

”کیا اب بھی کام کی ضرورت ہے..... مجرم تو خود تمہارے کنبہ میں دوڑا تو کھڑا ہے اب کس لیے کام کر رہی ہو..... سب چھوڑو..... لائف انجوائے کرو.....“ وہ مسکراتے ہوئے بولا تو وہ کچھ نہ کہہ سکی..... بس خاموش لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”اچھا..... اپنا خیال رکھنا..... میں جلدی آ جاؤں گا..... ایچ آئی ایم رنلے ہو گئی.....“ وہ اس کی پیشانی پر لب رکھتے ہوئے بولا۔ ”اب تو تمہیں یقین آ گیا ہو گا..... میرے دل کی دھڑکن سن کر..... اور ہر طرف اپنا کس دیکھ کر.....“ وہ مسکراتے ہوئے بولا اور خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا..... اور وہ دیں صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ گہری سوچ میں مگمگ رہی یہ سب کیا ہو گیا تھا..... اس نے تونہ جانے کئی پلاننگ کی تھی..... ملک منصور کو دھکارتے کی..... اسے اپنے سے دور رکھنے کی اور وہ کیسے اس کے قہقہے میں آ گئی..... اسے شرا کے الفاظ یاد آنے لگے.....

”وہ ہر عورت کو آ کنوہیں کی طرح قہقہے میں جکڑ لیتا ہے اور وہ پھر مزاحمت نہیں کر سکتی.....“ شرا نے اس کو بہت وارن کیا تھا اس کی ہر ہر بات بتاتی تھی۔ اس کی عادتیں، اس کی دلچسپیاں، اس کی مکارانہ چالیں..... سب کچھ اور وہ پھر بھی اس کی باتوں میں آ گئی اسے شدید احساس زیاں ہو رہا تھا۔ شدید قہقہے اور گناہ کا احساس اسے رفتہ رفتہ اپنے حصار میں لے رہا تھا۔ آنسو اس کے چہرے کو تر کرنے لگے..... اسے اس کا موہاں بننے لگا..... اس نے فیراٹھا کر دیکھا اور پوچھا.....

”آئییکہ..... کیا تم آئییکہ ہو؟“

”ہاں.....“ اس نے پھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”تمہاری آواز..... کیا تم رورہی ہو؟“ وہ جولا خاموش رہی۔

”کیا ملک منصور تمہارے پاس آیا تھا؟“

”ہاں.....“ وہ آہستہ سے بولی۔

”تو پھر.....“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔

”کیا تم اس کے ہاتھوں سے کھلوایا نہیں گئیں..... اور..... وہ تم سے کھیل چکا۔“ آنکھ سے سسکیاں بھرنے لگی۔

”آنکھ تم نے بہت خسارے کا سودا کیا۔ میں نے ہر بات سے تمہیں آگاہ کیا تھا وہ عورتوں کی مجبوریوں سے ان کو ایکسپلائٹ کرنے کا فن ابھی طرح جانتا ہے اور تم بھری..... میرے ہر طرح سے سمجھانے کے باوجود اس کے شکبے میں آ گئیں۔ میں نے تمہیں پہلے کی بہت کوشش کی مگر تم بھی میری طرح کمزور نکلیں۔ شاید ہر عورت اندر سے اتنی ہی کمزور ہوتی ہے۔ مجھے بہت افسوس ہوا ہے..... اب تمہارے پاس کوئی آپشن نہیں رہا..... ساری زندگی تم سبھی اور وہ تمہیں ڈانچ دیتا رہے گا..... آنکھ تمہارے ہاتھ سوائے پچھتاوے کے کچھ نہیں رو گیا..... اور تم نے یقیناً اسے سب کچھ بتا دیا ہوگا.....“ اس نے پوچھا۔

”نہیں..... وہ خود ہی جان گئے.....“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”اس نے یقیناً یہ کہا ہوگا کہ شزا اگر اسے اتنا ہمارا کہتی ہے تو اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتی.....“ شزا نے پوچھا۔

”ہاں.....“ وہ آہستہ سے بولی۔

”آنکھ میں اپنی پیار بیٹی کی خاطر اس سے کپڑا تو کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ شیزوفرینیا کی پروفنٹ ہے۔ اس گریٹ پستالٹی ڈس آرڈر..... اور اب دور رفتہ رفتہ میڈنس کی طرف جا رہی ہے..... مگر شاید مجھے اب کچھ سوچنا ہوگا..... وہ ہر ایک کو اپنی اذیتیں دیتا ہے۔ جیسے وہ ماڈرن سوسائٹی کے فیشنو کہتا ہے۔ خدا کرے تم اس سے بچ سکو۔ نہ جانے کیوں میرا دل چاہا کہ تمہیں اس درندے سے بچاؤں مگر افسوس تم بھی نہ بچ سکیں۔ سب کچھ کار ت گیا.....“ اس نے اچانک فون بند کر دیا۔ آنکھ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ اتنا الجھ چکی تھی کہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ خودکشی کر لے۔ وہ ان لمحوں کو گویا دیکھ رہی تھی جب وہ ملک منصور سے ملی تھی اور اس نے کیسے کیسے اسے اپنے دام میں پھنسا دیا تھا اور وہ پھنسی گئی تھی..... ہر طرف ولولہ مچ گیا..... اور وہ اس میں پھنسی کی پوری چھٹ چکی تھی۔ اس سے سانس لینا بھی محال ہو رہا تھا۔ دل میں جیسے آگ لگی تھی..... اور وہ اس آگ میں ملک منصور کو بھی جلا کر بھسم کرنا چاہتی تھی۔



نجیب احمد شفیق کو خود پشاور چھوڑ کر آئے تھے ان کے پہنچنے سے پہلے ہی حیدر نے تبسم آپا کو فون کر دیا تھا اس کی ہر ممکن حفاظت کرنے کو کہا تھا اور انہوں نے بھی اسے ہر طرح سے مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس سے بہت محبت اور تپاک سے ملیں گو کہ وہ اس سے شہلا حیدر کی شادی پر مل چکی تھیں مگر جب رسماً ملاقات ہوئی تھی۔ نجیب احمد اسے چھوڑ کر چند گھنٹوں کے بعد پلے گئے تھے وہ اپنے آپ کو اس گھر میں بہت اجنبی محسوس کر رہی تھی۔ وہ جب سے ماں سے مل کر آئی تھی اس کے امداد ایک شدید چھین تھی۔ ایک پہانس تھی۔ وہ کاہرا تو انہیں بہت دکھ دے کر آئی تھی۔ بہت غصے کا اظہار کر کے آئی تھی مگر دل بہت بے چین تھا۔ ماں کی اس حالت پر نہ جانے کیوں وہ اندر ہی اندر کڑھ رہی تھی جب بھی چہرہ نظروں کے سامنے محسوس ہوتا اس کی آنکھوں میں خود بخود نمی ہی حیرنے لگتی..... وہ اس خیال کو بار بار جھٹکتا چاہتی تھی مگر نہ جانے کیوں دل وہاں اکٹبا سا گیا تھا..... وہ

بہت پریشان اور افسردہ تھی۔ جب سے وہ آئی تھی وہ بہت خاموش تھی۔

”جینا کیا بات ہے۔۔۔ آپ کچھ بولتی نہیں، کیا باتیں کرنا نہیں آتیں؟“ تبسم آ پانے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے محبت سے پوچھا۔
”نہیں۔۔۔ بس بوجھی۔“

”یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔ تم یہاں ہر طرح سے مخلوط ہو۔ حیدر تار ہاتھ کہ تمہیں کوئی خطرہ ہے۔۔۔ کس سے خطرہ ہے۔۔۔“
”پاپا ہے۔۔۔“ نادانستہ اس کے منہ سے نکل گیا۔

”کیا مطلب۔۔۔ اپنے گئے باپ سے۔۔۔ اور حیدر نے کچھلی دھتیا ہاتھ کہ تمہارے پاپا تو امریکا گئے ہوئے ہیں اس لیے تمہیں ان کے پاس چھوڑ گئے ہیں۔ کیا دوا آگئے۔۔۔“ تبسم آ کا نے قدرے حیرت سے پوچھا۔
”آں۔۔۔ ہاں۔۔۔ نہیں۔۔۔“ وہ بوکھلا گئی۔

”گنا ہے تم کافی خوفزدہ ہو۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ یہ آری امیریا ہے۔ اس میں تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔۔۔ آرام سے رہو۔۔۔ ایک بات پوچھوں اگر تم پرانہ مٹاؤ تو۔۔۔“

”جی پوچھیے۔۔۔“ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

”کیا تم شہلا اور منصور کی بیٹی ہو۔۔۔؟“ تبسم آ پانے تجسساً لہجے میں پوچھا۔ وہ خاموش ہو گئی اور اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

”تو پھر۔۔۔ تم تو میری اپنی بیٹی ہو۔۔۔ میں تمہاری خالہ ہوں۔۔۔“ تبسم آ پانے فرط جذبات سے اسے گلے لگانے ہوئے اور چومتے ہوئے کہا ایک اور نئے رشتے کی دریافت اور اس کا احساس اسے بہت اچھا لگا۔

”میں نے جب چلی ہار تمہیں دیکھا تھا تب ہی جان گئی تھی تم ہو، پو شہلا پر مٹی ہو۔۔۔ اور تمہاری آواز بھی اس سے ملتی ہے مگر حیدر کے اظہار پر خاموش رہی۔۔۔ اب یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔۔۔ تم نہیں جانتی میں نے شہلا کو اپنی گود میں کھلایا ہے۔۔۔ وہ بہت پیاری اور اچھی ہے۔۔۔ بس قسمت کے ہاتھوں مار کھا گئی۔“ وہ انہوس سے بولیں۔ وہ خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی اتنے میں بیٹھ مینا چائے لے کر آ گیا اور اس کے سامنے قریب سے چائے رکھ رہا تھا۔

”جیکم صیب۔۔۔ صیب آپ کو بلا رہی ہے۔۔۔“ وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا تو شفق اس کی بات سن کر مسکرا دی۔

”سنو۔۔۔ تم مسکراتی بھی اپنی ماں کی طرح ہی ہو۔۔۔ میں ابھی تمہارے انگل کی بات سن کر آتی ہوں۔ تم چائے پیو۔۔۔“ وہ مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں تو وہ پھر کھنکھو گئی۔

قسمت کیسے کیسے لوگوں سے ملاری تھی۔ اس نے تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ پٹا اور تبسم آ پا کے ہاں آئے گی اور یہاں رہے گی۔

”اور ہاں تم نے بتایا ہی نہیں کہ تمہاری ماں اب کہاں ہے۔ یقیناً مانو اس سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے۔“ تبسم آ پانے واپس آ کر پھر

وہیں سے بات شروع کی۔

”وہ..... بہت تیار ہیں..... شاید آپ نہیں تو انھیں پہچان ہی نہ سکیں۔“ اس نے آہستہ سے بتایا۔

”غصا خیر کرے۔۔۔ اسے کیا ہوا ہے؟“

”بدرین ٹیومر۔۔۔ اور کیمو تھراپی کے بعد تو وہ بس..... اٹکل حیدر تار ہے تھے کہ شاید وہ چند دن کی مہمان ہیں۔۔۔“ اس نے گہری سانس

لے کر بتایا۔

”ہائے اللہ یہ کیا ہو گیا اور حیدر نے مجھے بتایا ہی نہیں..... میں ابھی حیدر کو فون کرتی ہوں۔ وہ بیمار ہے اور میں یہاں ہوں۔۔۔“ تبسم آ پا کی

آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

”آئی پلیز..... اٹکل کو فون مت کریں وہ خود آئیں گے۔“

”اور..... تم..... ماں کے پاس کیوں نہیں رہیں؟“ انھوں نے بغور اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ جواب وہ خاموش رہی۔

”یو لو بیٹا..... تمہاری ماں کی حالت اتنی خراب ہے اور تم یہاں ہو؟“

”میں ان کو دیکھنا بھی نہیں چاہتی.....“ اس نے آنسو بڑھ کرتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟“

”وہ ہم سے اس وقت نا تا توڑ گئیں جب ہم نے ڈھنگ سے چٹا بھی نہیں سیکھا تھا۔ ہم نے زندگی کے اتنے تلخ رنگ دیکھے ہیں کہ اب تو

ان سے عزت سی ہو گئی ہے۔۔۔ آئی آپ کو معلوم ہے نا..... ممانے ایک انگریز سے شادی کی تھی۔ ان سے ان کا ایک بیٹا بھی ہے۔“ ولیم انھوں نے

اس کو اپنے پاس رکھا۔۔۔ اور جو پہلا بیٹا تھا..... اس کو دھکے کھانے اور سسکتے کے لیے چھوڑ دیا..... میرا بھائی..... آفاق..... وہ بھی مر گیا اب ہم ان

سے کس ناتے سے ملیں.....“ وہ سسکیاں لینے لگی۔

”چپ ہو جاؤ بیٹا..... میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا..... رشتوں کی دیواروں میں دراڑیں ضرور پڑتی ہیں لیکن وہ کبھی زمین بوس نہیں ہو

سکتیں..... دنیا میں جہاں بہت سی اٹل جھینٹیں ہیں۔ وہاں رشتے ناتے بھی قدرت کے بنائے ہوئے ہیں جو کبھی بھی مٹ نہیں سکتے اور ماں اور اولاد کا

رشتہ تو کائنات میں سب سے حسین رشتہ ہے۔“

”ہمیں کیا معلوم کہ وہ حسین ہے یا نہیں..... ہم نے تو اس میں بھی تنگی اور بد صورتی دیکھی ہے..... ہم نے جس شے کو محسوس نہیں کیا اس

کے بارے میں کیا جانیں؟“ وہ دکھ سے بولی۔

”تم بھی ٹھیک کہتی ہو..... لیکن کبھی نہ کبھی تو رویوں کو بدلنا ہی پڑتا ہے اور کہیں نہ کہیں تو سربلر کرنا ہی پڑتا ہے۔ تم کب تک یونہی سوچتی رہو

گی۔ اس طرح تو تم بھی بکھری بکھری اور پریشان رہو گی اور تمہاری ماں بھی..... بہتر ہے کہ تم اپنی سوچ کو بدلو.....“ تبسم آ پائے سمجھایا۔

”لیکن جب دل ہی کسی طرف سے پلٹ جائے..... جب دلوں میں کسی کے لیے جگہ نہ رہے تو سوچ کیسی.....؟“ وہ قطعیت سے بولی۔

”کیا تم اس کے مرنے پر بھی نہیں جاؤ گی؟“

”نہیں.....“ وہ غصے سے لہجے میں بولی۔

”نہیک ہے..... میں تو کل ہی یہاں سے روانہ ہو رہی ہوں..... میں اسے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں نے تو اسے اپنی اولاد کی طرح پایا ہے۔ تمہارا دل سخت ہو سکتا ہے۔ میرا نہیں..... بے شک اس نے اتنا عرصہ ہم سے رابطہ نہیں کیا لیکن وہ دریاں مچھلیوں کو کم نہیں کر سکتیں۔“ تبسم آ پائے کہا تو وہ خاموشی سے سننے لگی۔

اگلے دن وہ انہی تو تبسم آ پالا ہوا جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ ان کے شوہر اسپتال جا چکے تھے اور گھر میں صرف بیٹ مین تھا جس کے سر پر وہ سارا گھر چھوڑ کر جا رہی تھیں وہ اسے خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئیں۔ تبسم آ پاجید کو انعام کیے بغیر لاہور آ گئی تھیں وہ اس کے ڈینٹس والے گھر گئیں تو وہاں حیدر موجود نہیں تھا انہوں نے شہلا اور اسد کو فون کر کے پوچھا تو وہ وہاں بھی نہیں تھا۔ شہلا ان کی آمد کا سن کر خوش ہو گئی تھی اور وہ ان سے ملنے آرہی تھی۔ شہلا اور اسد دونوں بہت محبت سے انہیں ملے۔ شہلا پہلے سے کافی صحت مند ہو چکی تھی اور اس کی جذباتیت بھی قدرے کم غصوں ہو رہی تھی۔

”پچھو آپ اچانک لاہور کیسے آ گئی ہیں؟“ شہلا نے حیرت سے پوچھا۔

”دراصل شفق میرے پاس آ گئی تھی..... شفق شہلا کی بیٹی ہے..... اس نے بتایا کہ شہلا کی حالت بہت خراب ہے اسے برین ٹیمر ہے..... سچ مانو مجھ سے رہا نہیں گیا۔ بس صبح سویرے ہی کوچ میں بیٹھ گئی۔ تمہارے اکل بہت روکتے رہے کہنے لگے ویک ایڈ پر کٹھے چلیں گے مگر میرا دل نہیں مانتا..... بس چلی آئی.....“ تبسم آ پائے بتایا تو شہلا اسد نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

”کیا واقعی وہ بہت بیمار ہیں.....“

”پچھو..... شفق آپ کے پاس کیوں گئی ہے؟“

”بس اس کا ایک مسئلہ ہے..... اس کا باپ اس کی جان کے پیچھے پڑا ہے اس لیے حیدر نے اسے میرے پاس بھیج دیا..... وہاں وہ محفوظ ہے۔“

”اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟“

”میں تو جلد از جلد شہلا سے ملنا چاہتی ہوں.....“

”اسد آپ کو ضروری کام تھا؟۔ آپ چلے جائیے..... میں خود ہی رات کو آ جاؤں گی.....“ شہلا کچھ سوچتے ہوئے اسد سے مخاطب ہوئی۔

”نہیک ہے..... میں جا رہی ہوں..... تم آ جانا.....“ اسد ان سے اجازت لیتے ہوئے بولا۔ شہلا نے ذوالفقار ڈرائیور کا نمبر ملا یا اور اسے گھر آ نے کو کہا۔ تھوڑی دیر میں وہ پہنچ گیا۔

”پاپا کہاں ہیں.....؟“ اس نے آتے ہی پوچھا۔

”آج صبح انہیں اسلام آباد جانا پڑا..... ان کی ایک اہم میٹنگ تھی..... میں انہیں ایئر پورٹ چھوڑ کر آیا ہوں۔“

”ذوالفقار..... ہمیں اس گھر لے جاؤ جہاں کوئی بیمار عورت رہتی ہے۔“ تبسم آ پائے کہا۔

”گلبرگ میں.....“ ذوالفقار نے پوچھا۔

”ہاں وہیں۔“

”ٹھیک ہے تبسم صاحبہ..... آپ گاڑی میں بیٹھو۔“ ذوالفقار چابیاں اٹھاتے ہوئے بولا اور دونوں اس کے ساتھ چلی گئیں۔

”شہلا..... کیا تم نے اس کے بارے میں ساری بدگمانیاں ختم کر دی ہیں۔“ تبسم آ پانے پوچھا۔

”ہاں..... پچھو..... شاید میں غلطی پر تھی..... میں ان سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔“

”اچھی بات ہے..... کاش وہ بھی مان جائے۔“

”کون.....؟“

”شفق..... وہ بھی ماں سے ناراض ہے..... اسی لیے نہیں آئی..... میں نے بہت سمجھایا مگر وہ کچھ سننے کو تیار نہیں اس کے دل میں اس کے

لیے بہت نفرت ہے.....“ وہ تاسف سے بولیں تو شہلا حیرت سے ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔ دونوں نے کمرے میں قدم رکھا تو اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”آ..... آپ..... تبسم آپا.....“ شہلا نے حیرانی سے کہا۔

”شہلا..... کیا یہ تم ہو.....“ وہ لپک کر آگے بڑھیں اور اسے گلے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ”یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ شہلا تم ایسی

تو نہ تھیں..... تم..... تو وہ نہیں۔“ تبسم آپا اس کے بازوؤں، ہاتھوں اور چہرے پر ہاتھ لگا کر بول رہی تھیں اور وہ روتی جا رہی تھیں۔ شہلا اسد بھی خاموش بھربانہ لگا ہوں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”آپ کو کیسے پتا چلا..... کیا حیدر نے بتایا.....؟“

”نہیں..... شفق نے.....“

”کیا وہ آپ کے پاس ہے؟“

”ہاں..... پتا درمیں.....“

”وہ نہیں آئی.....“ اس نے ارد گرد تلاش کیا ہوں سے دیکھا۔

”نہیں۔“ آپا نے آہستہ سے کہا۔

”ہاں..... وہ کیسے آ سکتی ہے..... وہ تو مجھے دیکھنا بھی نہیں چاہتی۔“ اس نے آدھ بھر کر کہا۔

”لیکن یہ سب کیسے ہوا.....؟“ تبسم آپا روتے ہوئے بولیں۔

”میرے گناہوں کا نتیجہ ہے۔ شفق بھی تو یہی کہتی ہے.....“ وہ تاسف سے بولی۔

”وہ بھوٹ کہتی ہے..... تم ایسی تو نہ تھیں.....“

”مگر ہوگئی۔۔۔ نہ چاہتے ہوئے گناہ پر گناہ کرتی تھی اور آج میں ہر ایک کی مجرم بنی کھڑے میں کھڑی ہوں۔۔۔ اور آج مجھے تو کوئی معاف کرنے کو بھی تیار نہیں۔“ وہ ان کے گلے لگ کر سسکتے لگی۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں آگئی ہوں نا۔۔۔ میں تمہارے پاس رہوں گی۔“ وہ اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔
 ”شکریہ آج۔۔۔“ اس کی آنکھیں محبت سے چمکتے لگیں۔ ”سسز۔۔۔ افضل سے کہو چائے بنائے۔۔۔ آج آپ فریش ہو جائیں تھکی ہوئی لگ رہی ہیں۔“ اس نے سسز سائرہ سے اور پھر آجاسے کہا۔

”اچھا۔۔۔ میں ذرا دوش روم سے ہواؤں۔“ آجاسے اٹھتے ہوئے بولیں۔ سسز سائرہ بھی جا چکی تھی۔ شہلا اسدا بھی تک خاموش تھی۔ موقع بہتر تھا وہ دونوں تہا تھیں وہ آسام سے اپنے دل کی بات کہہ سکتی تھی۔ وہ اٹھ کر ان کے پاس ان کے بستر پر بیٹھ گئی۔

”آئی آئی ایم سوری۔۔۔ مجھ سے بہت غلطیاں ہوئی ہیں۔۔۔ کبھی میں آپ کو غلط سمجھتی رہی اور کبھی پایا کہ۔۔۔ میں بہت کنفیوژ رہی۔۔۔ میں آپ کے رشتے کی نوعیت کو ہی نہ سمجھ پائی اور آپ دونوں سے بہت تنگی سے باتیں کرتی رہی۔۔۔ لیکن اب جبکہ میں خود محبت کے رشتے سے بندھ چکی ہوں اور مرد اور عورت کے رشتے سے مانوس ہوئی ہوں تو بہت غلط محسوس کرتی ہوں اب میں نے اس حقیقت کو جانتا ہے خدا نے پہلے عورت اور مرد کو کیوں تخلیق کیا۔ ان کے درمیان پہلے محبت کا رشتہ پیدا کیا اور پھر اس محبت سے قربت نے جنم لیا اور اس قربت نے قربت واری کو جنم دیا۔ اولاد ماں باپ، لیکن بھائی تو اس محبت کی پیداوار ہیں اور میں بالکل سمجھ ہی نہ سکی۔۔۔ اور آپ دونوں کے بارے میں بدگمان رہی۔۔۔ مجھ سے کتنی بڑی غلطی ہوگئی۔۔۔ یا پھر گناہ کہ میں جانتے بوجھے ہوئے بھی کہ میرا باپ مضبوط کردار کا انسان ہے ان کے بارے میں بدگمان ہوگئی۔ میں تو گنہگار ہوگئی اور۔۔۔ آپ سے بھی میں نے بہت بدتمیزی کی۔۔۔ آئی ایم سوری۔۔۔ یقین مایہ۔ جب سے میری شادی ہوئی ہے میں ہر لمحہ اپنے آپ کو نادم محسوس کرتی ہوں اور روکھی رہتی ہوں۔۔۔ خدا سے بہت دعا کرتی رہی کہ وہ مجھے موقع فراہم کرے اور میں آپ سے معافی مانگ لوں۔۔۔ شکر ہے آج اس نے مجھے یہ موقع دے دیا اور پھسوا گئی۔۔۔ آپ پلیز مجھے معاف کر دیں۔“ وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

”مجھے تم سے کوئی لگہ نہیں۔۔۔ یہ تو نیچرل ہے۔۔۔ اور تم بھی تو میری شفیق کی طرح ہو اور مجھے بہت عزیز ہو۔۔۔ حیدر میں اور مجھ میں محبت اچانے میں ہوا ان چڑھی لیکن ہم نے اپنے بزرگوں کی روایات کی پاسداری کی اور باقی نہ ہوئے۔ بڑوں کے ہر فیصلے پر سر جھکا یا نہیں دلوں کا کیا کیا جائے۔۔۔ جہاں ماضی دفن تو ہو جاتا ہے غائب نہیں۔ بزرادہ بھی کمر چڑھ کر صاف نہیں ہوتا۔۔۔ نہ یہ کبوت بھولتا ہے نہ انسان چھٹکارا پاسکتا ہے اور آج اگر حیدر میرا خیال رکھ رہا ہے تو اس لیے بھی کہ سید صاحب کی سگی نہ سہی مگر بیٹی تو تھی۔۔۔ میں نے نہ جب کسی کا حق چھیننے کی کوشش کی تھی نہ بعد میں۔۔۔ میں تو راستے سے ہی ہٹ گئی۔ اس لیے دور ہٹ گئی تاکہ پھر کبھی یہاں نہ آؤں مگر قسمت سے کون لڑ سکتا ہے۔ انسان جس شے سے جتنا بھاگتا ہے وہ اتنا ہی اسے گھیرتی ہے۔ میں تو ریز اور ریز ہوگئی ہوں۔ ٹوٹ چکی ہوں۔۔۔ میرا وجود تو ختم ہو چکا ہے۔ اب چند سانس باقی ہیں وہ بھی نہ جانے کس وقت۔۔۔“ اس کی آنکھیں بھرا گئیں۔

”آئی آئی آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔“ اس نے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔

”نہیں بیٹا..... اب دعا کرو..... کہ میں زندگی کے اس نفس سے جلدی نجات پا لوں..... اب تو برہم اذیت اور آزمائشوں سے بڑے ہے۔“ دودھ سے بولی۔

”تمہیں آپا فریش ہو کر آئیں اور تھوڑی دیر بعد غسل چائے کی ٹرائی بھی لے آئی۔“
 ”ولیم اٹھ گیا ہے۔ اسے کدو بھی ادھر آ جائے۔“ اس نے غسل سے کہا۔
 ”جی اچھا.....“ وہ چائے ان کو سرد کر کے باہر چلا گیا۔

”چند لمحوں بعد ولیم غسل خیز کر کمرے میں داخل ہوا تو دونوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔
 ”آپا..... یہ میرا بیٹا ہے۔“ اس نے حصارف کرایا۔

آپا نے اٹھ کر اسے چومنا اور گلے لگایا۔ شہلا نے بھی محبت سے اس کو ٹوکھا۔
 ”کیا نام ہے بیٹا.....؟ میں تمہاری خال ہوں۔“ جسم آپا نے محبت سے پوچھا۔
 ”ولیم.....“ وہ آہستہ سے بولا۔

”جسم آپا اور شہلا نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف استغماہی نظروں سے دیکھا۔ ولیم کے لیے ان نظروں میں استغماہم انجبی نہیں تھا مگر اب وہ اس سب سے شدید لرزہ جک ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اب ایسی نظروں سے شدید جبین محسوس کرتا تھا اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ کسی انجبی ویس میں ہو یا پھر بالکل تہا وجود..... اسی لیے ہر نگاہ اس کے بارے میں مشکوک تھی اور اسے مشکوک لگا ہوں سے دیکھتے تھے..... اس کے لیے وہاں رکنا محال ہو گیا وہ آہستہ سے اجازت لے کر اپنے کمرے میں آ گیا..... دروازہ بند کر کے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا..... اسے اپنا وجود بہت حقیر لگنے لگا تھا۔ ان سب کے درمیان وہ اپنے آپ کو بخش اور تپا پاک محسوس کرنے لگا تھا۔ نہ جانے کیوں جب سے وہ آیت اس کو ذہن نشین ہوئی تھی اس نے ہر بات کو اور اپنی ذات کو مختلف انداز میں آزمود کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اندر ہی اندر اپنے بارے میں شدید بدانتواوی محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ بھی ریت کے گھروندے کے مانند کھرجکا تھا..... وہ اتنا پٹلی ہو گیا تھا کہ معمولی سی بات، لہجے اور لگا ہوں میں چھپے مفہوم کو خود ہی اخذ کر کے رونے لگتا۔ نور کے جانے کے بعد تو وہ اور ہی زیادہ بکھر چکا تھا۔ اس لیے بھی وہ شدید اجنبیت، تنہائی اور لڑ پریش محسوس کر رہا تھا۔ اسے کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس سے بات کرے..... اس نے آنسو پونچھے ہوئے قاور کا نمبر ملا یا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔
 ”کون.....؟“ قاور کی بارعب آواز اس کی سماعت سے کھرائی۔

”قاور میں ولیم ہوں۔“ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”اوہ..... تم.....“ قاور نے لہجے میں کڑھکی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

”قاور..... آئی ایم آل الون..... قاور میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور میں اب چلی بھی نہیں سکتا.....“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”یہ تو ہوتا ہی تھا..... مائی سن..... یو آر کر سڈ جو لوگ کراسٹ سے بے وقائی کرتے ہیں۔ گاڈ ان کو ایسے ہی سزا دیتا ہے۔ تم نے گاڈ سے

اور کرائسٹ دونوں سے اپنا پراس توڑا ہے وہ قسمیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔ اب تم ساری زندگی یونہی اپنے پاں رگڑ رگڑ کر مرو گے۔ وہ بس ایک دفعہ آتا ہے مگر سرکشوں کو ایسی سزا نہیں دیتا ہے کہ وہ ساری زندگی تمہاری طرح تڑپتے رہتے ہیں۔“

”قادر پلیر ایسا مت کہیں۔۔۔۔۔ میں بہت شعلہ ڈھونڈ چکا ہوں۔“ وہ روہانسا ہو کر یولا۔

”تمہارے ساتھ اس سے بھی برا ہوگا۔۔۔۔۔ میں تو قسمیں جتا کی طرف لا رہا تھا۔ سوڈن بنا ناچا وہ رہا تھا۔ تمہاری سول کو کرائسٹ سے ملا نا چاہا رہا تھا مگر تم بھگ گئے تم بہت کمزور انسان نکلتے۔۔۔۔۔ اور گاڈ اپنے لیے کمزور انسان ہاںکل پسند نہیں کرتا۔ تم خود ہی دیکھو اس نے قسمیں لو لا، انگڑا، اپاچ بنا دیا ہے اب وہ قسمیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔۔۔۔۔ نیند۔۔۔۔۔ ایور۔۔۔۔۔ اور خداوند یسوع مسیح بھی تم سے بہت ناراض ہیں۔۔۔۔۔ دس ورڈ اڈا ہل قاریو۔۔۔۔۔“ قادر نے غصے سے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔ وہ اور شدت سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔۔۔۔۔ اس نے بہت ہی امید ہو کر فون کیا تھا اور قادر نے اس کی رہی سہی امید اور حوصلہ سب کچھ ختم کر کے رکھ دیا تھا۔۔۔۔۔ اس نے بہت مشکل سے شوق کے الفاظ کو بھلانے کی کوشش کی تھی رات کے جس پہر اس کی آنکھ کھلتی تھی۔ شوق کے الفاظ ”چلا پھرنا تمنا“ اس کے اندر کہہ بخور کر رکھ دیتے۔۔۔۔۔ اور اب قادر نے جب گاڈ اور کرائسٹ کی ناراضی کا بتایا۔ تو وہ شعلہ ڈھونڈ گیا۔۔۔۔۔ گاڈ اس سے ناراض تھا اور کرائسٹ بھی۔۔۔۔۔ ”میرا آکر سڑ، میرا آکر سڑ، میرا آکر سڑ، میرا آکر سڑ۔۔۔۔۔“ یہ الفاظ اس کے ذہن میں گونج رہے تھے اور اس کے اندر کہہ کر ہلا کر رہے تھے۔ وہ اتنی شدت سے رو رہا تھا کہ اس نے سوچ ہی نہیں رہے تھے۔۔۔۔۔ اس لیے وہ شدید تنہائی محسوس کر رہا تھا۔۔۔۔۔ ”گاڈ۔۔۔۔۔ اگر آپ مجھ سے ناراض نہیں تو۔۔۔۔۔ پلیر نور کو کہو۔۔۔۔۔ مجھے فون کرے۔۔۔۔۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔ بہت پریشان ہوں۔۔۔۔۔ آئی ایم شعلہ ڈھونڈ۔۔۔۔۔“ وہ دل ہی دل میں رگڑ رگڑ کر دعا میں کرنے لگا۔۔۔۔۔ اس نے رو رو کر اور گلے میں کرائسٹ کے لاکٹ کو ہاتھ میں پکڑ پکڑ کر دعا میں کیں۔۔۔۔۔ وہ رو رو کر تھک چکا تھا اور آنکھیں سوچ چکی تھیں۔۔۔۔۔ شام گہری ہو رہی تھی۔ وہ بستر پر لیٹا ہی تھا کہ موبائل کی بیل بجنے لگی۔۔۔۔۔ اس نے اٹھایا تو نور بول رہی تھی۔

”ہیلو ولیم کیسے ہو۔۔۔۔۔؟“ وہ بلاش لہجے میں بولی۔

”نور۔۔۔۔۔ تم کہاں ہو۔۔۔۔۔ اور قسمیں کس نے فون کرنے کو کہا۔“ اس نے بے تابی سے پوچھا۔

”بھئی کہا کس نے ہے۔ میرا دل چاہا رہا تھا اور بہت دنوں سے کوشش بھی کر رہی تھی مگر وقت ہی نہیں مل رہا تھا۔ ولیم میں یہاں بہت بڑی

ہوں۔ میں یہاں اپنا کارمنٹس کا بزنس سیٹ کر رہی ہوں۔۔۔۔۔ تم سناؤ تھیک ہوتا۔۔۔۔۔“

”نور تم کب واپس آؤ گی۔۔۔۔۔؟ اس نے بے تاب لہجے میں پوچھا۔

”کیوں بھئی کیا ہو گیا ہے؟“

”میں بہت اپ سیٹ ہوں۔“

”قادر گاڈ سیک۔۔۔۔۔ اب تو سدھرا جاؤ۔۔۔۔۔ نہ جانے کب سمجھو گے۔۔۔۔۔ میں بھی قسمیں سمجھا سمجھا کر تھک چکی ہوں مگر تم۔۔۔۔۔ اب تم نے ایسا کیا

نامم تم سے بات نہیں کروں گی۔“ وہ معنوی تنگی سے بولی۔

”پلیر نور۔۔۔۔۔ سنو۔۔۔۔۔ ناراض مت ہو۔۔۔۔۔ اور تم مجھے بتائے بغیر کیوں چلی گئیں۔“

”بھئی میں نے فون کیا تھا تم سارے تھے میں نے حیدر اگل کو بتا دیا تھا۔ مجھے اچانک آنا پڑا۔۔۔۔۔ اور میں نے کئی بار تمہیں فون کیا۔۔۔۔۔ حیدر اگل نے تمہیں نہیں بتایا۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ وہ معروف تھے شاید۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”اب بولو۔۔۔۔۔ کیوں پریشان ہو؟“

”میں نے تار کو فون کیا تھا۔“

”پھر۔۔۔۔۔“ وہ خاموش رہا۔

”انہوں نے تمہیں ڈانٹا ہوگا۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ کہنے لگے ہر آر کر سڈا چٹھ بٹے گا۔“

”وہاٹ نان سٹس۔۔۔۔۔ ولیم آئی ایم سب آف یو۔۔۔۔۔ کب تک تم Puppet بنے رہو گے۔۔۔۔۔ تم کب اپنا ذہن استعمال کرو گے۔۔۔۔۔ خدا کے لیے اب تو سوچو سمجھو۔ چھوڑ دو یہ سب کمزور سہارے۔۔۔۔۔“

”میں کیا کروں۔۔۔۔۔؟ مجھے کچھ نہیں آ رہا۔“ وہ بول رہا تھا کہ ایک دم فون ڈس کنکٹ ہو گیا۔ اسے شدید رنج ہونے لگا۔

شہلا داپس جا چکی تھی اور جسم آ پاؤ ہیں رک گئی تھیں۔ رات کو حیدر آیا تو انہیں وہاں دیکھ کر چمک گیا۔

”آپا۔۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔۔ یہاں۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ اور کب آئیں؟“ حیدر بے حد حیران ہو رہا تھا۔

”جیسے ہی شفق نے بتایا کہ شہلا بیمار ہے مجھ سے رہانہ گیا اور چلی آئی بلکہ شہلا بھی یہاں آئی تھی۔“

”وہ۔۔۔۔۔ یہاں۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔؟“ حیدر نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ بہت شرمندہ ہے اور شاید اس نے شہلا سے معافی بھی مانگی ہے۔“ تبسم آپا نے کہا تو وہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”اور شفق۔۔۔۔۔ وہیں پر ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ میں نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی تھی اس کے بارے میں وہ بہت بدگمان ہے لیکن میں نے تمہارے بھائی کو کہا ہے کہ وہ

اسے ہر ممکن طریقے سے سمجھانے کی کوشش کریں اور تم فکر نہیں کرو۔۔۔۔۔ وہ وہاں ہر طرح سے محفوظ ہے۔“ تبسم آپا نے اسے بتایا۔

”اسی لیے تو ادھر بھیجا ہے۔“

”مگر منصور کیوں اس کی جان کے پیچھے پڑا ہے۔۔۔۔۔“

”جب انسان کا دل ہوس اور لالچ سے بھر جائے تو وہ ہر رشتے کو مفادات کے آئینے میں دیکھتا ہے۔ منصور نے ہمیشہ اپنی ذات اور مفاد کو

اہم جانا۔۔۔۔۔ نہ رشتوں۔۔۔۔۔ کی پروا کی نہ جذبات کی۔۔۔۔۔ اور اب تو وہ ایسی گندی پھلی بن چکا ہے جو ہر مل کو گندا کر دیتی ہے۔ آپا۔۔۔۔۔ میں تو حیران ہوتا

ہوں کہ جس شخص کا گھر نکلتا نکھر چکا ہو۔۔۔۔۔ نہ لادو ہائی رہے۔۔۔۔۔ نہ رشتے اور جذبات باقی رہیں تو وہ کیسے سروائیو کر سکتا ہے مگر وہ کس قدر مطمئن اور

خوش ہے۔۔۔ نہ جانے کیسی زندگی وہ گزار رہا ہے۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔ وہ شروع سے ہی ایسا تھا۔ یہ تو شہلا کے نصیب ہی برے تھے کہ وہ اس کا نصیب بن گیا۔۔۔ اس کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو شاید آج شہلا کے یہ حالات نہ ہوتے۔۔۔“ وہ تاسف سے بولیں۔

”آپ نے اچھا کیا کہ آپ یہاں آ گئی ہیں۔۔۔ شہلا کی حالت روز بروز خراب ہو رہی ہے۔ کسی بھی وقت شاید۔۔۔“ وہ مایوس کن لہجے میں بولا۔

”حیدر۔۔۔ کیا اس بیماری کا کوئی علاج نہیں۔۔۔“

”جتنا ممکن ہو سکا میں نے کروایا ہے۔۔۔ مگر اب کہیں بھی کچھ بھی ممکن نہیں۔ نہ یہاں نہ بیرون ملک۔۔۔“

”حیدر۔۔۔ کیا شہلا کا چٹا کر بچا ہے۔۔۔؟“ آپ نے استہکامیہ لہجے میں پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ وہ کچھ بھی نہیں۔۔۔ نہ کر بچا نہ مسلم۔۔۔ اس بچارے کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ شہلا نے بہت حماقتیں کیں ہیں اور یہ اس کی سنگین غلطی ہے۔۔۔ وہ بچہ بچی طور پر منتشر ہو چکا ہے۔۔۔ اس کو ناہنسی مل رہی۔ آپ آپ نے جس طرح ہماری تربیت کی اسی طرح اس کا ذہن بھی ہموار کرنے کی کوشش کریں۔۔۔ اگر سید صاحب زندہ ہوتے تو شاید اتنا مسئلہ نہ ہوتا اور مجھے تو سیاست اور بزنس نے اس قدر کچا کر رکھ دیا ہے کہ میں تو اپنے پروفیشن سے بھی دور ہو گیا ہوں۔۔۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں جس گدی نشینی کے لیے سید صاحب نے سب کچھ کیا۔ میں تو ایک دن بھی اس کا حق ادا نہ کر سکا۔ سب کچھ بے معنی ہی رہ گیا۔۔۔ نہ میں وہ بین سکا جو وہ چاہتے تھے اور نہ وہ بین سکا جو میری خواہش تھی۔۔۔“ وہ تجسم آپا کے سامنے اپنا دل کھول رہا تھا۔

”ہاں۔۔۔ کبھی کبھی انسان کو خود بھی کچھ سمجھ نہیں آتا اور سب فیصلے بالائی ہال ہو جاتے ہیں بہر حال میں کوشش کروں گی۔۔۔ تم فکر نہیں کرو۔۔۔ اور اب کچھ آرام کر لو۔۔۔ بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔“

”ہاں۔۔۔ میں واقعی بہت تھک چکا ہوں۔۔۔ لو پر جا کر کچھ میا آرام کر لیتا ہوں۔“

وہ شہلا کو دیکھے اور ملے بغیر لاؤنج سے ہی لو پر چلا گیا۔



آنکھت کا پورا جسم جیسے آگ میں جھلس رہا تھا۔۔۔ وہ آگ کے گڑھے میں کھڑی تھی ہر طرف آگ کی دیواریں تھیں اور اس پر شدید تکباری ہو رہی تھی۔۔۔ وہ جھنجھکی اس نے منہ نہ کیا تھا۔۔۔ بہت بڑا گناہ اس کا اندر باہر آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ کہیں راہ فرار نہیں تھی۔ خوبصورت ہال۔۔۔ تیلی آئینیں۔۔۔ آئینیں حسن۔۔۔ سب کچھ ست رنگی آگ کی نذر ہو رہا تھا۔۔۔ وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔۔۔ اس کا سارا جسم پیسے میں نہا رہا تھا۔ وہ دونوں سے یہی خواب دیکھ رہی تھی۔ شدید احساس گناہ نے اس کی سوچوں کو تھیں نہیں کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کو شدید بخار ہو رہا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی بستر سے نہیں اٹھ سکی تھی۔ اس کو بہت روٹا آ رہا تھا۔ وہ ایسی تو نہ تھی۔ اس نے تو زندگی کے ہر موڑ پر سوچ کچھ کر قدم رکھا

تھا۔ اس نے تو اپنی طرف اٹھنے والی ہر بری نگاہ کو ایسا نشتر چھو یا تھا کہ وہ دوبارہ شائع نہ کی۔ وہ کس قدر اپنی ذات کے۔

وہ کس قدر اپنی ذات کے زعم میں جتا تھی۔ اسے ہمیشہ غور رہا تھا کہ اس نے صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی گزاری ہے۔ اگرچہ وہ ماڈرن سوسائٹی کی اہم رکن تھی۔ اس کا گیٹ اپ اور لائف اسٹائل سب کچھ ماڈرن تھا مگر زندگی کی ترجیحات، قدامت پسندی اور روایت کے حصار میں جکڑی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی مذہبی تونہ تھی مگر خدا تو ہر جگہ موجود تھا۔ یہ سوچ اور گناہ و سزا کا احساس سچے جذبہ کی طرح خون میں دھواں دھواں تھا۔ اس کا گھر اناوسط درجے کا مذہبی گھرانہ تھا جہاں مذہبی تعلیمات پر دن، بروقت ڈہرائی تو جاتی تھیں، محل شاد و ناور ہوتا تھا۔ مذہب دل کے کسی گوشے میں محفوظ تھا مگر مقتود نہیں تھا اور اب تو جیسے سب کچھ عود کر رہا تھا۔ اسے خدا کے تصور سے ہی خوف محسوس ہو رہا تھا۔ جب عورت اپنا سب کچھ گنوا دیتی ہے تو پھر خدا سے کیسے نظریں ملا سکتی ہے کیونکہ وہ ایسی بے باک نظروں کو پسند نہیں کرتا جن میں سے حیا ختم ہو جائے۔ یہ سب کچھ کیا ہو گیا تھا اس کا دل چاہ رہا تھا اور دروازے سے بیرون کوئی کرے، خوب روئے۔ اتار دئے کراٹھوں کی بیٹائی ختم ہو جائے اور وہ ملک منصور کے کمرہ چہرے کو دوبارہ زندہ کیجے سکے وہ نرم و گداز بستر پر لیٹی ٹرپ دی تھی، اندر ہی اندر چلا رہی تھی۔ ہر کرڈٹ پر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے آگ کی سلاخوں سے داغا جا رہا ہو۔

زمانے کی قسم انسان خسارے میں ہے۔

”ہاں، بہت بڑے خسارے میں، ہر طرف سے، اندر سے، باہر سے۔ یا اٹھی امیں کس کو پکاروں، میں کیا کروں۔ کاش میں اسی وقت مر جاتی۔“ وہ بیڑا رہی تھی، کچھ تار رہی تھی، مسک رہی تھی مگر سب کچھ بے کار تھا۔ وہ بری طرح جکڑی جا چکی تھی۔

ملک منصور رات کو آنے کا کہہ کر گیا تھا اور وہ دن ہو گئے تھے وہ ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ وہ اس کی آمد کی اتنی منتظر نہیں تھی جتنی یہ جاننے کی کہ اس نے شزا کے ساتھ کیوں ایسا کیا تھا۔ شزا کے الفاظ ابھی تک اس کے کانوں میں نشتر کی طرح چھو رہے تھے۔

”آٹھکٹ! ملک منصور نے مجھے بہت مارا ہے۔ زندگی میں پہلی بار اس نے مجھے اس شدت سے مارا ہے اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ تم نے جو جو گناہ کیے ہیں، میری بددعا ہے کہ خدا تمہیں کبھی صاف نہ کرے۔ میں نے بہت غلوں سے تمہیں بچانا چاہا تھا اور تم نے مجھے ہی اجازت دیا۔ ملک منصور نے مجھے طلاق دے دی ہے۔ میرا نام نہاد گھر بھی اجازت دیا۔ خدا کرے تمہارا ہر لمحہ الایت میں گزرے اور تم کبھی سکون سے نہ رہو۔“

شزا نے غصے سے روتے ہوئے فون بند کر دیا۔ وہ ٹھگ سی منتی رہی اور کچھ نہ کہہ سکی۔ اتنا بھی نہ بتا سکی کہ اس نے تو ملک منصور کو اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ وہ تو خود ہی اتنا شاطر نکلا۔ کیسے کیسے اس نے وہ سارے نمبرز ڈس آؤٹ کیے اور پی ٹی سی ایل سے سارے نمبرز کنٹرول کیے۔ خدا جانتا تھا کہ اس نے کچھ بھی ایسا نہیں کیا تھا اور وہ کیسے بھٹکے میں آ گئی تھی۔ اس شخص نے کیسے اسے اپنے منہری جال میں پھنسا لیا تھا۔ شزا کے فون کے بعد تو اس کی الایت میں اضافہ ہو چکا تھا۔ اگلے دن رات گئے وہ لوٹا۔ وہ میرون اور آف وائٹ کو کنٹینر میں پہلے سے بھی زیادہ ڈھنگ اور سارٹ لگ رہا تھا۔ وہ کمرے میں آیا تو اس کے پیچھے تین چارویٹر لڑے بڑے ڈبے بٹھا کر لارہے تھے۔

”ہاں، اور رکھ دو اور تم لوگ جاؤ!“ اس نے ٹھکانہ لہجے میں کہا اس نے اسے دیکھ کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

”بیلوڈار ٹھگ اسوٹ ہارٹ کسی ہوا“ وہ خاموش رہی اور شزم دا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہ کیا ابھی تک بستر میں ہی سو رہی ہیں؟ اس کی آنکھیں ابھی نہیں آگیاں۔“ اس نے بچے پر کھسک کر دیکھا۔ اس نے جلدی سے ڈاکٹر کا نمبر دیا۔ ”وہ ابھی آ رہا ہے۔ تم کچھ بولتی کیوں نہیں اور تمہاری آنکھوں میں اتنی اُداسی کیوں ہے؟“ اس نے محبت سے اس کے بلوڑے بالوں میں انگلیاں بکیرتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش رہی اور غالی غالی غنڈوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر آنکھیں بند کر لیں۔ بند آنکھوں سے آنسو گر کر بچے میں جذب ہونے لگے۔

”یہ کیا..... یہ اتنے سارے آنسو کہاں سے آ گئے۔ ڈنٹ پروری ڈیر ڈاکٹر آ رہا ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ اس کے گرم، پتے ہوئے ماتھے پر اپنا رخ ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

ڈاکٹر نے چیک اپ کیا اور میڈیٹو وغیرہ دے کر چلا گیا۔ وہ میڈیٹو کھا کر سو رہی تھی اور وہ کیا کرتا رہا، اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ صبح جب بیدار ہوئی تو اس کی طبیعت پہلے سے کافی بہتر تھی۔ وہ کمرے میں نہیں تھا۔ کمرے میں ہر شے قرینے سے اپنی اپنی جگہ پر تھی۔ وہ واش روم سے فارغ ہو کر باہر نکلی تو فون کی تہل بجے گی۔ آفس سے کال تھی۔ انیس وہ ڈاکو منٹس چاہیے تھے جو اس کی سیکرٹ فائل کا حصہ تھے۔ اس کا کوئی واپس ڈاکو منٹس لینے آ رہا تھا۔ وہ دروازہ لاک کر کے اپنے چھوٹے سے سیکرٹ چنڈیک سے وہ پیپر ڈکالنے لگی۔

ایک کے بعد دوسری..... پیپر ڈاکو منٹس غائب تھے۔ وہ پریشان ہو رہی تھی۔ اس نے تو بیک اپ اپنا ہی احتیاط کے ساتھ سائبر نیٹل کے خفیہ خانے میں رکھا تھا پھر کیسے اور کہاں غائب ہو گیا۔ وہ پریشان اور حیران ہو رہی تھی۔ اس کا دھیان بار بار ملک منصور کی طرف جا رہا تھا مگر اسے بیک اپ نہیں ملتا تھا کیونکہ اس نے بہت احتیاط سے اسے چھپایا تھا۔ اس نے بیک اپ بار بار چیک کیا اور پھر اسے الٹا تو ملک منصور کا ایک لاکٹ چمکا ہوا فرش پر پڑ چکے تھے۔ اس کا شک یقین میں بدل چکا تھا۔ اس نے اس کے ساتھ کتنا یاد دھوکا کیا تھا۔ وہ تو کہتا تھا اسے نہ کسی شخص کی پروا ہے اور نہ ہی ڈاکو منٹس کی اور وہ ڈاکو منٹس موجودہ حکومت کے لیے کس قدر خطرناک تھے وہ بھی جانتا تھا۔ نہ جانے اس کام کے اس نے کتنے ڈالر کمائے تھے۔ اسے شدید دکھ ہونے لگا۔ آفس والوں نے اسے ایما عمارت کچھ کراس پر ٹرسٹ کیا تھا اور وہ خود ہی دھوکا کھا گئی تھی۔ ان لوگوں کو کیا جواب دے گی۔ وہ پیپر ہونٹ بچھ چکا تھا اور تھوڑی دیر میں اس تک پہنچنے والا تھا۔ اسے کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کہے۔ وہ پیپر اس کے سامنے پیش اس سے پیپر ز مانگ رہا تھا اور وہ پیسے لگے۔ سی بی کچھ سن ہی نہیں رہی تھی۔

”میری طبیعت بہت خراب ہے اور فائل میں نے کہاں رکھی ہے، مجھے یاد نہیں آ رہا۔ میں شام کو فائل لے کر خود آؤں گی۔ مجھے تلاش کرنے میں کچھ دقت لگے گا۔“ اس نے وہ پیپر سے کہا تو وہ حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگا۔ وہ کچھ کہنے لگا تو وہ خود ہی بول پڑی۔

”ہاں، میں جانتی ہوں وہ بہت اہم ہے۔ میں نے کہا نا شام کو پہنچا دوں گی۔“ وہ پیپر بنا کچھ کہے حیرت سے ”اوکے“ کہتا ہوا بار بار کل گیا۔ اس کا سر غم و غصے سے پھٹ رہا تھا۔ اس شخص نے اس کے ساتھ کتنا یاد دھوکا کیا تھا۔ اس کی زندگی کے ساتھ بھی کھیلا اور اس کے پروفیشن کو بھی واڈ پر لگا دیا۔ پہلے ہر لمحہ گناہ کے احساس کی وجہ سے اذیت سے بڑھا اور اب دھوکا دہی کے ڈپریشن سے۔

"آنکھ اتم نے بہت بڑا دھوکا کھایا ہے۔ محبت کے خوبصورت لفظ سے دھوکا کھا گئی ہو۔ اس کی دلکش شخصیت، اس کے خوبصورت الفاظ، سب کچھ فریب تھا۔ وہ تو خود سراپا فریب ہے۔" کوئی اندر ہی اندر کچھ کے نگار ہوا تھا۔ اسے اپنے سارے جسم پر چھوٹیاں رنگتی ہوئی اور ڈنک مارتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ گناہ اور فریب، سنگساری یا آگ؟ تھوڑی دیر بعد وہ لوٹا تو مسکرا رہا تھا۔ وہ سونے پرانے تاجان بنی بیٹھی رہی اور ایک میگوینہ دیکھتی رہی۔

"اب کیسی ہو؟ لگ رہا ہے کہ بہتر ہو۔" وہ اس کے کندھے پر اپنا بازو پھیلاتے ہوئے بولا۔

"آج ہر چلیں۔" آنکھ ایک دم بولی۔

"کہاں؟"

"اپنے گھر..... میرا دل بہت چاہ رہا ہے وہاں جانے کو۔"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ تمہارا گھر ہے۔ مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے اور سنو اتم نے تو وہ جیوٹری اور پریلوڈ دیکھے ہی نہیں۔ کل تمہاری طبیعت خراب تھی اس لیے دکھانے کا ڈارنگ اکھول کر تو دیکھو۔ تمہارے ہوش اُڑ جائیں گے۔" اس نے ڈبچاس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"بعد میں دیکھ لوں گی۔" وہ پوٹی سے بولی۔

"نہیں نہیں، ابھی دیکھو۔" وہ ڈبچے کو لئے لگا۔ ایک کے بعد ایک خوبصورت ڈانٹ گولڈ اور ڈانٹنڈ کا سیٹ تھا۔ ہوشیار پر فٹ خوبصورت، دلکش جینکٹو میں۔ وہ لڈ بنا کر سامنے کو اس کے سامنے کر کے دبا تا۔ خوش کن، سونے کی موٹی موٹی خوشبوئیں روح تک کو صحر کرنے لگیں۔

"کیا لگا سب کچھ؟" وہ مسکرا کر بولا۔

"اچھا ہے۔"

"لیکن تم سے اچھا نہیں۔" وہ اس کے آگے جھکتے ہوئے بولا۔

"میرا خیال ہے چلیں۔"

"ہاں لیکن تم فریق تو ہو کر آؤ۔ چنچ کر اور ان میں سے سب سے خوبصورت ترین سیٹ پہنو۔ آج وہاں صرف ہم تم اور خوشبوئیں ہوں گی۔" وہ معنی خیر مسکراہٹ سے بولا۔ آنکھ خاموشی سے اٹھ کر داش روم میں چلی گئی اور شاد کو کھول کر شدت سے رونے لگی۔ اس کا دل پھٹ رہا تھا، چیخ رہا تھا۔ اس شخص نے اس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ اس کی زندگی، عزت، اس کا مستقبل اور شاید عاقبت بھی۔

دو داش روم سے لٹی تو تک منصور جیسے آنکھیں جھپکنا ہی بھول گیا۔ اس نے ریڈ کلر کا اسکرٹ اور بلاؤڈ پین رکھا تھا اور شاید پہلی دفعہ ریڈ کلر کی ڈارک لپ اسٹک لگائی تھی۔ اس کا دل بھی خونیں ہو رہا تھا۔

"واؤ..... اس نظر فل اتم ہر روز مجھے حیران کرتی ہو۔" وہ ہاؤ کی طرح اس پر جھپٹ کر اسے اپنے حصار میں لیتے ہوئے بولا۔

"نہ تم کہ ہے، چلیں۔" وہ اسے آہستہ سے اپنے علیحدہ کرتے ہوئے بولی۔

"ہاں، نا تم تو واقعی کم ہے اور ہمارے لیے تو ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ وہ گاڑی میں بھی اس سے محبت بھری باتیں

کرتا رہا اور وہ خاموشی سے سنی رہی۔ مگر کے پیچھے آنسو اس کی آنکھوں میں جیسے غم سے گئے تھے۔ اسے دل کی آرزو سے کتنا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کس قدر مطمئن اور خوش لگ رہا تھا۔

”وہ یونہی ہر عورت کو تہہ کرتا ہے۔ پہلے اسے اتنا مجبور کرتا ہے کہ راہ فرار نظر نہیں آتی اور پھر رفتہ رفتہ اسے تہہ و برہہ کر کے چھوڑتا ہے۔“ اسے شزا کے الفاظ یاد آ رہے تھے۔ وہ ایسی زندگی۔ وہ کیسے کھلونا بن گئی اور لوٹ گئی۔ اس نے کمزری سے ہار دیکھا۔

”خدا تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔“ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ نینگلوں آسمان پر سفید بادلوں کی کھوپیاں ادھر ادھر بکھری تھیں۔ پتھلا، شفاف، روشن صبح اب آہستہ آہستہ زوال کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سائے دگنے ہو رہے تھے۔ سورج کی روشنی بھی زوال پزیر ہو رہی تھی۔ اور گرد سفیدے کے لیے درخت تھے سیاہ کول تاریک سڑک سے ہوتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ بیو ایریا کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ملک منصور نے کل نما گھر کے سامنے جا کر گاڑی روکی اور اپنے بریف کس میں سے چابیاں نکال کر گیٹ کھولا۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ کسی ایک شے کے نہ ٹکرانے کی آواز تھی، نہ سانس لینے کی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر ساکت و جامد ہو گئی ہو اور محسوس نہ تھا۔ ہر شے بے جان اور مردہ لگ رہی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے لاؤنج میں داخل ہوا۔ دونوں نے بھرپور لگا ہوں سے مرد گرد دیکھا۔ ہر شے قرینے سے اپنی جگہ پر کھچی خوبصورت لگ رہی تھی۔

”آؤ، اپنے کمرے میں چلے ہیں۔“ وہ محبت سے بولا اور وہ خاموش روٹاٹ کے مانند اس کے ساتھ چلی گئی۔ اس نے اپنا کوٹ اندر کر صوفے پر پھینکا اور شوژا تار کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

”آج میں بہت تھک گیا ہوں۔“ وہ جھکے جھکے انداز میں بولا۔

”کیوں؟“

”بس کبھی کبھی اچانک ہی تھکاوٹ ہو جاتی ہے۔“

”کافی لاؤں کہ کوئلہ ڈرے؟“

”کافی لے آؤ اور سنو جلدی آنا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کافی لے کر آ گئی۔ خوبصورت چائیر کافی سیٹ سے قرینے سے کھڑے کو اس نے ٹھیک پر رکھا اور کافی پانے لگی۔ وہ کمرے کا کافی پانے لگی تھی۔ کافی پانے لگی۔

”تم نہیں پیو گی؟“

”میں بلیک پیو گی۔ آپ جانتے تو ہیں۔“

”اوہ آئی سی!“ دونوں کافی کے سپ لینے لگے۔ آجکات حیران تھی کہ اب وہ شادی کا ذکر بھی نہیں کر رہا تھا۔ اس نے خود بخود بات چھیڑی۔

”منصور! ہم شادی کب کریں گے؟“

”بہت جلد.....“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”کیا تم ابھی چاہتی ہو؟“

”نہیں، میں تو یونہی پوچھ رہی تھی۔“

”بے فکر ہوؤ اور تنگ امن ریلیشن کے لیے شادی ضرور کرنا ہوں ورنہ میری اپنی سادھ کو بھی خطرہ ہوتا ہے۔“ وہ ہنس کر بولا۔

”کیا مطلب؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”بھئی پلٹھکل انٹینس کوورنہ لوگ ہمیں جلسوں میں ہی نہ چھوڑیں۔ شادیاں کرنا ہماری مجبوری بن جاتا ہے۔ تم لوگوں کی بھی اور ہماری

بھی۔“ وہ تہہ تک کر بولا تو وہ دل سوس کر رہ گئی۔

”واقعی آج تو میں بہت تنگ گیا ہوں، خیند بھی آنے لگی۔“ وہ نائی کی ٹاٹ لوز کرتے بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں قہوڑا سا

ریٹ کر لوں پھر ہا پر چلیں گے۔“ وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ آہستہ آہستہ گہری خیند کی طرف سفر کر رہا تھا۔ اس نے بیڈر کا گیس

پرائنٹ آن کیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ لان میں چکر لگا رہی تھی۔ شام کا گھبراہٹ سا بیڈ آہستہ آہستہ دوپہر کی مدھم، سبے جان دھوپ اور اس کی روشنی کو

اپنے وجود میں سونے لگا تھا۔ وہ گہری سوچوں میں گم تھی اور ننگے پاؤں ادھر ادھر محو رہی تھی۔ ایک کے بعد دوسرا آنسو، جھری سی رواں ہو گئی۔ انسان

کے نکلنے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے۔ بس ایک پتھر کا قاصد..... لڑھکتے، غیر متوازن پتھر پر قدم رکھتے ہی انسان اسفل السالطین کے گہرے کھڈ میں جا

گرتا ہے اور پھر ساری زندگی پاتال کے اندھیروں اور گرداب میں پھنسا رہتا ہے۔ وہ احساسِ خامت کا شکار ہو رہی تھی۔

”یا خدایا! مجھے معاف کر دے۔ مجھ سے گناہ ہو گیا ہے۔ ایسا گناہ جو بہت کریم اور سوا کر دینے والا ہے۔ کیا تو مجھے معاف کرے گا۔“ وہ

گھاس پر دوڑا تو بیڈ پر آسان کی طرف ترچہ اٹھا کر دھا کرنے لگی۔ ”یہ ذمہ کی کیسے گزر پائے گی؟ میرا گناہ اور اس کا احساس مجھے کہیں بھی چھین نہیں

لیتے دے گا۔ ایسی اذیت، ایسا کرب اور ایسی جہنم تو میں نے کبھی بھی محسوس نہیں کی۔ میرا اندر تو جیسے الاؤ دین چکا ہے۔ ہر طرف آگ سی آگ ہے

جھلسا دینے والی، بھسم کر دینے والی۔

شام کا اندھیرا اب تاریکی میں تبدیل ہو چکا تھا۔ پردے گھر میں تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ تاریکی، گہرا سکوت اور گناہوں سے نصرت

وجودِ مطلق زوہ مکروہ چہرے..... اس نے سوچا اور اندھ کی طرف گئی۔ اسے وہ کرنا تھا جس کی وہ پلاننگ کر کے آئی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر لاؤنج کی

لائٹ آن کی اور کچن میں گئی۔ کینڈلر اور لائٹر لے کر وہ بیڈ روم کی طرف گئی۔ اندر گہری خاموشی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا تو معطر کن خوشبوؤں کے

جھونکوں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ چمک سی گئی۔ وہ تو گیس کا پھانٹ آن کر کے گئی تھی اور اب ہر طرف خوشبوئیں ہی خوشبوئیں تھیں۔ اسے سب کچھ

بکھاتا نے لگا۔ وہ جاگ رہا تھا اور شاید اسے آہ بڑھ بھی کر رہا تھا۔

”میں کبھی کبھی گولیاں نہیں کھیتی۔“ اسے منصور کے کہے ہوئے الفاظ یاد آنے لگے۔ وہ ہی بے وقوف تھی جو اسے یوں ڈانچ دینے لگی تھی۔

وہ تو عورت کی رگ رگ اور اس کی سرشت سے اچھی طرح واقف تھا۔ ان کے کمر و لمبوں کی ڈیمائز وہ ان کے انتہائی لمبوں کی سوچوں اور ان کے ری

ایکشن سے شاسا تھا۔ جس شخص نے ساری ذمہ کی اس کھلونے سے اچھی طرح جی بہلایا ہو۔ اس کو جی بھر کر توڑا ہو۔ اس کو کٹی ہار مسلا ہو، کٹی ہار جوڑا

ہو۔ ریزہ ریزہ کر کے پھر اس کو ٹوٹا و جوڑا ہو۔ اس میں اپنی سانسوں سے روح پھونکی ہو اور اسے ہر بار نیا روپ دیا ہو کیا وہ اس کی نفسیات سے واقف

نہ ہوگا۔ وہ کس قدر بے وقوف تھی۔ اس نے آہ بھری اور اپنی پلاننگ پر خود ہی لعن طعن کرنے لگی۔

”تم کبھی بھی اس کی سوچ تک نہیں پہنچ سکتیں۔ وہ مگر مجھ ہے اور تم مجھی رنگ برنگی پھیلیوں کو اس کا ترنوالہ بننے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ آئیکھ اس کے لیے بڑا جال بچانا پڑے گا۔ آگ کا کھیل کھیلنا ہوگا اور شاید خود بھی اس میں کودنا ہوگا۔“ وہ تاریکی میں کھڑی سوچتی رہی اور لائٹ آن کیا۔ ملک منصور نے ایک دم اسے پیچھے سے آکر اپنے مضبوط بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔

”سوئٹ ہارٹ! ابھی تم بہت نا تجربہ کار ہو۔“ وہ اسے مضبوطی سے پکڑتے ہوئے بولا۔
”کیا مطلب؟“ وہ چونک کر اس سے علیحدہ ہوتے ہوئے بولی۔

”بھئی اس گھر کی چیزوں سے واقفیت حاصل کرنے میں ابھی تھوڑا سا وقت تو لگے گا نا۔ تم شاید بیئر کا پوائنٹ کھلا چھوڑ گئی تھیں۔“ اس نے چہمت سے نکلنے کی صورت طے کرکے کھڑکوں کو آن کرتے ہوئے کہا۔

”اور، آئی ایم سوری الا سٹر نہیں مل رہا تھا۔ شاید بھول گئی۔ بس طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے میں بھول ہی گئی۔“
”کوئی بات نہیں، وہ تو ایک دم اسل آئی تو پھر میں نے بند کیا۔ آئندہ احتیاط کرنا۔ کبھی کبھی ایسی نا تجربہ کاری زندگی کو بھی شعلوں کی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا اور وہ ٹیبل سی کیئر پر جھلانے لگی۔

”کیا کوئی خاص بات ہے؟“ اس نے کیئر لٹروشن کرتی آئیکھ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
”بس یونہی دل چاہ رہا تھا اس تہائی میں ان کی روشنی میں چند لمبے چیلنے کو۔“

”واؤ گریٹ! آج تو تم بہت غیر معمولی چیزوں کے بارے میں سوچ رہی ہو۔“ اس کے لہجے میں چمپے شک اور طنز کو وہ محسوس کیے بغیر نہ ہو سکی۔
”کھانا کھانے باہر نہ چلیں۔“ ملک منصور نے رائے مانگی۔

”نہیں، اچھے دن ہو گئے ہو پھر میں کھاتے ہوئے۔ آج گھر میں کھانا کھائیں گے۔“
”ٹھیک ہے پھر باہر سے لے آتے ہیں اور ادھر ہی کھا لیتے ہیں۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“

”چلو پھر چلتے ہیں۔“

”اوکے!“ وہ کیئر لٹر پر پھونک مارتے ہوئے بولی۔ کھانا ٹیک کر داکہ دوواہیں آئے تو اس نے شیشے کی وسیع و عریض ڈائننگ ٹیبل پر کھانا چن دیا، کیئر لٹر جھلانیں۔ ملک منصور نے ڈائننگ روم کی ایک جھلک کے نیچے لگا ٹیبل آن کیا۔ جھلک خود بخود پیچھے ہٹ گئی اور اس کے پیچھے سے ایک حلیف نمودار ہوئی جس میں رنگ برنگی خوبصورت مختلف انواع و اقسام کی شیشے کی بوتلیں قریب سے جھکی تھیں۔ آئیکھ نے حیرانی سے دیکھا۔ اس نے آگے بڑھ کر شیشوں کی ڈالی اور گلاس میں ڈال کر ٹیبل کو پھر دیا یا پیننگ اپنی جگہ پتا گئی۔

”یہ کیا؟“ آئیکھ نے حیرانی سے قصد پتہ کرنا چاہی۔

”بھئی شیشوں ہے اور کیا ہے، کیا تم لوگ؟“ وہ ٹیبل لہجے میں بولا۔

”نہیں۔“ اس نے فکرت سے لہجہ میں جواب دیا۔

کھانا کھانے کے بعد اس نے شیمین پی۔ اس کی آنکھوں میں اور لہجہ میں سرد اور سستی چھانے لگی۔ وہ مدہوش ہو رہا تھا اور وہ بے ہوش ہونے والی تھی۔ اسے اس شخص سے خوف آنے لگا تھا۔ اس کا ایک اور روپ سامنے آ رہا تھا ایک غاصب لیبرے کا۔

”آئیٹھک! جلدی کرے میں آؤ۔ میں تمہارا شہر ہوں۔“ دو قدرے حکمانہ لہجہ میں بولا۔ آئیٹھک نے دیکھا وہ مضبوط اعصاب کا آدمی تھا۔ نہ وہ لڑکھارہ تھا نہ بہک رہا تھا۔ آئیٹھک نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ وہ جا چکا تھا۔ آنسو شیشے کی ٹیبل پر ٹپ ٹپ کر رہا تھا اور پھسلنے لگے اور مخصوص زاویے بنانے لگے۔ اس نے ٹیبل میں اپنا ٹکس دیکھا۔ اس کا چہرہ دگنا لگ رہا تھا، بگڑا ہوا، مسخ شدہ، پھٹکا زدہ اور ملحوں زدہ۔ وہ کتنی ہی دیر اُدھر بیٹھی سوچتی رہی۔ اٹھ کر دواش روم میں چلی گئی اور وارڈ روپ سے شلواریں اور چادر نکالی۔ ملک منصور بیڑ پر بیٹھا سارے پینے میں مصروف تھا اور ساتھ ساتھ موبائل پر کسی سے بات بھی کر رہا تھا۔ اس نے کن آنکھیں سے سوٹ کی طرف دیکھا اور ٹیبل میں سر ہلایا اور وائٹ فرلر والی مین سی ٹائٹی کی طرف اشارہ کیا۔ آئیٹھک نے اشارے سے کچھ سمجھا یا اور دونوں ڈر بسولے کر باہر نکل گئی۔ دوسرے کمرے میں جا کر اس نے سوٹ پہنا اور جانماز پر بیٹھ کر سجدے میں سر رکھ کر رونے لگی۔ اتنا روئی کہ شاید پیدونے کا آخری دن تھا۔ آنکھیں اور دل پھٹنے کو تھے۔ وہ کوئی دعا نہیں کر رہی تھی۔ اسے زندگی میں اب کچھ بھی نہیں چاہیے تھا۔ سب کچھ حاصل ہو کر اب لا حاصل میں بدل چکا تھا۔ ہر شے اپنا مفہوم کھو چکی تھی۔ بس وہ رو رہی تھی، گڑ گڑا رہی تھی۔

”بس تو مجھے معاف کر دے اور کچھ نہیں چاہیے۔ مجھ سے ناراض نہ ہونا، میں بہک گئی اور مادے سے بہک گئی تھی۔ اب میرے پاس کوئی راستہ نہیں رہا۔ میری مدد کر، بس ایک دفعہ، آخری بار اس کے بعد میں تجھ سے کبھی کچھ نہیں مانگوں گی۔“ اس نے روتے ہوئے آنسو پونچھے اور جانماز قرینے سے دے کر کسی پر رکھی اور تائٹی پہن لی۔ اس سوٹ کو ختم تھا لیٹ کر اس میں ایک بوتل رکھی اور کمرے میں چلی گئی۔

”کہاں رہ گئی تھیں، میں تو پریشان ہو رہا تھا۔“ اس نے موبائل بند کرتے ہوئے کہا۔ ”اوہ، فریٹش ہو رہی تھیں۔“ اس نے اسے تائٹی میں لمبوس دیکھ کر کہا۔ آئیٹھک نے خاموشی سے ختم تھا سوٹ شاپنگ بیگ میں ڈال کر سائیڈ ٹیبل کے ساتھ بے خیالی میں رکھنا چاہا تا کہ اسے شک نہ ہو اور اس کے پاس آگئی۔

”اس کو ادھر کیوں رکھ دیا؟“ ملک منصور نے مشکوک لہجہ میں پوچھا۔

”وہ تو بڑا سا گندہ ہو گیا ہے۔“

”تو دواش روم میں رکھ دیتیں۔“

”اوہ، آئی ایم سوری!“ وہ اٹھ کر جانے لگی۔

”چلو رہنے دو صبح اٹھا لیتا۔“ اس نے کہا۔

”منصور! کیا آپ نے شزا کو بتا دیا کہ ہم شادی کر رہے ہیں؟“ وہ کسی نہ کسی طرح شزا کے بارے میں جاننے کی خواہش تھی۔

”ہاں، ہاں مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“ اس نے بنوراس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”یونہی میرے ذہن میں خیال آ رہا تھا۔“

”اس وقت کچھ مت سوچ۔ صرف اپنے اور میرے بارے میں سوچ۔ اس کے علاوہ ہر سوچ کو ذہن سے مٹا دو۔ اس خوبصورت ماحول میں صرف ہم دونوں ہیں۔ کسی تیسرے کو دستک بھی نہیں دینی چاہیے۔“ وہ رفتہ رفتہ اسے اپنے حصار میں لینے لگا اور وہ ہر آن گم ہوتی گئی۔ اندر ہی اندر روتی رہی اور سسکتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں جیسے ریت بھر گئی تھی۔ وہ شدید جھین محسوس کر رہی تھی۔ اس کا مطلق شنگ ہو رہا تھا۔ وہ نیند کی واوی میں کھو رہا تھا۔ اس نے اٹھنا چاہا مگر اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک لیا۔ وہ سانس روک کے لیٹی رہی۔ کافی دیر بعد اس نے چپک کیا وہ سوچا تھا۔ اس نے لیپ آف کیا اور بیڈ سے اٹھ کر اندازے سے سیڑ کی طرف گئی اور اس کا پورا تھک پوری قوت سے کھول دیا۔ گربہ پانی سے ٹوٹتی ہوئی وہ اس کی سائیل پر آئی اور اس کے اوپر بوتل آٹریل دی۔ دھڑپنے لگا، پیچھے چلانے لگا، بندیان کہنے لگا۔ اس نے جلدی سے لائٹر آن کیا اور اس کی روشنی میں اس کو ترچے ہوئے دیکھا۔

”ملک منصور اتم ہمیشہ عورتوں کے ساتھ کھیلنے آئے ہو اور تم نے مجھے بھی تباہ کرنا چاہا۔ آج میں تمہیں تڑپا ہوا دیکھنا چاہتی تھی۔ اب تمہارا مسخ شدہ چہرہ دیکھ کر کوئی بھی نہیں پہچانے گا کہ یہ تم ہو۔“ تیزاب کی بوتل نیچے کارپٹ پر اونٹ سے منہ پڑی تھی اور قطرہ قطرہ تیزاب کارپٹ میں جذب ہو رہا تھا۔ وہ بیچ رہا تھا۔ دو کو نکار رہا تھا۔ اس کا گالیاں بک رہا تھا مگر ہر طرف گہرا سکوت تھا جیسے وہ قبر میں چلا رہا ہو، کوئی بھی اس کی آواز نہیں سن رہا تھا۔ اس کا گہرا ہر سے پرسکون لگ رہا تھا۔ چاند اور ستاروں کی روشنی میں جھلکنا تا خوبصورت عمل..... ملک منصور نے لپک کر اس پر حملہ کرنا چاہا ایک دم جلتا لائٹر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے پڑی تیزاب کی بوتل پر گر گیا۔ گیس کی اسمبل نے بھی سارے غلا کو پڑ کر رکھا تھا۔ لائٹر گرا اور ایک دم آگ لگزی۔ ہر طرف فٹلی فٹلی تھے۔ آگ نے بھاگنا چاہا مگر ملک منصور نے اس کی ٹانگی کا کوتا پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ دونوں گھم گھما ہو گئے اور دونوں کو آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کمرے میں دھواں کے خوبصورت دھڑپنے آگ کے لیے بے ستون بن گئے تھے۔ ہر شے آگ میں بھڑک رہی تھی۔ انسان، ہڈیاں، لوہا، تاجا، لکڑی، پتھر سب اس دھواں کا حصہ بن گئے۔ دونوں چلا رہے تھے، چنچ رہے تھے۔ چاروں طرف آگ پھیلی تھی، اوپر بھی نیچے بھی اور ارد گرد بھی۔ ان کے پیچھے چنگھاڑتے دھواں کو خاستر ہو رہے تھے۔

اس کے خوبصورت بلوٹڑ ہال، نازک مرمریں بدن، آتھیں حسن، ذہانت، لطافت، لافیت سب کچھ آگ کی نذر ہو رہا تھا اور وہ لے شنگ، جڑم و جود، شاطر، فطین الذہن اپنی ساری مکارانہ چالوں اور پلاننگ سمیت آگ میں جل کر خاک ہو رہا تھا۔ سالوں کی پلاننگ اور منصوبے بنانے والا چند ثانیوں میں راکھ ہو رہا تھا۔ چاروں طرف اونچی اونچی دیواروں سے طمرہ جیسی آگ لپٹ رہی تھی۔

خدا کی ہز کاٹی ہوئی آگ کی طرح جودلوں پر چالنے کی اور وہ اس میں بند کر دیے جائیں گے یعنی آگ کے لیے بے ستونوں میں..... انہیں آگ کے لباس پہنا دیے گئے تھے اور آگ کی زنجیریں۔ ان کے چہرے جھلس رہے تھے۔ دل خاستر ہو رہے تھے۔ بدن تڑپ رہے تھے اور رومیں جیسے آگ کی تپش سے راؤ فرار چا رہی تھیں اور اس نفس سے پرواز کو بے تاب تھیں۔ وہ پیچھے رہے، بڑپتے رہے اور راکھ ہو گئے۔ کب آگ ٹھنڈی ہوئی۔ کب کسی نے پولیس کو بلا دیا، خوبصورت عمل راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا۔ بلیک دی ٹی آئی سے صرف چند چلے ہوئے کاغذ ملے تھے جن سے

بڑی مشکل سے کینوں کی شناخت ہوئی تھی۔ نہ وجود رہے تھے نہ آثار، نہ شناخت باقی رہی تھی نہ پہچان۔ راکھ کے ذرے ہوا میں بکھر چکے تھے۔ نہ نماز جنازہ ہوئی نہ کسی نے دعا پڑھی۔ بے شک انسان شمارے میں ہے۔ نہ کوئی لب دعا کے لیے بل سکے نہ کوئی ہاتھ آسمان کی طرف اٹھ سکے۔ ان کی پہچان ہی مشکوک تھی۔ کوئی تصدیق کیا کرتا۔

شرانے خبر اخبار میں پڑھی تو جیسے سکون کا گہرا سانس لیا۔ اس شخص سے ہمدانی کا اسے نہ دکھ ہوا تھا نہ لال۔ اسے تو اس کے پردہ گارنے پکڑا تھا جس کی پکڑ بڑی شدید ہے اور جب وہ اچانک پکڑتا ہے تو انسان بوکھلا جاتا ہے۔ اسے کس نے اٹھایا۔ وہ تو گہری نیند میں تھی۔ شاکل تو بے خبر تھی۔ اسے رشتوں کی ضرورت نہ رہی تھی اور نہ ہی کسی کے جانے کا انھوں اس کے لیے باپ کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور وہ اس سے بے خبر رہی۔

شخص اخبار پڑھ کر بہت روئی تھی مگر اس نے بھی کوئی دعا نہ کی اسے بچپن یاد آنے لگا جب وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ بھر کسی اور سے کرنے لگا تو انھیں بھولتا گیا اور رفتہ رفتہ اس کی جان کا دشمن بن گیا۔ اس کی گھات میں بیٹھا رہا۔ اب اسے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ آزاد ہو گئی تھی ہر خوف سے، ہر خطرے سے۔

حیدر نے اخبار پڑھا تو گہری سانس لی اور اخبار آ پا کی طرف بڑھا دیا۔ آپا نے خبر پڑھی اور چپ ہو گئیں۔

میر نے فون کیا۔ وہ بہت دور ہوا تھا۔ جلد از جلد گھر آنا چاہو رہا تھا اور شرانے سے لینے جا رہی تھی۔

آنکھ کے گرد والوں کو اطلاع دے دی گئی تھی مگر ابھی تک وہ امید و ہم کی کشمی میں سوار تھے۔ وہ یقین نہیں کر رہے تھے اب اس کی چند چیزیں جائے دھرم سے ملیں گی۔ اس کی ماما کا بیٹل کالا کٹ جس پر آنکھ لکھا تھا جو انھوں نے اسے تختے میں دیا تھا۔ اس کی آگ میں جھلسی ہوئی سیاہ انگلی گھبرا کر نہ تو تابوت میں ساسکی نہ قبر کا حصہ بن سکی۔ نہ جانے ہوا سے کہاں لے لڑی اور کس کس کے قدموں سے روندی گئی۔

”بے شک تو مجھے روند ڈال، خاک کر دے، میرے تن بدن کو جلا دے مگر مجھے معاف کر دے۔“ آپاں بھرتی ہوا سسکی راکھ کو ادھر سے ادھر اڑا رہی تھی۔ اس کا بھائی آیا اور ناکام لوٹ رہا تھا۔ نہ وجود ہاتھ آیا تھا نہ آثار۔ وہ بچے انگلیوں اور دھماگوں کے ساتھ اس کی مغفرت کی دعا کرتے ہوئے واپس لوٹ گیا۔

”تمہاری دنیا کی زندگی تو بس ایک دن کی تھی۔ دنیا کی زندگی تو بس کھیل تھا تھی۔“ کھیل ختم ہو چکا تھا اور دنیا محو تھا تھی۔ کردار جا چکے تھے اور دنیا کا اسٹیج خالی تھا۔ منظر گاہیں پہلے کرداروں کو رفتہ رفتہ بھلا رہی تھیں۔ وہ ذہن سے محو ہو رہے تھے۔ ماضی کا تاریک حصہ بن رہے تھے۔ زمانے کا فرعون وقت کے میق سمندر میں حصہ پار یہ بننے کے لیے غوطہ زن تھا۔



”یہ ولیم کا گلاس ہے اور مجھے اس کے گلاس میں پانی مت دیا کرو۔“ سسٹر سائرہ لاؤنچ میں بیٹھی انھیں پر برس رہی تھی۔ ولیم اپنے کمرے سے وہیل چیئر پر کل رہا تھا۔ یہ اتفاق اس کی سماعتوں سے گمراہ تو وہ ہیں رک گیا۔ دکھ کا شدید احساس اس کے دگ دپے میں سرایت کر گیا۔

”میڈم! یہ ان کا گلاس نہیں۔ ان کے برتن تو تیلید ہیں۔“ انھیں نے صفائی دی۔

”نہیں، یہ دیکھو۔ میں نے مار کر سے اس کے گھاس اور دوسرے برتنوں پر نشان لگا دیے ہیں۔ وہ مسلمان نہیں اس لیے اس کے برتن طہرہ رکھا کرو۔“ وہ نگلی سے بولی۔ اس کا دل کربہی کر رہی ہو رہا تھا۔ یہ پہلی بار نہیں ہو رہا تھا۔ اسے بار بار ایسے رویوں اور نظروں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مٹھکوں لہجے، جس سنا نہ سہا مہنگا ہیں، مقررہ جملے، سب کچھ اتنا تکلیف دہ تھا کہ وہ اندر ہی اندر بہت زیادہ بکھر چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ اپنے آپ کو نجس اور ناپاک تصور کر رہا تھا۔

”بھئی ہم تو نماز پڑھنے والے لوگ ہیں، اس طرح کی ناپاکیوں سے ہمیں بچاؤ۔“ سسر سائرہ زبان کی بہت تلخ عورت تھی۔ وہ افضل کو ڈانٹ رہی تھی جو گلاس ٹرے میں رکھ کر واپس جا رہا تھا۔ اسی لمحے جسم آ پا کرے سے باہر آئیں۔ انھوں نے بھی اس کی باتیں سن لی تھیں۔ دلیم دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔

”کیا بات ہے بھئی، کس بات پر ناراض ہو رہی ہو؟“ آپا نے پوچھا۔

”ہونا کیا ہے جی افضل، ولیم صاحب کے برتنوں میں مجھے کھانے پینے کو دے تو میں ناراض نہیں ہوں گی تو کیا ہوگا؟“ وہ گڑبڑ بولی۔

”کیوں، اس کے برتنوں کو کیا ہوا ہے؟“

”جیسے آپ کو تو معلوم ہی نہیں کہ وہ کون کون ہے۔“

”اور کون کون کے ساتھ کھانا پینا جاتا ہے، یہ قرآن کا فیصلہ ہے۔“ آپا نے بات کاٹ کر کہا۔

”لیکن احتیاط تو کرنی چاہیے۔ ہم لوگ نماز، روزے والے لوگ ہیں۔ ایسی ناپاک باتیں برداشت نہیں کر سکتے۔“

”خدا کے لیے اتنی تنگ نظر مت بنیں۔ آپ تو بڑی لکھی ہیں اور ایسی باتیں کر رہی ہیں۔ ہم کیا اور ہماری نمازیں کیا..... ہم جیسے لوگوں نے تو مذہب کو بدنام کر کے رکھ دیا ہے اسی لیے ایک مشہور مسلم ادیب نے خود ہمارے بارے میں ہی لکھا ہے کہ اسلام دنیا کا بہترین مذہب ہے مگر اس کے ماننے والے بدترین لوگ ہیں۔“ آپا نگلی سے بولیں۔

”اب ایسی بھی بات نہیں، اسلام طہارت اور پاکیزگی کا حکم دیتا ہے۔“

”لیکن دلوں کو توڑنے کا نہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کا ایک تلخ جملہ دوسروں کے لیے کس قدر رونی افایت کا باعث بن سکتا ہے اور خدا تو کہتا ہے کہ وہ تمہاری صورتوں کو نہیں تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔ آپ ایسی گفتگو سے پرہیز کیا کریں اور..... خیر چھوڑیں۔“ آپا نے ناراضی سے کہا۔

”لیک ہے جی، میں یہ تو کئی ہی چھوڑ دیتی ہوں۔ میں کافروں کے گھر تو کئی نہیں کر سکتی۔ نہ پاکی کا پاناہ پلیدی کا۔“ وہ پھر نگلی سے بولی۔

”خدا کے لیے آپ ایسی گفتگو سے کیا چاہتی ہیں۔ آپ اپنی سوچ کو نہیں بدلیں گی مگر تو کئی چھوڑ دیں گی۔ کیا آپ کے اس عمل سے خدا

خوش ہوگا اور آپ کا تو شعبہ ہی انسانیت کی خدمت ہے۔ آپ تو مذہب اور رنگ کی تیرہ سے آزاد ہو کر انسانیت کی خدمت کے لیے میدان میں آئی ہیں۔“ آپا نے لامتناہی سے سمجھانے کی کوشش کی۔

”نہیں جی، مجھے کوئی انسانیت کی خدمت کا شوق نہیں۔ یہ میری مجبوری ہے۔ میرا شو ہر نفی ہے اور مجھے اپنے بچے پالنے ہیں۔ اللہ مالک

ہے ایک در بند، سو رکھنے اور خدا خوش ہونے میں اول تو مطمئن ہوگا۔" وہ غصے سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"آپ بیٹھیے اور سکون سے میری بات سنئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مسجد نبوی ﷺ کی اسلام میں کیا اہمیت ہے؟"

"ہاں، کیوں نہیں، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ کالی کالی والے ﷺ کے بعد اس بزرگ گنبد کے سوا ہمارا اور ہے کون؟" وہ قدرے عقیدت

سے بولی۔

"اگر آپ کو ان سے اتنی محبت ہے تو آپ جانتی ہیں کہ ایک دفعہ کچھ میرائی مہائے کے لیے مسجد نبوی ﷺ میں آئے۔ جب ان کی عبادت کا وقت ہوا تو انھوں نے اپنے قبلے کی طرف رخ کر کے اسی مسجد میں عبادت کی اور جب ہماری نماز کا وقت ہوا تو ہمارے نبی ﷺ نے اپنے قبلے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی۔ انھوں نے تو یہ نہیں فرمایا کہ ٹھوہاں سے۔ ہمارے وجود سے ہماری مسجد ناپاک ہوتی ہے۔ ایسے نبی ﷺ کے ماننے والوں کی ایسی چھوٹی سوچ نہیں ہونی چاہیے۔ وہ تو کسی کی طرف غصے کی لٹاؤ سے نہیں دیکھتے تھے اور آپ ایسی باتیں کر رہی ہیں۔" آپانے پھر سمجھانے کی کوشش کی۔

"وہ جی بڑے دل اور عظمتوں والے لوگ تھے۔ ہم گنبد اس قابل کہاں۔ ہم تو ان کے قدموں کی خاک ٹھہرے۔ بس میرا دل ہی نہیں مانتا اس گھر میں کام کرنے کے لیے آپ کسی کہ جن فرس کا بندوبست کر لیں۔ بڑی مل جاتی ہیں، میں جا رہی ہوں اور حیدر صاحب کو کہہ دیجیے گا میرا حساب کر دیں خدا حافظ، کہا سنا معاف کر دیں۔" وہ پرس اٹھاتی باہر نکل گئی اور آپا سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ دہم کا دل ٹوٹ چکا تھا مگر آپا کی باتوں سے نہ جانے اسے کیا تقویت ملی تھی کہ وہ ان کی طرف آ گیا۔ آپانے اسے دیکھا تو پیار سے مسکرائیں اور محبت سے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

"آئی! مجھے ہاتھ لگانے سے آپ ناپاک تو نہیں ہوئیں؟" اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

"نہیں بیٹا! ایسا سوچتے بھی نہیں۔ جو لوگ ایسا سوچتے ہیں وہ بہت چھوٹے ذہن کے لوگ ہوتے ہیں اور چھوٹے ذہن کے لوگ تو ہر جگہ، ہر ملک اور ہر مذہب میں ہوتے ہیں۔ یہ لوگ مجھے کیا ہوا ہے کہ میں اپنے جیسے کو پیار نہ کروں؟" انھوں نے اٹھ کر اس کا ہاتھ چومے اور محبت سے ساتھ لگا لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

"بے خوف! تم دل کیوں چھوٹا کر رہے ہو۔ ہم سب کو تم بہت عزیز ہو۔" آپانے اس کا ہاتھ سہلانے ہوئے کہا۔

"تو پھر ہر کوئی مجھے کیوں ایسی نظروں سے دیکھتا ہے جیسے میں نے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ ہر ایک کا پہلا سوال یہی کیوں ہوتا ہے کہ کیا میں کر چکی ہوں، کیا کر چکن خدا کے بندے نہیں؟"

"ہیں کیوں نہیں بلکہ ہمارے قرآن میں تو ان کا ذکر بڑی محبت سے آیا ہے کہ دوسرے لوگوں کی نسبت یہ ہمارے زیادہ قریب ہیں۔ یہ تو ہم لوگ ہیں جو خود ہی ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں میں پڑ جاتے ہیں۔ رہی تمہارے بارے میں جاننے کی بات تو جب تم سے ایسا پوچھا جاتا ہے تو حیرانی تم پر نہیں تمہاری ماں پر ہوتی ہے کہ اس نے کیا کیا۔ تم سوال نہیں بننے بلکہ سوال تو تمہاری ماں بنتی ہے۔ تم یونہی پریشان نہ ہو۔"

"آئی! شفق نے مجھے چٹا پھرتا گناہ کہا تھا۔" اسے بہت دنوں بعد کوئی محرم راز ملا تھا اور اب وہ اپنا دل کھول کر ان کے سامنے رکھ رہا تھا۔

”اچھا اس نے ایسا کہا۔ اصل میں وہ تمہاری ہمارے بہت ناراض ہے اس لیے ایسا کہا ہوگا اور بہت غلط کہا ہے۔ میں ضرور اسے ڈانٹوں گی۔“ وہ خشکی سے بولی۔

”نہیں رہنے دیں۔“ وہ مصحومیت سے بولا۔

”اور یہ تمہاری ناگوں کو کیا ہوا ہے؟“

”ایکسڈنٹ۔۔۔۔۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”اور آئی ایم سوری اللہ آرام دے گا۔“

”لیکن قادر تو کہتے ہیں کہ جب خدا کسی سے ناراض ہوتا ہے تو ایسے ہی سزا دیتا ہے۔“ وہ بائوس کن لہجے میں بولا۔

”بہت بری بات ہے، نہ جانے انھوں نے ایسا کیوں کہا ہے۔ دیکھو اللہ کو سب سے پیارے نبی ہوتے ہیں اور سب سے زیادہ تکلیفیں بھی انہی کو دی گئیں اور جس کو ایک تکلیف پہنچتی ہے اللہ اس کی دس برائیاں معاف فرماتا ہے۔ وہ تو اپنے بندوں سے بہت بہت پیار کرنے والا ہے اتنی محبت کہ کوئی کسی سے نہیں کر سکتا اب تم اپنے قادر کو دیکھو اور سسر سارہ کو۔ ان کی سوچوں میں کیا فرق ہے اور یہ دونوں کتنے اہم شعبوں سے وابستہ ہیں ایک روحانی سیما اور ایک جسمانی۔۔۔۔۔ خدا کو وہی پاتا ہے جو اس سے کچی محبت کرتا ہے چاہے وہ کوئی فقیر ہو یا ان پڑھ مزدور یا پھر کوئی عالم، پیر اور سب کو اسی نے کیا ہے۔“ تبسم آپ نے اتنی محبت سے اس کو سمجھایا کہ ایک دم اس کے اعد سے دکھ اور غم کے بادل چھٹنے لگے۔ اسے ایک روحانی خوشی سی ملنے لگی۔ اسے دنوں سے اس کا اعدہ شہر عاتشوار کا شکار ہو چکا تھا۔ اب شہیدم عمارت اپنی واضح شکل میں پھر سے نمودار ہونے لگی۔ اس کے دل سے بوجھ کم ہونے لگا۔ وہ خدا جو بہت دنوں سے اس سے دور جا چکا تھا، ایک دم اسے اپنے بہت قریب محسوس ہوا۔

”آئی! کیا گاڑوا تھی مجھ سے ناراض نہیں؟“ وہ تصدیق کرتا چاہا رہا تھا۔

”نہیں بیٹا، بالکل نہیں۔ وہ کیوں اپنے بندوں سے ناراض ہوگا اور تم نے کیا گناہ کیا ہے جو تم لوں پوچھ رہے ہو۔“

”میں چرچ جرائن کرنے والا تھا کہ ماما کی طبیعت خراب ہوگئی اور ان دنوں مجھے ایک۔۔۔۔۔ اور کتاب اینڈ کرنا تھی جو میں نہ کر سکا۔ قادر مجھ سے ناراض ہو گئے۔ وہ مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے اور پھر میرا ایکسڈنٹ ہو گیا اس لیے انھوں نے ایسا کہا۔“

”تم اپنے ذہن کو بالکل صاف رکھو۔ خدا ان باتوں سے بالکل ناراض نہیں ہوتا۔ وہ تو کہتا ہے کہ زمین و آسمان تمہارے گناہوں سے بھرے ہوں تو بے کر کے میری طرف لوٹو تو میں سب کچھ معاف کر دوں گا۔“

”کیا واقعی آئی؟“ اس کی آنکھیں مسرت سے چمکنے لگیں۔

”ہاں، کیوں نہیں، ہماری کتاب میں تو بار بار یہی ذکر ہے کہ وہ بہت معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ تم ایسی بات سوچنا بھی

مت۔ وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے اور تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے انشاء اللہ اور یہ تکلیفیں تو انسان کی آزمائشیں ہوتی ہیں۔“

”تو کیا ماما کی بھی آزمائش ہے؟“

”ہاں بالکل! وہ شاید اس کی ساری تکفیس اسی دنیا میں ختم کر دینا چاہتا ہے۔“

”آئی! کیا ممانے زندگی میں بہت گناہ کیے ہیں؟“

”یہ تمہیں کس نے کہا؟“ آپا کو اس کا یہ سوال قدرے برا لگا۔

”میں نے ممانے سنا تھا اور شفیق بھی کچھ ایسا ذکر کر رہی تھی۔“

”وہ بہت ناانسنس ہے۔ ہاں اس نے ناانسلم سے شادی کر کے گناہ کیا ہے۔ ہمارے مذہب میں یہ جائز نہیں۔“

”کیوں جائز نہیں۔ ایک عورت کسی مرد کو پسند کرے تو وہ اس سے شادی کیوں نہیں کر سکتی۔ شادی کرنے کا حق تو ہر ایک کو ہے کہ وہ اپنی

پسند سے شادی کرے۔ اس میں کیا برائی ہے جب دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہوں۔“ اس کی نظروں کے سامنے نور مجوم گئی جو ایک دوسرے

سے محبت تو کرتے تھے مگر شادی کا ذکر کبھی نہیں سمجھتا تھا۔ وہ خود تو چرچ جو اُن کرنے کی وجہ سے خاموش تھا مگر حالات بدلنے کے بعد بھی نور نے کبھی

اس کا ذکر نہیں کیا تھا اور یہ بات اکثر اسے حیران بھی کرتی تھی۔ شادی کا مقصد نسل انسانی کی بڑھاپا ہے اس لیے فیصلہ سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔

”اسلام جذباتی فیصلوں کے حق میں نہیں۔ یہ محبت کی شادیاں وقتی طور پر تو بہت اچھی لگتی ہیں لیکن یہ آئندہ نسلوں کے لیے بہت خطرناک

ہوتی ہیں جیسے اب تم منتظر رہتے ہو۔ پریشان سوچوں میں گم کہ تمہارا انجو چرچ لیکن کیا ہوگا۔ باپ، اولاد اور بچی دونوں کا کفیل ہوتا ہے۔ وہ دونوں کو

مجبور کر سکتا ہے کہ وہ اس کے مذہب یا اصولوں پر رہیں اس لیے ہمارے مذہب میں مردوں کو حق ہے کہ وہ اہل کتاب عورتوں سے شادی کر لیں لیکن

پھر بھی بجز یہی ہے کہ وہ ہم مذہب میں کریں جبکہ عورت کو اس لیے منع کیا گیا ہے کہ وہ غیر مسلم شوہر کی وجہ سے مجبور ہوگی اور اپنی اولاد کو اپنے عقیدے

کے مطابق نہیں پال سکے گی اور ویسے بھی آج کل کے دور میں جہاں ڈپریشن بہت بڑھ رہا ہے، ایسے تصادم بچوں کے ذہنوں کو شدید مضطرب کر دیتے

ہیں اور وہ اکثر نفسیاتی مریض بن جاتے ہیں۔ ہر مذہب کی اپنی آئیڈیالوجی ہوتی ہے۔ جو ہمارے ہاں حلال جان کے ہاں حرام ہے ایسے تصادم

ادہاں کو شدید زک پہنچاتے ہیں اس لیے اللہ نے آقا میں ہی ایسا کرنے سے منع کیا ہے اور اللہ کا کام تو انسان کو بچانا ہے۔ پورے قرآن کا موضوع

ہی انسان ہے۔ وہ انسان کی مجبور یوں اور نفس کی خواہشوں کو سمجھتا ہے، پھر سمجھاتا ہے، کہیں محبت سے، کہیں ڈانٹ کر، ڈرا کر۔“ آپا نے اسے محبت

سے سمجھایا۔

”ڈانٹ کر کیوں؟“

”کیوں، ممانے کبھی نہیں ڈانٹیں جب غصے میں آتی ہیں۔ کیا ان کی ڈانٹ بری لگتی ہے۔“

”نہیں، وہ محبت بھی تو بہت کرتی ہیں۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”اللہ ممانے بھی کہیں زیادہ محبت کرتا ہے۔“

”آئی! سب لوگ آپ جیسے کیوں نہیں؟“ وہ محبت بھرے لہجے میں بولا۔

”اچھا کیونکہ سارے نیچے ولیم جیسے کیوٹ بھی تو نہیں۔“ انھوں نے محبت سے اس کے سر پر چھت ماری۔

”ٹھیک پڑ آئی!“

”کس بات کا ٹھیک پڑا، اچھا تاؤ کیا کھاؤ گے۔ میں اپنے بیٹے کے لیے خود پکاؤں گی۔“

”سیٹھ وچرا اور فریج فرائز۔“

”وائے ناٹ شیڈرا“ وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

”آئی! آپ اپنے بچوں سے بھی ایسے ہی پیار کرتی ہیں۔“

”ہاں بہت زیادہ، تمہارے جتنا۔“

”اور وہ؟“

”وہ بھی بہت زیادہ، میری بیٹی ایسا اسلام آباد میں ڈاکٹر ہے۔ اطیر آری میں کچن میں ہے اور فیضی ایف ایف ایس کی میں ہے اور پڑی میں پڑھتا ہے۔ سب لوگ ہم دونوں کو مجھے اور تمہارے انکل کو بہت مس کرتے ہیں۔ ہم سب لوگ فریج کی طرح رہتے ہیں۔ جب وہ گمراہ آتے ہیں تو کبھی سب کرکٹ کھیل رہے ہیں۔ کبھی چس (Chess)، کبھی کیرم، کبھی آؤٹنگ اور چس بتاؤں ایٹا نے ایک دفعہ گڑیا کی شادی کی۔ جینوں باپ بیٹا اتنی بن کر آئے اور ہم میں بیٹی نے گڈی کو رخصت کیا۔“ جسم آپا کھلکھلا کر فیس رہی تھیں اور وہ بھی ان کی بات سن کر مسکراتے لگا۔

”آئی! آپ بہت اچھے لوگ ہیں۔“

”ٹھیک ہے، ان لیتی ہوں اگر تم کہتے ہو۔ ویسے تمہارے انکل تو ہر وقت مذاق ہی اڑاتے رہتے ہیں کہ ہم بہت بھگڑا لوگ ہیں۔“

”نہیں، وہ مذاق کرتے ہیں۔“ وہ ایک دم ہنستے ہوئے بولا۔

”ہنستے رہا کرو۔ بہت پیارے لگتے ہو۔ میرا فیضی تمہاری طرح ہی ہوتا ہے۔ میں چھپس ان لوگوں سے ملواؤں گی تو تم بہت خوش ہو گے، وہ

واقعی بہت کیوت ہیں۔“

”آئی کب؟“

”جب وہ آئیں گے۔ اب میں کچن میں جاتی ہوں۔ تم ماما کے پاس چلو۔ آؤ میں ہی لے چلتی ہوں۔“ وہ اس کی دھیل چیر کر کود چلی گئی۔ وہ شہلا کے پاس لے گئیں۔ دوسری تھی اس لیے وہ اسے دائیں اپنے کمرے میں لے آئیں۔

وہ جسم آئی کے آنے سے بے حد خوش ہو گیا تھا۔ جیسے ہر طرف پھیلنے والی تاریکی میں چمکنے کے مانند کھن سے اڑتی ہوئی روشنی آگئی ہو اور اس نے سارے کمر کو نور کر دیا ہو۔ آئی خود بھروسہ، دروازہ، باپردہ درمیانی عمر کی اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت تھیں۔ ساری زندگی آری میڈ اپ میں گزار دی تھی اس لیے ہر بات اور کام بہت منظم طریقے سے کرنے کی عادی تھیں۔ ان کا محبت بھرا شفیق لب و لہجہ، ہر مشکل کو لاکھلی لینا اور کسی کو بھی ٹینس نہ ہونے دینا اس کے لیے باعث رحمت بن گیا تھا۔ شہلا بھی ان کے آجانے سے بہت بھڑکھوس کر رہی تھیں۔ وہ کبھی اسے محبت سے سمجھاتیں کبھی قرآن پڑھ کر سناتیں تو کبھی اس کی دلجوئی کرتیں۔ حیدر سے وہ ہر صبح یوں محبت سے ملتی تھیں جیسے پھول، خوشبو کا استقبال کرتا ہے۔ دوسرا محبت تھیں

اور اس کے لیے رحمت نبی جاری تھیں۔

وہ چند دنوں میں ہی ان کا اتنا عادی ہوتا ہوا تھا کہ اپنے دل کی ہر بات ان سے کرنے لگا تھا۔ وہ اپنی ہر سوجھ بوجھ ان سے شیئر کرنے لگا تھا۔ ان سے گفتگو کر کے اسے تسلی ہوتی اور مسرت بھی محسوس ہوتی جو روحانی احساس اور ارتقا کا عمل ایک سال پہلے شروع ہوا تھا، اچانک دک جانے کی وجہ سے وہ شدید بے چارن اور اضطراب کا شکار ہوا تھا اب پھر عود کر آ رہا تھا مگر اب اس کا زلزلہ بدل رہا تھا۔ وہ جو ہمیشہ گاڈ اور کرائسٹ کا ذکر کرتا باعث افتخار سمجھتا تھا، عقیدت سے اس کا دل پہنچ جاتا تھا۔ اب اکثر باتوں میں اللہ اور اس کے پرافٹ کا ذکر کرنے لگا۔ گوکہ حضرت محمد ﷺ کہتے ہوئے وہ ہمیشہ تہذیب کا شکار ہوتا لیکن پرافٹ کہنے میں کبھی عار محسوس نہ کرتا۔ صرف ہائل کو ہمیشہ مقدس اور روحانی کتاب سمجھنے والا اب قرآن کے ہارے میں بھی تجسس سے سوال کرتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ خدا سے محبت کا تصور اس کی ذات کو رفتہ رفتہ اعتماد بخش رہا تھا۔ پہلے وہ ہر بات میں خدا سے بہت خوف محسوس کرتا تھا۔ کرائسٹ سے محبت اور خدا سے خوف، انہی دو مخلوط تک اس کی سوچیں محدود تھیں، اب خوف کم اور محبت نے جگہ لے لی تھی۔ اس احساس نے اس کی روح میں ایک درد اُٹھایا تھا۔ ایسا درد جس کے اندر نور و طہانیت تھی اور جس نے اس کے وجود کو خوشی اور اطمینان سے بھر دیا تھا۔

”محبت ہر رنگ میں خوبصورت ہے۔ ایک حسین احساس کا نام جو دلوں سے کدورتیں اور نفرتیں مٹاتی ہیں۔ خدا کی طرف سے ایک مہربان..... ذہر آلود دلوں کے لیے تریاق کا کام دیتی ہے۔“ عجم آئی نے محبت کا ایسا ہی حسین احساس اس کے اندر چھپایا تھا۔ نور کی محبت تو دل کے ایک گوشے تک محدود تھی جس سے روح سیراب ہوتی تھی۔ اب ایسا محبت پیدا ہو رہی تھی جو عام تھی اور جو وجود کے ساتھ ساتھ پورے ماحول کو بھی سحر کر رہی تھی۔ دور رفتہ رفتہ نور کی غیر موجودگی کو قبول کر رہا تھا۔ پہلے جس طرح مضطرب اور پریشان رہتا، اب صرف مختل رہتا۔ ہر خوبصورت انسان اپنی ذات میں بے مروتی کی طرح ہے۔ ہر ایک کے لیے مخصوص چمک اور دلکشی لیے ہوئے۔ وہ نور کو سب کچھ بتانے کے لیے شدت سے مختل تھا۔



تھوڑا سا آسمان (معاشرتی رومانی ناول)

تھوڑا سا آسمان آپ کی پسندیدہ مصنفہ عمیرہ احمد کی ایک نہایت عمدہ تحریر ہے۔ آسمان دو عروج ہے جس کو پانے کی خواہش ہمیں ہمیشہ بہ تاب رکھتی ہے ہم سب کبھی نہ کبھی تھوڑا سا آسمان ضرور تلاش کرتے ہیں۔ اس تلاش میں بہت سے لوگ بہت کچھ کھودتے ہیں اور بعض دفعہ اس تلاش میں ہم اپنے ہمدردوں کے نیچے موجود زمین کو ٹھوکر مار دیتے ہیں۔ پھر جب آسمان تک پہنچ نہیں پاتے تو واپس زمین پر آنے کی کوشش کرتے ہیں جب بعض دفعہ زمین ہمیں پاؤں رکھنے کی جگہ نہیں دیتی۔ خوبصورت تحریروں کی خالق عمیرہ احمد کا یہ ناول کتاب گھر کے معاشرتی رومانی ناول سیکشن میں دستیاب ہے۔

شرزا میر کو گھر لے کر آئی تو بے چین ہو گئی۔ وہ باپ کے بارے میں بہت عجیب و غریب سوالات کرتا۔ کبھی شاکل کے بارے میں پوچھتا رہتا۔ شاکل کی حالت روز بروز بگڑ رہی تھی۔ اسنے شاکس کے بعد بھی وہ ٹھیک نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے ٹھیک ہونے کے بارے میں ختم ہو چکے تھے۔ شرزا اس کو دیکھ کر ہر وقت آپس بھرتی رہتی۔ اتنی خوبصورت، نرم و نازک، حسین و جواں کالچ کی گڑیا کے مانند کرسی پر کبھی بکھر چکی تھی اور اب اس کی کرسیاں بھی سیٹا مشکل ہو گیا تھا۔ شرزا کی انگلیاں لٹک رہی تھیں اور روح چھٹی ہو گئی تھی۔ اس کی ساری کوششیں رائیگاں ہو گئی تھیں۔

”اس کا بھی مل ہے کہ اسے فوشین ہاؤس بھیج دیں۔“ ڈاکٹر نے مشورہ دیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”کاش وہ مر جائے تو مجھے سکون مل جائے۔ اس طرح کیسے اسے زندہ رہا تو وہ گور کر آؤں۔“ اس نے کہا۔

”بہت نہ ہاریں، حرفہ آخر خدا ہے جو بے جان سے جاندار تخلیق کرتا ہے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ آپ ہذا میر ہیں اور اس سے دعا کریں۔“ ڈاکٹر نے تسلی دی۔ وہ جانتی تھی یہ محض تسلی ہے۔ اس کا دل کہیں نہیں ٹھہر رہا تھا کیونکہ اس کی ریکوری کے تمام چانسز وہ خود کوڑ کر چکی تھی یا پھر حالات نے اسے مواقع فراہم نہیں کیے تھے۔

”ڈاکٹر صاحب! میں خود کیسے اسے چھوڑنے جاؤں۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہوتا۔“ وہ روتے ہوئے ”ٹھیک ہے سزا منصور! میں آپ کی مدد کروں گا اور اسے فوشین ہاؤس چھوڑ آؤں گا۔“

”نہیں۔“ وہ ایک دم بدبلائی ہو گئی۔

”ٹھیک ہے، آپ فیصلہ کر لیں اور پھر مجھے بتا دیجئے گا۔“ وہ بدولی سے اٹھ کر آگئی۔ وہ میر کو لے کر شاکل سے ملنے گئی۔ وہ خاموشی سے بیٹھی تھی۔ ان کو دیکھتی رہی پھر اٹھی اور ٹھٹھکا کر بیٹھنے لگی۔

”یہ بندہ کہاں سے آ گیا؟“

”میں بندہ نہیں ہوں۔“ میر غصے سے بولا۔

”میر! خاموش ہو جاؤ، اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔“ شرزا نے اسے سمجھایا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ سب ہانگ ہیں۔ گندے لوگ، ہر وقت لڑتے رہتے ہیں اور یہ کی ماؤں۔۔۔۔۔ منگی، یہ بھی ہانگ ہے۔“ وہ اس کا منہ چڑاتے ہوئے بولی۔

”شٹ اپ!“ میر ایک دم غصے سے بولا۔

”کس کو شٹ اپ کہا، کس کو؟“ وہ غصے سے میر کو زور زور سے تھپڑ مارنے لگی۔ شرزا بچانے کی کوشش کرنے لگی تو اس نے اسے بھی زور سے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر گر پڑی مگر وہ میر کو مسلسل مارتی رہی۔ کسی طرح رک ہی نہیں رہی تھی۔

”میر! تم کمرے سے بھاگنا اور زور نہ کرنا۔“ شرزا نے دونوں کے درمیان آتے ہوئے میر سے کہا۔ وہ ایک لمبے کے لمبے ٹیبلٹ دیا اور بھاگ کر اٹھا۔ شرزا بھی جلدی سے باہر نکل اور دروازہ زور سے بند کر دیا۔

”ڈاکٹر صاحب! آپ ابھی اسے فوٹو نہیں ہاؤس ہی چھوڑ آئیں۔ یہ بہت ناقابل برداشت ہو رہی ہے۔“ اس نے قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں ڈاکٹر سے کہا۔

”ٹھیک ہے، آپ کل آ جائیے۔ ابھی تو میں کچھ مصروف ہوں کل چلیں گے۔“ وہ افسردہ سی کرے سے ہار نکل گئی۔

”مما! شکیل کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ تو بالکل پاگل لگتی ہے۔“ سیر نے حیرانی سے گاڑی میں بیٹھے ہوئے پوچھا۔ اس نے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور کانگڑا بہن لپے۔

”مما! بتائیں نا اسے کیا ہو گیا ہے؟“

”کچھ نہیں۔“

”تو وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ کہیں وہ ایکٹنگ تو نہیں کر رہی۔“

”نہیں۔“ وہ افسردہ لہجے میں بولی۔

”مما، اس کو اب گھر نہ لانا اور نہ وہ مجھے مارے گی۔ خیر، مجھے کیا ہے۔ میں تو واپس مری چلا جاؤں گا۔“

”نہیں سیر! اب تم واپس نہیں جاؤ گے۔ میرے پاس رہو گے۔“

”نہیں، مجھے واپس جانا ہے۔ مجھے آپ کے ساتھ رہنا چاہی نہیں لگتا۔“

”کیوں؟“ شزرا کو سخت دھچکا لگا۔

”آپ بہت بڑے لوگ ہیں۔ ہر وقت بڑی، گھر سے اچھا تو ہاٹل ہے۔ وہاں میرے دوست ہیں۔ ہم سب مل کر کھاتے ہیں اور پڑھتے

ہیں۔ یہاں پر کیا ہے، کچھ بھی نہیں، مجھے آپ کے پاس نہیں رہنا۔“

”پلیز بیٹا! میں آپ کے لیے اب کہیں نہیں جاؤں گی۔“

”تو ممّا! آئی ڈونٹ ڈرسٹ یو!“ شزرا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ کس قدر صاف گوئی سے اسے آئینہ دکھا رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کا منہ

دیکھنے لگی اور کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اس وقت اس سے بحث کرنا اسے مناسب نہ لگا۔

ملک منصور کے بعد اس نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اس خواہش سے جلد از جلد دور بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اس نے ایک

قلین کرائے پر لے لیا تھا اور وہ سیر کے ساتھ وہاں شفٹ ہو جانا چاہتی تھی۔ صرف سیر ہی اس کے پاس باقی بچا تھا اور وہ اسے کسی قیمت پر بھی کھونا

نہیں چاہتی تھی۔ وہ آنے والے دنوں کی تنہائی سے خوفزدہ تھی۔ شکیل پہلے ہی جدا ہو رہی تھی اور اب سیر بھی ایسی باتیں کر رہا تھا۔ زندگی کا حاصل کیا

تھا؟ سب کچھ رفتہ رفتہ ختم ہو رہا تھا۔

اگلے دن وہ سیر کو گھر چھوڑ کر ڈاکٹر کے ساتھ شکیل کو فوٹو نہیں ہاؤس چھوڑنے لگی تو سارا وقت روتی رہی۔ شکیل پہلے تو خاموشی سے ماں کے

ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی پھر ڈاکٹر کو دیکھ کر ایک دم چلانے لگی۔

”میں اس کے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گی۔ یہ مجھے مارتا ہے، بہت مارتا ہے۔“ اس نے کھلی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے کارڈ رائیو کرتے ہوئے ڈاکٹر پر حملہ کر دیا۔

”ڈاکٹر صاحب آپ میری گاڑی میں آ جائیے۔ میں اس کو لے کر جاتی ہوں۔“ شزا نے اپنی گاڑی کی چابی پرس میں سے نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ وہ گاڑی سے باہر نکل گیا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ اب وہ ایسے مطمئن بیٹھی تھی جیسے کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ سیٹ کے ساتھ سر ٹکا کر باہر دیکھ رہی تھی۔ شزا آنکھوں سے مسلسل بہتے اشکوں کو بھی نہیں پونچھ رہی تھی۔ اس لمحے وہ اسے نارمل لگ رہی تھی جیسے موت سے پہلے ہر مریض صحت یاب لگتا ہے۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑے اندر داخل ہوئی اور ڈاکٹر کا انتظار کرنے لگی۔ وہ تھوڑی دیر بعد نکلی گیا اور انپارچ سے ساری بات کی۔ اس کی رپورٹس دکھائیں اور اسے محلے کے حوالے کیا۔ شزا باہر نکلتے کتنی کہ وہ حیرتی سے اس کی طرف بھاگتی ہوئی آئی اور اس کے ساتھ چٹ گئی۔

”میں یہاں نہیں رہوں گی، میں آپ کے ساتھ گھر جاؤں گی۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ پلیز مجھے چھوڑ کر مت جائیں۔“ وہ سہم کر چڑیا کی مانند اس کے ساتھ چٹ رہی تھی اور اس کا دل لہلہا ہوا ہوتا تھا۔ شزا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”خوصلہ کریں مسز منصور“ ڈاکٹر نے تسلی دینا چاہی۔ ایک نرس اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ شکیل نے دور سے اسے تھپڑ مارا۔ وہ تھوڑا کر گر پڑی۔ دو تین لوگ بھاگتے ہوئے آئے اور اسے زبردستی اندر لے کر جانے لگے۔ وہ دروری تھی، چلا رہی تھی، چلی رہی تھی، سسک رہی تھی مگر کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ سب محو تماشا دیکھ رہے تھے۔ ایک پاگل کردار دنیا کے اسٹیج پر پر قادم کر چکا تھا اور تماشائی حیرت سے انسانوں کے اس جم خیر میں ایک ایسا نارمل کردار کو دیکھ کر تاسف کر رہے تھے۔ ایک کے بعد ایک اور اسٹیج ایک اور کردار نہ ادا کر سکے وہ دنیا کے لیے مرجاتا ہے اور دنیا کو ایسے کرداروں کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس کا خوبصورت مگر بے کار وجود ایک حقیر تنکے کے مانند حالات کے بہاؤ میں بہہ چکا تھا۔ اب کوئی اس کا منتظر نہیں تھا۔ اس کا وجود رفتہ رفتہ زوال پذیر تھا۔ اونچی اونچی دیواروں میں قید، ہراساں، پریشاں حال، منتشر وجود جیسے خزاں رسیدہ درخت کا سوکھا، پھڑپھڑاتا، شکستہ حال، ادھر ادھر سرگرداں تھا۔



مغیث انگل فون پر اپنی بیٹی ایسا سے بات کر رہے تھے اور وہ صوفے پر بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ مغیث انگل کا انداز گفتگو بہت محبت بھرا تھا۔ وہ ایسا کے فون کا سن کر ہی کھل اٹھے تھے۔ اس سے ہر بات پر چہرہ رہے تھے۔ اس کی محبت، روئین، کھانے، مریضوں، موسمِ غریبہ کو کوئی موضوع نہیں چھوڑ رہے تھے۔ دونوں نے گھٹنا بھر باتیں کیں اور وہ حیرت سے پاس بیٹھی سنی رہی۔ دونوں کی محبت کو قدرے رنگ بھری نگاہ سے دیکھتی رہی۔ جس شے سے انسان محروم ہو وہ ہمیشہ سے چھٹی رہتی ہے۔ اس کے نہ ہونے کا احساس ہمیشہ انسان کو اندر ہی اندر دھکی کر تارہتا ہے۔ پہلے دوحید را نکل اور شہلا کی محبت کو حسد بھری نگاہوں سے دیکھتی تھی اور اب مغیث انگل اور اب مغیث انگل اور اب مغیث انگل۔

”کیا ہر باپ اپنی بیٹی سے ایسی ہی محبت کرتا ہے؟“ دوبار بار اچھے آپ سے سوال کر رہی تھی۔ ”ہر باپ نہیں صرف کوئی کوئی یا پھر شاید سب ہی سوائے میرے باپ کے۔“ اس نے غصے سے ہونٹ چبائے اور آنکھوں میں بھرے آنسوؤں کو اچھے ہاتھوں سے صاف کرتے ہوئے باہر نکل

مٹی۔ منیٹ انکل کی اس کی طرف پشت تھی اس لیے اسے دیکھ نہ سکے۔ وہ باہر لان میں آگئی اور ادھر ادھر ٹپکنے لگی۔ کافی دیر وہ ادھر ادھر چلتی رہی پھر بیٹا میں بلائے آگیا۔

”ہاجی! کمرے صبح کھانے کے لیے بلا رہی ہے۔“ وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا تو وہ اندر آگئی۔

”کیا بات ہے بیٹا! آپ کچھ اس لگ رہی ہیں۔“ انکل منیٹ بھی تبسم آنکھی کی طرح بہت شفیق اور مہربان تھے۔ انسانوں کے ہجوم میں..... خوبصورت وجود، بیکر محبت.....

”جیس یونہی، آپ کیا سے بات کر رہے تھے اس لیے میں باہر چلی گئی۔“

”بھئی، وہ میری اپنا کافون تھا۔ دیکھو میں آج ہی اسے مس کر رہا تھا اور اس کا فون آگیا۔ کہہ رہی تھی کہ وہ بھی آج مجھے بہت یاد کر رہی تھی۔“ وہ لڑکھنڈ بات سے مسکراتے ہوئے بولے۔

”اپنا سے آپ بہت محبت کرتے ہیں؟“

”ہاں، یقیناً ہر باپ اپنی بیٹی سے بہت محبت کرتا ہے۔“

”کیوں ہر باپ کیوں اپنی بیٹی سے محبت کرتا ہے؟“ اس نے سوال ڈھرایا۔

”فرانڈ تو اسے الیکٹرا کمپلیکس کہتا ہے۔ جس مخالف کی محبت لیکن ہمارے مذہب میں تو اسے اصول رشتے کے طور پر لیا جاتا ہے۔ باپ اپنی ذات کا عکس اس میں دیکھتا ہے اور شاید یہ قدرتی امر بھی ہے کہ باپ کو قدرتی طور پر بیٹیاں بہت عزیز ہوتی ہیں۔“

”لیکن ہر باپ کنکشن۔“ وہ ہائیو سے بولی۔

”ہاں یہ بھی ممکن ہے لیکن ایسے باپوں کو صرف بیٹیاں نہیں بیٹے بھی عزیز نہیں ہوتے۔ ان کے اندر خود غرض خواہش ہوتی ہے۔ ایک نادرل باپ دونوں سے بہت محبت کرتا ہے۔ ابھی تم دیکھنا۔“ غم کا بھی فون آئے گا کیونکہ میں آج اسے بھی بہت مس کر رہا ہوں۔ تم کھانا کھاؤ۔ یوں باتوں میں نہ کھوجایا کرو نہ تہجاری آنٹی مجھ سے بہت ناراض ہوں گی۔ معلوم ہے جاتے ہوئے بھی اور ہر روز فون کر کے بس بھی کہتی تھی ہیں منیٹ! شفیق کا بہت خیال رکھنا۔ بھئی تم مجھے ان کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچا لینا۔“ وہ جتنے ہوئے بولے۔

”انکل! کیا آپ آنٹی سے بہت محبت کرتے ہیں؟“

”ہاں بھئی، یہ بھی پوچھنے کی بات ہے۔ شی از دیری ٹائس لیڈی! انھوں نے میرا اور میرے بچوں کا بہت خیال رکھا ہے۔“

”تو کیا صرف آپ اس وجہ سے ان سے محبت کرتے ہیں کہ انھوں نے آپ کا اور آپ کے بچوں کا خیال رکھا۔“ اس نے معنی خیز اعزاز میں سوال کیا تو وہ چونک گئے اور اس کی طرف قدرے حیرت سے دیکھنے لگے۔

”آپ کیوں ایسا پوچھ رہی ہیں؟“

”کیا ایک مرد صرف عورت سے اس لیے محبت کرتا ہے کہ وہ اس کا اور اس کے بچوں کا خیال رکھتی ہے، ان کی خدمت کرتی ہے۔ ساری

زندگی اسی میں صرف کر رہی ہے۔ پھر وہ اسے محبت کرتا ہے۔“

”نہیں، وہ اس لیے بھی اس سے محبت کرتا ہے کہ اس کے وجود سے اسے خوشی بھی ملتی ہے۔ سرت اور اطمینان کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے جب وہ باعث رحمت تصور کی جاتی ہے۔“ وہ ذرا غمیدہ ہو کر بولے اور پانی پیا۔

”اور جو عورت یہ سارے کام نہ کر سکے تو اسے زندگی سے نکال دینا چاہیے۔ اس کی تو پھر زندگی میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی نا۔ وہ تو ایک بے کار وجود ہوتی ہے جسے بھیک دینا چاہیے، دھکا کر دینا چاہیے۔“

”بیٹا، آپ کیوں اتنا غشی ہو کر سوچتی ہیں؟“

”انگل اشاید میری ماما بھی ایسی تھیں اس لیے انہیں زندگی میں کسی سے بھی محبت نہ مل سکی اور میں بھی ایسی ہی ہوں۔ میرے دل میں کسی کے لیے بھی محبت نہیں۔ کسی ایک انسان کے لیے بھی نہیں۔ شاید میں پوری زندگی کسی سے بھی محبت نہیں کر سکوں گی۔“ وہ بے یقینی کے انداز میں بولی۔

”انسان کچھ بھی دلوں سے نہیں کہہ سکتا۔ اگلے لمحے وہ کیا کرے گا اسے خود بھی اندازہ نہیں ہوتا۔ انسان اس دنیا کی سب سے زیادہ..... ناقابل یقین مخلوق ہے۔ جس کے سارے دعوے کھوکھلے اور بے معنی ہوتے ہیں۔ وہ ہر وقت تغیر و تبدل کا شکار رہتا ہے اس لیے ایسا سوچنا بھی خام خیالی ہے۔ ہم کس سے، کب کہاں اور کیسے ایک دم محبت کرنے لگتے ہیں، ہمیں خود بھی معلوم نہیں ہوتا۔ ویسے بھی مجھوں اور نقرتوں کا سرچشمہ تو دل ہوتا ہے اور دل کب بدل جائے، کسے معلوم؟“ وہ غمگین سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولے۔ اتنے میں فون کی بیل بجنے لگی۔ سیٹ مین نے فون اٹھایا۔

”صیب! اشیم بابا کا فون ہے۔“ وہ اونچی آواز میں بولا۔

”دیکھا، میں نے کیا کہا تھا۔ مجھے یقین تھا اس کا فون ضرور آئے گا۔“ وہ ہنستے ہوئے بولے اور وہ حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ حینم سے بھی ایسا کی طرح ہنس نہیں کر سکتی تھی۔ ان کے چہرے سے بے حد ملامت اور اطمینان جھلک رہا تھا اور وہ انہیں دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ رشتے کتنے اہول ہوتے ہیں جب مجھوں کی شیرینی سے گندھے ہوں۔ دنیا کی ہر نعمت سے زیادہ قیمتی اور نایاب.....



نور کے فون نے اسے چمکا دیا۔ اس نے صرف چند منٹوں کی کال کی تھی، وہ بے حد خوش تھی۔ وہ اپنے باپ کا جیسا ایک گازمنٹس لیکچری میں انویسٹ کر رہی تھی۔ اور پچا اوروہ کراچی میں انگریز سنٹ پر سائن کرنے کے لیے رک گئے تھے۔ امریکا میں ان کے پارٹنر نے ڈیڈی کی پراپرٹی سیل کر کے انہیں سارا جیسا بھجوا دیا تھا اور اب پچا اسے اپنے ایک دیرینہ دوست کے بیٹے شرنیل کے ساتھ بزنس کرنے پر آمادہ کر رہے تھے۔ وہ تو اس بات سے بالکل بے خبر تھی۔ پچا اس کے گارڈین تھے۔ اس کے گھر، بینک بیلنس اور امریکا والی پراپرٹی اور اس سے متعلقہ سارے معاملات وہی دیکھتے تھے۔ اس نے کبھی بھی اس حیلے میں ان سے کوئی بات نہیں کی تھی لیکن اس اچانک بزنس ڈیل پر وہ بوکھلا گئی، انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ ابھی وہ پڑھ رہی ہے۔ تعلیم کے بعد وہ بزنس کرے گی مگر وہ کسی طور مان ہی نہیں رہے تھے اور اچھی طرح کونفیس کرنے لگے کہ تعلیم مکمل ہونے تک اس کا بزنس بالکل سیٹ ہو چکا ہوگا۔ وہ تعلیم بھی جاری رکھے اور بزنس بھی دیکھے۔ وہ ان گئی۔ شرنیل سے ملاقات کے بعد تو وہ واقعی مطمئن ہو گئی۔ اس کی ایک گئی

کی مل تھی اور ایک گارڈنٹس لیکشری۔ اس نے بی اے کر رکھا تھا لیکن بزنس میں وہ بہت گھاگ تھا۔ اس کے والد راجیل ایک اعلیٰ ریٹائرڈ سرکاری ملازم تھے انھوں نے اپنی دشمنی سچ کر سارا چسپاں شرجیل کے بزنس میں لگایا تھا اور اب اس کی ترقی دیکھ کر وہ بزنس مزید پھیلاتا چاہتے تھے۔ شرجیل کے ساتھ ساتھ راجیل کو بھی بزنس کا کریر ہو گیا تھا بلکہ انھوں نے اپنی ملازمت کے دوران ہی انور چچا کے ساتھ بزنس شروع کر دیا تھا اور دونوں نے تین سال پہلے بیچو کی ملیا۔۔۔۔۔ میں کوئی لیکشری لگائی۔ بزنس میں نقصان ہوا تو وہ سب کچھ بیچ کر کراچی چلے گئے جہاں بزنس دن دگنی رات چو گئی ترقی کرنے لگا۔ چچا نے نہ جانے کب ان سے ساری بات چیت مکمل کر لی تھی اور اب انگریز سینٹ سائن ہونے والا تھا جب لوہے نے فون کر کے اسے تعصیلات بتائیں۔

”نورا کیا تم بزنس کر دگی؟“ ولیم نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں بھی، کیوں نہیں۔ مجھ میں اتنے ٹکس ہیں کہ میں ایک بہت اچھا بزنس چلا سکتی ہوں۔“ وہ بڑا اعتماد لہجے میں بولی۔

”لیکن بزنس کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم یونی۔۔۔۔۔“

”کیا مطلب؟“

”کچھ نہیں۔“

”بتاؤ نا۔“

”کچھ بھی تو نہیں۔“

”اچھا میں تمہیں بعد میں فون کروں گی۔ ہم لوگ کل آرہے ہیں پھر بہت سی باتیں ہوں گی۔“ اس نے فون بند کر دیا۔ وہ کہیں کھوسا گیا تھا۔ وہ سارا وقت افسردہ رہا۔ اندر ہی اندر اپنے آپ سے الجھتا رہا۔ اسے صاف محسوس ہو رہا تھا جیسے رفتہ رفتہ نور اس سے دور جا رہی تھی اور وہ اپنا وجود بھی کھوتا جا رہا تھا۔ وہ اس کے بغیر ادھورا تھا۔۔۔۔۔ بہت ادھورا۔ وہ تو سانسیں بھی اس کے ساتھ لینے کا مادی ہو چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ چند روز کے لیے دور لگی ہے اور جلد لوٹ آئے گی مگر اب کراچی بزنس کرنے سے وہ اس سے بہت دور چلی جائے گی۔ اسے شدید پریشان ہونے لگا۔

”کیا بات ہے وٹا! آپ کچھ اس لگ رہے ہو؟“ تبسم آنتی نے اسے سوچوں میں گم اور پریشان ساد دیکھ کر پوچھا۔

”یونی، کوئی خاص بات نہیں۔“

”کچھ تو ہے، کچھ الجھا لکھ لگ رہے ہو۔“

”نہیں۔“ اسی لمحے شہلا اور اسد گھر میں داخل ہوئے۔ تبسم آنتی خوشی سے ان کی طرف ٹپکیں اور وہ دایوبی سے اندر لوٹ آیا۔ شہلا اور اسد کافی دیر شہلا کے پاس بیٹھ رہے اور پھر واپس چلے گئے۔ جانے سے پہلے حیدر کمرے میں داخل ہوئے تو دونوں کو وہاں دیکھ کر چوہے گئے۔

”السلام علیکم پاپا! شہلا آگے بڑھ کر سر جھکانے ہوئے بولی۔

”وہیکم السلام! کیسی ہو اور اسد بیٹا تم؟“

”تمہیک ہوں اٹکل!“ وہ بھی تپاک سے ملا۔

”آج ادھر کیسے آنا ہوا؟“ حیدر نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”ہم لوگ آئی کدیکھنے آئے تھے۔“ شہلا نے بستر پر لیٹی شہلا کی طرف دیکھ کر کہا تو حیدر حیران ہوئے بغیر بندہ سکا اور معنی خیز انداز میں مسکرا دیے۔ دونوں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد چلے گئے تو حیدر نے حیرت سے تبسم آ پا اور شہلا کی طرف دیکھا۔

”اُس اے پلیز نٹ چیج اشہلا بہت بدل گئی ہے۔“ حیدر مسکرا کر بولے۔

”وقت انسان کو بہت بدل دیتا ہے اور جب انسان کو خود کسی بات کا تجربہ ہوتا ہے تو وہ خود بخود بدل جاتا ہے۔“ تبسم آ پا نے کہا۔

”آپا اشتیاق کے لیے بھی دعا کریں۔ خدا اسے بھی بدل دے۔ اس کے دل میں میرے لیے بہت غرت ہے۔ حیدر اس کو فون کر دے کہ مجھے صرف ایک دفعہ آ کر مل جائے۔ مجھے لگتا ہے کہ اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں۔ معلوم نہیں وہ آتی بھی ہے کہ نہیں۔“ شہلا مایوس کن لہجے میں آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں۔

”وہ کیوں نہیں آئے گی، میں خود اس سے بات کروں گی بلکہ سفیث کو کہوں گی کہ اسے لے کر آئیں۔“ تبسم آ پا نے انھیں تسلی دی۔

”حیدر اتم سے فون کرو۔ تمہاری وہ جرات مانتی ہے۔ حیدر سنو! میں مرغی یا تو ولیم اور شیخ کو تم اپنے پاس رکھنا ان کو بھی جہانہ ہونے دیتا۔ انھیں میری طرح خاہنشاہی نہ بننے دیتا اور نہ دونوں میری طرح نکھر جائیں گے۔ نہ ان کا حال رہے گا نہ مستقبل۔ پلیز حیدر وعدہ کرو۔“ وہ ایک دم بے چینی سے بولیں تو حیدر حیرانی سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ انھیں قطعی یقین نہیں تھا کہ وہ یوں اچانک باتیں کرتے ہوئے کس طرف جا نکلیں گی۔

”شہلا اتم کیسی باتیں کر رہی ہو؟“

”نہیں حیدر، وعدہ کرو۔۔۔۔۔ پلیز یہ وعدہ تمہارا دینا اس میں تو کوئی رکاوٹ حاصل نہیں ہوگی نا۔“

”وہ پہلے بھی تو میرے پاس ہیں نا۔ کیا تمہیں مجھ پر شک ہے۔ کیا میں ان کی دیکھ بھال نہیں کر رہا اور تم جانتی تو ہو میں یہ سب کیوں کر رہا ہوں؟“ حیدر نے قدرے سنجیدگی سے کہا اور استغماہمیتا ہوں سے شہلا کی طرف دیکھا۔

”تبسم آ پا گواہ ہیں تا یا ابا مرتے دم تک تمہیں یاد کرتے رہے اور مجھ سے کبھی وعدہ لیتے رہے کہ میں زندگی کی آخری سانسوں تک تمہارا خیال رکھوں۔ وہ ہمارا بھی کہتے تھے کہ تم لوٹ آؤ گی۔ شاید وہ جہان کی آنکھ سے دیکھ رہے تھے جب تم تھک کر لوٹو گی تو تمہارے اپنے ہی تمہیں سنبھالیں گے۔“

”ہاں شہلا! آخری لمحوں تک سید صاحب کی لہان پر تمہارا نام تھا۔ تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ وہ تم سے کتنی محبت کرتے تھے۔“

”واقعی..... اور آپ لوگوں نے مجھے بتایا ہی نہیں۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

”شہلا! ہم تو رشتوں کی محبت کو ایک ذہنی جذبہ سمجھ کر انھیں بھلانے اور ان کے آثار بھی ختم کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ وہ تو اٹل حقیقتوں کے مانند ہمارے دلوں میں اور روحوں میں اچھی طرح طول ہوتے ہیں۔ وقت کی لہر انھیں مدھم تو کر سکتی ہے، ختم نہیں کر سکتی۔“

حیدر نے کہا تو وہ ان کی طرف خاموش نظروں سے دیکھنے لگیں۔ اتنے میں لاؤنج میں رکھے فون کی بیل بجی تو آ پا اٹھ کر باہر چلی گئیں۔

"حیدر کون کہتا ہے کہ میں نے تمہیں اور سید صاحب کو کبھی بھلا یا۔ تم تو اس وقت بھی میرے ساتھ تھے جب میں منصور اور پیر کی چکی تھی۔ شاید میں بھی ان رشتوں سے انصاف نہیں کر پائی۔ میں جس طرف قدم بڑھاتی ہوں نہ جانے کہاں سے درمیان میں آ جاتے۔ تمہارے ساتھ تو میں نے ہر لمحہ، ہر آن سفر کیا ہے۔ تم تو میری روح کا حصہ تھے، ہم تم جدا ہو گئے تو میری روح بھی مضطرب اور منتشر ہو گئی۔ نہ محبت ختم ہوئی اور نہ آثار مٹ سکے۔ میں تو کسی بھی بات میں کامیاب نہیں ہوئی۔ ساری زندگی سرگرداں رہی۔ ناکامیوں کا سفر طے کرتی رہی، بھٹکتی رہی اور ٹوٹتی رہی۔" وہ چہرے پر ٹپکتے ٹانوس کو دیکھ کر بولیں۔

"اور یہی کچھ میرے ساتھ ہوتا رہا۔ شہلا اہم کیسا سفر طے کرتے رہے ہیں۔ کچھ سمجھ ہی نہیں آیا۔"

"اور میں خارخزاں بنتی گئی۔" وہ افسردگی سے بولیں۔

"میں ایسا بے اثر، بے ہوا کا جھولا جو کسی کو باریا اور نہ کر سکا۔" وہ بھی آدھ بھر کر بولے۔

"زندگی یونہی رابیاں چلی گئی۔" شہلا تاسف سے بولیں۔

"شاید یہی لا حاصل کی جستجو اور اس کا ثمر ہے۔" حیدر بولے۔

"منیٹ اسے لے کر ویک اینڈ پر آئیں گے۔" عجم آپاسکرتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔ شفق کے بارے میں بتایا اور دونوں کو خاموشی اور آنکھوں میں نمی کی دھیر تہوں کو دیکھ کر چمک سی گئیں۔

"یہ تم دونوں کو کیا ہو گیا ہے۔ پھر ماضی میں کھو گئے تھے؟"

"ہاں شاید" حیدر بولے۔

"وہ محبت ہی کیا جس میں جدائی کا درد نہ ہو اور اس کی معراج ہی کیا جس میں لا حاصل کی تمنا اور تڑپ نہ ہو۔" آپانے کہا تو شہلا نے چمک کر ان کی طرف دیکھا۔

"چاہے لا حاصل کی تمنا انسان کو ریہہ ریہہ کر دے۔" شہلا بولیں۔

"ہاں اور معراج تو ہے ہی نا اور نا کے سفر میں انسان کے پاس باقی رہتا ہی کیا ہے اور محبت جب عشق کا روپ دھارتی ہے تو اصل میں فنا کی طرف قدم بڑھاتی ہے۔" آپانے دونوں کی طرف دیکھ کر کہا تو دونوں خاموش ہو گئے۔ کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا۔ ہر طرف ایک ایسی خاموشی تھی جہاں زبان میں ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ مضمون سمجھار ہی تھی اور تخیل بھی ہو کر سن رہے تھے، بھڑبھڑاتے تھے مگر کچھ بول نہیں رہے تھے۔



نور کو ایئر پورٹ چھوڑنے سے پہلے ٹرینیل نے اسے پرہیز کیا تو وہ چمک گئی۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی۔ وہ تو خالہ خاں بزنس کی کنیت سے وہاں آئی تھی۔ اس نے حیرت سے ٹرینیل کی طرف دیکھا۔

"اس میں حیرانی کی کیا بات ہے؟ ہمارے بزرگ بھی تو یہ چاہتے ہیں۔" ٹرینیل نے اس کو اس قدر تعجب دیکھ کر کہا۔

”کون؟“

”میرے ڈیڈی اور آپ کے اکل۔“

”لو آئی سی اتو اس لیے بچانے یہ سارا جال بنا تھا۔“ وہ بری طرح ان کے زہرے میں آئی تھی۔ ایگرینٹ سائن ہو چکا تھا۔ وہ اور شرٹل نفی پر سنڈ شیئر کے بزنس پارٹنر تھے اور جانے سے پہلے انھوں نے اس سے کسی قسم کا ذکر کیے بغیر ہی اس کے دشمن کی بات شرٹل کے ڈیڈی سے کر دی تھی۔

”آپ اس قدر حیران کیوں ہو رہی ہیں؟“ شرٹل نے پھر پوچھا۔

”مجھے حیرانی آپ پر نہیں بلکہ اپنے بچپا پر ہو رہی ہے۔ انھوں نے مجھے کس طرح فریب کرنا چاہا ہے۔“

”انھوں نے کوئی جال تو نہیں بچھایا؟“

”بچھایا ہے نظر نہ آنے والا۔ بہر حال اگر میں اس رشتے سے انکار کروں تو کیا آپ بزنس میں میری مدد نہیں کریں گے۔“

”کیوں نہیں، بزنس تو ہم کسی سے بھی کر سکتے ہیں۔ دیکھئے آئے نور امیرے لیے بے شمار پروپوزٹرز ہیں۔ میں کسی بھی لڑکی کی ہر ڈیمانڈ

پوری کر سکتا ہوں لیکن مجھے آپ بے حد پسند آئی ہیں۔“

”جھینک بوا لیکن جہاں آپ کے بے شمار پروپوزٹرز ہیں، میرا ایک بھی نہیں۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”تو پھر انکار کی وجہ؟“

”میری کسی سے کمنٹ ہے..... اگر آپ کی کسی سے کمنٹ ہو تو کیا آپ اسے میرے لیے چھوڑنا پسند کریں گے۔“ آئے نور نے اس

سے پوچھا۔

”بہرگز نہیں۔“

”بس میرا بھی یہی مسئلہ ہے۔ میں کس طرح اسے چھوڑ دوں جس سے میں نے آخری سانس تک ساتھ بھانے کا وعدہ کیا ہے۔ آئی

ہو پ ایڈونٹ مائڈاٹ!“

”نندیا مٹ آل! اچھی بات ہے آپ نے حقیقت بتادی لیکن بزنس کے لیے مجھ سے ان ٹیجے رہے۔ ہم اچھے پارٹنرز کی طرح ایک دوسرے

کو سسٹ کرتے رہیں گے بلکہ جب آپ لاہور میں اپنی کارٹنٹس ٹیکسٹری کا افتتاح کریں تو مجھے ضرور انوائٹ کیجئے گا۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”جھینک بوا بری ٹیج! پلیز ان تمام باتوں کا ذکر اکل سے نہ کریں۔ خود ہی اپنے ڈیڈی کو منع کر دیں۔“

”راعت اب چلیں!“

انور بچا اور اس کے ڈیڈی لان میں کھڑے ہاتھیں کر رہے تھے۔ ان دونوں کو باہر نکالنا دیکھ کر ان کی طرف آئے۔

”اچھا بھئی راجل اب میں چلا ہوں۔ مجھے اس بات کا جلدی جواب دینا۔“ بچانے معنی خیز انداز میں شرٹل کے ڈیڈی سے کہا۔

”ہاں ہاں تم بے فکر رہو۔ ہماری طرف سے ہاں ہی سمجھو۔“ وہ مطمئن لہجے میں بولے۔ نور اور شرٹل نے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھا

اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ لاہور آنے تک چچا اور اس میں کوئی بات نہ ہوئی البتہ چچا بہت خوش تھے اور اسے ان کی اس حرکت پر بے حد مسکوں ہوا تھا۔
”کیا بات ہے نور پڑنا اتم خوش نہیں؟“

”کس بات پر؟“

”بھئی تم اپنا بزنس شروع کرنے جا رہی ہو اور سنو! شرجیل اچھا لڑکا ہے۔ میں نے راضی سے تمہارے سلسلے میں بات کی ہے۔ میرا خیال ہے شرجیل بھی تمہیں پسند کرنے لگا ہے۔“

”خدا کے لیے اکل آپ کن باتوں میں پڑ گئے ہیں۔ ہم یہاں بزنس کے سلسلے میں آئے تھے کہ رشتے دار پاں کرنے۔ ویسے بھی فی الحال میرا شادی کا کوئی سوچ نہیں۔ ابھی تو میری اسٹڈی بھی کاپلیٹ نہیں ہوئی۔“ وہ قدرے خشک سے بولی۔

”لیکن مجھے تو اس اٹار کے پیچھے کوئی اور بات لگ رہی ہے۔“ وہ اپنے مخصوص جاسوسانہ اسٹائل میں بولے۔

”ایک تو آپ ہر وقت ہر بات کی جاسوسی نہ کرتے رہا کریں۔“

”لیکن جب بات ہی ایسی ہو تو جاسوسی کرنا پڑتی ہے اور سنو! تمہارے دماغ میں ولیم کا جو خیال ہے نا وہ نکال دو۔ ہم تمہاری شادی ہرگز کسی کرچن سے نہیں ہونے دیں گے اور ویسے بھی نہ اس کے آگے کوئی ہے اور نہ پیچھے نہ جانے کس کی اولاد ہے اور.....“

”پلیز اکل! احد سے مت گزر جایا کریں۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے لیے کیا بہتر ہے۔ میں تان سنس نہیں ہوں اور اپنی شادی کا فیصلہ بھی میں خود ہی کروں گی۔“ وہ جتنی لہجے میں بولی۔

”لیکن ایسا بالکل نہیں ہوگا جو تم چاہتی ہو۔“ وہ بھی غصے سے بولے جو بااود خاموش ہو گئی اور ان کی کسی بات کا جواب نہ دیا۔ گھر آ کر بھی وہ بہت خاموش تھی۔ چچی اسے مبارک باد دے رہی تھیں اور اسے قطعاً کوئی خوشی نہیں ہو رہی تھی۔ چچا بھی کوئی خاص رتی ایکٹ نہیں کر رہے تھے۔

اگلے دن وہ ولیم سے ملنے گئی تو گھر کا بدلا بدلا ہوا سکون ماحول دیکھ کر اسے قدرے حیرت ہوئی۔ ولیم بہت تازگی انداز میں مسکراتا ہوا تھا۔ اس کی ماما بھی قدرے سکون سی ہو رہی تھیں۔ ان کے علاوہ گھر پر کوئی نہ تھا۔

”ولیم! میں آج کچھ خاص بات یہاں محسوس کر رہی ہوں۔“

”کیا؟“ ولیم مسکرا کر بولا۔

”گھر کی خفا قدرے بہتر اور خوشگوار لگ رہی ہے اور تم بھی مت بھلائے بھلائے نہیں پھر رہے۔ لگتا ہے یہاں کچھ مینج آ رہا ہے۔“

”میں تمہارے آنے سے بے حد خوش ہو رہا ہوں اس لیے تمہیں ایسا لگ رہا ہے۔“

”لیکن اس میں اتنی خوشی کی کیا بات ہے۔ مجھے تو آہی تھا۔ بات کچھ اور ہی ہے۔“

”کچھ بھی نہیں اتم سناؤ بزنس کا کیا بنا؟“

”ہاں سب کچھ سیکل ہو گیا ہے۔ بہت جلد ہم یہاں کام شروع کر دیں گے۔“

”ہم کون؟“

”میں اور شرجیل۔“ وہ قدرے بے خیالی میں بولی۔

”کون شرجیل؟“

”میرا بزنس پارٹنر۔“

”اوا آئی سی؟“ وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔

”افوہ ایک تو تم لوگ بھی بڑے جلس ہوتے ہو۔ جیسے ہی کسی دوسرے لڑکے کا ذکر کرو، اسی کو ٹھیک میں دیکھنا شروع کر دیتے ہو۔ وہ

صرف میرا بزنس پارٹنر ہے اور کچھ نہیں۔“ وہ حتیٰ لچھے میں بولی۔

”آئی ایم سوری اتم نے ایسا محسوس کیا۔ میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔“

”تمہارا جو بھی مطلب تھا وہ مجھے تمہارے لچھے سے ہی پتا چل گیا ہے۔ خیر تم سناؤ کیسی طبیعت رہی اور انگل حیدر کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہیں۔“

”اور آئی کسی ہیں۔ ابھی سوری ہیں اس لیے بات نہیں ہو سکی لیکن چہرے سے وہ بھی بے سکون لگ رہی ہیں۔“

”آخر تم جانتا کیا چاہتی ہو۔ ہم مطمئن اچھے نہیں لگ رہے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”بہت اچھے لگ رہے ہو۔ اس راز کو جانتا چاہتی ہوں۔“ اسی لمحے تبسم آئی اور شہلا اسد لاؤنچ میں داخل ہوئیں۔ وہ مارکیٹ سے کچھ

شاپنگ کر کے لوٹی تھیں اور دونوں کی بات پر ہنس رہی تھیں۔

”یہ بابر شو کیسا ہے؟“ نور نے جلدی سے ولیم کے کمرے کا دروازہ کھول کر دیکھنا چاہا۔

”رہنے دو وہ ابھی ادھر ہی آ جاتی ہیں۔“

”کم آن ولیم! کون ہیں یہ لوگ؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہیلو ولیم! کیسے ہو؟“ شہلا اسد مسکرا کر اس کا کندھا چھتپاتے ہوئے بولی۔

”بیٹا! کوئی پراہم تو نہیں ہوئی۔“ تبسم آئی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں، پورا گئی تھی۔“ اس نے نور کی طرف اشارہ کیا۔

”نور اتم جو بات پوچھ رہی تھیں اس کی وجہ تبسم آئی ہیں۔ یہ شہلا باجی ہیں اور یہ نور ہے۔ میری کلاس فیلو اور فرینڈ بھی۔“ ولیم نے تعارف

کر دیا تو سب نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر مسکرانے لگے۔

”ہیلو بیٹا! کیسی ہیں آپ؟“ تبسم آئی نے اسے محبت سے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ نور کو ان کا یہ محبت بھرا انداز بہت اچھا لگا اور وہ مسکرا کر

ان کی طرف دیکھنے لگی۔

”اچھا یعنی تم لوگ ہاتھیں کرو۔ ہم لوگ تمہاری ماسا کے پاس جا رہے ہیں اور انٹھل کو مس کتنی ہوں۔ تم لوگوں کو چائے! دھری پینچا رہے۔“
”نہیں آئی! ہم سب لوگ آج آئی کے پاس ہی چائے پیئیں گے۔“ نور نے کہا تو وہ مسکرا دیں۔

”وائے ٹاٹ شیڈر! میں ہمارے آپ لوگوں کو بلاتی ہوں ابھی آپ ہاتھیں کرو۔“ دونوں مسکراتے ہوئے ہاہر لگلیں۔
”ولیم! یہ کون ہیں۔ شی! ایچ! آئیکس لیڈی۔“

”یہ ماما کی بہن اور میری آئی ہیں اور شہلا ہاچی حیدر انکل کی بیٹی ہیں۔“

”زبردست! یہ ایک سٹارٹ کن شخصیت کی مالک ہیں۔“

”وہ بھی بہت اچھی ہیں مگر تم آئی سب سے اچھی ہیں۔ پٹار سے آئی ہیں۔ جب ان کو پتا چلا کہ ماما باہر ہیں ماسی دن آئیں۔“

”ان کو پہلے کسی نے نہیں بتایا تھا؟“ نور نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں، یہ تہ شفق نے جا کر بتایا تھا۔“

”کون شفق؟“

”میری اسٹیپ سسٹر۔“

”ولیم! یہ سب کیا ہے۔ میرے جانے کی دہشتی..... اتنے زیادہ انکشافات ہو رہے ہیں۔ یہ تمہاری اسٹیپ سسٹر کہاں سے آئی؟“

”بس آئی ہے لیکن وہ ہر ایک سے ناراض ہے۔“ وہ گہری سانس لے کر بولا۔

”کیوں، کیا وہ بہت خشک حراج ہیں؟“

”نہیں، وہ بہت پریشان ہے۔ چھوڑو اس بات کو۔ تم اچانک کیوں چلی گئی تھیں، تمہارے بول اچانک چلے جانے کی وجہ سے میں بہت

اپ سیٹ ہو گیا تھا۔“

”ہاں میں جانتی تھی لیکن سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ مجھے بھی کچھ سمجھ نہیں آیا۔ انکل نے بہت برا گیم کھیلا ہے۔“

”کون، وہی جاسوس انکل؟“

”ہاں۔“

”کیا کیا؟“ اسی لمحے انٹھل انہیں بلانے آ گیا اور وہ اس کی ویل چیر کر پھینکتے ہوئے ماما کے کمرے میں لے گئی۔ شہلا، نور کو یوں اچانک

دیکھ کر کھل اٹھیں۔

”نور بیٹا! تم کب آئیں؟“ وہ اسے لپٹے لپٹے پیار کرتے ہوئے بولیں۔

”کل رات کو اور آپ کیسی ہیں؟“

”تمہیک ہوں۔ آپا! اس بچی نے ہماری بہت خدمت کی ہے۔ میں ہاسٹل سے اس کے گھر میں شفٹ ہوئی اور پھر یہی مجھے ولیم کے ساتھ

اسپتال بھی لے کر جاتی تھی۔ میرا بہت خیال رکھتی رہی ہے۔ کپڑے پہنچ کر داتی، میڈیسن کھلاتی۔" وہ آہستہ آہستہ انھیں بتا رہی تھیں اور تبسم آپا معترف انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"تھینک یو جیٹا! آپ نے میری بہن کا اتنا خیال رکھا۔" تبسم آنٹی نے محبت سے کہا تو وہ مسکرا دی اور اٹھ کر سب کے لیے چائے بنانے لگی۔

"مما! نور! اہود میں گارمنٹس لیکٹری شروع کرنے لگی ہے۔" ولیم نے ماں کو بتایا۔

"واؤ، ذہر دست! ابھی تو آپ اسٹوڈنٹ لگتی ہیں۔ بزنس بھی شروع کر لیا۔" سب کی ہار شہلا اسد بولی۔

"ہاں، بس حالات ہی ایسے ہو گئے سب کچھ خود بخود ہو گیا۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ وہ سب کو چائے دے کر قاریغ ہوئی تھی کہ حیدر کی گاڑی بھی پارک میں داخل ہوئی۔ اس کا ہارن بن کر وہ نور اکٹری ہو گئی۔

"حیدر اکل آ گئے۔" وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر بولی تو شہلا اسد نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ حیدر کمرے میں آچکے تھے۔ کمرے میں اتنی گہما گہما تھی دیکھ کر وہ مسکرا دیے۔

"اوسے بھئی اور جیٹا! آپ کب آئیں۔ آپ نے تو ہمیں اداس کر دیا تھا۔" وہ سامنے بیٹھی نور کو دیکھ کر بے ساختہ بولے۔

"انکل! میں بھی آپ کو بہت مس کرتی رہی۔" وہ حیدر کے آگے سر جھکاتے ہوئے بولی انھوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ حیدر، شہلا کو نہیں دیکھ سکے ایک دم شہلا کو یہ سب بہت برا لگا اگلے ہی لمحے اس نے اپنے آپ کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔

"شہلا! تم کب آئیں۔ آج تو سب لوگ کسی خاص موڈ میں لگے ہیں۔" وہ شہلا کے قریب جا کر بولے اور اسے بھی یاد دیا۔

"میں نے تبسم پھپھو کے ساتھ مارکیٹ جانا تھا، ابھی آئی ہوں۔" وہ اپنے لہجے میں چھپی ہنسی کو چھپانے لگی۔

"نور! میری بیٹی سے ملی ہو۔"

"جی انکل! اشی از کلک ویری ہائس ایڈز گریس فل!" وہ چپکتے ہوئے بولی تو شہلا نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"شہلا! نور بہت اسٹرونگ لڑکی ہے۔ اس کے بھڑش نہیں ہیں لیکن بہت ہمت سے ہر کام کرتی ہے اور بہت ذہین بھی ہے۔" ولیم سے زیادہ حیدر نے ہنستے ہوئے کہا تو ولیم کے منہ تانے پر سب کھلکھلا کر ہنس دیے۔

"شہلا! اسد نہیں آیا؟" حیدر نے اس کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"وہ رات کو فوجی لینے آئیں گے۔"

"حیدر! آج دیک ایڈ ہے۔ رات کو ہمارے بچے مغیث کی طاعت بھی ہے۔ وہ اور شفق آرہے ہیں۔ ان کو ایئر پورٹ لینے جانا ہے۔" تبسم آنٹی نے حیدر اکل کو بتایا تو ولیم کا دل لرز سا گیا۔ اسے شفق کے نام سے ہی ڈر لگے لگتا تھا۔ اس نے خوفزدہ لگا ہوں سے تبسم آنٹی اور نور کی طرف اور

پھر ماما کی طرف دیکھا۔ صرف ماماں کی لگا ہوں کا مطلب جان سکیں کیونکہ وہ بھی جانتی تھیں کہ شفق کے آنے کے بعد دونوں کو کس قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔

”ٹھیک ہے لیکن کیا آپ نہیں چلیں گی؟“ حیدر نے تبسم آپا سے پوچھا۔

”شہلا اکیلی ہوگی۔“ آپا نے ان کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

”جیسے ولیم میرے پاس ہوگا۔ آپ چلی جائیے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ آپا نے کہا۔ ولیم دھیل جھیر کو آہستہ سے چلاتے ہوئے باہر جانے لگا تو درجہ دی سے آگے بڑھی اور اسے لے کر اس کے کمرے میں چلی گئی۔

”ولیم! کیا بات ہے، تم ایک دم کیوں اپ سیٹ ہو گئے؟“

”نورا مجھے شفق کی خسر بھری نگاہیں اور لہجہ یاد آتا ہے تو بہت ڈر گئے لگتا ہے۔ نہ جانے وہ مجھ سے کیوں اتنی خائف ہے؟“ ولیم کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔

”تم اس قدر کیوں خوفزدہ ہو رہے ہو، کچھ نہیں ہوگا۔“ نور نے اسے تسلی دی۔



”انگل! میں ہمارے پاس نہیں جاؤں گی۔ آپ مجھے ڈینٹس والے گھر..... چھوڑ دیں۔“ شفق گاڑی میں ہی حیدر سے خند کر رہی تھی۔ تبسم آپا اور کرٹل منیٹ دونوں ہی اس کو مسلسل سمجھا رہے تھے مگر وہ کسی کی نہیں سن رہی تھی۔

”ٹھیک ہے حیدر بھائی! اس کو وہیں چھوڑ دیتے ہیں۔“ منیٹ انگل ایک دم بولے۔

”بیٹا! آپ کیوں ایسا کر رہی ہیں۔ سب بڑے سمجھا رہے ہیں اور آپ ہیں کہ اپنی بات پھاڑی ہوئی ہیں۔“ حیدر نے اسے مزید سمجھانا چاہا۔

”انگل! میں جب بھی ان کے سامنے جاتی ہوں، بدتمیزی کرتی ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس وقت ان کی حالت بہت خراب ہے اور مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے لیکن میں اپنے آپ پر کنٹرول نہیں رکھ سکتی۔“ وہ صاف گوئی سے بولی تو سب خاموش ہو گئے۔

”لیکن وہ اس وقت تمہاری منتظر ہے شفق بیٹا! ہم جا کر اسے کیا کہیں گے؟“ تبسم نے اسے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”آئی! میں کچھ نہیں جانتی۔ جو حقیقت ہے میں نے آپ کو بتا دی ہے۔ بس میں وہاں نہیں جاؤں گی۔“ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ حیدر نے اسے گھر ڈراپ کیا اور ہاتھی سب لوگ گلبرگ چلے گئے۔

رات کے دو بج رہے تھے۔ شہلا ابھی تک منتظر لگا ہوں سے اس کا شدت سے انتظار کر رہی تھیں لیکن ان سب کے ساتھ اسے نہ پا کر وہ پریشان ہی ہو گئیں۔

”شفق کہاں ہے؟ وہ کیوں نہیں آئی؟“ شہلا نے بے تابی سے پوچھا۔

”وہ ڈینٹس والے گھر میں ہے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ہم سامان رکھنے وہاں گئے تو وہ ادھر ہی رک گئی، نکل آ جائے گی۔“ حیدر نے آہستہ سے کہا۔

”نہیں، وہ نہیں آئے گی۔ وہ بڑی خدی ہے۔ وہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی۔“ آلسان کی آنکھوں سے بہہ کر تکپہ بھگونے لگے۔
”بھت کرو شہلا! کیا ہو گیا ہے؟“ تبسم آپا نے سمجھانا چاہا۔

”مغیٹ بھائی سے تاملو۔“ حیدر نے توجہ ہٹانے کے لیے کہا تو انھوں نے ان کی طرف دیکھا اور مسکرا دیں۔
”کیسی ہیں آپ؟“ کرمل مغیٹ نے خوش کن لہجے میں پوچھا۔

”ٹھیک ہوں، بس آخری سانس کا انتظار کر رہی ہوں۔ نہ جانے وہ بھی کیوں نہیں آ رہی؟“ دو ماہیس کن انداز میں بولی۔
”بہری بات! ایسی باتیں نہیں کرتے۔ خدا کی رحمت سے ماہیس نہیں ہوتے۔“ کرمل مغیٹ نے کہا۔

”خدا کی رحمت میری دفعہ نہ جانے کہاں چلی جاتی ہے۔ مغیٹ بھائی! میں تو ہمیشہ اس کی رحمت کی بھڑھری رہی اور وہ کبھی بھی میری چھت پر نہ برسی ساری زندگی میں ایک دفعہ بھی نہیں۔ مجھے تو بس مزائیں ہی ملی ہیں۔“ وہ بے حد شکہ لہجے میں بولیں تو سب لوگ پریشان ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

”شہلا! بلیر دل چھوٹا نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ذرا مغیٹ کو کھانا دوں پھر ہم سب ادھر ہی آتے ہیں۔ جسکے کچھ چاہیے تو نہیں۔“ تبسم آپا نے صورت حال کے پیش نظر کہا۔

”نہیں۔“ وہ آہستہ سے بولیں سب لوگ باہر نکل گئے۔

”مغیٹ! کیا آپ نے اس کو سمجھانے کی کوشش نہیں کی؟“ تبسم نے کرمل مغیٹ کے سامنے کھانا رکھتے ہوئے کہا۔

”تبسم! اس کا ذہن بے حد متحرک ہے۔ وہ ایسے سوال کرتی ہے کہ بعض اوقات میں خود بھی دنگ رہ گیا اور جو شخص ذہنی طور پر اتنا مستعد ہو اس کو سمجھانا بے حد مشکل کام ہے یہ نسبت اس شخص کے جراتنا ہا شعور نہ ہو اور تم جانتی ہو انسان جتنا زیادہ باشعور ہوتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ سوچتا ہے اور جتنا زیادہ وہ سوچتا ہے اتنا ہی زیادہ ڈپریشنڈر ہوتا ہے۔ اس کو کنوئیں کرنا اور اسے اپنے موقف سے ہٹانا شاید دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ وہ واقعی ذہنی طور پر بہت پریشان ہے۔“ کرمل مغیٹ نے سالن پیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”جن بچوں کی زندگی ایسے احوال میں گزری ہو ان کی سوچ بھی تو ویسی ہی ہوگی۔ یقین کریں آپا میں نے اسے کبھی مسکراتے کرتے ہوئے اور جیتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہر وقت پریشان رہتی ہے۔“ اب کی بار حیدر نے کہا تو کرمل مغیٹ نے بھی تائید کی۔

”وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن اب کیا کرنا چاہیے؟“ تبسم آپا ٹکرمندی سے بولیں۔

”میں خود پریشان ہو گیا ہوں۔ شہلا شدید پریشان ہے اور وہ کسی طور مانتی ہی نہیں۔ میں تو خود سخت الجھن میں ہوں۔“ حیدر بھی ٹکرمندی سے بولے۔
”آپا! کیا دلیم نے کھانا کھا لیا ہے؟“ حیدر نے ایک دم پوچھا۔

”دلیم کون؟“ کرمل مغیٹ نے گہری استکھامیہ لگا ہوں سے پوچھا۔

”وہ شہلا کا بیٹا ہے۔ وہ بھی شدید ٹینشن میں تھا۔ شکر ہے میرے سمجھانے سے کچھ بہتر ہوا ہے۔ وہ لوگوں کے رویوں سے خائف تھا، اب

بھر ہے۔" آپا نے بتایا۔

"شفیق، آفاق کو نہیں بھولتی۔" حیدر بولے۔

"اور آپا نے بھی تو ان کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ اس سارے جھگڑے میں تو اولاد ہی ہستی ہے نا۔ زیادہ تو انہوں نے ہی مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ شفیق میں اپنا رٹلی بہت بڑھ گئی ہے۔" تبسم آپا تاسف سے بولیں۔

"اب میرے لیے کیا حکم ہے۔ میں کل شام کو واپس جا رہا ہوں۔" کرل سفیٹ نے کہا۔

"ٹھیک ہے، آپ چلے جائیں۔ شہلا کی حالت خاصی خراب ہے۔ میں کچھ دوا بعد آ جاؤں گی۔" تبسم آپا نے کہا۔

"رائٹ اب میں کچھ آرام کروں۔ مجھے کمر اٹھا دو۔" کرل سفیٹ ایک مائیڈ پر لگے واش بیسن میں ہاتھ دھوتے ہوئے بولے۔

"آپا انصاف ولیم کے ساتھ والے کمرے میں لے گئیں اور حیدر اوپر کمرے میں چلے گئے۔ شہلا بے عین اور مضطرب سی بستر پر تڑپتی، سسکتی اور آہیں بھرتی رہیں مگر سب کچھ بے معنی لگ رہا تھا۔



نورخت پریشان تھی۔ انور بچپانے اس کا گھر سے لٹکنا بند کر دیا تھا۔ گوکہ وہ ان کے ایسے احکامات کو کم ہی خاطر میں لاتی تھی مگر اب کی بار تو وہ نہ جانے کیوں خاموش ہو رہے تھے۔ ہر وقت اس کے کمرے کے باہر بیٹھ کر اخبار پڑھتے رہتے۔ گھر سے بھی کم لگتے اور وہ ان سے کسی بھی قسم کی بحث میں پڑ کر گھر میں ٹینشن پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"راجیل مجھ سے رشے کا پوچھ رہا ہے۔ بولو میں کیا جواب دوں۔ میں نے بس کل تک کا وقت مانگا ہے۔" وہ قدرے غصے سے اس کے کمرے میں آ کر بولے تو وہ چونک گئی۔ اس سلسلے میں اس میں اور شرجیل میں کنٹسٹ ہو چکی تھی اب وہ کیوں ایسا کہہ رہے تھے۔ وہ سخت الجھن میں تھی۔ اس نے شرجیل سے رابطہ کرنا چاہا تو اس سے بھی بات نہ ہو سکی۔ اس نے ولیم کا نمبر ملایا۔ وہ اس وقت سو رہا تھا۔ اس نے فون میں ہی فون اٹھایا۔

"ہی ہیلو! کیا بات ہے۔ پریشان لگ رہی ہو؟" ولیم نے اسے قدرے گھبرائے ہوئے محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"ولیم! حیدر بالکل کہاں ہیں، میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"مگر بتاؤ تو سہی، آخر کس لیے اور نور تم جیسی لڑکی پریشان ہو، میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔" ولیم نے حیرانی سے کہا۔

"کیوں، میں انسان نہیں اور جب صورت حال ایسی ہو کہ قدموں تلے زمین بھی گردش میں آ جائے تو انسان بھاگ کر کہاں جائے۔ اس

وقت میں بھی ایسی ہی پھوٹن نہیں کر رہی ہوں۔"

"آخر ہوا کیا ہے؟"

"انور بچپا خواخواہ میں میرا شرجیل کے ساتھ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونک سا گیا۔

”مجھے قطعی علم نہیں کہ ان کی اس بزنس ڈیل کے پیچھے کیا پلاننگ ہے۔ شرجیل اچھا انسان ہے اور اس سے میری اس سلسلے میں بات بھی ہوئی ہے لیکن شرجیل کے ڈیڑی اور انور چچا تو بس میری جان کو ہی آگے ہیں۔ برصورت میں یہ رشتہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ کاروبار کے ساتھ ساتھ رشتہ بھی ایسا مضبوط ہو کر ٹوٹنے کا سوال ہی پیدا نہ ہو سکے۔“

”اور انور تم کیا چاہتی ہو؟“ وہ آہستہ سے بولا۔

”ظاہر ہے میرے اٹار کی وجہ سے ہی وہ مجھ پر سختی کر رہے ہیں؟“

”تو تم دو گھری کیوں نہیں چھوڑ دیتیں؟“

”کم آن ولیم! دنیا میں صرف اور صرف یہی میرے رشتے دار ہیں۔ ان کے بغیر میں ادھوری ہوں۔ میری کہیں بھی کوئی پہچان نہیں اور نہ

ہی کوئی اور مجھے قبول کرے گا۔ میں اس حقیقت کو بھٹکا نہیں سکتی۔“

”اور انور دل کے رشتے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”نہیں ولیم! دل کے رشتے انسان کو کوئی شناخت نہیں دے سکتے اور نہ ہی کسی کو شوش کر اس سے بچا سکتے ہیں۔ یہ تو ایک شخص کے وجود اور

اس کی روح تک بھدور رہتے ہیں۔ دنیا کی نظر میں تو یہ بے نام رشتہ ہوتا ہے اور جس کا اپنا کوئی نام نہ ہو، دنیا اس سے ساری پہچان چھین لیتی ہے۔ یہ تو

ادھورے رشتے ہوتے ہیں۔“ وہ بہت عجیبی سی بولی۔

”تو کیا تم اور میں؟“

”معلوم نہیں۔“ وہ آدھ کر بولی۔

”نور! تم نے تو زندگی کی آخری سانس تک وعدہ بھانے کو کہا ہے۔“

”ہاں اور میں یہ پورا کر کے رہوں گی بشرطیکہ.....“

”بشرطیکہ کیا.....؟“

”خدا ساتھ ہو، میں نے تم سے جب بھی کہا تھا۔ وہ اگر ساتھ نہ دے اور کائنات کی ساری قوتیں بھی مل کر میری مدد کریں تو میں کچھ نہیں کر

سکوں گی۔“

”نور! خدا کیوں ہمارا ساتھ نہیں دے گا۔ وہ تو ہم سب سے محبت کرتا ہے۔“

”لیکن ولیم! خدا سے کچھ طلب کرنے کے لیے پہلے اپنا تعارف بھی تو کروانا پڑتا ہے نا۔“

”کیا مطلب..... کیا میرا انسان ہونا کافی نہیں۔“

”نہیں، انسان تو اس نے بہت سے پیدا کیے ہیں مگر بہتوں پر غضب ناک بھی ہوتا ہے۔ کسی کی طرف تو دیکھتا بھی نہیں اور کسی پر اپنی جھٹیں

اور جھٹیں نچھاور کرتا جاتا ہے۔ ہمیں خود کو تعین کرنا چاہیے ہم کس کھٹکری سے تعلق رکھتے ہیں۔“ وہ بلا واسطہ انداز میں سمجھا رہی تھی۔

"کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ مجھے بحیثیت کرکچن کہیں بھی قبول نہیں کیا جائے گا؟"

"ولیم! جو تم نہیں ہو وہ تم کیوں دنیا کے سامنے بن رہے ہو۔ تم تو کرکچن بھی نہیں۔"

"اور اگر کرکچن ہوتا تو باقی لوگوں کی طرح تمہارے گھر والے بھی مجھے نفرت کی لٹاؤ دیکھتے۔" اس کے لہجے میں فلسفگی سی پیدا ہو گئی۔

"نفرت کی نہیں بلکہ حیرت کی لٹاؤ ہے۔ ولیم! تم سمجھ کیوں نہیں رہے۔"

"آخر جو تم مجھے سمجھانا چاہتی ہو صاف صاف کیوں نہیں کہیں۔"

"بے وقوف تم بھی نہیں۔"

"آج تمہارے گھر والے میرے نان مسلم ہونے پر اعتراض کر رہے ہیں۔ کل میرے معذور ہونے پر کریں گے۔ نور اس سوائی کے

پھانٹ آف دیو سے میں کسی بھی طرح تمہارے قابل نہیں۔ آئی ایم ریجنیکلٹ بائے آل۔۔۔۔۔ ہر کوئی مجھ سے نفرت کرتا ہے۔۔۔۔۔ ہر کوئی مجھے یوں دیکھتا

ہے جیسے میں بہت سی گتھکار، ناپاک انسان ہوں۔ سب لوگ اتنے تنگ دل کیوں ہیں؟"

"ایسی بات نہیں، تم غلط سمجھ رہے ہو۔" اس نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"نہ ہب۔۔۔۔۔ نہ ہب۔۔۔۔۔ سب لوگ نہ ہب کے ٹھیکیدار بنے ہوئے ہیں۔ بس تم لوگوں کا ہی خدا اور رسول ہے باقی کسی کا نہیں۔ تم لوگ

دیوانے ہو چکے ہو۔" ولیم کی آواز طے سے غمر غمرانے لگی اور اس نے فون بند کر دیا۔

نور بیٹو، بیٹو کتنی ری گھر وہ فون بند کر چکا تھا۔ نور کا دل شدت سے تڑپنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ اب وہ دروہا ہو گا اور وہ اسے دلاسا دینا

چاہتی تھی اس کے پاس جانا چاہتی تھی اس نے چاہی اٹھائی اور باہر نکلتا چلا۔ انور بچا کی غشکیں نگاہوں نے اس کا تعاقب کیا۔

"کہاں جا رہی ہو؟" انھوں نے غصے سے پوچھا۔

"مارکیٹ تک، مجھے ضروری کام ہے۔" وہ بے پروائی سے بولی۔

"اب جھوٹ بولنا بھی شروع ہو گئی ہو۔ میں جانتا ہوں تم کہاں جا رہی ہو۔"

"انکر جانتے ہیں تو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"کیوں اس بند کردار اور اندرونی ہو جاؤ۔" وہ اس پر چلاتے ہوئے بولے۔ اس کے لیے ان کا لہجہ اور یہ انداز وہاں اس قدر غیر متوقع تھا کہ وہ

حیران رہ گئی۔ وہ تو انھیں ہمیشہ مضبوط پر تائی سمجھتی آئی تھی اور وہ اب کیسے بدل رہے تھے۔

"مجھے جانے دیں، مجھے بہت ضروری کام ہے۔" وہ لاؤنج عید کرنے لگی تو انھوں نے زنائے دار چھڑا کر اسے جڑ دیا۔ وہ بے ہوش ہونے

کے قریب تھی۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

انور بچا اور ایسا رویہ۔۔۔۔۔ وہ تو ان کو کبھی اتنی اہمیت ہی نہیں دیتی تھی۔ پھپھو کے گھر بچو پا اور ان کے بچوں کا رویہ اس سے اچھا نہیں تھا تو اس

نے مستقل بچا کے پاس رہنے کا سوچا تھا اور اب وہ نہ جانے کیوں ایسا کر رہے تھے۔ جیتنا یہ سب اس کی محبت اور بہتری کے لیے تو نہیں کر رہے تھے۔

یہ وہ بھی اچھی طرح جانتی تھی۔ انھوں نے اسے کمرے میں دھکا دیا اور دروازہ زور سے بند کر دیا۔ اس لمحے وہ بہت روئی۔ اسے اپنی ذات کی اتنی حقیر محسوس ہوئی کہ پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو اپنے آپ کو بولڈ سمجھتی تھی اور اپنے آپ کو اس قابل سمجھتی تھی کہ وہ ہر پوزیشن میں ڈھل کر سکتی ہے مگر یہ کیا..... وہ تو ذرا ناک انگلی۔ ایک عورت جس کی کوئی پہچان نہیں تھی۔ وہ ان سب کے بلنڈ ادھوری تھی اور عورت چاہے معاشرے کے اعلیٰ ترین طبقے سے تعلق رکھتی ہو یا پچھلے سے، اسے اپنی ذات کی وابستگی اور شناخت کے لیے ہمیشہ سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب اسے رفتہ رفتہ اپنی حیثیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ نہ وہ ان لوگوں کو چھوڑ سکتی تھی اور نہ ان کے سامنے سر ہڈ کر سکتی تھی۔ سچی تو کسی بات میں ڈھل نہیں دے رہی تھیں ورنہ وہ ہر بات میں چچا کر ڈانٹ کر رکھ دیا کرتی تھیں۔ ایسی پوزیشن میں وہ سخت ڈپریشن کا شکار ہو رہی تھی۔ کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ولیم کے لیے کیسے بات کرے جس کو اپنی منزل کا خود علم نہیں تھا۔ وہ تو راستے کے پتھر کی طرح خود ادھر ادھر لڑھک رہا تھا۔ کس طرح اس کی وکالت کرے۔ کوئی ٹھوس بنیاد ہی نہیں تھی۔ وہ کوئی مضبوط سہارا نہیں تھا جس پر وہ بکیہ کر سکتی۔

ولیم دونوں سے کمرے میں بند تھا۔ لائٹ آف کیے ہالنگ خاموش..... کبھی بستر پر لیٹ جاتا تو کبھی دھیل چیر پر بیٹھ کر کمرے میں ادھر ادھر چکر لگا کر شروع کر دیتا۔ شہلا بار بار اس کا پوچھ رہی تھیں اور آپا کرے کی لائٹ آف دیکھ کر باہر سے ہی چلی جاتیں۔ وہ بے حد مضطرب تھا۔ اسے اس وقت نور کی بہت ضرورت تھی۔ نور ہی نے تو اس کی زندگی میں رنگ بھرنے کی کوشش کی تھی۔ ہر قدم پر اسے امید کی کرن دکھائی تھی۔ اس کی مضطرب اور منتشر سوچوں کو سنوارنے کی کوشش کی تھی اور اب وہ اس سے بچھڑ جائے گی۔ یہ تصور ہی سوہان روح تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کسی طرح بھاگ کر اس کے پاس چلا جائے۔

اسے اپنی زندگی کا کوئی مقصد نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ کس قدر منتشر انسان ہے۔ اس کا کیا ٹھوچ ہوگا؟ ادھوری شخصیت، معذور جسم، ادھوری تعلیم، ادھوری پہچان، وہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے نام والے، عزت و ناموس والے وقت کے بھاؤ میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں اور وہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے شدید کمپلیکس ہونے لگا تھا۔ پہلے تو ہمیشہ اسے ڈپریشن ہوتا تھا اور اب کمپلیکس بھی، شدید احساس کمتری..... وہ حیدر انکل سے بات کرنا چاہتا تھا مگر اس کے پاس کیا تھا۔ کس بنیاد پر ان سے بات کرے۔ وہ اپنے آپ سے لڑ کر تھک گیا تھا۔ ایک دم لائٹ آن ہوئی۔ کمرے میں ہر طرف روشنی سی پھیل گئی۔ عیسیم آتی مسکراتی ہوئی اس کے سامنے کھڑی تھیں، وہ چونک سا گیا۔

”کیا بات ہے وٹا! کیوں اس قدر پریشان ہو؟“ انھوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”آئی..... نور.....!“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”کیا ہوا نور کو؟“

”کچھ نہیں.....“ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ انھیں کیا اور کیسے بتائے۔

”اس سے بہت محبت کرتے ہو، کیا وہ بہت اچھی لگتی ہے؟“

”ہاں۔“ وہ آہستہ سے سر جھکا کر بولا۔

”اور وہ؟“

”وہ بھی۔“

”تو پھر مسئلہ کیا ہے؟“

”آئی! مسئلہ میں ہوں۔ اس کے بچے اس کی شادی نہیں اور کرنا چاہ رہے ہیں اور وہ دوسرے پر بہت سختی کر رہے ہیں۔“

”ہائیں ایہ۔۔۔۔۔ یہ کیا بات ہوئی۔ میں اور حیدر خود ان کی طرف جاتے ہیں۔“ وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولیں۔

”نہیں آئی، وہ کسی سفر پر اور وہ بھی کر سکتی ہے ہرگز شادی نہیں کریں گے۔“ تبسم آئی کے قدم وہیں رک گئے اور وہ خاموشی سے اس کی

طرف دیکھنے لگیں۔

”تو تم کیوں مسلمان نہیں ہو جاتے؟“ آئی ایک دم بولیں تو اس نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

”میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔ مجھے اسلام کی ابھی تک کسی بھی بات نے متاثر نہیں کیا کہ میں اسے فوراً قبول کر لوں۔“ وہ دھڑک لہجے میں بولا۔

”تو کیا تم نور سے متاثر نہیں اور کیا وہ مسلم نہیں؟“

”اس نے بحیثیت انسان مجھے متاثر کیا ہے۔ ہم دونوں نے کبھی مذہب کو اس طرح ڈسکس نہیں کیا جس طرح کرنا چاہیے۔ مگر کیا بھی ہے

تو بہت کم۔“

”تو تم کیا چاہتے ہو، ہر مان مسلم کی طرح تم بھی کسی مجرے کے طلب گار ہو؟“

”لیکن کچھ تو ایسا ہو جو روح کو متاثر نہ کرے اور انسان کو پھر رافرا نظر نہ آئے۔ کیا مسلمانوں کے پاس ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔“

”کیوں نہیں ہے۔ اگر آج بھی کھول کر دیکھو گے تو سب کچھ ہے۔ اگر بند رکھ کر دیکھنے کی کوشش کرو گے تو سامنے کا منظر بھی نظر نہیں آئے

گا۔۔۔۔۔ مسلمانوں کے پاس ان کا نبی ﷺ ہے۔ ایسا نبی ﷺ جس کی ذات معجزہ ہے۔ جو شخص پڑھنا لکھنا نہ جانتا ہو اور ساری دنیا کی مخلوق کے حقوق متعین

کر دے جو ہر حق دنیا تک ایک مشورہ کے طور پر مانے جاتیں۔ کیا یہ معجزہ کسی سے کم ہے اور ہمارا کلام ایسا ہے جو ہر حق سے بھی سخت دلوں کو صوم کر دے۔“

”یہ بھی تو حیرت کی بات ہے کہ اتنے اعلیٰ نبی ﷺ کے ماننے والے دوسروں کو اتنا حقیر اور کمتر سمجھیں۔ مجھے اب تک جن رویوں کا سامنا

کرنا پڑا ہے، مجھے تو مسلمانوں نے بہت مایوسی کیا ہے۔“ وہ مایوسی سے بولا۔

”کیا ان سب میں سے کوئی ایک بھی اس قائل نہیں ملا جو تمہاری سوچ کو بدل سکے۔ اگر ایسا ہے تو تمہارا ہم ہیں نہ کہ ہمارا مذہب اور کلام۔“

”ہاں ملا ہے، صرف آپ، حیدر انکس اور نور۔“

”کیا اتنے بہت سوں میں سے یہ چھ کوئی اہمیت نہیں رکھتے؟“

”لیکن صرف اس بات کے لیے ذمہ داری کا سب سے بڑا فیصلہ بدلا بھی نہیں جاسکتا۔“ وہ قطعیت سے بولا۔

”آخراً کیا چاہتے ہو؟“ تبسم آئی نے حیرت سے پوچھا۔

”ایسا شعلہ جو میرے اندر پکڑ کے تو میرے اندر کو جلا کر راکھ کر دے۔ میں کچھ ایسا..... محسوس کرنا چاہتا ہوں جو میرا ماضی، میرے اس بنگ کے حقائق اور میرا سب کچھ بہا کر لے جائے اور گھٹنے ٹیکنے کے سوا کچھ مجھے کوئی راہ نظر نہ آئے۔“ تبسم آتی اس کی بات سن کر خاموش ہو گئیں۔

شہلا کے بچے کتنے عجیب ہیں۔ شفیق بھی انتہائی عجیب و غریب باتیں کرتی ہے، نہ بھکنے والی اور ولیم بھی..... شاید ان کی سرشت میں ایک ہی لیے میں ہر تسلیم ختم کرنا شامل نہیں۔ وہ ہر ہر بات کے پس منظر اور اس کے ہر پہلو پر مکمل بحث کرتے ہیں..... یا تو جھجھکس ہیں یا پھر انتہائی ضدی۔ تبسم آج پانچ گھنٹے کے دوپہر بہت عجیب لگے۔ پہلے شفیق نے نہ بھکنے والی باتیں کی تھیں اور اب وہ بھی ایسی ہی بھٹکس کر رہا تھا۔ وہ خود بھی الجھ گئی اور اٹھ کر چلی گئیں۔



پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام

شہلا کی طبیعت اچانک بہت خراب ہو گئی تھی۔ شام سے ہی ان کا دل گھبرا رہا تھا۔ وہ بار بار ہاتھ اور پاؤں بستر پر زور زور سے مار رہی تھیں۔ آنکھیں قدرے ہار کر کھل آئی تھیں۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ آپا تو گھبرا گئیں۔

”کیا بات ہے شہلا! کیا محسوس ہو رہا ہے؟“ وہ گھبرا کر پوچھیں۔

”آپا! بس میرا آخری وقت آ گیا ہے، پلیز شفٹ کو بلا لیں۔۔۔ حیدر کو کہیں اس کو ایک دفعہ صرف۔۔۔ صرف ایک دفعہ لے آئے۔“ ان کی سانس اکھڑ رہی تھی اور وہ شفٹ سے ملنے پر مصر تھیں۔

”اچھا تم فکر نہیں کرو۔ میں ابھی حیدر کو فون کرتی ہوں۔“ انھوں نے حیدر کے موبائل پر رنگ کیا اور انھیں شفٹ کو لے کر کہا۔

”اچھا، میں کوشش کرتا ہوں۔“ وہ آہستہ سے بولے۔

”آپا اولیم کو بھی میرے پاس لے آئیں۔“

”اچھا۔“ وہ اٹھ کر اسے لینے چلی گئیں۔

”آپ مجھے کہاں لے کر جا رہی ہیں؟“ ولیم نے حیرت سے پوچھا۔

”شاید یہ تمہاری ماما کے آخری لمحات ہیں اور وہ تمہیں اپنے پاس دیکھنا چاہتی ہے۔“ آپا کی آنکھوں سے ایک دم آنسو بہہ نکلے۔

”جہیں، یہ کیسے۔۔۔ اُس اسیا سٹیل!“ وہ لرز سا گیا۔ موت کی موجودگی کا احساس تو تھا مگر یوں اس قدر اچانک سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اس نے سوچا بھی نہ تھا اور وہ بھی ماما۔۔۔ اگر ماما کو کچھ ہو گیا تو اس کا کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ ایک ہی لمحے میں بے شمار سوچیں اس کے دماغ کا احاطہ کرنے لگیں۔ آپا اسے لے کر کمرے میں داخل ہوئیں۔ شہلا بستر پر ٹپ رہی تھیں۔

”ولیم! تم آگے۔“ شہلا نے اپنا لرزاں ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

”ہاں ماما، میں ادھر ہی ہوں اور آپ بھی میرے پاس ہیں، آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔“ اس نے انھیں تسلی دینی چاہی۔

”جہیں، اب نہیں، اب میرے پاس وقت نہیں۔ ولیم! وعدہ کر دو شفٹ کو کہیں جہاں نہیں چھوڑو گے۔ وہ بہت اکیلا ہے۔“

”ماما! آپ کیسی بات کر رہی ہیں۔ آپ سب جانتی تو ہیں۔“ وہ حیرت سے بولا۔

”جہیں، میں کچھ نہیں جانتی، میں کچھ نہیں جانتی۔ بس تم دونوں حیدر اٹکل کے پاس رہو گے۔ کبھی ایک دوسرے کو نہیں چھوڑو گے، وعدہ کر دو۔“ وہ بے حد مضطرب ہو کر بولیں۔

”شہلا! صحت کرو اور یہ میری پالیو۔“ آپا نے میرپ ایک جھج میں ڈال کر اسے پلانا چاہا۔

”جہیں، اب اس کی ضرورت نہیں۔ آپ بس میرے پاس بیٹھ کر کچھ قرآن پاک سنا دیں تاکہ میری جان آسانی سے نکل سکے۔ آپا! اس وقت میں سخت تکلیف میں ہوں۔ شفٹ ابھی تک نہیں آئی اور حیدر کہاں ہے۔ اس کو کہیں جلدی آئے۔“ وہ دروازے کی طرف دیکھ کر بولیں۔

”بس وہ آ رہے ہیں، میں نے فون کر دیا ہے۔“

”آپ مجھے قرآن سے کچھ سنا دیں۔ وقت بہت کم ہے، میری جان نکل رہی ہے۔“ ولیم ماں کی ایسی حالت دیکھ کر سخت مضطرب اور پریشان ہو رہا تھا۔

آپا جلدی سے قرآن پاک لے آئیں اور سورہ طہین پڑھنے لگیں۔ ولیم خاموشی سے سنتا رہا اور اس دوران ماما کو آہرز دکر تارہا۔ وہ کس طرح ایک خوبصورت، صحت مند عورت سے ایک مضمحل، بیمار، ہڈیوں کا بچہ بن کر رہ گئی تھیں۔ نہ سر پر بال تھے نہ جسم پر گوشت۔۔۔ جلد کی رنگت بھی جل کر سیاہ ہو چکی تھی اور اب تو ان کی حالت ایسی خوفناک ہو رہی تھی کہ دو ڈر رہا تھا۔ وہ کبھی پاؤں کو زور سے جھٹکتی تھیں، کبھی ہاتھوں کو بستر پر مارتیں۔ کبھی منہ پر ہاتھ بھیرتی تھیں۔ چہرے پر شدید کرب اور اضطراب کے آثار تھے اس سے ان کی یہ کیفیت برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

”اور تم مرنا تو مسلمان ہی مرنا۔ شہلا اکلمہ پڑھ لو۔“ آپا نے آیت پڑھی تو ولیم کا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ وہ بہت دلوں سے اپنے آپ کو مصروف رکھے ہوئے تھا۔ نور کی ذات میں اور اس کے بارے میں گہری سوچوں نے اس کی توجہ اس طرف سے ہٹا رکھی تھی اور اب پھر سب کچھ عود کر باہر آ رہا تھا۔ وہ پھر مضطرب ہو رہا تھا۔ وہ پھر ایسی کیفیت سے دوچار ہونے لگا تھا۔ راور فرار نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کا اندازہ تحمل و تحمل ہونے لگا۔ ایسا اضطراب اور بے چینی پیدا ہونے لگی جو شاید اس وقت ماما کے چہرے پر نمایاں تھی۔

”شہلا اکلمہ شہادت پڑھتی جاؤ۔ میرے ساتھ پڑھو۔“ آپا کلمہ پڑھنے لگیں تو شہلا کی آنکھوں سے جیسے دھارے پھوٹ پڑے۔

”اے انسان! تو کشاں کشاں اپنے رب کی طرف چلا جا رہا ہے اور اس سے ملنے والا ہے۔“ آپا نے ایک آیت کا ترجمہ پڑھا اور پھر اسے تسلی دی۔

”وہ محاف کرنے والا ہے اور اس کی رحمت انسان کو ہر جگہ گھیرے ہوئے ہے۔ فکر نہیں کرو، سب بہتر ہوگا۔“ آپا نے محبت سے کہا اور اس کے سر پر ہاتھ بھیرا۔ وہ شدت سے رو رہی تھیں، جاں ہلب تھیں۔ تڑپ رہی تھیں اس مچھلی کی طرح جسے سمندر سے نکالا گیا ہوا اور وہ دوبارہ پانی میں جانے کے لیے تڑپ رہی ہو۔ دم توڑنے سے پہلے اپنے وجود کی ساری قوتوں کے ساتھ ہر ممکن زندہ رہنے کی جدوجہد میں مصروف ہو۔ ان کے لب بھی آہستہ آہستہ مل رہے تھے۔ وہ کلمہ پڑھنے کی پوری کوشش کر رہی تھی مگر کلمہ ادا کرنا انتہائی مشکل ہو رہا تھا۔ زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ قوت گویائی زائل ہو رہی تھی۔ زبان اکڑ گئی تھی یا پھر کوئی غیر مرئی قوت اسے ان کے لیے مشکل بنا رہی تھی۔ ان کا ناتواں وجود کلمے کا بوجھ نہیں سہہ پا رہا تھا۔ وہ الفاظ کو تھکیٹ رہی تھیں۔ ساری ذخیرہ توڑ کر کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کے ہونٹ سکڑ رہے تھے، زبان خشک ہو رہی تھی۔ گلے میں کانٹے اور ان کی شدید جھنجھٹ تھی۔ شاید ایمان اور عقائد آپس میں برسرِ پیکار تھے یا پھر دوبارہ از سر نو روح میں طویل ہو رہے تھے۔ جس چیز کا اعادہ دنیا میں آسان تھا شاید اب اس ہستی کے سامنے اقرار مشکل ہو رہا تھا۔ بنیادی کے دوران شہلانے بارہا کلمہ پڑھا تھا اور اب ایک دفعہ کی ادا نیکی بھی مشکل ہو رہی تھی۔ شاید جسم اور روح کی آپس میں چٹختش تھی۔ جسم کی ساری قوتیں، روح کی ساری سہائیاں، حواس کی ساری لطافتیں اور جذبات کی ساری نزاکتیں۔۔۔۔۔ سب کچھ صرف ایک کلمے کی ادا نیکی میں صرف ہو رہی تھیں مگر پورا کلمہ پھر بھی ادا نہیں ہو پا رہا تھا۔ ”یا اللہ! حیرتِ رحمت کبھی مجھ پر مکمل کر نہیں۔۔۔۔۔ اب کی بار صرف آخری بار مجھے اس سے نوازا دے۔“ شہلانے دل میں گڑگڑا کر دعا کی۔

”اور ہم نے انسان کو احسن ترین صورت میں پیدا کیا پھر اسے اسفل ترین گھاٹی میں پھینک دیا۔“

وہ اس گھاٹی سے نکلنا چاہ رہی تھیں۔ اندر ہی اندر التجائیں کر رہی تھیں۔ سارے گناہ مجرم بنے ان کے سامنے کھڑے تھے اور وہ سر نہیں اٹھا پارہی تھیں۔ ان کی حالت ناقابل بیان حد تک خراب اور مضطرب ہو رہی تھی۔ شاید وہ مسلمان ہونے کا اعادہ کر رہی تھیں۔ کلمہ اور مہم کی جدوجہد۔۔۔۔۔ آخری لمحوں کی اضطرابی کیفیت۔۔۔۔۔ رگوں میں گردش کرتے خون کی توانائی سے خارج ہونے والی اکھڑتی سانپوں کے ساتھ اعراب اور تلفظ کی قیود سے آزاد بعض الفاظ ادا کرنا چاہ رہی تھیں۔ ایسا کلمہ جو شاید نامہ اعمال میں سب سے بھاری تھا۔ جس کا اقرار انسان کی راہیں متعین کرتا ہے، اس کی حد بندی کرتا ہے۔ اسے ذرہ خاک سے ذرہ آفتاب بنادیتا ہے۔ اسے وحدہ لاشریک کی ہستی کے سرور و رموز سے آشنا کرتا ہے اور عام حقیر انسانوں کے جہدم سے نکال کر اسے ایک قابل عزت ہستی کا درجہ دیتا ہے۔

”اور ہم نے تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا۔“ انسان کے وجود کو اتنی جلا بخشنے والا کلمہ یقیناً بھاری تھا۔ نامہ اعمال میں سب سے بھاری جس کا اقرار انہیں کہیں پہنچا رہا تھا، ان کی راہیں متعین کر رہا تھا۔ انہیں گناہوں سے پاک کر رہا تھا۔ وجود کی آلائشوں اور گنہ گریوں سے ان کو معاف کر رہا تھا۔ ان کی منزل متعین ہو رہی تھی۔ وہ خطا و نسیان کے ادوار سے نکل کر اقرار کی منزلوں پر گامزن تھیں، خوشتر تھیں۔ وہ سب کچھ حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اسے اضطراب میں وہ سب کچھ بھول چکی تھیں۔ شفق، حیدر، ولیم، آپا کوئی بھی ارد گرد نہیں تھا۔ صرف ایک ہستی سامنے تھی اور وہ اس کے سامنے اقرار کرنے کی سرگرمی و کوشش میں مصروف تھیں۔

”لا۔۔۔۔۔ اللہ۔۔۔۔۔ محمد۔۔۔۔۔“ الفاظ سمجھ نہیں آ رہے تھے۔ سانس کی کھڑکھڑاہٹ، گلے کی گڑگڑاہٹ، آواز کی قمر قرعہ آہٹ اور جسم کی کپکپاہٹ۔۔۔۔۔ سب ہی قوتیں بہت مشکل سے ان الفاظ کا اعادہ کر رہی تھیں۔ ولیم حیرت سے آنکھیں کھولے دیکھ رہا تھا ایسا مضطرب و روح فرسا تھا۔ انسان کو لڑو دینے والا، اس کا انجام بتا دینے والا، کس قدر تکلیف دہ اور سخت تھا۔ بس یہی ہے انسان، اس قدر بے بس، وہ الفاظ ذہرانے کی بار بار کوشش کر رہی تھیں، دل چھٹ رہا تھا، روح خشک ہو رہی تھی۔ ساری قوتیں، توانائیاں اور لحاظاتیں زائل ہونے کو بے تاب تھیں۔ ولیم کا اپنا دل بے تاب ہو رہا تھا۔ اسے اچانک ایسی ہستی کا شعور ہو رہا تھا جسے وہ جھٹلاتا آیا تھا جس تک پہنچنے کے لیے اس نے غلط راہوں کا انتخاب کرنا چاہا تھا۔ شاید اس کے اپنے بھی زاویہ درست ہو رہے تھے۔

”جیسے اللہ نور نہ دے اس کے لیے پھر کوئی نور نہیں۔“ اسے اس نوری تابانیاں اپنے حصار میں لے رہی تھیں۔ اس کے اندر جذبات طوفان کی صحت میں لہر رہے تھے، دل شق ہو رہا تھا، روح پھن پھن رہی تھی۔ کچھ کرنے کو آکساری تھی۔ ایسا اقرار جو اسے حیات کے سرور سے آشنا کر دے۔

”ہم مقرر ہیں ان کو اپنی نشانیاں ان کے گرد و نواح میں بھی دکھادیں گے اور خود ان کی ذات میں بھی اور یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہی حق ہے۔“

ایسا اضطراب اور استعار اس نے کبھی زندگی میں محسوس نہیں کیا تھا۔ اچانک فون کی بیل بجنے لگی۔ آپا بھی اندر ہی اندر پریشان تھیں۔ جلدی میں قرآن پاک کو رمل پر کھلا رکھ کر باہر نکل گئیں۔ ولیم پہلے ہی بے تاب ہو رہا تھا۔ مہم کی کیفیت، آیات کا ترجمہ اس کے دل کو کھینچے میں جکڑ رہا تھا۔

اس کا دل بھر رہا تھا جیسے کسی مائع سے لبریز ہو رہا تھا۔ وہ جی بھر کر رونا چاہ رہا تھا مگر آنسوؤں کو ضبط کیے ہوئے تھا۔ اس نے بغیر ہاتھ لگائے قرآن کے ایک کھلے ہوئے صفحے کو پڑھنا چاہا۔ عربی سمجھنا آتی تو ترستے پر نظر دوڑائی۔

”اور جب غمگینوں کے دفتر کھولے جائیں گے اور جب آسمان کی کھال کھینچ لی جائے گی اور جب دوزخ کی آگ بجڑ کائی جائے گی اور بہشت جب قریب لائی جائے گی جب ہر شخص معلوم کر لے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔“

اس نے جیسے ہی ترجمہ پڑھا اس کا دل لرزنے لگا۔ اس نے ایک تک مہم کی طرف دیکھا۔

”تب ہر شخص معلوم کر لے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے؟“ اس نے ایک لمحے کے لیے اپنے بارے میں سوچا۔ ”کیا لے کر آیا ہے؟“ کچھ بھی نہیں..... خالی ہاتھ..... خالی دل..... خالی روح..... کچھ بھی نہیں..... کیا لے کر آیا ہے؟ کچھ بھی نہیں.....“ اس کا دل پکار پکار کر اس سے سوال کر رہا تھا۔ اس کے اندر عظیم سائبہ پاہونے لگا۔ ہر طرف چیخ و پکار تھی۔ نہ جانے کہاں سے ایک آنسو گرا، دوسرا بھرتیرا اور تیسرا ہی لگ گئی۔ اٹک بیٹے لگے۔ مائع سے لبریز دل، انگلیوں کی صورت میں اندر کے غبار کو خارج کرنے لگا۔ نہ جانے کون روح کو بھنچوڑ رہا تھا۔ جسم کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ اس کے دو گئے کمرے ہو رہے تھے۔ دل پیٹنے کو تھا۔ کہیں فرار کا راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ساری راہیں مسدود نظر آ رہی تھیں۔ بس کھینچے کھینچے کو دل چاہ رہا تھا..... سر تسلیم خم کرنے کو مجبور کر رہا تھا۔ مارتپ رہی تھیں۔ عجیب بے چارگی اور بے بسی کا عالم تھا۔ وہ بری طرح سرا دھرا دھرا رہی تھیں۔ لمحہ بہ لمحہ ان کی جان جسم کے ایک ایک روعیں سے کھینچی جا رہی تھی۔ نزع کی کیفیت دہ تھی۔ وہ کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔ ان کی تکلیف محسوس کر سکتا تھا مگر مجبور تھا۔ بے بس تھا، کتنا قریبی رشتہ اور کس قدر محبوب، وہ اس وقت بالکل تنہا اور بے سہارا لگ رہی تھیں۔

”کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔“

”مما..... ممما..... پلیز بہت کریں۔“ اس نے سخت مضطرب ہو کر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تسلی دینی چاہی مگر وہ کچھ بھی نہیں سن رہی تھیں۔ بس شدید کرب میں مبتلا تھیں۔ کرب، اضطراب، ملال، ہوکھ، رنج، غم..... کبھی باتوں کو بند کرتیں اور کبھوتیں۔

”کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمہیں ہماری طرف کبھی پلٹنا ہی نہیں ہے۔“

نہ کوئی دوا کام آ رہی تھی، نہ دوا۔ وہ بھی الفاظ بھول گیا تھا۔ دعائیہ الفاظ..... جو کبھی قادر نے اسے سکھائے تھے۔ وہ یاد کرنا چاہ رہا تھا مگر ذہن خالی ہو چکا تھا۔ اس میں اب کوئی پرانی یاد باقی نہ تھی۔ وہ پریشان ہو گیا پھر قرآن کی طرف نظر دوڑائی۔ شاید کہیں سے الفاظ مل جائیں جن سے وہ ماما کو تسلی دے سکے۔

”اور تمہیں کس چیز نے اپنے رب کریم کے بارے میں دھوکے میں ڈالا۔“ اس کی انا پرکاری ضرب تھی۔ اس کا وجود کھپتی کھپتی ہو گیا۔ سامنے مامائیں اور ان کا کھل کھل..... ایک طرف وہ تھا خالی الذہن..... اس نے ایسا شعلہ لگا تھا جو اندر کو بھڑکا دے اس کی ہستی کا ثبوت مانگتے والا، اب ایک ہی وار میں چاروں شانے چت ہو گیا تھا۔ بلند و نامک دعوے ہوا ہوا ہے تھے۔ مخلوق اور اولیٰ پر نکمے کرنے والا خود ہی دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ بس چند الفاظ نے شعلہ بھڑکا دیا تھا اور اس کے وجود کو خاکستر کر دیا تھا۔

تجسم آئی اسے سبھاری تھیں۔ حیدر اکل کوغیس کر رہے تھے مگر وہ امن ہی نہیں رہی تھی۔ ”صرف ایک دفعہ آ جاؤ۔“ تجسم آئی نے انتہائی ملتی جلتا انداز میں کہا تو اس نے فون رکھ دیا۔ بعض اوقات لحوں کی تکلیف انسان کو خوفناک حد تک منتشر کر کے رکھ دیتی ہے۔ تجسم نے آدھ بھر کر سوچا اور دل ہی دل میں خدا سے دعا کی۔

”یائہی! وقتِ رحمت کو لکھ، وصال بنا دے۔ یارب! تم سے تو کچھ بھی بعید نہیں۔ تیری رحمت کی نظر تو یہاںوں کو غلطان بنا دیتی ہے۔ دلوں کو بدلتا تو تیرے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔ اس کا دل بدل دے۔“ وہ امید و ہم کی کھٹکھٹ میں جلا اندر گئیں۔ وہ ابھی تک مضطرب تھی اور شاید غصہ بھی اس لیے جان لیں برآ کر رک گئی تھی۔

”شہلا! اوہ آ رہی ہے۔“ تبسم آ پانے کہا۔ شہلا نے کچھ نہیں سنا اور نہ ہی جواب دیا۔ بس لب لہجے رہے اور بند آنکھوں سے آنسو بہتے رہے جیسے کوئی کتا راہ ادا کر رہی ہو۔ لیکن ہر جھکائے آنسو بہا رہا تھا۔

”حاصل کرو بیٹا! بہادر ہو،“ تبسم آئی نے اسے دلاسا دیا مگر وہ خاموش رہا۔ وہ بے تاب آنسو تو اندر کے غبار کو کم کر رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد گاڑی کا پلہ بن بجا۔ تبسم آپا نے جلدی سے کمر کی سے دیکھا۔ شفق، شہلا اور حیدر اندر آ رہے تھے۔ آپا نے دل ہی دل میں

شکرا دا کیا۔

”شہلا اشق آری ہے۔“ دوسرے سے ملائی تھیں۔

شوق، شہلا اور حیدر اگل اندر آچکے تھے۔ ممانے مشکل سے آنکھیں کھول کر ان کی طرف دیکھا۔ شوق کی آنکھوں میں اس کے لیے کسی قسم کے کوئی جذبات نہیں تھے البتہ چہرے پر انفرادی سی چھائی تھی۔ ممانے اشارے سے اسے اپنے پاس بلا یا۔ تبسم آئی نے جلدی سے اسے ان کے پیڑ پر ہی بٹھا دیا۔ دوسرے جگہ بیٹھی تھی۔ اس کی بھی آنکھوں سے آنسو رواں تھے مگر وہ زبان سے کچھ نہیں کہہ رہی تھی۔

”شفق“ شہلانے بمشکل کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر دلیم کی طرف بڑھا دیا۔ ”خیال رکھنا۔“ دو بمشکل بولیں۔ شفق خاموش رہی اور دلیم کی طرف بالکل نہ دیکھا۔ ان کی سانس اُکڑ رہی تھی جیسے وہ صرف اس کی آمد کی منتظر تھیں۔ بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھیں مگر کبہ نہیں پا رہی تھیں۔ ایک دم گلے میں کھڑکڑاہٹ ہی ہونے لگی۔ شہلانے اشارہ کیا۔ آپا نے جلدی سے برتن آگے کیا۔ انھوں نے خون آلودے کی اور ٹہ حال ہی ہو کر لیٹ گئیں۔ ہر ایک کی آنکھوں میں خوف سا سا گیا تھا۔ ناقابلِ بیان مہلر، مہمانی کی روح فرساہیوں کو شق کرنے والا۔

اس نے آخری بار اونچی آواز میں کلمہ پڑھنا چاہا تو آبا، حیدر، شہلا اور شفق بھی بلند آواز میں کلمہ شہادت پڑھنے لگے۔۔۔۔۔ سب حیران رہ گئے۔ ایک دم چونک گئے اور دیکھتے ہی رو گئے۔ ولیم کی آواز سب سے زیادہ بلند تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور اس کی آواز سب آوازوں سے منفرد لگ رہی تھی۔ اس کا کلمہ سب سے مختلف تھا۔ ممانے انتہائی اضطرابی کیفیت میں ایک دم ولیم کی طرف دیکھا اور زیر لب مسکرانے کی کوشش کی۔ حیدر نے آگے بڑھ کر ولیم کو گلے لگایا۔ آپا نے بھی پیار سے اس کا ہاتھ چومایا ایک شعلہ سا بھڑکا تھا اور اس کے اندر آنکھوں میں خاستر کر دیا تھا۔ اس نے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ سب کچھ بہ چکا تھا۔ لہجوں میں مجروحہ رونما ہو گیا تھا۔ دلوں کو پلٹنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ انسان خود ہی حیران رہ جاتا ہے۔

وہ بھی ماما کی طرح ایک ایک کرکند ہر بار ہاتھ اور آنسو بھی بہا رہا تھا۔ روح بخود اڑتی تھی۔ خون کی گردش میں اضافہ ہو چکا تھا۔ ایمان رنگ و پے میں سرایت کر رہا تھا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ جسم کا ایک ایک حصہ مسام اور بر رواں سب اس کے ایمان کی تصدیق کر رہے تھے۔ سب حیران تھے مجروحہ طلب کرنے والا جب خود ہی کسی مجروحے کا سامنا کرتا ہے تو کیسے دنگ رہ جاتا ہے۔ اس کی بے قرار روح کو ایک لمحے میں سکون مل گیا۔ ماما کے چہرے پر سکون سا آ گیا تھا۔ شاید وہ اسی لیے مضطرب تھیں۔ اب ہر طرف سکوت اور نظم اڑا تھا۔ ان کی آنکھوں میں اطمینان اور مسکراہٹ کی لہری نمودار ہوئی۔ خدا کی رحمت نے ہر طرف احاطہ کر لیا تھا۔ ان کی جان کب اور کیسے ٹپکی کسی کو احساس بھی نہ ہوا۔ وہ سب تو ولیم پر حیران ہو رہے تھے جس نے سب کو حیران کر دیا تھا۔ سب اس کی طرف متوجہ تھے اور وہ سب سے منہ موڑ کر کہیں جا چکی تھیں۔

”ہم سب اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔“

حیات کا ایک طویل سفر ختم ہو گیا تھا۔ زندگی کے اسٹیج پر ایک اور کردار اپنا رول ادا کر کے جا چکا تھا۔ دنیا بخود شائق تھی اور حیران تھی۔ ایک اور کردار کی آمد کی بھڑک تھی جو قصہ پارینہ سن سکے، جو پیشہ انہوں میں موجود ہے اور جس کی یاد سے انہیں بخور ہیں۔ شاید کوئی ایسا ہو۔۔۔۔۔ ہر نگاہ بھڑک تھی۔۔۔۔۔ ہر طرف جھوم تھا اور افراتفری تھی۔۔۔۔۔ کوئی تو ہو جو انسانیت کی بھاکے لیے کچھ کر سکے۔۔۔۔۔ جس کی طرف نگاہیں اٹھیں تو اس کے انسان ہونے پر غور محسوس ہو۔۔۔۔۔ کوئی تو ہو۔۔۔۔۔



نور، انور چچا کے خیمے اور ڈانٹ پھٹار کے باوجود حیدر کے فون کرنے پر آ گئی تھی۔ وہ کئی دنوں سے وہیں تھی۔ شہلا کی وفات کا دکھ تو تھا مگر ولیم کے یوں اچانک راستہ بدلنے اور سہائی قبول کرنے پر سخت حیرانی اور خوشی بھی تھی۔ گھر میں خوب مصروفیت تھی۔ کبھی گرد و لوار کے لوگ تعزیت کے لیے آ رہے تھے تو کبھی مسجد سے قرآن خوانی کے لیے حفاظ۔۔۔۔۔ درنگ و سخن ہاسٹل سے بھی خواتین آ رہی تھیں۔ ہر کوئی آنے والا دعائے مسخرت کر رہا تھا اور اس کے لیے سب کچھ بہت عجیب تھا۔

مجھے کاندن تھا جب حیدر نے اسے قہقہے کرنے اور نٹے پڑے پہننے کے بارے میں کہا۔

”کیوں؟“ وہ حیران ہو گیا۔

”آج تم مسجد میں میرے ساتھ چلو گے اور اسلام قبول کرو گے اس لیے اور سنو! چہار اسلامی نام کیا رکھیں؟“ حیدر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
 ”جہا آپ کو بہتر لگے، مجھے اس کے بارے میں کچھ علم نہیں۔“
 ”آپا آپ کا کیا خیال ہے؟“ حیدر نے تبسم آ پاسے رائے مانگی۔
 ”بھئی نور سے پوچھو، اسے جو نام پسند ہو۔“ وہ کن آنکھیں سے اس کی طرف دیکھ کر بولیں۔
 ”موحد.....!“ دوا چانک بولی تو سب مسکرا دیے۔

دو دن انتہائی خوشی کا دن تھا جب وہ مسجد سے اسلام قبول کر کے لوٹا۔ اس کا دل اور روح انتہائی سرور تھی۔ ایسی خوشی نصیب ہوئی تھی جس کا کوئی نعم الہدٰی نہیں تھا۔ حیدر اکل، تبسم آنٹی اور باقی سب لوگ بھی بہت خوش تھے۔ حیدر اکل نے مسجد میں بھی مٹھائی پائی تھی اور اپنی فیکٹری میں بھی..... یہ لہو کی محبت سے کم تو نہ تھا۔ جب انسان سر تسلیم خم کر دے اس ہستی کے سامنے جس کے سامنے کائنات کی بڑی سے بڑی قوت بھی ہلچ ہے اور جودلوں میں رہتا ہے۔ سب نے اسے مبارک باد دی سوائے شفق کے۔ دھاما کی دقات کے بعد بہت خاموش تھی۔ وہ جس کیفیت سے دود چا رہی تھی۔ صرف وہی جانتی تھی۔ اس نے آخری لمحوں تک ماما کے سامنے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جو دلوں کے درمیان ناراضی قلم ہونے کی علامت سمجھی جاتی۔ سب کے بہت سمجھانے کے باوجود وہ اپنی خند پراڈی رہی تھی۔ وہ موجود تو تھی مگر اس کی آنکھوں میں ان کے لیے محبت منقوڑ تھی اور اب اس کا دل بے حد پریشان تھا جیسے کسی ہماری بوجھ تلے آ گیا ہو۔ کسی طرح بے قراری کم ہی نہیں ہو پاری تھی۔ وہ سخت پریشان اور بے چین تھی۔ سب آہستہ آہستہ خاک میں پنہاں ہو گئے تھے۔ کیا تھا اگر وہ ماما کو معاف کر دیتی۔ ان کے آخری لمحوں میں ان کے لیے تسکین کا باعث بن جاتی مگر وہ اپنے دل کو نہ بدل سکی۔ وہ اسی طرح اکھڑی رہی۔ وہ تو صرف تبسم آنٹی کی بہت زیادہ التجا اور حیدر اکل کی محبت میں چلی آئی تھی ورنہ وہ آنے سے گریز اس تھی اور اب جبکہ ماما نہیں رہی تھیں، سب کا امر اسی شتم ہو چکا تھا۔ دوا اکل تنہا رہ گئی تھی۔ کسی نے بھی اس کو اس کے رویے پر سرزنش نہیں کی تھی۔ کسی نے اس کو زنج کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سب خاموش تھے اور ان کی خاموشی کو وہ اپنے لیے کسی عذاب اور آزمائش سے کم نہیں سمجھ رہی تھی۔ وہ بہت بری ہے۔ اس کا اعتراف سے بار بار کچھ لگا رہا تھا اور وہ مزید مضطرب ہو جاتی۔

”ہاں ہاں، میں عی بری ہوں۔ سب کی گتہ گار..... قاتلہ..... اور..... اور.....“ اس کی نظروں کے سامنے روپا اور عابد گھومنے لگے۔ وہ جتنا چلانا چاہتی تھی۔ خوب رونا چاہتی تھی مگر اب سب کچھ بے سود لگ رہا تھا۔ ہاں نور، شہلا، اسد، حیدر، موحد، تبسم آنٹی اور کرمل فیض سب خوش اور سرور پیٹنے تھے اور وہ تنہا کمرے میں دروازہ لاک کر کے اپنے آپ سے الگ ہو رہی تھی۔
 دروازے پر دستک ہوئی۔ انھل اسے بلانے آیا تھا۔ حیدر اکل اسے مار رہے تھے۔
 ”کہہ دو میری طبیعت ٹھیک نہیں اور میں سو رہی ہوں۔“ اس نے دروازہ کھول کر اور اپنا موقف بنا کر دروازہ بند کر دیا۔ نہ جانے یہ اس کی خود سری تھی یا پھر اس کا ڈپریشن۔ سب نے خاموشی سے اس کے ایکسکیو ز کو قبول کر لیا۔

”موحد! تم نے یہ فیصلہ بہت اچانک نہیں کیا؟ یہ مجھے معلوم ہی ہے کہ تم اچانک فیصلے کرنے کے عادی ہو.....“ نور نے قدروے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں..... تھا تو اچانک لیکن پڑوسیں بہت فلوں سے شروع ہو چکا تھا اور اس لمحے میں حراحت نہیں کر سکا..... نور میں اس وقت کی کیفیت کو لکھنوں میں بیان نہیں کر سکا..... اور اگر میں ایسا نہ کرتا تو شاید پھر ایسا نکھرتا کہ ختم ہو جاتا..... ان لکھنوں کی شدت نے میرے جسم اور روح کو ایسا جکڑا تھا کہ فرار ممکن نہیں تھا۔ نور واقعی ایمان میں جو لطافت اور طاقت ہے وہ دنیا کی کسی اور شے میں نہیں..... تم نے ٹھیک کہا تھا کہ کوئی سچا مسلمان کبھی اپنا راستہ نہیں بدلتا۔ میں خوش ہوں اور تم سب لوگوں کا مشکور کہ اتنی بڑی نعمت کے حصول میں تم سب نے میری بھرپور مدد کی..... درنہنہ نہ جانے کہاں کہاں اور کب تک بھٹکتا رہتا، اب میری روح بہت پرسکون ہے جیسے کسی منزل پر پہنچ کر کوئی پرسکون ہو جاتا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں خوشی اور مسرت سے آنسو جھلکانے لگے۔

”کیا قادر کو کچھ نہیں بتاؤ گے.....؟“ نور نے جان بوجھ کر اسے مجھیرنا چاہا۔

”نہیں..... اب مجھے کسی کا ذکر نہیں اب مجھے اس ہستی تک پہنچنے کے لیے کسی رابطے اور وسیلے کی ضرورت نہیں، کسی قادر کا خوف نہیں..... اور نہ ہی کسی مشن کے چھوٹنے کا طال..... میرا راستہ تو اب صاف اور سیدھا ہے۔“ وہ اعتماد سے بولا۔

”موجود..... تم کتنے بڑے اعتماد لگ رہے ہو..... ایک دم غلط اور مجھے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ تم میں پھر وہ کونفیدنس آچکا ہے جو میں نے پہلی دفعہ ہاشل میں تم سے مل کر محسوس کیا تھا۔ اس وقت تم مجھے بہت اچھے اور بڑے اعتماد لگے تھے..... بعد میں تو تم.....“ اس نے مسکراتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”ان دنوں بھی میں اپنے آپ کو خدا کے قریب محسوس کرتا تھا، صرف ایک لگن تھی کہ مجھے خدا تک پہنچنا ہے..... پھر میں جنونی ہوتا گیا جیسے ایک دم غبارے میں ہوا بھر کر پھر اس کا نہ کھول دیا جائے اور جب ہوا نکلتی ہے تو وہ پھر سے سر مل سا پھس پھسا سا ہو جاتا ہے لیکن میں اس وقت کے اعتماد میں اور اب کے اعتماد میں بہت فرق محسوس کرتا ہوں۔ اب میرے پاس ٹھوس حقیقت اور سچ کی روشنی ہے، سیدھا راستہ ہے اور منظر صاف ہے..... میری منزل کیا ہے..... اب مجھے اس کا علم ہے، نور اب مجھے یقین ہو چکا ہے کہ اندھیرے اب میرا مقدر نہیں..... میں اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کر رہا ہوں۔ خدا نے اپنے نور کی شمع میرے اندر روشن کی ہے اس کا مطلب ہے وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ بس یہی احساس کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے میرے لیے اس دنیا میں ہر شے سے بڑھ کر قیمتی ہے اور جب کسی کو یہ احساس ہو جائے کہ کوئی اس سے جتنی محبت کرتا ہے تو اس کا سرخرو سے کس قدر بلند ہو جاتا ہے اور اس کے احساسات کا کیا عالم ہوگا جسے یہ احساس ہو کہ کائنات کا مالک اس سے محبت کرتا ہے..... نور دیکھو میں ماما کی لڑکھ سے پہلے ان سے جدائی کا تصور کر کے ہی کانپ جاتا تھا۔ سوچتا تھا کہ کس طرح ذمہ دار پاؤں گا لیکن اب مجھے دکھ تو ہے مگر خوف نہیں، کاش تم اس وقت ہو تیں جب ماما صرف گلے کی ادائیگی کے لیے اس قدر رڑپ رہی تھیں..... ایسی بے چینی میں نے آج تک کسی چہرے پر نہیں دیکھی یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس وقت صرف اور صرف خدا کے سامنے کھڑی ہوں اور پوری قوت سے کلمہ ادا کرنے کی کوشش کر رہی ہوں..... میں تو جب تک ہی گیا انھیں کوئی لگ نہیں تھی، کسی قسم کا کوئی خوف نہیں تھا۔ صرف ایک ہی جدوجہد تھی کہ کسی طرح کلمہ ادا ہو جائے اور پھر انھوں نے جس کیفیت میں کلمہ پورا کیا..... میرے اندر جیسے آگ سی لگ گئی اور پھر کیسے اور کس قوت نے میری زبان سے بھی کلمہ جاری کر دیا میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔ کاش تم اس وقت ہو تیں.....“ اس

کی آنکھیں پھر فرما جذبات سے جھٹلائے لگیں۔ نور کی آنکھوں میں بھی نمی ہی تیرنے لگی۔

”شکر ہے موصد..... خدا نے میری بھی دعائیں سن لیں جب تم جرجے میں جرجے کے لیے گئے تھے نا..... اس وقت میں نے بازار میں جس طرح تمہارے لیے دعائیں کی تھیں تم اندازہ نہیں کر سکتے۔“ نور نے مسکرا کر کہا۔

”واقعی..... اور اس وقت میں اس قدر بے چینی اور بے بسی محسوس کر رہا تھا پہلی دفعہ جرجے سے میں اس قدر مضطرب ہوا تھا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ نور اس کا مطلب ہے خدا کوئی دعا بھی رائج نہیں جانتا۔“

”ہاں بالکل نہیں..... اور تمہاری ٹانگیں بھی جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔“ نور نے اس کی بہت بندھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں..... انشاء اللہ اب میں بہت بڑا امید یوں الحمد للہ۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”نہیں..... ہیں..... یہ تم نے اتنے سارے عربی کے الفاظ کہاں سے سیکھے؟“ نور نے حیرت سے پوچھا۔

”جسم آئی سے..... شی از ویری ٹائس، لائیک مدر.....“ وہ مسکرا کر بولا۔

”میں شی از.....“ اس نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔

”تم آتی رہو گی نا.....؟“ وہ اسے اٹھتے دیکھ کر بولا۔

”معلوم نہیں..... کیا جانتا ہے..... انور چچا خواستہ میں مجھے تنگ کر رہے ہیں، مجھ میں نہیں آ رہا آخر وہ کیوں ایسا کر رہے ہیں۔ بہت مشکل سے صرف حیدر انکل کے کہنے پر مجھے یہاں آنے کی اجازت ملی ہے ورنہ تو وہ باہر بھی نہیں لگنے دیتے..... تم میرے لیے دعا کرنا۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”ہاں، ہاں کیوں نہیں اب تم بہت نہ ہارنا۔“ وہ بولا تو اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، مسکرا دی..... اور باہر چلی گئی۔



وہ مگر پہنچی تو ڈرامٹک روم سے اونچی اونچی آوازیں آرہی تھیں جیسے کوئی جھگڑ رہا ہو، چچی بچن میں مصروف تھیں۔ چچی کی کوئی اولاد تو تھی نہیں کہ مگر میں کسی قسم کا شور شرابا ہوتا، وہ توڑی دیر لاؤنچ میں بیٹھی اور پھر کمرے میں جانے لگی تو اس کے قدم جیسے رک گئے۔

”راہیل۔۔۔ مجھے تھوڑا سا دقت دو دو مان جائے گی۔“ چچا ان سے التجا کر رہے تھے مگر وہ تو ایسے بڑکے ہوئے تھے کہ ان کی کسی بات کو سننے کو تیار نہ تھے۔

”انور۔۔۔ تم میرے ساتھ کب تک جھوٹ چھوٹ بولتے رہو گے تم بہت دھوکے کا انسان ہو۔۔۔ اب میں تمہارے فراموش آئے دلا نہیں۔“

”راہیل تم تو میرے کالج کے دوست ہو۔۔۔ اور خدا گواہ ہے میں نے تمہارے ساتھ کوئی دھوکا کرنے کی کوشش نہیں کی، بس حالات ہی ایسے ہوتے تھے کہ میں تمہاری رقم لوٹا نہیں سکا اور قرضوں کے بوجھ تلے دیتا گیا مجھے بزنس کا خاک علم قائم نے ہی خواہنا وہ مجھے پسند آیا۔۔۔ اور آج میں اس حالت کو پہنچی گیا ہوں۔ تم تو سارا بزنس سنبھال بیٹھے اور میں کوڑی کوڑی کا محتاج ہو گیا۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تم مجھے میری بیٹی کے ہاتھوں ہی ذلیل کر دانا چاہتے ہو۔۔۔ پہلے اس کے پیسے پر ہاتھ صاف کیا اور اب اس کی زندگی پر ڈاکا ڈالنا چاہتے ہو۔۔۔ تم کیسے دوست ہو دو ایک جیم بچی ہے اور تیسوں کا مال کھانا بیٹوں میں آگ ڈالنے کے برابر ہے۔“ انور چچا قدرے اونچی آواز میں بولے تو راہیل بالکل کھلکھلا کر ہنس دیے۔

”اسی لیے تو آسان راستہ بتا رہا ہوں کہ اس کی میرے بیٹے کے ساتھ شادی کر دو۔۔۔ اس کے علاوہ تو کوئی اور آپشن تمہارے پاس ہے ہی نہیں اور یہ میں ہی ہوں۔۔۔ انور جس نے تمہاری فضول بکواس سن لی، آئندہ اس لہجے میں مجھ سے بات کی تو جان لینا کہ وہ تمہاری زندگی کا آخری باعزت دن ہوگا۔ مجھے جلد از جلد اس رشتے کا مثبت جواب چاہیے۔۔۔“ وہ جواب کم دھمکی زیادہ دے رہے تھے۔

”لیکن شرنیل اور نور دونوں ہی اس رشتے میں اتنے زیادہ دلچسپی نہیں لے رہے۔“

”شرنیل تو بے وقوف ہے اسے کیا معلوم کہ بزنس چلانے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیٹھے پڑتے ہیں اور وہ جو کارمنٹس کی ٹیکسری چلا رہا ہے وہ کس کی ہے۔۔۔ ہونہ۔۔۔ بیسوں کے بغیر بزنس چلا کر تو دکھائے۔۔۔ سارا دم غم نہ نکل جائے تو میرا نام بدل دے اپنی بیٹی کو بتاؤ کہ تم اس وقت پھانسی کے پھندے پر لٹک رہے ہو۔۔۔ اگر وہ تمہیں بچا سکتی ہے تو بچالے۔ شرنیل کی تم فکر نہ کرو۔۔۔ میں اگر آج اسے قاتل کر دوں تو کوڑی کوڑی کا قاتل ہو جائے گا۔ اسے اس رشتے پر ہاں کرنا ہی ہوگی۔“

”اس کے پاس بھی اور کوئی راستہ نہیں وہ یہ بزنس میرے بھروسے پر ہی تو کر رہا ہے ورنہ اس کے پاس ہے کیا۔ بی بی اے کی خالی غولی ڈگری۔۔۔ کئی بی بی اے تو چڑھ اسی بھرتی ہونے کے لیے بھی تھیں کرتے رہتے ہیں۔۔۔“ راہیل صاحب فیس سے پھٹکارتے ہوئے بولے۔

”سے کچھ کچھ بات سمجھ میں آگئی تھی اور وہ تقریباً بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔ اسے قطعی اعازہ نہیں تھا کہ اس بات کے پیچھے اتنا پیچیدہ جال بچا ہے اور شرنیل بھی یقیناً اس سے ناواقف تھا۔۔۔ اس لیے تو اس نے آسانی سے اس رشتے سے انکار کو قبول کر لیا تھا۔۔۔ اس کا دل جیسے پھٹنے کو تھا وہ بے حد پریشان تھی۔ اس سے وہاں برکتا محال ہو گیا وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ وہ شدید شش و پنج کا شکار تھی۔۔۔ اسی لیے انور چچا اس پر اتنی سختی کر رہے تھے ورنہ وہ اتنے سخت مزاج نہیں تھے وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ پوریج سے گاڑی ریورس کرنے کی آواز آئی۔۔۔ اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھا۔

راجیل انگل گیٹ سے باہر جا چکے تھے اور انور چچا انتہائی مایوسی میں گیٹ کے پاس کھڑے تھے اور انھیں جاتا ہوا دکھ رہے تھے۔ دوجیسے ہی اندر آئے سسلی چچی ان پر برسنے لگیں، وہ ہیشان کی خوب بے عزتی کرنے کی عادی تھیں۔

”سنو..... انور تمہاری مہمانوں نے ہمیں آج یہ دن دکھا دیا ہے..... آئندہ اس شخص کو گھر نہ آنے دینا ورنہ تم دونوں کو دھکے مار کر باہر نکال دوں گی۔ یہ تو فیاں تم کرو اور سزا کیس ہم بھگتیں.....“ سسلی چچی غصے میں یو لیں، چچا خاموش تھے۔ انور کمرے کے دروازے کو تھوڑا سا کھول کر باتیں سن رہی تھی۔

”کہاں گیا وہ سب بدبندہ جانے کس کس کو عیش کروائے اور اب اتنا قرضہ چڑھا لیا ہے۔“

”خدا گواہ ہے سسلی ایسی کوئی بات نہیں..... بس میری نا تجربہ کاری مجھے لے ڈالی۔“ چچا رو ہانسنے لہجے میں بولے۔

”تم تو ہو ہی ایک نمبر کے بیوقوف، گاڈی..... تم جیسے شخص کے ساتھ تو شادی کرنا ہی میری سب سے بڑی غلطی تھی..... تم تو اس قاتل ہی نہ تھے۔“ انور کو بہت افسوس ہو رہا تھا سسلی چچی ان کی اتنی بے عزتی کر رہی تھیں اور وہ خاموشی سے سب کچھ سن رہے تھے۔ انور کو ان پر ترس آنے لگا پھر ایک دم خاموشی چھا گئی..... چچا اس کے پاس بھی نہیں آئے وہ بھی کمرے میں بند رہی۔

”دونوں بعد راجیل انگل کا فون پھر آ گیا..... وہ شاید دوبارہ ان کا وعدہ یاد دلوا رہے تھے اور چچا ہوں ہاں کر کے سن رہے تھے۔“

اس کے پی۔ اے کے قاتل ایگزاحر ہونے والے تھے اور وہ کتا ہیں بیڈ پر پھیلائے کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب دروازہ پر دستک ہوئی اور چچا کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ بہت شگفتہ اور پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ انور انھیں دیکھ کر چمک گئی۔

”انور بیٹی..... آج میں تم سے کچھ بات کرنے آیا ہوں اور پھر فیصلہ تمہارا ہوگا..... میں سمجھتا ہوں آج تمہارے سامنے تمہارا چچا نہیں تمہارا مرحوم باپ ہے جس سے تم بہت پیار کرتی تھیں اور میں بھی تم سے انتہائی پیار کرتا ہوں..... میری کوئی اولاد نہیں لیکن خدا گواہ ہے تمہیں میں نے اپنی اولاد سے کم نہیں سمجھا.....“ انھوں نے اسے راجیل انگل کے ساتھ کی گئی ساری ذیل بتا دی۔

”اب تمہارے ہاتھ میں میری عزت ہے..... کیا تم چاہو گی کہ میں یوں بے عزت ہو کر مر جاؤں۔ اگر راجیل کو اس کا پیسہ داپس نہ ملا تو تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ وہ کس حد تک گر جائے گا اور میں اگر اپنے جسم کا ایک ایک بال بھی بیچ دوں تو اس کا قرض نہیں اتر سکے گا..... پلیز..... مجھے چالو مجھے معلوم ہے تم ولیم کو پسند کرتی ہو اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ مسلمان ہو چکا ہے اور مجھے تمہارے رشتے پر قطعی کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن میں بہت مجبور ہوں..... بہت مجبور..... اور اس گھر کی بات بھی باہر نہ جائے میں یہی چاہتا ہوں..... کیا تم میرے لیے یہ قربانی دے سکتی ہو..... کیا تم یہ کر سکتی ہو؟“ چچا نے روتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑ دیے..... وہ انتہائی بے بس لگ رہے تھے۔

”پلیز..... انور چچا..... آپ کیا کر رہے ہیں ہمت کریں کچھ نہیں ہوگا برسرِ تلے کا کوئی نہ کوئی مل جاتا ہے اور جیتے تاس کا بھی ہوگا، آخر آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں مجھے تو اس ساری بات کے بجائے گراؤ کا علم ہی نہیں۔ آپ پلیز مجھے کچھ بتائیں تو سہی آخر بات کیا ہے.....؟“ انور نے دوجیسے لہجے میں کہا۔

”راجیل ان دنوں لاہور میں تھا اور اس کی ریٹائرمنٹ قریب آ رہی تھی جب تمہارے ڈیڑی کا انتقال ہو گیا..... تمہاری جائیداد تمہارے نام منتقل کروا رہا تھا۔ خدا گواہ ہے میرے دل میں رتی بھر بھی بے ایمانی نہیں تھی میں بے وقوف ضرور ہوں مگر بے ایمان نہیں..... جب اسے تمہارے ڈیڑی کی وصیت کا بھی علم ہو گیا جس میں مجھے تمہارا گارڈین بنایا گیا تھا، مجھے تب بھی قطعی علم نہیں تھا اس نے کیا پلاننگ کر رکھی تھی۔ اس نے مجھے کنوئیں کر لیا کہ میں تمہارا سارا پیسہ کا دو بار میں لگا دوں تاکہ تمہارا مستقبل محفوظ کیا جاسکے اس ضمن میں، میں نے تمہارا گھر بھی بینک میں رجمن رکھ دیا۔ اس نے سچو کی لمپا میں شوگرل لگانے کو کہا پھر خود ہی ارادہ بدل لیا اور کیمیکلز فیکٹری لگائی۔ اس نے نقصان میں مجھ سے ففٹی پرسنٹ پر ڈیل کی جبکہ پرائٹ میں ٹوٹی پرسنٹ پر۔ جب میں نے وہ لفٹوں میں احتجاج کیا تو کہنے لگا کہ تم تو صرف پیرا نوویسٹ کر رہے ہو جبکہ میں پیرا بھی نوویسٹ کر رہا ہوں اور اپنی محنت بھی۔

ایک سال تو آرام سے گزر گیا۔ پرائٹ بھی ٹھیک ٹھاک ملا..... وہ میں نے تمہارے اکاؤنٹس میں جمع کروا دیا پھر نہ جانے کیا ہوا ایک سال بعد مجھے خبریں ملنا شروع ہو گئیں کہ بزنس خسارے میں جا رہا ہے، کیسے خسارے میں جا رہا ہے مجھے علم نہ ہو سکا۔ سوائے اس کے کہ کتنا اسٹنٹ کینسل ہو گئی۔ یہ ہو گیا وہ گیا..... انہی دنوں بینک سے نوٹس ملنے شروع ہو گئے کہ جیولون لیا تھا مارک اپ سیٹ اسے واپس کیا جائے میں تو شدید الجھ گیا پھر راجیل نے مجھے پینتیس لاکھ روپے دیے کہ میں بینک کا قرضہ واپس کر دوں میں نے کر دیا۔ پھر وہ سب کچھ نکال کر کراچی چلا گیا اب دو سال بعد اس نے وہ پیر اور پچھلا پیسہ ملا جلا کر میری طرف اسی لاکھ نکال دیے ہیں..... اور تم تو جانتی ہو میرے پاس پھوٹی کوڑی نہیں ہوتی۔ مشکل سے یہ دس مرلے کا گھر بنایا ہے اور جاب بھی کسی ہے تم سب جانتی ہو..... میں سخت پریشان تھا تو اس نے ایک اور آفر دی کہ میں اس کے جیٹے شرجیل کے ساتھ ففٹی پرسنٹ لاس اینڈ پرائٹ پر گارنٹنس فیکٹری لاہور میں لگاؤں میں نہ مانا تو کہنے لگا کہ اب تمہاری بھتیجی اس کا مل ہو چکی ہے اس کو کا دو بار میں شریک کر لو..... میں نے پہلے تو نہ کر دی اس نے مجھے انکسپلائیڈ کرنا شروع کر دیا کہ یا تو میں اس شیئر پر رضامند ہو جاؤں یا اس کی رقم واپس کر دوں..... مجبوراً مجھے ایسا کرنا پڑا کیونکہ راجیل کو تمہاری امریکا والی جائیداد کا بھی علم تھا، میں نے جب سرمائے کی کمی کی بات کی تو اس نے خود ہی امریکا والی پراپرٹی یا دلائی اور مجھے چاروٹا چارایا کرنا پڑا۔ مجھے پھر بھی یقین تھا کہ وہ دوست ہو کر مجھ سے کوئی ایسا دیکسی ڈیل نہیں کرے گا۔ جب ڈیل ہو گئی تو اس نے تمہارا رشتہ ماتحت لیا میرے تو قدموں تلے زمین نکل گئی۔ میں تو قطعی یہ سوچ نہیں سکتا تھا کہ وہ ایسا گھبر جال بچائے گا اور تم نے وہاں نوٹ کیا ہوگا کہ اس نے ڈاکومنٹس پہلے سے ہی بنا کر رکھے تھے، ہمیں ڈسکس کرنے کا موقع ہی نہیں دیا اور اب میں نے یہاں دیکل سے ڈسکس کیے ہیں تو میں حیران رہ گیا ہوں کہ ہم تو بری طرح چھن چکے ہیں۔

”اٹکل..... یہ آپ نے کیا کیا.....؟“ اتکا بڑا نقصان..... ڈیڑی نے آپ پر ہی تو اعتماد کیا تھا اور آپ نے اتنے بڑے ہلنڈرز کیے ہیں۔“ نور پریشانی سے بولی۔

”ہاں..... لیکن اب میں کیا کر سکتا ہوں تمہارے پاس تو کوئی راستہ نہیں اس نے ہماری ساری کشتیاں جلا دی ہیں۔“

”آخرا شادی کیوں ضروری ہے..... مجھے زندگی میں پیسے سے زیادہ اپنا سکون چاہیے..... اپنی خوشی عزیز ہے میں ایسے مکار لوگوں میں کیسے

زندہ رہ پاؤں گی جنھیں پیسے کی اتنی ہوس ہے۔۔۔۔۔ اٹکل یہ ناممکن ہے۔۔۔۔۔ میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی، مجھے تو ایسے لوگوں کے سائے سے بھی خوف آتا ہے اس قدر لالچی اور مکار لوگ ہیں۔۔۔۔۔ اور ویسے بھی میری کسی اور کے ساتھ کنٹنٹ ہے۔“

”جیسا میں سب جانتا ہوں لیکن پھر بھی میں مجبور ہوں اگر تم شادی سے انکار کرتی ہو تو سارا پیسہ تو جائے گا ہی ساتھ ساتھ اس نے جو قرضوں کے بوجھ ہم پر لا دیے ہیں وہ ہم کہاں سے ادا کریں گے۔۔۔۔۔ ہمارے پاس تو اس شخص نے ایک کوڑی تک نہیں چھوڑی۔۔۔۔۔ قصص ہر صورت میں یہ شادی کرنا ہوگی۔“

”اٹکل اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ شادی کے بعد وہ آپ کو تنگ نہیں کرے گا۔“

”جیسا تم سمجھ کیوں نہیں رہیں۔۔۔۔۔ وہ سب جانتا ہے کہ ہمارے پاس کچھ نہیں، دراصل جو نقدی پر سند شیئرز پر فیکٹری کی ڈیل ہوئی ہے وہ اپنے نقدی پر سند میں تمہارے نقدی ملا کر مکمل طور پر مالک بننا چاہتا ہے، وہ کل نے مجھے یہی بتایا ہے۔“

”اُف۔۔۔۔۔ آپ نے یہ کیا کیا۔۔۔۔۔؟“

”میں تمہارا گنہگار ہوں لیکن ایک امید ہے کہ شریل باپ سے بہت مختلف ہے اور اچھا انسان ہے۔۔۔۔۔ وہ قصص خوش رکھے گا۔“

”اٹکل مجھ سے میری ساری خوشیاں چھیننے کے بعد آپ کن خوشیوں کی بات کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ آپ نے تو میرا سارا کچھ چھین لیا، مجھے کچال کرنا چاہ رہے ہیں۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

”جیسا پلیز ان سفید بالوں کی لالچ رکھ لو مجھے اس شخص کے ہاتھوں ذلیل ہونے سے بچالو۔۔۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ میں تمہارا مجرم ہوں اور شاید میں اپنے آپ کو ساری زندگی معاف نہ کر سکوں۔۔۔۔۔ آئی ایم اے گرین لبلیر۔۔۔۔۔ بٹ یو۔۔۔۔۔“ بچانے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیا اور مولے مولے آنسوؤں کا چہرہ تر کرنے لگے۔۔۔۔۔ وہ تڑپ اٹھی۔

”اٹکل بس کریں۔“ وہ ان کے ہاتھوں کو تھامتے ہوئے بولی تو وہ باہر نکل گئے اور وہ شدید الجھن کا شکار ہو گئی۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ حالات اس قدر خراب ہو جائیں گے۔ وہ بری طرح بکڑی جا چکی تھی۔۔۔۔۔ ہر طرف گرداب تھے اور وہ سراسیمگی کے عالم میں ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کر رہی تھی۔۔۔۔۔ کبھی کبھی حالات کیسے انسان کی گرفت سے نکل جاتے ہیں اسے اندازہ بھی نہیں ہو پاتا۔۔۔۔۔ وہ مضبوط اعصاب کی لڑکی تھی مگر اب وہ بھی لمحہ لمحہ بکھر رہی تھی۔۔۔۔۔ جب سے صورت حال مکمل کر سامنے آئی تھی۔ سلی ٹیجی ہر وقت چچا کی بے عزتی کرتی رہتیں اور وہ خاموشی سے سب کچھ سنتے جاتے۔ چچا کے ساتھ وہ اسے بھی باتیں سنانے سے گریز نہ کرتیں۔ وہ بہت تلخ ہو جاتی تھیں مگر دل سے ہمدردی بھی بہت کرتی تھیں۔۔۔۔۔ اسی لیے تو اس نے ان کے پاس رہنے کا فیصلہ کیا تھا وہ ان کی باتوں کا برا نہیں مانتی تھی مگر چچا کی حالت بہت ناگوار ہوئی جا رہی تھی۔ اس کا دماغ سوچ سوچ کر تھک جاتا تھا۔۔۔۔۔ ہر وقت مودعا آنکھوں کے سامنے گھومتا جس سے اس نے زندگی کی آخری سانسوں تک ساتھ بھانے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ انسانی دعوے کتنے پورے ہوتے ہیں اور وجود کتنے کھوکھلے۔۔۔۔۔ وہ ابھائی بے بسی سے سوچ رہی تھی۔

شوق بہت پریشان تھی۔۔۔۔۔ ماما کے آخری لمحات اور اس کی ہٹ دھرمی سب کچھ اندری اندر اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔۔۔۔۔ اسے سرزدش کر رہا تھا اس نے جو کچھ بھی کیا غلط کیا۔۔۔۔۔ وہ تو ماں تھیں اور شاید ایک مجبور ماں وہ کیوں اتنی کٹھن ہو گئی۔۔۔۔۔ سب کے سمجھانے کے باوجود۔۔۔۔۔ کاش اسے اندازہ ہوتا کہ بعد میں وہ اتنی مضطرب ہو جائے گی تو وہ ہرگز ایسا نہ کرتی۔ اسے ماما کے الفاظ شدت سے یاد آ رہے تھے۔۔۔۔۔ جب وہ ولم کا خیال رکھنے کے بارے میں کہہ رہی تھیں۔۔۔۔۔

میں کیسے اسے بھائی مان لوں۔۔۔۔۔ میرا بھائی تو صرف آقا تھا۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ یہ تو ماما کا بیٹا ہے۔۔۔۔۔ میرا اپنا بھائی مجھ سے روٹھ کر چلا گیا تو یہ کیسے میرا بھائی بن سکتا ہے۔۔۔۔۔ بھائی تو دکھوں کو بچھنے والے اور انھیں شیراز کرنے والے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ جو بہنوں کے لیے مضبوط ڈھال ہوتے ہیں، ان کی آہوں پر ترپنے اور پلکنے والے۔۔۔۔۔ ان کے آنسوؤں کو پونچھنے والے جو دلوں کے قریب رہتے ہیں۔۔۔۔۔ جس کے ہارے میں سوچنے سے روح بھی سرور ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔ مجھ سے بھرا یہ رشتہ کس قدر معمول ہے مگر میں اس رشتے کی لطافت سے بے بہرہ رہی۔ آقا کی بھی ایسا بھائی نہ بن سکا جو میرے لیے کبھی ڈھال بننا۔۔۔۔۔ جس کی موجودگی سے میری روح بھی سرشار ہو جاتی جو میرے کبھی آنسو بھی پونچھتا۔۔۔۔۔ وہ تو کچھ بھی نہ کر سکا لیکن وہ تھا تو طمانیت کا اک احساس تھا کہ پوری دنیا میں میری ماں کی نشانی میرے پاس ہے۔۔۔۔۔ ہمارے وجودوں میں ماں کی آغوش کی خوشبو ایک جیسی تھی اور میں اسے اپنے لیے قیمتی سرمایہ سمجھتی تھی۔۔۔۔۔ پوری دنیا میں میرا اپنا بھائی۔۔۔۔۔ یہ میرا بھائی کبھی بھی نہیں بن سکے گا اور میں اسے کبھی بھی آقا کی جگہ نہیں دے سکوں گی۔۔۔۔۔ یہ کیسے ممکن ہے۔۔۔۔۔ وہ اپنے آپ کو جھٹلاتی اور پھر ماما کا چہرہ نظروں کے سامنے گھومنے لگتا جنھوں نے آخری لمحات میں بس یہی اک آرزو کی تھی۔ انھوں نے اس سے کچھ بھی طلب نہیں کیا تھا اور اس کے کندھوں پر کتنی بڑی ذمے داری ڈال دی تھی۔ ماما نے ایسا کیوں کیا۔۔۔۔۔ وہ سب کچھ جانتی بھی تھیں پھر بھی انھوں نے مجھے آزمائش میں ڈال دیا۔ وہ جھنجھلائے لگی تھی، ماما پر اسے فحشاء نے لگا انھوں نے مرکز بھی مجھے آزمائش میں ڈال دیا۔ لیکن اگلے ہی لمحے کسی نے بری طرح سرزدش کی۔ یہ ماما کی آرزو تھی۔۔۔۔۔ اور مجھے یہ پوری کرنی ہے۔ لیکن۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ یہ ناممکن ہے وہ ایک دفعہ اپنے آپ کو سمجھاتی تو دوسرے ہی لمحے جھنجھلا جاتی۔ وہ سخت کھٹکھٹ اور شش و پنج میں جتا تھی پھر وہ اچانک انہی اور موصد کے کمرے کی طرف بڑھی۔۔۔۔۔ دروازہ کھولنے سے پہلے ایک دفعہ اس کے قدم وچیں رک گئے۔۔۔۔۔ وہ جھنجھلا گئی۔۔۔۔۔ پھر زور سے دروازہ کھول دیا۔ موصد ایک اسلامی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا اس نے سر اٹھا کر اور قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ۔۔۔۔۔؟ آجائیں۔۔۔۔۔" وہ قدرے آہستگی سے بولا مبادا وہ کہیں پھر ناراض نہ ہو جائے۔

"نہیں۔۔۔۔۔ میں جا رہی ہوں۔۔۔۔۔" وہ پھر مزید موصد خاموشی سے اسے دیکھتا رہا وہ پھر جھنجھلا گئی۔۔۔۔۔ اور اس کی طرف مڑ کر دیکھا وہ حیرت سے ہونٹوں کی طرح اسے دیکھ رہا تھا۔۔۔۔۔ وہ جو کچھ کر رہی تھی وہ قطعی نارمل رویہ نہیں تھا۔

"کیا آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں؟" وہ اس کی بے چینی اور جھنجھلاہٹ دیکھ کر بولا۔

"سنو۔۔۔۔۔ کیا تم ماما سے بہت محبت کرتے تھے؟" اس کے اس اچانک سوال پر وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"ہاں۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔۔؟"

”نہیں..... میں بالکل نہیں..... میں ان سے محبت نہیں کرتی تھی۔“

”کیا اب بھی نہیں..... جبکہ وہ اب اس دنیا میں نہیں۔“

”ہاں..... اب بھی نہیں وہ ہمارے لیے تب ہی مر گئی تھیں جب ہمیں چھوڑ کر۔“

”میرے ڈیڑی سے شادی کر لی۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

”ہاں.....“

”ہاں ہاں بات کو ذرا ہر آنے سے قائل ہو..... اب آپ مجھے کیا بتانے آئی ہیں؟“ مومد نے اطمینان سے اس کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

”میں..... میں، کچھ بھی نہیں.....“ وہ پھر مڑنے لگی۔

”آپ کیوں پریشان ہیں آپ کو مجھ سے اگر کچھ کہنا ہے تو آپ کہہ سکتی ہیں۔“

”تم میرے بھائی نہیں ہو اور میں تمہاری آپ بھی نہیں..... سنا تم نے؟“

”آپ کی دونوں باتیں غلط ہیں..... میں آپ کا بھائی بھی ہوں اور آپ میری آپ بھی ہیں، میں سگانہ سگی سو بیٹا تو ہوں..... اور خدائے
جو ہمارے درمیان رشتہ بنایا ہے آپ اس کو کبھی مٹا نہیں سکتیں۔“

”میرا بھائی صرف آقا تھا اور وہ مر گیا ہے.....“ وہ قلعیت سے بولی۔

”لیکن آپ میری بہن ہیں اور جب تک میں زندہ ہوں آپ میری بہن رہیں گی اور میں آپ کو دل سے اپنی بہن مان کر عزت کرتا

رہوں گا۔“ وہ بھی بڑے سکون لہجے میں بولا۔

”شخص نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا..... اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی کے پیچھے رقصاں سپائی کو محسوس کیا اور اس کے قریب صوفے

پر خاموشی سے بیٹھ گئی۔

”یہ محبت ہے جو بالکل انجانے لوگوں کو بھی دل کے اتنے قریب لے آتی ہے کہ رشتے دار یاں بھی پیچھے رہ جاتی ہیں اور میں آپ سے بہت

محبت کرتا ہوں..... آپ کو دیکھتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ میری ماما میرے سامنے آ گئی ہیں آپ کو سنتا ہوں تو لگتا ہے مجھ سے بات کر رہی

ہیں..... کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ اپنے دل سے ساری غمیں ختم کر دیں..... ساری رنجشیں..... اور ہم دونوں بہن بھائی ایسے رہیں جیسے جسم آتی اور حیدر

انکل ہیں..... وہ دونوں بھی تو مجھے بہن بھائی نہیں لیکن آتی، انکل سے کس طرح محبت سے ملتی ہیں۔ ان دونوں کو دیکھ کر میں اکثر خدا سے دعا کرتا تھا

کہ وہ مجھے بھی ایسی بہن دے، سچی محبت کرنے والی، بلائیں لینے والی..... کیا آپ میری ایسی بہن نہیں بن سکتیں؟“ مومد نے اس کی آنکھوں میں

جھانکتے ہوئے بہت محبت سے سوال کیا۔

”یہ ممکن ہے.....“

”لیکن میں اس کو ممکن بناؤں گا.....“ مومد نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور محبت سے انہیں اپنی آنکھوں

کے ساتھ لگایا۔ شفق چمک گئی، اس کے لیے محبت کا یہ لمس، یا احساس اتنا نیا اور لطیف تھا کہ وہ حیران رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیسے اور کہاں سے ڈیروں آنسو بھرا آئے وہ اس کی محبت کے آگے کوئی بند نہ باندھ سکی اور ہاتھوں کی راحت نہ کر سکی۔ آفاق تو اس کا سا بھائی تھا مگر اس نے کبھی ایسے نہیں کیا تھا۔۔۔۔۔ اس نے تو کبھی محبت سے اسے چھوا بھی نہیں تھا اور جسے وہ بھائی مانتے کو تیار ہی نہیں تھی اس نے کیسے ایک ہی صوف میں اجنبیت کی ساری دیواریں مسمار کر دیں تھیں، اسے اپنی محبت کے حصار میں لے لیا تھا۔۔۔۔۔ اور اسے چوکا دیا تھا۔۔۔۔۔ اس کے اندر رات کی محبت اور وارفتگی کہاں سے عود آئی تھی، شاید اس کے اندر محبت کا چشمہ فراوانی سے بہتا تھا جس نے اسے ایک ہی لمحے میں سیراب کر دیا تھا کہ اس کی روح بھی سرشار ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ اس کا بھی ہاتھ محبت سے اس کی طرف بڑھا اور اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔۔۔۔۔ وہ اس کے قریب آیا اور اس کے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔۔۔۔۔ اس نے محبت سے اس کی پیشانی کو چھوا اسے یوں محسوس ہوا جیسے آفاق اس کے سامنے تھا اس کا چھوٹا، پیارا سا بھائی، اس کا ماں جانا۔۔۔۔۔ وہ بھی بے حد مسرور ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ اسے اس سے ماما کی خوشبو آ رہی تھی۔۔۔۔۔ اس کی بہن، ماما جیسی کتنا خوبصورت رشتہ تھا، کتنا قریبی اور کتنا منفرد۔۔۔۔۔ قدرت نے دونوں کے ذلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت بھری تھی اور دونوں اس محبت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ فرط جذبات سے دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔



وہ سخت غصے میں تھی جب اچانک شرینیل کا فون آ گیا وہ کچھ روز کے لیے ہانگ کا ٹک، فیکٹری کی نئی مشینری خریدنے کے لیے گیا تھا اور جیسے ہی اسے معلوم ہوا کہ نور نے کئی دفعہ اسے رنگ کیا تھا تو اس نے فوراً ہی اس سے رابطہ کیا وہ ہر بات سے لاطم تھا یہ جان کر وہ حیران رہ گئی۔

”شرینیل۔۔۔۔۔ آپ کے ڈیڑی ہر ممکن یہ چاہ رہے ہیں کہ ہماری شادی ہو جائے۔“ وہ بے مشکل بولی۔

”لیکن وہ کیوں ہند ہیں۔۔۔۔۔ میں نے تو انھیں آرام سے سمجھا دیا تھا کہ ایسا ہونا ناممکن ہے پھر بھی۔۔۔۔۔ نہ جانے کیوں۔۔۔۔۔؟“ وہ خود ہی حیرت سے بولا۔

”کیا واقعی آپ سے انھوں نے کچھ شکس نہیں کیا۔۔۔۔۔؟“

”بھلا ہاتھ لگ نہیں۔۔۔۔۔ میں تو آج ہی ہانگ کا ٹک سے لوٹا ہوں اب آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں۔۔۔۔۔؟“

”معلوم نہیں۔۔۔۔۔“ وہ آدھ بھر کر بولی۔

”نور۔۔۔۔۔ میں نہیں جانتا کہ قدرت نے ہمارے لیے کیا فیصلہ کیا ہے میں چھوٹی کوشش کروں گا کہ ایسا نہ ہو لیکن اگر خدا نے ہماری قسمتوں میں کچھ ایسا لکھ دیا ہے تو یقین رکھنا میں بھگدل انسان نہیں۔۔۔۔۔ آپ کی جو بھی کنٹنٹ کسی سے ہے وہ میرے لیے محترم رہے گی۔۔۔۔۔ اور میں وعدوں پر نہیں حقیقت اور عمل پر یقین کرنے والے بندہ ہوں۔ آئی ایم ہنڈرڈ پیر سنڈ پر یکنیکل“ نور خاموشی سے اس کی بات سنی رہی اور پھر اسے خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔ فیکٹری کا بچہ ورک مکمل ہو چکا تھا اور اب اسٹیلٹھف کے مراحل میں تھی لیکن جب سے یہ صورت حال پیدا ہوئی تھی اس کا دل ٹوٹ سا گیا تھا۔۔۔۔۔ گو کہ بچانے ہی یہ کام شروع کیا تھا مگر اس کی دلچسپی بھی بڑنس میں تھی اور اب نہ دلچسپی رہی تھی نہ کسی قسم کا جذبہ۔۔۔۔۔ ہر چیز جیسے تھالی کی طرف کا حزن تھی۔۔۔۔۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ شل ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ وہ جو لمحوں میں معاملات حل کرنے کی دعوے دار تھی اور اسے اپنی صلاحیتوں پر بہت

احساں تھا اب خودی نکلتا کش کا دکھ ہو گئی تھی۔

الور چچا اس کی طرف ایسی بے بس نگاہوں سے دیکھتے کہ اس کا دل کٹنے لگا۔۔۔ انھوں نے گھر سے باہر جانا چھوڑ دیا تھا ہر وقت اپنے کمرے میں بند رہتے اور جب اس کی طرف دیکھتے تو آنکھوں میں آن گت سوال اور اچھا نہیں ہوتیں۔ سلی چچی اٹھتے بیٹھتے ان کو صلواتیں سناتی رہتیں۔۔۔ ایسا لگا پچاس شخص جس کی سادہ لوحی نے اسے اس حال تک پہنچا دیا تھا، اب کسی مجھوے کا شہر تھا۔ راتیں اٹکل کا جب بھی فون آتا ان کے اوسان خطا ہو جاتے۔۔۔ اور اس وقت ان کی بے بسی ناقابل بیان ہوتی۔ ایسی صورت حال میں فیصلہ کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا خاموش تماشائی بن کر وقت گزارنا بہت کٹھن ہو گیا تھا۔۔۔ زندگی نے ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا تھا جہاں ہر طرف کانٹوں کا جال بچھ گیا تھا اور اسے دامن بچائے بغیر اس جال کو بھلا نکلتا تھا۔۔۔ وہ کس طرح اپنے آپ کو بچائے یہ فکر دامن گیر تھی۔۔۔ اس کی ساری صلاحیتیں جیسے منجمد ہو گئی تھیں۔



پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام

تہم آ پادوسوں کے بعد واپس جاری تھیں اور حیدر سمیت گھر کے سب افراد بہت افسردہ تھے۔ ان کے وجود سے گھر بھر میں اچالا سا مکمل گیا تھا اور سب ان کی موجودگی سے اک حرارت ہی محسوس کرتے۔۔۔۔۔ اک مہربان بزرگ کی جن کی آنکھوں سے صرف اور صرف محبت کی شعاعیں ہی پھوٹی تھیں، لہجے سے مناس اور محبت کی شیرینی سننے والے کے کانوں میں برس گھوٹی تھی۔۔۔۔۔ انھوں نے ان دنوں جس طرح شفق اور مود سے محبت کی تھی وہ کبھی بھی انھیں بھلا نہیں سکتے تھے۔ کرل منیٹ ایسا اور ضمیمہ انھیں لینے آئے تھے، وہ بھی انہی کی طرح بہت محبت کرنے والے تھے۔۔۔۔۔ شفق اور مود ان سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ ایسا ویسے تو ڈاکٹر تھی مگر اس کی عادتیں بالکل بچوں والی تھیں۔۔۔۔۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھرپور تہقیر لگاتی اور جان بوجھ کر اعتماد حرکتیں کرتی تاکہ ماما اور پاپا اس کی باتوں کو انجوائے کریں لیکن وہ اتنی اچھی نہیں تھی جتنا وہ ظاہر کرتی تھی۔۔۔۔۔ ان سب کی موجودگی میں وہ اپنی ساری تنگیاں تھوڑی دیر کے لیے بھلا بیٹھے تھے۔۔۔۔۔ شفق اور مود میں آہستہ آہستہ بے تکلفی پیدا ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ اجنبیت کی دیواریں گر رہیں تھیں۔۔۔۔۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتیں ڈسکس کرنے لگے تھے، شفق بھی کافی حد تک نارل ہو رہی تھی۔ کبھی اس کی ویل چیرے کے لالہ آنج میں لے آتی تو کبھی کمرے میں اور اکثر اس کے لیے کھانا بھی لے جاتی۔۔۔۔۔ تہم آ پاپا اور حیدر اس میں یہ جھدیلی دیکھ کر بہت خوش ہوتے اور خدا کا شکر ادا کرتے۔

تہم آ پاپا کے بچوں کے قیام کے دوران تو وہ بہت خوش رہنے لگے تھے۔۔۔۔۔ اب جب آئی جا رہی تھیں تو دونوں پھر افسردہ ہو گئے تھے اور وہ انھیں بار بار تسلیاں دے رہی تھیں کہ وہ ان سے ملنے آتی رہیں گی۔ انھوں نے جس طرح مود کو اسلامی آداب زندگی سکھائے تھے وہ ان سے بہت متاثر ہوا تھا۔۔۔۔۔ خدا نے کیسے اس کے لیے خود بخود بندوبست کر دیا تھا وہ اکثر سوچ کر حیران رہ جاتا اس نے بجلی بجلی واڑھی بھی رکھ لی تھی۔۔۔۔۔ وہ پکا اور سچا مسلمان بننا چاہتا تھا۔ سنت نبوی ﷺ پر مکمل طور پر عمل پیرا ہونا چاہتا تھا۔ اسلام اور ایمان کی تابانیوں سے اپنے وجود کے ایک ایک گوشے کو منور کرنا چاہتا تھا وہ نام نہاد مسلمان تین کر زندگی نہیں گزارنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ وہ اہدیت اور لاقائیت کے وسیع بحر میں غوطہ زن ہونا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ ان کے جانے کے بعد دونوں افسردہ ہو رہے تھے اور حیدر، شفق کے کہنے پر دونوں کو گاؤں لے کر جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ شفق مود کو حویلی اور وہاں کے لوگوں کے بارے میں سب کچھ مزے لے لے کر بتا رہی تھی اور وہ حیرت سے سن رہا تھا۔

”شفق آئی۔۔۔۔۔ نور کو بھی ساتھ لے لیں۔۔۔۔۔ اس نے ڈرتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ کیوں نہیں تم اسے فون کرو۔۔۔۔۔ خوب مزہ آئے گا اور وہ اتنے دنوں سے آئی بھی نہیں۔“ شفق بے تکلف کرتے ہوئے بولی۔

”اس کے پی۔ اے کے ایگزٹر اچر ہونے والے ہیں۔۔۔۔۔ پڑھائی میں بہت مصروف ہے میں ابھی اسے فون کرنا ہوں وہ ہمارے ساتھ جانے پر ضرور تیار ہو جائے گی۔“ اس نے خوشی خوشی اسے فون کر کے آنے کو کہا۔ وہ تھوڑی دیر بعد اس کے سامنے تھی مگر کچھ کچھ خاموشی ہی تھی۔ مود اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ کچھ دلی بھی لگ رہی تھی، اس کی سفید رنگت بھی چٹلا ہٹ کا شکار ہو گئی تھی اور آنکھیں ایسے سوئی تھیں جانے کب سے سوئی نہیں تھی۔

”کیا بات ہے نور۔۔۔۔۔ تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟“ مود نے حیرت سے اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ تمہارا وہم ہے۔۔۔۔۔ اور تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟“ اس نے ارد گرد پیک سامان دیکھ کر پوچھا۔ شفق اس سے مل کر دوسرے

کمرے میں تیار ہونے چلی گئی تھی۔

”ہم لوگ گاؤں جا رہے ہیں..... تم بھی ہمارے ساتھ چلو.....“ وہ خوش ہو کر بولا۔

”نہیں..... میں نہیں جاسکتی۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”کیوں.....؟“ اور خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اپنے بچہ کی طرف ہاتھ بڑھا کر مسودہ حیرت سے اس کو آہستہ سے روک رہا تھا اس

نے ویلنگ کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ..... یہ..... یہ کیا ہے.....؟“ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔

”کھول کر دیکھ لو.....“ وہ آہستہ سے بولی۔ اس نے بے صبری سے لفافہ کھولا..... اس کے ہاتھ مسلسل کانپ رہے تھے۔ اس نے مشکل

سے کارڈ کھولا..... اس کے جذبات میں شدید تلاطم پیدا ہونے لگا..... سارا جسم پیسے میں نہا گیا اس نے گھبراتے ہوئے کارڈ کھولا تو ایک دم چیخ کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا..... نور سر جھکائے بیٹھی تھی..... اس کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔

”تم ایسا نہیں کر سکتی ہو..... تم..... نور..... تم نے جو مجھ سے وعدہ کیا تھا کیا تم بھول گئیں..... اتنی جلدی.....“ اس کی آنکھوں سے آنسو بس چھلکنے کو ہی تھے نور نے اس کی آواز کے ارتعاش سے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی۔

”مسودہ..... تم کھڑے ہو گئے! کیا تم جانتے ہو کہ تم ٹھیک ہو گئے ہو!“ وہ حیرت اور خوشی سے چلا رہی تھی مگر وہ اس کی کوئی بات نہیں سن رہا تھا۔

”اس بات کو چھوڑ دو..... اور مجھے جواب دو۔“ وہ کچھ اور سننے کے موڑ میں نہیں تھا۔

”کیا..... اس بات کو چھوڑ دوں جس کے لیے میں نے اتنے وقفے اور دعائیں کیں اور خدا نے کیسے لکھیں میں یہ معجزہ کرو یا..... آئی ایم

ریگلا سوپھی۔“

”پلیز نور..... میرے لیے اس وقت کچھ اہم نہیں ہوا ہے تمہارے..... تم نے ایسا فیصلہ کیوں کیا بولو..... جواب دو۔“ وہ مجبوراً کر بولا۔

”رشتوں کو بچانے کے لیے کبھی کبھی بہت بڑی قربانیاں بھی دینی پڑتی ہیں اور مجھے بھی یہ کرنا پڑا.....“ وہ مسند دوسری طرف کر کے بولی۔

”تم ایسا نہیں کر سکتیں..... اور مجھ سے جو وعدہ کیا تھا۔“

”میں ہمیشہ یہ بھی تو کہتی تھی بشرطیکہ خدا بھی ایسا چاہے اور مسودہ اب خدا ایسا نہیں چاہ رہا..... وہ ہمارا ساتھ نہیں دے رہا..... میں نے اس

کے آگے بہت ہاتھ جڑے ہیں، بڑی دعائیں کی ہیں..... بہت واسطے دیے ہیں مگر..... مگر نہ جانے وہ یہ دعا کیوں نہیں سن رہا..... میں کیا کروں۔“ وہ بھی روہانے لہجے میں بولی۔

”کیوں..... وہ کیوں نہیں سن رہا..... کیا وہ ہم سے محبت نہیں کرتا..... کیا وہ نہیں جانتا کہ ہم بھی کتنی محبت کرتے ہیں..... وہ کیوں ایسا چاہ

رہا ہے؟“

”شاید وہ ہماری آزمائش کرنا چاہ رہا ہے.....“ وہ آہ بھر کر بولی۔

”نہیں..... وہ ہمیں توڑنا چاہتا ہے..... منتشر کرنا چاہتا ہے وہ..... وہ کیوں ایسا کر رہا ہے اور میرے ساتھ بردھد ایسا کیوں کرتا ہے پہلے
مما اور اب تم..... نہیں یہ نہیں ہوگا۔ میں نکھر رہا ہوں۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

”موحد..... مجھے رونے والے مرد پسند نہیں میرے سامنے مت رویا کرو..... مجھ سے تمہارے آنسو برداشت نہیں ہوتے کبھی بھی نہیں۔“
وہ آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے ساتھ چہرہ دوسری طرف کر کے بولی۔
”اور تم بھی تو روری ہو۔“

”لیکن میں تمہیں مضبوط دیکھنا چاہتی ہوں..... ایسا مضبوط کہ پہاڑ بھی تم پر لوٹ پڑیں تو تم گھبراؤ نہیں..... یہ میری خواہش ہے شاید
آخری خواہش۔“ موحد پھر رونے لگا۔ وہ سسکیاں بھر رہا تھا اور وہ بھی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی مگر کچھ بول نہیں رہی تھی۔
”نور..... خدا ہمارے ساتھ ایسا کیوں کر رہا ہے؟“ وہ روتے ہوئے بولا۔

”شاید ہم زندگی میں جس شے اور جس ہستی سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں وہ زندگی میں ایک بار ضرور اسے ہمارے سامنے آزمائش
بنا کر کھڑا کر دیتا ہے..... کبھی مجھوں میں آزمائش ہے تو کبھی جذبوں میں اور کبھی رشتوں میں..... اور میں تو ہمیشہ رشتوں میں آزمائی جاتی رہی ہوں اور
اب جذبے سے بھی ہار گئی۔“

”ایسی کیا قیامت آگئی ہے کہ شرنیل سے تمہاری شادی بہت ضروری ہے۔“
”میں کیا کیوں..... میرے پاس کہنے کو کچھ بھی تو نہیں جب خدائی کسی بات کو ہمارے لیے بہت ضروری بنا دے تو فرار کبھی ممکن نہیں.....
میرے لیے بھی فرار کا کوئی راستہ نہیں میں اس کو تسلیم نہیں کر سکتی۔“

”تو پھر مجھے بتاؤ..... میں کیا کروں..... میں تو زندگی کا تصور بھی تمہارے بغیر نہیں کر سکتا میری سوچوں پر، میرے جذلوں پر، میرے دل و
دماغ پر، میری روح پر ہر جگہ تو تم ہو..... صرف تم، میں کیا کروں گا، میں پاگل ہو جاؤں گا یا پھر مر جاؤں گا۔“

”نہیں موحد، تمہیں کچھ نہیں ہوگا یاد ہے جب ہم ملے تھے تو میں ایک بات کہا کرتی تھی کہ معلوم نہیں ملاپ ہونا قسمت میں ہے کہ نہیں مگر
میں اپنی زندگی میں اور ماضی میں ایک ایسی کھڑکی ضرور رکھنا چاہتی ہوں..... جب زندگی کے درد و غم سے گھبرا جاؤں تو اس سے تازہ ہونے کے لیے
لیے اسے کھول دوں..... کبھی کبھی نادانستہ کبھی ہوئی باتیں کیسے پوری ہو جاتی ہیں۔ میں وہ بات بھول گئی تھی اور خدا سے ہمیشہ اپنے اور تمہارے ملاپ کی
دعا کرتی تھی لیکن وہ بھولی ہوئی بات کیسے سامنے آگئی اور موحد..... یاد ہے وہ اسٹوڈنٹ ہارنس جس میں پرنس محبت میں ناکام ہوتا ہے تو پادری بن
جاتا ہے اور لڑکی نن..... مائی گاڈ..... دیکھو وی اسٹوڈنٹ، وہی قسم، وہی سب کچھ ہمارے ساتھ ہو گیا ہے اور اس وقت اسٹیج پر ہم کیسے سراہے گئے تھے
صرف جذبات سے بھر پورا ٹیکنک کی وجہ سے اور اب حقیقت میں بھی ہم جذلوں کی شدت کے ساتھ..... رخصت ہو رہے ہیں..... موحد کیسے کوئی غیر
مرئی قوت ہم سے سب کچھ کرواتا ہے ہم چلیاں ہیں اور کچھ نہیں۔“

”میں کچھ نہیں مننا چاہتا..... میں تمہیں جانے نہیں دوں گا..... یہ کیسے ممکن ہے کہ مجھے سارا کچھ آہستہ آہستہ دے کر اب سارا کچھ ایک دم

جھین رہی ہو۔ میرا نام۔۔۔ میرا اہتمام۔۔۔ میرے اندر رکھ لی روشنی۔۔۔ یہ سب تمہاری بدین ہی تو ہے۔۔۔ نہیں، میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔“ وہ بہت بے صبر اور ہاتھ۔

”موصد۔۔۔ خدا شاید تمہیں کندہ بنانا چاہتا ہے۔۔۔ ہم دونوں کا دقیق ملاپ شاید ایک دوسرے کی آزمائش تھا۔“
”میں کچھ نہیں جانتا۔۔۔ تمہاری کوئی لاجب، کوئی ریزن کچھ بھی نہیں بس تم ایسا کچھ نہیں کرو گی۔۔۔ فور۔۔۔ ایسا کرتے ہیں کہ تم شادی کرد اور نہ مل۔۔۔ ہم دونوں تنہا تنہا زندگی گزار لیں گے، کیا یہ بھی ممکن نہیں؟“

”نہیں۔۔۔ کبھی کبھی کسی کو زندگی بچانے کے لیے اپنی سانسیں بھی قربان کرنا پڑتی ہیں، بس کچھ لواب میں بھی ایسی ہی مجبور ہوں۔“
”کس کی خاطر۔۔۔ کون ہے وہ جو تمہیں مجھ سے بھی بڑھ کر عزیز ہو گیا۔۔۔ کون ہے وہ خوش قسمت۔۔۔؟“
”میرے چچا۔۔۔ میرے ڈیڈی کے بھائی، میرے رشتے دار۔۔۔ جو مجھے اپنی بیٹی کہتے ہیں۔“
”ان کے لیے۔۔۔؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ انہی کے لیے۔“
”کیا وہ تمہیں مجھ سے زیادہ عزیز ہیں؟“
”نہیں۔۔۔ وہ آدھر کر بولی۔

”تو پھر۔۔۔ کیوں مجھے لہجہ رہی ہو۔۔۔ تم ہمیشہ سے مجھے لہجہ ہی آئی ہو۔۔۔“

”تم سے تو میرا دل کا رشتہ ہے، دل کے رشتے تو اندر ہی اندر روح تک کو کھوکھلا کر دیتے ہیں اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔۔۔ نہ ہر میں مجھے بھڑکے مانند۔۔۔ جو رگوں میں بہتے خون کو آہستہ آہستہ زبر آلود کر دیتا ہے اور کسی کو بتا بھی نہیں چلا۔۔۔ مگر دنیا کی نظر میں یہ رشتے بالکل بھی اہم نہیں۔۔۔ دنیا کو تو وہ رشتے چاہئیں جو نظر آتے ہیں وہ ان کو مضبوط دیکھنا چاہتی ہے، موصد دل کے رشتے ہار جاتے ہیں اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی مگر ہم مل بھر رہے ہوتے ہیں۔۔۔ محبت مصداق انسانوں کے ساتھ چلتے، قہقہے لگاتے ہیں جبکہ ہمارے دل اس وقت بھی مسکایاں لہ رہے ہوتے ہیں۔ نہ جانے یہ کس کا ایسے انسانوں کا۔۔۔ ہڈیوں کا۔۔۔ یا پھر رشتوں کا۔۔۔؟“ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ شاید زندگی میں پہلی بار وہ اس کے سامنے یوں روئی تھی اور اس سے اس کے آنسو بھی برداشت نہیں ہو رہے تھے۔ فور جیسی بڑی بھی رو سکتی ہے۔ جب دوسروں کی ہمت بندھانے والا خود ریزہ ریزہ ہوتا ہے اور شکست پر حائر کی طرح پھڑپھڑاتا ہے، روتا ہے اور سسکتا ہے تو پوری کائنات قہم ہی جاتی ہے، ورطہ حیرت میں ڈوب جاتی ہے اور حیرت سے اس کی طرف دیکھتی ہے۔۔۔ ہر انسان رک کر اسے دیکھتا ہے ایسا مضبوط انسان بھی یوں ٹوٹ سکتا ہے۔۔۔ اشک بہا سکتا ہے جیسے مضبوط سنگلاخ ہاتھروں سے بھی جھٹے جاری ہو سکتے ہیں۔ دونوں رونے لگے زندگی میں آخری بار یا پہلی بار ایسی شدت سے جس سے دل بھی شق ہوتے ہوئے محسوس ہوں اور کیچے پھٹتے ہوئے۔۔۔ شق اچانک کمرے میں آئی تو چونک گئی موصد کھڑا تھا اور وہ ہاتھ اور منہ ہی تھی اور وہی تھی۔

”کیا ہوا۔۔۔ خیریت تو ہے۔۔۔ تم دونوں کیوں رو رہے ہو۔۔۔؟“ شق نے حیرت سے پوچھا۔

"اچھا اب میں چلتی ہوں۔" لور بیگ اٹھا کر باہر نکل گئی۔ وہ وہیں ساکت سا کھڑا رہا پھر اس کے پیچھے بھاگا۔۔۔۔۔ وہ گیت سے باہر نکل رہی تھی۔۔۔۔۔ اس نے اسے آواز دی وہ رکی اور سرخ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"لور۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ تمہارے لیے کیا دعا کروں؟" اس نے گہرے دھکے سے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔۔۔۔۔ کچھ بھی نہیں چاہیے۔۔۔۔۔ کوئی دعا نہیں جب دنیا کی قیمتی شے ہاتھ سے چھوٹ کر گر جائے تو ساری زندگی انسان کیا دعا کر سکتا ہے۔ اس کے پاس تو کوئی آپشن ہی نہیں ہوتا اب تو زندگی کا سفر ہے جیسے جیسے اس کا مسافر تو بننا ہی ہے مگر کیا تم میری ایک خواہش کو پورا کرو گے؟" اس نے استغلامیہ لگا ہوں سے پوچھا۔

"کیا۔۔۔۔۔؟"

"یہ آگھیں کبھی بچکتے نہ پائیں، کبھی بھی نہیں، چاہے کسی دن میری موت کی خبر بھی سنو تب بھی نہیں۔۔۔۔۔"

"دل میں مخمخ بیج ست ہو۔۔۔۔۔ اور کوئی فکرتہ خون بھی نہ ہے یہ ناممکن ہے میں یہ خواہش پوری نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔" وہ ختم آلود آنکھوں سے بولا۔

"تو کیا تمہارے دل سے میں یونہی خالی ہاتھ چلی جاؤں۔۔۔۔۔ وقت رخصت کوئی تھکے لیے بغیر۔۔۔۔۔" اس نے زخمی لہجے میں پوچھا تو وہ دل سسوس کر رہ گیا اور ختم آنکھوں کے ساتھ بے تاب ہو کر اندر لوٹ آیا۔۔۔۔۔ اس سے جذبات نہیں ہو رہا تھا وہ کچھ نہ کر سکتا تھا اس کی بے قراری اور بے تابی کہ اس کا دل پھٹنے کو تھا۔۔۔۔۔ وہ جا چکی تھی اور شفق پریشان تھی۔ اس نے حیدر اٹکل کو فون کیا اور جیسے ہی وہ آئے لور کا کارڈ ان کے سامنے رکھ دیا وہ تو چمک ہی گئے اور لرزے ہاتھوں کے ساتھ کارڈ کھولا۔۔۔۔۔ کارڈ پر نہ تو وہ آکھنڈ تھا بلکہ وہ آکھنڈ تھا۔۔۔۔۔ انھیں اپنے ہی کہے ہوئے الفاظ دکھ دینے لگے۔

"خدا کرے۔۔۔۔۔ جسے تم چاہتی ہو وہ تمہارا نصیب بھی ہے اور کتنے نصیب والے وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا خدا یوں ملاپ کر دے انسان سوچے تو اسے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔" وہ بھی انہی کی طرح ٹکلی تھی کیا وہ دونوں بھی ایسے ہی بڑے رہیں گے، یا خدا یا۔۔۔۔۔ یہ کیسی آزمائش ہے نہ جانے یہ محبت کی معراج ہے یا پھر۔۔۔۔۔ آزمائشوں کی۔۔۔۔۔ ان کی دل کر پٹی کر پٹی ہو رہا تھا اور شہلا آنکھوں کے سامنے نہ جانے کہاں سے آگئی تھی۔۔۔۔۔ "دل کی دنیا کن ناموں سے آباد ہوتی ہے کسے خبر ہوتی ہے؟" انھوں نے آہ بھری۔

حیدر اٹکل نے اس کے چچا سے رابطہ کیا اور انھیں روکنے کی کوشش کی مگر انھوں نے ذاتی معاملہ کہہ کر انھیں خاموش کر دیا۔ انھوں نے لور سے بھی بات کی مگر وہ بھی خاموشی سے سنتی رہی اور پھر اچانک خدا حافظ کہہ دیا۔

"یا خدا یا تو کیوں ایسے لوگوں سے ملا دیتا ہے جو کسی اور کا نصیب ہوتے ہیں۔۔۔۔۔" موعود رات کی تنہائیوں میں اٹھ اٹھ کر خدا سے دعا کرتا۔

جب وہ سو رہا ہوتا۔۔۔۔۔ وہ بھی بے قراری محسوس کرتی تھی۔۔۔۔۔ جب وہ سسکی تو اسے لگتا جیسے کوئی اسے یاد کر رہا ہو۔۔۔۔۔ جب وہ تنہائی میں چونک جاتی تو لگتا وہ اسے دیکھ رہا ہے اور بلارہا ہے اور جب وہ آہیں بھرتا تو اسے لگتا کہ وہ بھی اس کے لیے یونہی بے قرار ہے۔ دل کے رشتے بھی عجیب ہوتے ہیں نہ سمجھ میں آنے والی داستان جو دل کے زیادہ قریب ہوتا ہے وہ سب سے زیادہ دکھ دیتا ہے۔۔۔۔۔ یہ فلسفہ قلمی حقیقت!

شفق اس کا بہت خیال رکھتی۔۔۔۔۔ وہ گاؤں نہیں گئے تھے یا پھر کہیں بھی جانے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ شفق اس سے ڈیروں باتیں کرنے

گلی تھی مگر وہ کہیں کم ہو جاتا۔۔۔۔۔ بات کرتے کرتے رک جاتا۔۔۔۔۔ آنکھوں میں نہ جانے کہاں سے نمی آ جاتی تو جلدی سے ضبط کرنے کی کوشش کرتا۔۔۔۔۔ کسی کی آواز کی وارفت سنائی دیتی "میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتی۔۔۔۔۔" وہ جلدی سے ہاتھوں کی پشت سے آنکھوں کو گڑ گڑنے لگا مبادا کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے اور اس سے روٹھ نہ جائے۔۔۔۔۔ شفق چوبک کر اس کی طرف دیکھتی اور سوچتی، کوئی اتنا دور ہونے کے بعد بھی اتنا قریب ہو سکتا ہے۔ یہ سراب تو نہیں اور یہ تخیل بھی تو نہیں۔۔۔۔۔ یہ تو دل کی دنیا ہے اور دل کی باتیں ہیں۔۔۔۔۔ نہ سمجھ میں آنے والی۔۔۔۔۔ نہ نظر آنے والی شفق اسے یوں افسردہ اور دکھی دیکھتی تو سمیل نظروں کے سامنے محو جاتا۔ اس کے دل سے بھی آہ نکلتی اور آنکھوں میں نمی حیرنے لگتی۔

حیدر اسے دیکھتے تو ان کا دل بھی کٹنے لگا۔۔۔۔۔ اپنا زمانہ یاد آ لے لگا انسان کہیں چلا جائے۔۔۔۔۔ مشرق ہو یا مغرب۔۔۔۔۔ اختیار ہو یا بے اختیار اس کا نصیب کہیں نہیں بدلتا۔۔۔۔۔ شہلا اور نور۔۔۔۔۔ شہلانے شہلاخت کے ہاتھوں مار کھائی تھی اور اپنے نصیب سے لڑنے کی کوشش کی تھی، کرہی کرہی بکھر گئی۔۔۔۔۔ خاک میں پنہاں ہو گئی۔۔۔۔۔ اور نور رشتوں کے ہاتھوں ہار گئی جیسے میں اور سوحہ جند بوں کے ہاتھوں شکست کھا گیا اور شفق اس کے پاس تو کچھ بھی ایسا نہ تھا جو آزمائش بنا مگر پھر بھی وہ ہار گئی۔ قدرت انسان کو کیسے کھٹے کھٹے پر مجبور کر دیتی ہے اور ہر چیز میں آزمائشی ہے جن کا اس نے وعدہ کیا ہے۔۔۔۔۔

نہ حیدر اسے سمجھاتے، نہ شفق اسے سمجھاتی۔۔۔۔۔ سب جانتے تھے کہ دلوں کے یہ زخم قدرت خود ہی بھرتی ہے نہ لفظ مرہم بنتے ہیں نہ حوصلہ افزائیاں، حتیٰ کہ اپنی اپنی جگہ منتشر اور بکھرے ہوئے تھے اور سسک رہے تھے۔۔۔۔۔ جس دن نور کی شادی تھی۔۔۔۔۔ وہ سارا دن کمرے میں بند رہا اور نصرت فتح علی خاں کی آواز پر رے زبردیم کے ساتھ مارے گھر میں گونجتی رہی۔

"سانوں اک پل چین نہ آئے جہاں تیرے ہٹا۔"

حیدر انگلی صبح سویرے ہی گھر سے نکل گئے۔۔۔۔۔ ان کا دل بھی بہت پریشان تھا۔ نہ جانے انھوں نے بھی دل میں کتنی دعائیں ان کے لیے مانگی تھیں۔ کسی ایسے معجزے کے لیے جو دلوں کو پھر سے ملا دے۔۔۔۔۔ شفق نے بھی بہت گڑ گڑا کر دعا مانگی تھیں، خود اس کے پاس تو سوائے آہوں اور دعاؤں کے کچھ بھی نہ تھا جو دل کی گہرائیوں سے نکلتی تھیں۔ وہ دن اس کے لیے کسی قیامت سے کم نہ تھا۔۔۔۔۔ اس نے فون ملایا۔۔۔۔۔ نور کی آواز سنی وہ روتی روتی کہتی رہی۔

"میں جانتی ہوں یہ تم ہو، کیا تم مجھے بھول نہیں سکتے؟"

"اپنے نام کو کیسے بھولوں۔۔۔۔۔ جو تم نے دیا ہے اور اپنی سوچوں کو کیسے چھوڑوں جن پر صرف تم حادی ہو۔"

"پلیز۔۔۔۔۔ ہٹ کر دو۔۔۔۔۔ میں بھی تو اس وقت۔۔۔۔۔ اس وقت خوش ہوں۔" اس کے لہجے میں آنسوؤں کی ٹہنی قہر قہر ابھٹ پیدا کرنے لگی۔۔۔۔۔ اور اس نے فون رکھ دیا۔ اس نے آنکھیں بند کیں تو پوری شدت سے آنسو بہنے لگے۔ وہ شدت سے رونے لگا بلکہیں بھی جھپٹکا تو آنسو گر پڑے آج تو نہ جانے کہاں سے اتنی فراوانی سے آنسو آ گئے تھے۔۔۔۔۔ سارا دن اور ساری رات مسلسل آنکھیں جھپکاتے کے ساتھ آنسو پمپ ٹپ کرتے رہے۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں کے گوشے اس قدر محروم ہو گئے تھے کہ آنکھیں بند کرنے میں بھی تکلیف ہونے لگی تھی یوں محسوس ہوا تھا جیسے صدیوں سے آنکھیں

خواب ہوں اور بندھن نہ ہو رہی ہوں۔ ساری رات بے خوابی میں گزری..... کروٹیں بدلتے ہوئے، سسکیاں بھرتے ہوئے اور روتے ہوئے۔
اگلے دن شفق اس کی حالت دیکھ کر سخت پریشان ہوئی۔ ”موحد..... کیا تم میرے ساتھ کہیں چل سکتے ہو؟“ اس نے اس کی توجہ ٹھانے کے لیے اسے کنکنا باہر نے جانا چاہا۔

”کہاں.....؟“ وہ بے ذاری سے بولا۔

”کہیں..... ضروری کام ہے.....؟“

”کیا آج ہی ضروری ہے.....؟“

”ہاں.....“

”اچھا..... چلیے۔“ وہ اسی طرح اٹھتے ہوئے بولا۔

”کم آن..... کپڑے تو پہنچ کر لو۔“

”یہی ٹھیک ہیں..... کیا فرق پڑتا ہے۔“ وہ اس کے ساتھ باہر نکلا۔ شفق گاڑی ڈرائیو کرنے لگی اور وہ خاموشی سے سوچوں میں گم بیٹھا رہا۔ وہ سب سے پہلے سیکل کے گھر گئی..... اس کے گھر والوں کو پیسے دیے اور ان کا ایڈریس لیا کہ آئندہ وہ انیس مئی آؤڈر بھجوا دیا کرے گی..... اس کی ماں ابھی تک بستر پر پڑی موت کی منتظر تھی..... اس کی بہنیں اس کا بہت شکریہ ادا کر رہی تھیں موحد نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور گرد و پھیلی یا سیت کو چار پائی پرائیڈیاں رکڑتے وجود کو..... زندگی کو یوں سکتے دیکھ کر وہ گھبرا سا گیا اس کا دل کٹنے لگا۔

”کون تھے یہ لوگ.....؟“ اس نے شفق سے گاڑی میں پوچھا۔

”ہمارا ایک ڈرائیو تھا اس کے گھر والے وہ مارا گیا..... اور اب یہ تھا ہیں ہائل تھا کوئی بھی تو آسرا نہیں۔“ شفق آہ بھر کر بولی۔

”کیا..... وہ ایک ہی آسرا تھا اور وہ بھی مارا گیا..... یہ پھر بھی زندہ ہیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں..... زندگی تو گزاری ہی پڑتی ہے..... ہر کوئی اعداد سے انتہائی دگنی ہے جتنے تم ہو۔“

”کیا آپ بھی.....؟“

”ہاں..... میں بھی.....“ وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

”کس کے لیے.....؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”بہت سوں کے لیے.....“ وہ خاموشی سے ڈرائیو کرنے لگی۔ پھر آصف کے گھر اس نے پیسے دیے..... شام گہری ہو رہی تھی جب اس نے بڑے سے گھر کے سامنے گاڑی روکی اور باہر نکل کر گیت کھولا ہر طرف گہری اداسی اور تاریکی سی چھائی تھی..... یوں جیسے کوئی شہر غوشاں ہو نہ جانے زندگی کے آثار کب کے مٹ چکے تھے..... اس نے گاڑی پورے بیچ میں داخل کی، اس کی لائٹ آن کی اور دروازہ کھول کر اندر چلی گئی وہ اس کے ساتھ تھا..... لاؤنج میں بلکی بلکی روشنی تھی اور ٹی وی انتہائی آہستہ آواز میں چل رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ٹیوب لائٹ آن کی شہزاد ایک صوفے پر

چار لپے بیٹھی تھی اور اس کے ہاتھ میں سکرٹ سلگ رہا تھا۔ وہ شفیق اور مودود کو دیکھ کر چمکی۔

”شزا آئی..... یہ..... کیا آپ کو کیا ہوا ہے.....؟“ وہ شزا کی بری حالت دیکھ کر بولی۔ اس کی صحت بہت خراب لگ رہی تھی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے جیسے نہ جانے کب سے جاگ رہی تھیں۔

”شفیق..... تم..... کہاں سے آئی ہو.....؟“ شزا نے حیرت سے پوچھا۔

”میں..... میں..... میری چھوڑ دیے، آپ نے کیا حالت بنا رکھی ہے..... آپ کو کیا ہوا ہے اور شائل کہاں ہے؟“ شائل کے نام پر مودود نے چونک کر اسے دیکھا اور اس کے سامنے خوبصورت نیلی آنکھوں والی ماڈرن سی خاتون محکم گئی جواب اپنی ذات سے بھی بے نیاز عجیب سے طبع میں بیٹھی تھی۔

”کیا آپ شائل کی مما ہیں.....؟“ مودود نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں..... میں ہی اس بد نصیب کی ماں ہوں۔“ وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

”کیوں..... کیا ہوا..... اور شائل کہاں ہے.....؟“ اس نے یکدم چونک کر پوچھا۔

”وہ..... فوشین ہاؤس میں ہے۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”اوہ..... تو.....“ مودود شفیق دونوں ایک دم چونک کر بولے۔

”اس کے حواس کام نہیں کر رہے، وہ بالکل پاگل ہو گئی ہے۔“ وہ ہلکتے لہجے میں بولی۔

”مگر کیسے.....؟“ شفیق پوچھا کر بولی۔

”اس گھر میں نہ جانے کون سی محسوس ہے یہاں کسی کا بھی اپنے حواسوں پر قابو نہیں ہے اور شائل کے اندر تو بہت سے طوفان اکٹھے ہو گئے

تھے۔ وہ..... وہ..... ان کا مقابلہ نہ کر سکی اور ٹوٹ گئی..... بکھر گئی..... میری بیٹی ریزہ ریزہ ہو گئی۔“ شزا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”آئی ایم سوری..... اور اس نے مجھ سے بھی رابطہ نہیں کیا۔“ مودود بولا تو شزا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی جیسے کچھ

بجھانے کی کوشش کر رہی ہو۔

”تم..... تم..... ولیم ہو.....“ شزا نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں..... پہلے تھا..... اب مودود ہوں۔“

”کیا تم مسلمان ہو گئے ہو.....؟“

”ہاں.....“ شزا کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں۔

”اور تم شفیق کے ساتھ..... کیسے؟“

”یہ میری بہن ہیں.....“ مودود نے جواب دیا۔

”کیا مطلب..... تم شہلا کے بیٹے ہو.....؟“

”جی.....“

”اوہ..... مائی گاڈ..... یہ سب کیا ہے تو دوسری میں شہلا تھی اور میں اسے پہچان ہی نہ کی۔ یہ کیسے ممکن ہے.....؟“ وہ بڑبڑائی۔

”مما کی اب ڈیو تھ ہو چکی ہے۔“ شفق نے اسے بتایا۔

”کب.....؟“

”ایک ماہ ہو چکا ہے اور آپ میرا دوسری کیوں نہیں بلاتیں بھانجی کیسے گزرے گی؟“ شفق نے کہا۔

”وہ..... یہاں نہیں رہتا چاہتا اسے اس گھر کے در و دیوار سے عزت ہے میں نے اس کے لیے فلیٹ بھی لیا تھا لیکن وہ نہ میرے ساتھ

رہتا چاہتا ہے اور نہ ہی اس گھر میں..... آئی ایم آل الون..... نوکر ہیں اور میں ہوں۔“

”آئی آپ گھر نہیں کریں، ہمت کریں ہم یہاں آتے رہیں گے۔“ شفق نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

”جج.....“ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں جیسے گھٹا ٹوپ اندر سے اس کوئی جگنو چاٹک بھٹکا ہوا کہیں سے آ گیا ہو اور وہ ایک لمحے کے لیے دم

خورد ہو گئی ہو.....

”ہم..... شاکل سے ملے فوشین ہاؤس بھی جائیں گے اور شاکل ٹھیک ہو جائے گی۔“ موحہ نے اسے تسلی دینا چاہی۔

”کیا وہ واقعی ٹھیک ہو جائے گی..... کیا تم واقعی جج کہہ رہے ہو۔“ انتہائی مایوسی میں اس جملے نے جیسے مرہم کا کام کیا۔ ”خدا..... تمہیں ہمیشہ

سلامت رکھے۔“ اس نے موحہ کے سر پر ہاتھ دیا..... شزا کے منہ سے انتہائی بے بسی سے نکل ہوئی دعا نے جیسے اس کے اندر حرارت بھر دی..... اسے اپنے

قدموں تلخ زمین اور سر کے اوپر آسمان مسکراتے ہوئے محسوس ہوئے..... ایک ٹولے والی کی دعا لکنا اثر کرتی ہے اس کا دل بھی سرور ہونے لگا۔

”ہم کل اس سے ملنے جائیں گے.....“ موحہ نے شفق سے کہا تو وہ خوش ہو گئی۔

”آئی اپنا خیال رکھیں..... سب ٹھیک ہو جائے گا مجھے اپنی کچھ چیزیں چاہیے تھیں وہ لینے آئی ہوں۔“ وہ کہہ کر کمرے میں چلی گئی۔

”تم بہت خوش نصیب ہو کہ خدا نے تمہیں ایک اچھی بہن دے دی ہے۔“ شزا نے اس سے کہا تو وہ کہیں کھوسا گیا۔ خدا ایک رشتہ دیتا ہے

تو دوسرا چھین لیتا ہے۔ اور کو چھینا تو شفق کو دیا..... ماما کو چھینا تو حیدر انکل کو دے دیا..... خدا کی مصلحتیں وہی جانے لیکن شزا آئی کی بات نے اسے

قدرے سکون سادیا۔

”چلو..... موحہ.....“ اس نے جگ پکڑتے ہوئے کہا۔

”لائیں یہ مجھے پکڑا دیں۔“ اس نے آگے بڑھ کر اس کا جیک پکڑا اور ہار نکل گیا..... اسے واقعی آج کسی بھائی کی بہن ہونے پر فخر ہونے

لگا۔ اس کا بوجھ اٹھانے والا اس کے ساتھ قدم بہ قدم چل رہا تھا اسے ایک عجیب سی طمانیت اور تحفظ کا احساس ہو رہا تھا..... وہ قدرت کی اس نعمت پر

حیران ہو رہی تھی..... تاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھا..... جہاں ہر طرف تاریں جھلار ہے تھے جیسے ان کے ملاپ پر خوش ہو رہے ہوں.....

دونوں اگلے دن فونٹین ہاؤس گئے تو شزا بھی وہاں پہنچی ہوئی تھی آج وہ قدرے بہتر لگ رہی تھی۔

”آئی آپ کب آئیں۔۔۔۔۔؟“ شفق نے حیرت سے پوچھا۔

”صبح سے یہاں پہنچی ہوں۔۔۔۔۔ تم لوگوں کی شکر تھی کہ ہو سکتا ہے ہم تینوں کو دیکھ کر میری مثال کچھ پازینوری ایکٹ کرے۔“ وہ بے امید لہجہ میں بولی۔

تینوں مثال سے ملنے گئے۔۔۔۔۔ مثال کے ہال ٹھہرے ہوئے تھے اور آنکھیں کسی بھی جذبے سے بالکل عاری تھیں نہ چہرے پر کسی قسم کے تاثرات تھے نہ آنکھوں میں۔۔۔۔۔ وہ حیرت سے تینوں کی طرف دیکھتی رہی اور پھر جیسے موجد کی طرف دیکھتے دیکھتے وہ کسی سوچ میں ڈوب گئی۔۔۔۔۔ وہ زبان سے کچھ نہ بولی۔۔۔۔۔ بس دیکھتی رہی اور پھر نہ جانے کہاں سے اس کے لبوں پر مسکراہٹ سی پھیل گئی۔۔۔۔۔ اسے عرصے بعد خوبصورت سی مسکراہٹ آنکھوں میں بھی ان کا عکس لہرا سا گیا۔۔۔۔۔ شزا شفق اور موجد تینوں چونک گئے جیسے کسی کونز کے عالم میں زندگی کا پروانہ مل گیا ہو۔۔۔۔۔ وہ بغیر کچھ کہے مسکراتی ہوئی واپس چلی گئی۔

”موجد۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ وہ دیکھا تم نے۔۔۔۔۔ آج۔۔۔۔۔ اسے عرصے بعد مسکرائی ہے وہ۔۔۔۔۔ میری مثال ٹھیک ہو جائے گی نا۔۔۔۔۔ وہ زندگی کی طرف لوٹ آئی گی نا۔۔۔۔۔ اے میرے خدا اس کو بس ایک بار زندگی کی طرف لوٹا دے۔“ شزا کی سرت دیدنی تھی۔ آنکھوں سے خوشی کے آنسو برسنے لگے۔

”موجد شاید اس نے تمہیں پہچان لیا ہے۔“ شفق بولی۔ خوشی کے مارے اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

”معلوم نہیں۔۔۔۔۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ یقیناً۔۔۔۔۔ وعدہ کرو۔۔۔۔۔ تم یہاں آتے رہو گے پلیز میری بیٹی کو زندگی کی طرف واپس لے آؤ تمہارا یہ احسان میں کبھی بھی نہیں بھولوں گی۔ ایک ٹوٹے دل کی بھی دعا ہے کہ خدا تمہیں ایسی خوشیوں سے نوازے کہ ساری زندگی کسی بھی شے کی تمنا نہ رہے۔۔۔۔۔“ شزا کے لہجے کی بے بسی اور ملتیجائی نہ لہجے نے اس کے دل کے زخموں کو ہرا کر دیا۔ اس نے سر جھکا یا تو لورا آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔

”میں انسانیت کی ایسی خدمت کرنا چاہتی ہوں کہ جب میں مروں تو میرے لیے زمین بھی روئے اور آسمان بھی۔۔۔۔۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو حیرنے لگے۔ تمہاری کس کس بات کو بھولوں۔۔۔۔۔ تم بن زندگی کیسے گزر پائے گی۔ مثال نہ جانے کہاں سے آگئی تھی اور لورا کا مشن اسے کچھ کرنے پر آمادہ کرنے لگا نہ جانے خدا کنزیاں کہاں سے کہاں ملاتا ہے۔۔۔۔۔ ہم سوچتے رہ جاتے ہیں اور ان راستوں اور نشانوں کو کھوجتے رہ جاتے ہیں کہ اس نے ہمارے لیے کیا کچھ پلان کیا ہے۔ کیا کیا مصلحتیں۔۔۔۔۔ کیا کیا حکمتیں اور کیا کیا راز پوشیدہ ہیں۔۔۔۔۔ اتنی دنیاؤں کا خالق انسانوں کو بھی کیسے کیسے الجھاتا ہے۔۔۔۔۔ اور انسان زندگی کی آخری سانچوں تک ان الجھے ہوئے دھاگوں کو سلجھاتا رہتا ہے۔۔۔۔۔ سمجھ بھگ بھی نہیں آتی۔

”وعدہ کرو۔۔۔۔۔ تم انسانیت کے ناطے یہاں آتے رہو گے میری مدد کرو گے۔۔۔۔۔ ایک بے بس مکرور ماں کی جس کے پاس کچھ بھی نہیں رہا اور تمہارے لیے صرف میرے پاس دعا کہیں ہیں۔“ اس نے فرط جذبہ سے اس کے ہاتھوں کو چوم لیا۔ اس کے اندر خوشی کا مہرہ احساس جاگزیں ہو

گیا..... ایسی خوشی جس کا زندگی میں پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے مگر چہرے پر مسکراہٹ ہی پھیل گئی۔

”ہاں..... میں انشاء اللہ یہاں آتا رہوں گا..... بشکل اور اس طرح کے بہت سے لوگوں کے لیے میں جو کچھ بھی کر سکا، ضرور کروں گا۔“

وہ آہستہ سے بولا تو شہزادہ سرور کی لوث مٹی جیسے اس کے سر سے کوئی بوجھ دھڑکی طور پر ہٹ گیا ہوا اور اس نے چند ساتھوں کے لیے سکون کا سانس لیا ہوا۔

انسان کا نشوونما کی کہی جیمن اندر ہی اندر محسوس کرتا رہتا ہے مگر پھر بھی چہرے پر مسکرائیں سہائے شادیاں رہتا ہے۔ شاید ہر ایک کے اندر کہیں نہ کہیں ایک کفر کی ضرورت ہوتی ہے..... جہاں زندگی کے درد و الم سے گھبرا کے وہ چند گھنٹوں کے لیے اسے کھولتا ہے تو تازہ ہوا کے جھونکے اسے چند ساتھوں کے لیے پرسکون کر دیتے ہیں..... ایسا سکون جس کا پوری کائنات میں کوئی نعم البدل نہیں ہوتا..... جس سے صرف روح معطر ہوتی ہے، دل کی دنیا سرور رہتی ہے مگر پھر بھی نہ جانے نمی کہاں سے آ کر آنکھوں میں تیرنے لگتی ہے اور گونج دار قبضوں کے سنگ اک سر آواز نہ جانے کہاں سے ابھر کر سارے وجود کا احاطہ کرنے لگتی ہے۔ آنکھیں سامنے کوئی اور منظر دیکھتی ہیں مگر نہ جانے کہاں کھوی جاتی ہیں، باتوں باتوں میں بھٹکتے ہوئے نہ جانے آنکھیں کیوں بند سے لگتی ہیں۔ جسم سے جذب ہوا اور روح سے آئینہ ساری کے سفر میں اتفاقیات کھانے کے بعد انسان ہل بھر کر رک کر سو چتا ہے.....

جب تک کسی ایسی ہستی کا دکھ دل میں بسیرا نہ کر لے اور روح میں سرایت نہ کر جائے جو دنیا بھر سے محبوب ہو..... جو عزیز از جان ہو..... جس پر سارے سچے جذبے قربان ہوں، جو ہمیشہ سانسوں کے سنگ زندہ رہے، جو دل میں آنے والے خیالوں سے بھی ہم کلام ہو اور جو سچوں پر بھی حاوی ہو..... ایسی ہستی سے جہاں کا دکھ انسان کے رویں روئیں میں جب تک طویل نہ کر جائے تو یہ آنکھیں دنیا والوں کے دکھوں پر یوں اچانک کبھی نہ بھرا نہیں..... اٹک اچانک کبھی نہ بہہ نکلیں، کسی کو مضطرب دیکھ کر دل کبھی بے قرار نہ ہو کسی کی تڑپ کبھی اپنی تڑپ نہ محسوس ہو۔ جذبوں کی ایسی آبیاری کے لیے پہلے انہی کے خون سے تو انہیں پہنچا پڑتا ہے۔

کس	قدر	دکھ	ہے	زندگانی	میں
جیسے	نکل	جائے	زہر	پانی	میں
سستی	صدیوں	کا	درد	شمل	ہے
ایک	انسان	کی		کہانی	میں

دو دنیا کے سانچ پر کھڑا تھا۔

ہر کوئی پر مشوق نکالوں سے محو تھا شائق..... اس کے وجود کی روشنی سے گرد و نواح بھی روشن ہو رہے تھے..... نہ جانے کتنے لڑکھانے منور ہو رہے تھے..... کتنے لب دعا گو تھے..... اور آنکھیں محبت سے جھکی جا رہی تھیں۔ اس کی حیات جاوداں کے لیے کتنے ہی دل بخود عا تھے..... انسان جنم لیتا ہے اور پھر راضی عدم ہو جاتا ہے مگر حقیقت میں وہی کامیاب ہوتا ہے جو قدم بدھاتا ہے فکرت ہاتھوں کو تھامنے کے لیے..... نوٹے دلوں کو جوڑنے کے لیے..... اور برستی آنکھوں کو پونچھنے کے لیے..... جو زمانے کے دھکے مارے ہوؤں کو خار غزاں نہیں بننے دیتا۔ قدرت اس پر حیات جاوداں کے راز منکشف کرتی ہے۔ دنیا کا سانچ ان کے مرنے کے بعد بھی ان کے وجود کی رعنائیوں سے کبھی خالی نہیں ہوتا۔

قدرت ان کے وجود کی خوشبو پوری کائنات میں بھرتی ہے۔ وہ ایسا ہی ایک کردار بنے جا رہا تھا۔۔۔۔۔ جیسا نور نے چاہا تھا۔ جنور کا مشن تھا اسے اب وہ اپنا لے جا رہا تھا۔۔۔۔۔ اور اس نے پہلا قدم رکھ دیا تھا۔۔۔۔۔ شاید قدرت بھی ایسا ہی چاہ رہی تھی۔
”اور تم کچھ چاہی نہیں سکتے مگر جو جہانوں کا پروردگار ہے۔“
انسان نالمد ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اس کی ہمتوں سے اور اس کے منصوبوں سے اسرار ہمیشہ اسرار ہی رہتے ہیں۔



ختم شد

پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام